٤٩

سلاطین دہلی

کا

سیاسی نظریہ

محمد حبیب و بیگم افسر عمر سلیم خاں

U-954.022
HAB

سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ

سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ

(بمعہ ترجمہ فتاوائے جہانداری از ضیاء الدین برنی، سال تصنیف تقریباً ۹-۱۳۵۸ء)

مؤلفین

محمد حبیب

اور

ڈاکٹر بیگم افسر عمر سلیم خاں، ایم۔ اے، پی ایچ ڈی

مترجم

سید جمال الدین

ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی

بہ اشتراک

انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی

CHECKED 2019

پہلا اُردو ایڈیشن ——— 1000 ——— 1979ء ——— 1901 (شک)

© اُردو : انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی

954.022
MOH
History Delhi - Sultans
1) India - Sultanat period - History

POLITICAL THEORY OF DELHI SULTANATE

8433
G 895

قیمت : -/13 روپے

CHECKED 2002

[اس کتاب کا اُردو ترجمہ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی سے حاصل ہوا۔]

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اردو، ویسٹ بلاک 8، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی 110022 نے اے۔ جے پرنٹرز۔ نئی دہلی سے چھپوا کر ترقی اردو بورڈ، حکومت ہند، نئی دہلی کے لیے شائع کیا

CHECKED 2013

پیش لفظ

علم، دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ذخیرۂ علوم ان کی اپنی زبانوں میں دست یاب ہو۔ اردو والوں کی ذہنی اُپج، فکری بالیدگی اور ان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے بھی ضروری ہے کہ اردو زبان میں عصری علوم اور فنون سے متعلق بنیادی، معلوماتی اور معیاری کتابیں شائع ہوں۔ چنانچہ ترقی اردو بورڈ / بیورو فار پروموشن آف اردو نے عصری ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں، بچوں کے ادب، لغات، فنی اصطلاحات اور انسائیکلوپیڈیا کی تیاری کے علاوہ عام مطالعے کی سائنسی، علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتّب کیا ہے۔

اب تک بیورو نے خاصی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں جن کو ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا جارہا ہے۔ بعض کتابوں کے تو دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی اشاعتی پروگرام کا ایک حصّہ ہے۔ امید ہے کہ اسے علمی اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

بیورو فار پروموشن آف اردو،
وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود،
حکومتِ ہند

به یاد

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی، ڈی۔ایس سی

وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فہرستِ مضامین

عنوانات	نمبر صفحہ
مقدّمہ	
(پروفیسر محمد حبیب)	۱۵
ترجمہ فتاوائے جہانداری	۳۵
(ڈاکٹر افسر بیگم)	
دیباچہ از ضیاء الدین برنی	
نصیحت ۱ (سلطان کا ذاتی تحفّظ)	۳۶
نصیحت ۲ سلطان کی دینداری کے اثرات کے بارے میں	۳۸
نصیحت ۳ صلاح و مشورہ کے فیوض کے بارے میں	۴۹
نصیحت ۴ عزمِ درست، اِس کے اور استبداد اور ستیہش کے درمیان فرق کے بارے میں	۵۸
نصیحت ۵ سلطان کے عدل کے بارے میں	۶۳
نصیحت ۶ افسران اور خواص کے مراتب کے بارے میں	۶۹
نصیحت ۷ فوج کے بارے میں	۷۴
نصیحت ۸ ۱۔ برید کے بارے میں	۸۹
۲۔ خلافتِ راشدہ کا دور تاریخِ عالم میں درمیانی وقفہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ نوعِ انسان اپنے قدیم طریقوں پر واپس آجاتا ہے۔	
نصیحت ۹:	
۱۔ قیمتوں پر کنٹرول (نرخوں کا ضبط)	۹۷

		نمبر صفحہ
	۲۔ اسلام کے اصولوں اور ادارۂ بادشاہت کے درمیان تضاد۔	۱۰۵
نصیحت ۱۰	سلطان کے وقت (کی اہمیت) کے بارے میں	۱۰۸
نصیحت ۱۱	مرکز میں حق و صداقت کے قیام کے بارے میں،	۱۱۲
	۱۔ نظریۂ تناقص: منفیات کا اتفاق ناممکن ہے کیوں کہ دو منفی قوتوں میں سے کوئی بھی اپنی مخالف ضد کو قطعاً ناپید نہیں کر سکتی۔	
	۲۔ برنی ہندو مذہب کے خلاف کھل کر مقابلہ کرنے کی وکالت کرتا ہے۔	
	۳۔ برنی یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین بے تعصب ہیں۔	
	(الف) ہندو خوش حال ہیں، (ب) مسلمانوں کو گناہ آلود پیشیوں کی چھوٹ ہے اور (ج) فلسفیوں کو تعلیم دینے کی اجازت ہے۔	
	۴۔ برنی اس بات کی وکالت کرتا ہے کہ تعلیم کمتر طبقوں کے لیے ممنوع ہونا چاہیے کیونکہ تعلیم انھیں قابل اور لائق بنا دے گی۔	
نصیحت ۱۲	عدل کے نظم و نسق کے بارے میں	۱۲۶
	۱۔ فرماں روا کا فطری اور جبلّی جذبۂ عدل	
	۲۔ مساواتِ خاص و عام	
نصیحت ۱۳	سلطان کا رحم اور سرزنش	۱۳۲
	۱۔ اعتدال اور امتیاز کی ضرورت	
	۲۔ سلطان کا اعترافِ حقوق	
	۳۔ سرزنش کے کچھ مسائل	
نصیحت ۱۴	ضوابط کے بارے میں	۱۴۶
نصیحت ۱۵	سلطان کی اولو العزمی کے بارے میں	۱۵۸
نصیحت ۱۶	سلطنت کے امراض کے بارے میں	۱۶۵
نصیحت ۱۷	سخت مطالبات ترک کرنے کی مصلحت کے بارے میں	۱۷۷
نصیحت ۱۸	سلطان کی متضاد خوبیوں کے بارے میں	۱۸۲
نصیحت ۱۹	ریاست کے معاونین کی عالی نسبی کے بارے میں	۱۹۳
نصیحت ۲۰	کسی کو سلطان پر فوقیت حاصل نہیں ہونا چاہیے۔	۲۰۱

نمبر صفحہ

نصیحت ۲۱ شریف اور رذیل کے بارے میں ۲۰۲

نصیحت ۲۲ سلطان کے پرانے خاندانوں کے تحفظ کے فوائد کے بارے میں ۲۰۹

نصیحت ۲۳ تنگ خیالیاں جو بادشاہت سے میل نہیں کھاتیں۔ ۲۲۳

نصیحت ۲۴ تمام نصیحت کی اساس۔ سلطان کی نجات نیاز مندی پر منحصر ہوتی ہے جس سے اس کا قلب معمور ہوتا ہے۔ ۲۲۹

ضیاء الدین برنی کی حیات اور افکار ۲۳۴ تا ۳۲۶

(پروفیسر محمد حبیب)

باب اول: مقدمہ ۲۳۴

باب ۲ : تصانیف ۲۴۰

باب ۳ : ضیاء الدین برنی: خاندان اور ابتدائی زندگی ۲۵۸

باب ۴ : ضوابط ۲۶۴

باب ۵ : حکمراں طبقہ ۲۷۷

باب ۶ : ضیاء الدین برنی: عالم شباب اور عہد ۲۹۱

باب ۷ : نظریۂ بادشاہت ۳۱۶

ضمیمے ۳۲۴

حرفِ آغاز

یہ میرا خوش گوار فرض ہے کہ میں میڈیویل انڈیا کوارٹرلی کے اڈیٹر کی حیثیت سے کہ جس میں یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی اس کو عوام سے متعارف کراؤں۔

ظاہر ہے کہ ہر ملک اور ہر دور میں متعدد سیاسی نظریے ہوں گے جن میں کشمکش بھی ہوگی۔ یہ بدنصیبی ہے کہ دہلی سلطنت کے عہد سے سیاسی نظریات کے موضوع پر ہم تک جو واحد تصنیف پہنچی ہے وہ مشہور مورّخ ضیاءالدین برنی کی فتاوائے جہانداری ہے اس میں ہمیں ایک مخصوص مفکر کے خیالات اور ایک مخصوص جماعت کا نقطۂ نظر ملتا ہے۔ لیکن صرف یہی کافی نہیں ہے۔

عہدِ سلطنت کے سیاسی نظریات کا آغاز جہانداری سے ہونا چاہیے۔ لیکن اس کتاب کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے اور اس سلسلے میں پہلے تو مصنّف کی زندگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاکہ اس کی ذاتی پسند یا ناپسند کو خارج کیا جاسکے اور دوسرے اس عہد کے سیاسی واقعات کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے تاکہ اس میں شامل بیانات اور اس کے قطعی فیصلوں کی صحت کی پرکھ ہوجائے۔ پیشِ نظر کتاب اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے۔

فتاوائے جہانداری کا ترجمہ (بہ زبانِ انگریزی) افسر بیگم (بیگم افسر سلیم خاں) نے لندن اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے ڈاکٹر پیٹر ہارڈی کی زیرِ نگرانی کیا تھا۔ علی گڑھ واپس آکر انھوں نے اپنے ترجمہ پر نظرِ ثانی کی لیکن ان کے ترجمہ کی جو موجودہ شکل ہے اس میں ان کے بیشتر، پرانے حواشی ناکافی محسوس ہوئے۔ ڈاکٹر افسر بیگم نے، جن کا تقرر پشاور یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا تھا، اپنے ترجمہ کا نظرِ ثانی کیا ہوا ٹائپ شدہ نسخہ اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ حواشی کے ساتھ پروفیسر حبیب کے پاس چھوڑ دیا۔ باقی حواشی جو زیادہ تر تنقیدی نوعیت کے ہیں، پروفیسر حبیب نے مس انیس جہاں ایم اے (استاد تاریخ، مہارانی لکشمی بائی کالج، بھوپال) کی مدد سے تیار کیے جنھوں نے تمام مواد جمع کیا، حوالے تلاش کیے، اور

اصل نوٹس کو ٹائپسٹ کے لیے صاف ستھرا لکھا۔

اس مرحلہ پر پروفیسر حبیب نے، جو صفحے پر صفحے لکھتے جاتے تھے اور پھاڑتے جاتے تھے۔ فرمایا کہ بحیثیت ایڈیٹر میڈیول انڈیا کوارٹرلی یہ میرا فرض ہو جاتا ہے کہ میں انھیں اس سلسلے میں مشورہ دوں کہ اس کتاب کے کیا تقاضے تھے۔ میں نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ ایک مختصر مقدمہ لکھیں جو اضافی حواشی کی مدد سے فتاوائے جہانداری کے ترجمہ کو قابل فہم بنا دے گا اور یہ کہ وہ جہانداری کے اختتام پر ضیاء الدین برنی کی حیات اور اس کے خیالات پر ایک مقالہ مزید شامل کر دیں تاکہ جہانداری اور اس عہد کی دوسری تصانیف کی تنقیدی تحقیق سے عہدِ سلطنت کے ایک نظریہ کا ظہور ہو سکے۔

دہلی سلطنت کے طلباء کے لیے فتاوائے جہانداری ایک بیش قیمت دریافت ہے۔ یہ ہمیں قرونِ وسطیٰ کے سیاسی ماحول، یعنی حکمراں طبقے کے نصب العین اور حوصلوں اور اہم جماعتوں کی سرگرمیوں کا تاثر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ تاریخِ فیروز شاہی کے سمجھنے میں بھی معاون ہے۔ بے شک ہندوستانی تاریخ ادب میں اسے ایک مستقل مقام حاصل ہوگا۔

خلیق احمد نظامی

مقدّمہ

عصرِحاضر میں عہدِ سلطنت کی دستیاب کتابوں میں خواجہ ضیاء الدین برنی کی فتاوائے جہانداری واحد ہندی تصنیف ہے جو قطعی طور پر سیاسی نظریات کے لیے وقف ہے۔ تاریخ ہند کے تمام طالب علموں کو اس کے انگریزی ترجمہ کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو ڈاکٹر افسر بیگم (بیگم افسر سلیم خاں) کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اصل فارسی نسخہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی ریسرچ اسسٹنٹ مس کشور رشید ایم۔اے مرتّب کر رہی ہیں

فتاوائے جہانداری کے لیے ایک مفصل مقدمہ۔ یا بلکہ عہدِ سلطنت کے سیاسی نظریات کے لیے مقدمہ۔ میں تیار کر رہا ہوں اور امید ہے ایک دن یہ چھپ جائے گا۔ بہر کیف جہانداری کے ترجمہ کو صحیح طور سے سمجھنے کے لیے قاری کے سامنے مندرجہ ذیل نکتے پیشِ نظر ہیں۔

۱۔ فتاوائے جہانداری فی الحقیقت مصنّف کی مشہور تاریخ فیروز شاہی کی توسیع ہے۔ اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان بنیادی خیالات کو، جن کا برنی اپنی پہلی تصنیف میں اظہار کر چکا ہے، سیاسی فلسفہ کے ایک مربوط طرز کی شکل میں پیش کرے۔

۲۔ فتاوائے جہانداری کی نوعیت کی وضاحت کرنے میں یہ حقیقت ہماری مدد کرتی ہے۔ یہ ہمیں اس عہد کے دو بڑے اہم ترین سیاسی سرگرم گروہ یعنی 'غلام افسران' سے مختلف اشراف، یا 'عالی نسب' افسران کے گروہ کے سیاسی نظریات سے روشناس کراتی ہے اور اس کے سیاسی مقاصد کی تشریح کرتی ہے۔ برنی 'غلام افسران' کے گروہ کو 'زر خرید' روپیوں سے خریدے ہوئے) کہہ کر اس کی توہین کرتا ہے لیکن انھیں مجموعی طور پر مملکت کے سیاسی نظام پر غلبہ حاصل تھا گو کہ انھیں یہ غلبہ بلا شرکت غیرے حاصل نہیں تھا۔ صرف یہی دو سرگرم گروہ تھے جو محکمۂ حکومت چلانے میں دلچسپی لیتے تھے۔ کئی دوسرے سرگرم گروہ بھی تھے جیسے ہندو تاجر طبقے، ہندو زمیندار، مسلم صوفیا، علماء، فوجی افسر اور سپاہی، شہری مزدور، طبقے وغیرہ لیکن انھیں اپنے مخصوص معاشی اور تہذیبی مفادات

ہی سے سروکار تھا اور ان کا کوئی نظریۂ حکومت نہیں تھا۔

برنی ایک ایسے خانوادہ سے تعلق رکھتا تھا جس کے عالی نسب ہونے کے بارے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کی پرورش اس طرح ہوئی تھی کہ اسے یہ یقین ہو گیا کہ سماجی نظام کے لیے اولین حقیقت عالی نسبی ہے لیکن اس کے طبقہ کی ناکامیابی اور اس کی ذاتی مایوسیوں نے اس کے جذبات کو بہت تلخ کر دیا تھا، اسے علاؤالدین خلجی کی حکومت میں کوئی عہدہ نہیں ملا۔ وہ بیس سال تک محمد بن تغلق کا ندیم رہا لیکن فیروز شاہ کے تخت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد، جس وقت برنی کی عمر بہ حساب قمری ستر سال تھی، اس کے خلاف الزامات عائد کیے گئے اور اسے بھٹنیر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کی زندگی تو بخش دی گئی لیکن معلوم ہوتا ہے اس کی جائداد ضبط کر لی گئی تھی کیونکہ اس نے اپنی بقیہ زندگی، تقریباً آٹھ یا نو سال، انتہائی عسرت میں گزاری۔ وہ اپنے کو کوزہ پشت، سفید ریش اور نصف نابینا بتاتا ہے اور یہ کہ کوئی اس کا دوست نہیں ہے اور وہ کسی سے ایک پیسہ بھی قرض نہیں لے سکتا۔

پھر بھی اس نحیف و نزار اور بے سہارا شخص نے عہد سلطنت کی دو عظیم ترین تصانیف قلمبند کیں جن کی تالیف کی پشت پر تین مقصد کارفرما تھے۔ یعنی فیروز شاہ تغلق اور اس کے امراء کے درمیان شرف قبولیت، حصول بہشت اور مستقبل کے عالی نسب قارئین کی ہدایت۔ پہلے مقصد میں اسے ناکامیابی ہوئی لیکن ممکن ہے دوسرے مقصد میں اسے کامیابی ہو گئی ہو۔ اس حقیقت کے بعد کہ جہانداری کو تقریباً ٹھیک چھ سو سال بعد مرتب کیا جا رہا ہے۔ اور اسی کا ترجمہ کیا جا رہا ہے (اور یہ کہ فیروز شاہی کو، جسے پہلے سرسید احمد خاں نے مرتب کیا تھا، پروفیسر ایس۔ اے رشید دوبارہ مرتب کر رہے ہیں) یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ برنی کم از کم اپنے آخری مقصد میں کامیاب ہے۔

ترکان چہل گانی کے دور سے، جنھوں نے شمس الدین التمش کی موت کے بعد دہلی سلطنت کو اپنے زیر اثر کر لیا تھا، ان کم اصل اشخاص تک جنھوں محمد بن تغلق نے ان کی 'لیاقت' اور 'وفاداری' کے سبب اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا تھا، 'تاریخ فیروز شاہی کم اصلوں کے سیاسی اقتدار کے خلاف ہمارے مصنف کے مسلسل احتجاجات کا بیان کرتی ہے۔ جس وقت ہمارا مصنف جہانداری کی تالیف کر رہا تھا اس وقت نسب کے اصول میں اس کا یقین مذہبی عقیدہ کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ وہ اس طرح اظہار خیال کرتا ہے۔ "زمانہ کی ابتدا سے ہی انسانوں کی خوبیوں اور خامیوں کی تقسیم کر دی گئی ہے اور انھیں ان کے نفوس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ انسانوں کے اعمال و افعال احکام الٰہی سے سرزد ہوتے ہیں۔ جب بھی قادر مطلق خداوند قدوس کسی انسان میں اچھائی یا برائی، نیکی یا بدی پیدا کرتا ہے تو وہ اسے وہ قدرت بھی عطا کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ اچھائی یا برائی، نیکی یا بدی کا اظہار کر سکے۔ فنون کے لیے، وہ لطیفہ ہوں یا عامیانہ، یہ قابلیت موروثی ہے۔ اور کیوں کہ فضیلتیں ان لوگوں کے اندر پیدا کی گئی ہیں جو عمدہ پیشے اختیار کرتے ہیں چنانچہ وہی نیک ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان ہی کو عالی رتبہ، پیدائشی آزاد، نیک، دیندار، عالی نسب اور نجیب الطرفین کہا گیا

ہے..... صرف یہی گروہ سلطان کی حکومت میں عہدوں اور منصبوں کے مستحق ہیں..... رذیلوں اور کم اصلوں کو ترقی دینے سے اس دنیا میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے کیوں کہ خالق کائنات کی حکمت کے خلاف کام کرنا عاقبت اندیشانہ ہے..... کم اصلوں اور کمینوں کی ہوشیاری اور مستعدی پر فریفتہ نہ ہو کیوں کہ ان کی فضیلتیں نقلی ہیں اصل نہیں" (نصیحت ۲۱)

۳- لہٰذا فتاوائے جہاں داری کی بنیادی خصوصیت اس کا طبقاتی نقش ہے۔ برنی مذہب اور سیاست دونوں کو اشراف کے حقوق و مراعات کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ وہ اشراف یا عالی نسب مسلمانوں کو متعدد درجات اور ذیلی درجات میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اور ان کا تمام عہدوں اور وظیفوں پر اجارہ ہونا چاہیے۔ تعلیم کم اصل مسلمانوں کو لائق اور قابل بناتی ہے جس سے وہ اپنے سے برتر لوگوں کو للکار سکتے ہیں اور ان پر سبقت لے جاسکتے ہیں لہٰذا برنی اس بات پر زور دیتا ہے کہ حکومت کمتر درجوں سے آنے والے مسلمان لڑکوں کو تعلیم حاصل کرنے سے باز رکھے اور جو شخص بھی انھیں تعلیم دینے کی جسارت کرے اسے سزا دینا چاہیے اور جلاوطن کر دینا چاہیئے۔ برنی کی نظر میں دکان دار اور ان سے نچلے تمام طبقے کم اصل ہیں۔ برنی کو دکان داروں سے بہت زیادہ نفرت ہے۔ ہوسکتا ہے انھوں نے اسے ادھار سامان دینے سے انکار کیا ہو۔

قرآن کی تمام مستند تفسیروں اور تمام تر مذہبی ادب کی ضد میں اشراف کے مخصوص حقوق و مراعات کے اس نظریے کو مذہبی زندگی اور آخرت کے امور میں پر رد دیا گیا ہے۔ قرآن کی مشہور آیت "بے شک، تم میں سے جو پرہیزگار ہیں وہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز ہیں،" کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ تقدس اشراف کا حق ہے۔ لہٰذا بالفرض کوئی شخص پرہیزگار ہے تو اس کے اجداد میں ضرور ہی اشراف کے کچھ عناصر ہوں گے لیکن اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ کم اصل ہے تو پھر اس کا تقدس محض تصنع ہے۔ اگر اللہ کی نظروں میں خانوں، ملکوں اور امیروں کے مقابلہ میں تسائیوں، جلاہوں، دکان داروں کے بیٹوں کی زیادہ عزت ہے تو یہ ایک شرمناک بات ہے۔ اسی طرح برنی کا سلطان صوفیاء و مشائخ سب سے بالاتر (قطب) ہے اور اس کا رتبہ انبیاء کے برابر ہے جب کہ سلطان کے عالی نسب مشیر ان رازوں کو سمجھ سکتے ہیں جو خدا نے اپنی لوح محفوظ میں پوشیدہ رکھے ہیں۔ ایسے ہی رجحان کی مظہر وہ لعن طعن ہے جو برنی نے ان اشخاص پر کیا ہے جو اپنی ذاتی 'آزاد مرضی' سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اچھی شراب کی طرح اسلام کا پشتوں کے مٹھوں میں پک کر پرانا ہونا ضروری تھا۔ روحانی طور پر اثر انداز ہونے کے لیے اسلام کو موروثی ہونا چاہیئے تھا۔

۴- " حالانکہ میں انس و ملائک کی زبانوں سے بولتا ہوں اور ہمدردی نہیں برتتا ہوں پھر بھی میں خالی خولی پیتل یا ایک بجتے ہوئے جھانجھ کی طرح ہوں۔ (کورنتھی)" برنی یقیناً فرشتوں کی زبان سے نہیں بولتا ہے۔

CHECKED 2018

وہ اس کا اعتراف کرتا ہے کہ جب محمد بن تغلق کی موت کے بعد اسے بھٹنیر کے قلعہ میں نظر بند کیا گیا تو اس کے دشمنوں نے فیروز تغلق کے سامنے اس کے نام کے ساتھ "ہزاروں اقسام کے زہر آلودہ الفاظ" منسوب کیے۔ وہ (زہر آلودہ الفاظ) صحیح ہو سکتے ہیں۔ برنی بحیثیت مصنف کے نامہذب حکمات کا بے حد شائق ہے جن میں سے کئی کلمات صرف اسی وقت سمجھے جا سکتے ہیں جب ان کا فارسی سے ہندی میں لفظی ترجمہ کر لیا جائے۔ فیروز شاہی میں تو اس کی سخت کلامیوں میں ایک ادبی رنگ ہے لیکن جہانداری میں محض گھٹیا گالیاں ہیں۔ نیز رب العالمین نے اپنی رحمت کے خزانہ سے ہمدردی، تحمل اور عفو پروری کے اوصاف سے برنی کو محروم رکھا ہے۔ وہ نفرت کرتا تھا اور بہت سخت نفرت کرتا تھا اور اپنی نفرت کو ایک خوبی تصور کرتا تھا۔ مسلمانوں میں فلسفی، سائنس داں، مرتد، تمام کم اصل مسلمان اور خاص طور سے ان میں سے وہ جنھوں نے اعلیٰ عہدے حاصل کر لیے تھے اس کے تنفر کا نشانہ بنے۔ اسے غلام طبقہ امراء سے بھی اتنی ہی سخت نفرت رہی ہوگی لیکن اس موضوع پر وہ بالواسطہ اور محتاط ہو کر بولنے کے لیے مجبور تھا۔ وہ تمام غیر مسلموں اور خاص طور سے ہندوؤں سے نفرت کرتا تھا۔ اور حتیٰ کہ "ہندو مذہب کے خلاف عام جنگ" کو جائز قرار دینے کے لیے جس کے لیے سلطانوں نے برسرپیکار ہونے سے انکار کر دیا تھا، اس نے امام شافعی کے نظریات کی غلط تصویر پیش کی۔ ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ہمارا مصنف اپنے حریفوں کی نفرت میں بجھی ہوئی چوگان کی چھڑی سے پاگل ہونے کے لیے مجبور" کر دیا گیا تھا۔ جنھوں نے اسے ذاتی طور پر ایذا پہنچائی تھی وہ انھیں گالی نہیں دے سکتا تھا البتہ جنھوں نے اسے کوئی تکلیف نہیں دی تھی ان پر لعنت بھیج کر اس نے اپنی روح کو تسکین پہنچانے کا راستہ تلاش کر لیا۔

۵۔ فتاوائے جہانداری کی عجیب ہی طرز ہے۔ اس کتاب کا واحد دستیاب نسخہ دولت مشترکہ کے کتب خانہ (Commonwealth Library) میں ایک قلمی نسخہ کی شکل میں محفوظ ہے جس سے موجودہ ترجمہ (بہ زبان انگریزی) کیا گیا ہے۔ اس قلمی نسخہ کے صفحہ اول میں "ضیاء برنی" اپنے کو اس کتاب کا مصنف بتاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ صفحے غائب ہیں اور ہم اندازے ہی لگا سکتے ہیں کہ برنی نے کیا لکھا ہوگا؟ جوں جوں ہمارا مطالعہ بڑھتا ہے ہم پر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ سلطان محمود اس کتاب کا میر افسانہ ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ تین مختلف اشخاص یکے بعد دیگرے بول رہے ہیں یعنی سلطان محمود، محمود کا ایک ہم عصر اور خود برنی، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کہاں ان میں سے ایک کی گفتگو ختم ہوتی ہے اور دوسرے کی شروع ہو جاتی ہے۔ نیز کبھی محمود کے بارے میں اس طرح گفتگو کی جاتی ہے جیسے وہ حیات ہو اور کبھی اس طرح جیسے وہ مرحوم ہو۔ تیسرے شخص غالباً مولانا قفال ہیں جو شافعی عالم تھے اور جنھوں نے (ابن خلکان کے خیال کے مطابق) مرو میں محمود کو شافعی مسلک بنایا یا کسی شخص نے مولانا قفال کے نام سے ایک مصنوعی کتاب تحریر کر دی جس کا عنوان ہے تاریخ محمودی اور برنی

نے اپنی تاریخ برمکی کے پیش لفظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ قفّال کی کتاب اس کے زیر مطالعہ رہی ہے. غالبًا اسی کتاب سے متاثر ہو کر برنی نے اپنی کتاب کے لیے یہ مخصوص طرز اختیار کیا. تاریخ کے سلطان محمود کے متعلق برنی کی واقفیت بہت کم ہے یا وہ بالکل ناواقف ہے. بلکہ درحقیقت اس کی لاعلمی خوفناک ہے. بہرحال محمود کو برنی کے فلسفہ کا بوجھ برداشت کرنا ہے گو کہ اس نے الف سے لے کر ی تک اس کی تردید کی ہوتی. ہمعصر ادبی روایت نے اس عجیب طرز بیان کی اجازت دے رکھی تھی، اور برنی نے کچھ تو اس لیے اس طرز کو فوقیت دی ہوگی تاکہ اسے اپنے نظریات کے لیے وہ داد و تحسین حاصل ہو سکے جو محمود جیسی روایتی شخصیت عطا کر سکتی تھی لیکن اس طرز کے انتخاب کا اولین مقصد تنقید اور تعذیب سے دامن تہی رہا ہوگا. پھر سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ محمود اور قفّال کے اقوال کے لیے کوئی اسے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا. محمود کے بارے میں جو متضاد باتیں ہیں جو اول تا آخر موجود ہیں. انھیں میں برنی کی کمزور یادداشت سے منسوب کرتا ہوں. اس کتاب کے آخری پیراگرافوں میں جنھیں افسر برنی کا آخری حصّہ کہتی ہیں. ہمارا مصنف اپنی مایوس کن زندگی اور اپنی تصنیف کے لیے مستقبل کے عظیم افسروں سے انصاف کی امید میں ایک ایک مرتبہ پھر سے اپنی داستان سنانے لگتا ہے. جہاں داری کا طرز بیان برنی کے لیے یہ لازم کر دیتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے بعد کے واقعات یا اشخاص کا حوالہ نہ دے. اس نے سلطان سنجر کا ذکر کیا ہے، اس کی وجہ غالبًا لاعلمی یا چوک ہے. جہانداری میں کسی بھی دہلی سلطان کو اس کے نام سے یاد نہیں کیا ہے حالاں کہ کئی جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس کے ذہن میں رہے ہوں.

۶- تاریخ فیروز شاہی کی برتری سے ہمیشہ کے لیے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ برنی ہمعصر واقعات کا بے مثل اندراج کرنے والا تھا- وہ عربی کا ایک اچھا عالم تھا اور اسے رسولؐ اور خلفائے راشدین کے عہد کے اہم واقعات کا علم تھا، باقی تاریخ اسلام کے بارے میں اس کا علم بہت معمولی تھا اور جو کچھ اسے معلوم بھی تھا وہ سب غلط تھا- اپنی تاریخ فیروز شاہی کے پیش لفظ میں برنی کچھ مصنوعی کتابوں اور نیز مندرجہ ذیل مشہور و معروف مصنفوں کی تصانیف کا حوالہ دیتا ہے- طبری، عتبی، بیہقی، فردوسی اور منہاج السراج، فتاوائے جہانداری کا جائزہ لینے پر یہ ثابت ہوگا کہ یا تو برنی نے ان مصنفوں کی اصل تصنیفات کا مطالعہ نہیں کیا ہے یا پھر وہ انھیں قطعی بھول چکا تھا. غالبًا پہلی صورت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے- اسی طرح جہانداری میں جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یا تو گھٹیا اور بے کار من گھڑت تھیں. جو ہم تک نہیں پہنچ سکیں، یا صرف وہ ہمارے مصنف کے پیکر خیالی میں موجود رہی تھیں.

اس مسئلہ پر بہت غور و فکر کی ضرورت ہے- تصوف پر عہد سلطنت سے ہم تک کافی کتابیں آئی ہیں جنھیں یقینًا ان صوفیاء اور علماء نے نہیں لکھا تھا جن سے وہ منسوب کی گئی تھیں مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش ہے. ایک ملاقاتی نے شیخ نظام الدین سے عرض کیا کہ اس نے اودھ میں شیخ کی تصنیف کی ہوئی ایک کتاب پڑھی تھی. شیخ نے

یہ سن کر جواب میں فرمایا "لیکن میں نے کسی کتاب کی تصنیف نہیں کی ہے اور میرے چشتیہ سلسلہ کے کسی بھی شیخ نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے" اس کے باوجود اس وقت بھی تمام عظیم چشتی مشائخ اور ان کے نمایاں خلفاء کے نام سے نثر اور نظم میں جعلی کتابیں لکھی جارہی تھیں۔ شیخ نصیرالدین چراغ نے اس مصنوعی ادب کے خلاف احتجاج کیا لیکن یہ ادب بڑھتا ہی رہا۔ کسی شخص کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کہاں سے آتا تھا اور کسی کو بھی اس کے لیے ذمہ دار نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ اس ادب کی، جس کے ایک حصہ کا میں بہت عورسے تجزیہ کرچکا ہوں، دو نمایاں خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی سطح علم بہت معمولی ہے۔ مصنف خاصے مشہور و معروف تاریخی حقائق سے ناواقف ہیں۔ تصوف کے اصولوں کے بارے میں ان کی معلومات بہت خفیف ہیں اور وہ ایسی من گھڑت کرامات بیان کرتے ہیں جو زمانہ تاریخ کے برعکس ہیں اور ایسی کتابوں کے نام ایجاد کرتے ہیں جن کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ تمام ادب بالکل بے مقصد ہے یہاں تک کہ مصنفین کے ساتھ کوئی ضرر رساں مدعا بھی منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ وہ عظیم اور بہت زیادہ مقبول مشائخ اور ان کے خلفا کے نام سے کچھ۔ کچھ بھی۔ لکھیں۔

ہم اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے ہیں کہ یہ صوفی ادب جعلی تھا کیوں کہ اس کی بہت زیادہ اور غیر تنقیدی مانگ تھی۔ عہد سلطنت میں اگر کسی شخص کو ایک کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو اسے بس ایک کاتب کو رکھنا پڑتا تھا جو اس کے لیے یہ کتاب لکھ سکے۔ لیکن کتب فروش فوری ضرورت کے لیے ایسی کتابیں اپنے پاس رکھتے تھے جن سے ان کی آمدنی میں خوب اضافہ ہو سکے۔ بہر کیف چشتی سلسلہ کے عظیم مشائخ نے کوئی بھی کتاب نہیں لکھی۔ اس کے باوجود عوام مستقل ان کی تصنیف کی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ہم یہ آسانی سے تسلیم کر سکتے ہیں کہ متعدد کتب فروش ایسے کرائے کے اہل قلم رکھتے تھے جنھیں اس طرح کی مصنوعی کتابیں تیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی تھی جن کو عوام ان صوفیاء پر اپنے عقیدے کی وجہ سے خریدنے کے لیے تیار ہوتے تھے جن سے وہ منسوب ہوتی تھیں۔ حق طبع یا اشاعت کا کوئی مسٔلہ ہی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جب پہلے کتب فروش نے اپنی تیار کرائی ہوئی کسی کتاب کے کچھ نسخوں کو "چلا دیا"، تو دوسرے کتب فروش بہت شوق سے اس کی نقلیں تیار اور فروخت کر کے کچھ بھی منافع کما سکتے تھے۔ شیخ نصیرالدین چراغ نے، جیسا کہ پہلے بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ فیروز شاہ کے عہد میں اس قسم کے ادب کے خلاف اس بنیاد پر اعتراض کیا کہ یہ لغو تھا اور قابل اعتماد نہیں تھا، عصر آخر کے ناقد عالموں نے، جیسے اکبر کے عہد میں شیخ عبدالحق نے، اسے مستند تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اس کے باوجود اس کی نقل در نقل ہوئیں اور فروخت ہوئیں۔ جن صوفیاء و مشائخ کے ساتھ یہ ادب منسوب تھا ان کے لیے عوام کا جذبۂ احترام ان کی بقاء کے لیے ذمہ دار تھا۔ اور آخری بات یہ کہ زمانہ اور وقت نے اسے ایک طرح کا تقدس دے دیا۔ پچھلی

دو نسلوں کے دور میں ہندوستان میں مختصر جلدوں میں تصوف کی جعلی کتابیں اصل فارسی میں بھی اور ان کے اردو تراجم بھی بہت مقبول رہے اور ان کی کافی فروخت تھی۔ ذاتی کتب خانوں اور عام کتب خانوں میں زیادہ جعلی تصانیف کے قلمی نسخے بہت آسانی سے مل جاتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اس زمانہ میں اس طرح کے جعلی ادب میں اضافات شامل کرنے کی روایت بند ہوگئی ہے۔

عہد سلطنت میں تاریخ کے میدان میں بھی اسی طرح کے مصنوعی ادب، کا ظہور ہوا۔ عوام جمشید جیسے بادشاہوں کی تصنیفات کے خواہش مند تھے جن بادشاہوں کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا یا وہ سنجر جیسے ان عظیم سلطانوں کے اوپر لکھی گئی کتابوں کی مانگ کرتے تھے جن کی وہ تعریف وستائش چاہتے تھے۔ لہٰذا کتب فروشوں نے ایک وصایائے جمشید اور سنجر کی سوانح حیات، جو اس کے مفروضہ معتمد معین اعتم کی لکھی ہوئی تھی، شائع کردیں۔ اس قسم کا ادب خاصا ضخیم تھا۔ لیکن اس کی قیمت اتنی اچھی نہیں تھی جتنی کہ تصوف پر لکھے گئے مصنوعی ادب کی تھی کیوں کہ اسے وہ تقدس حاصل نہیں تھا جب یہ ثابت ہوجاتا تھا کہ تاریخ پر ایک تصنیف مصنوعی تھی تو کوئی اس کے تحفظ کی فکر نہیں کرتا تھا چنانچہ اس طرح کا بیشتر مصنوعی تاریخی ادب ناپید ہوگیا۔ بدقسمتی سے برنی ایسے مصنوعی، جعلی ادب سے اپنی واقفیت کی بنیاد پر مورخ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ جہاں داری کی تاریخی مثالیں اس کی کافی تصدیق کرتی ہیں یہاں تک کہ برنی کی ان مستند کتابوں کے بارے میں لاعلمی، جو اس کے زمانہ میں دہلی میں دستیاب تھیں، کافی خطرناک ہے اور جغرافیہ کے بارے میں اس کی لاعلمی اس سے بھی زیادہ پرخطر ہے۔

لیکن برنی نے جن حالات میں تصنیف وتالیف کا کام سنبھالا، انھیں فراموش نہیں کردینا چاہیئے۔ ۱۳۵۱ء میں اپنی برطرفی کے بعد یعنی اڑسٹھ سال (بحساب قمری) کی عمر سے برنی نے کم از کم سات کتابیں سپرد قلم کیں۔ ثنائے محمدی (یا نعت محمدی)، صلوٰۃ کبیر، عنایت نامۂ الٰہی، مآثر سادات، تاریخ فیروز شاہی، حسرت نامہ اور فتاوائے جہانداری۔ وہ یادداشت کی بنیاد پر لکھ سکتا تھا، ترجمہ کرسکتا تھا، کسی دوسری تصنیف کی بنیاد پر اپنی ایک کتاب لکھ سکتا تھا یا پھر وہ ان خیالات کو منطقی طور سے پیش کرسکتا تھا (جیسا کہ اس نے جہانداری میں کیا) جو عرصہ سے اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ لیکن تحقیق وتفتیش اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

۷۔ سیاسی نظریات پر قلم اٹھانے والا کوئی بھی اہل قلم دنیا کی تاریخ کو نظرانداز نہیں کرسکتا ہے، لہٰذا برنی نے اپنے سیاسی فلسفہ کے بنیادی اصول یعنی حق موروثی کے اصول کے مطابق حکومت کے تمام عہدوں کی تفویض کے موافق دنیا کی تاریخ کا ایک خیالی پیکر بنالیا ہے۔ اپنی تاریخ فیروز شاہی میں وہ یوں اظہار خیال کرتا ہے کہ "کیمرث (آدم کے بیٹے) سے لے کر خسرو پرویز (قبل اسلام کے عظیم شہنشاہوں میں سب سے آخری تاجدار) تک ایران (عجم) کے کسراؤں کے عہد میں بادشاہ کا بیٹا منصب بادشاہی پر جلوہ افروز ہوتا تھا اور ملک

کا عہدہ ملک کے بیٹے کو جاتا تھا اور امارت اشراف تک محدود تھی" جہانداری میں بھی ایسے ہی بیانات نظر آئیں گے۔ وہ تمام حقائق جو اس سیدھے سادے اصول سے میل نہیں کھاتے تھے انھیں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۸۔ برنی نے ہندوؤں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا وہ غور طلب ہے۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں برطانوی حکومت صرف تین سے سات پشتوں تک قائم رہی۔ برطانوی حکومت کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ ایک اجنبی نسل ملک کے سیاسی اور اقتصادی دونوں نظاموں کو اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھی اور جس نے یہ طے کر رکھا تھا کہ یہ اجنبی ہی رہے گی اور اپنا الگ رنگ اور شکل و شباہت قائم رکھنے کے لیے دیسیوں سے خلط ملط نہیں کرے گی اور جو یقیناً اپنی تہذیبی، انتظامی، سائنسی اور صنعتی اہلیتوں سے ان سے کہیں برتر تھی۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو کرۂ ارض پر حاوی عظیم سفید سلطنت کے بے انتہا مضبوط فوجی اور اقتصادی وسائل نے مزید قوت بخشی۔ بہر کیف برطانوی عہد میں مصنفین نے 'برطانوی حکومت' کو سامنے رکھ کر نام نہاد 'مسلم حکومت' کی ایک خیالی تصویر بنالی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ 'برطانوی حکومت' کے بارے میں تو اپنی براہ راست معلومات حاصل تھیں لیکن جہاں تک "مسلم حکومت" کا سوال ہے، ان کا علم جنگوں اور سلطانوں تک محدود تھا۔ یہ درست ہے کہ مسلم سلاطین، جن میں سے بیشتر کا سلسلۂ نصب دوسرے ملک سے جا کر ملتا تھا، تقریباً چھ یا سات صدیوں تک ہندوستان میں مسند نشین رہے۔ لیکن وہ مسند نشین صرف اس لیے رہ سکے کیوں کہ ان کی تخت نشینی 'مسلم حکومت' کی تخت نشینی نہیں تھی۔ اگر صورت حال دیگر ہوتی تو ان کی حکومت ایک پشت تک بھی قائم نہ رہ پاتی۔ مسلمان اس سرزمین پر ایک اقلیت تھے۔ جن کے غیر ممالک سے راہ و رسم نہ تھے اور نہ ہی انھیں کسی غیر ملک سے کوئی مدد مل رہی تھی۔ ان میں سے امیر ترین سے لے کر غریب ترین تک تمام طبقوں اور گروہوں کے لوگ شامل تھے۔ کوئی بات بھی ان کے حق میں نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ان کے سماجی نظام میں مساوات کا رجحان پایا جاتا تھا اور وہ ذات برادری سے مبرا تھے۔ دونوں قوموں کے مزدور طبقوں کے پاس ایک ہی سے اوزار تھے، ویسا ہی اوسط ہنر تھا۔ ایک ہی بازار میں ایک ہی قیمت پر اپنی بنائی ہوئی اشیاء فروخت کرتے تھے، ایک طرح کا کپڑا پہنتے تھے جو کچھ مختلف طریقے بُنتا اور سیا جاتا تھا اور ایک ہی شے سے بنے ہوئے لیکن قدرے مختلف طرز کے مکانوں میں رہتے تھے۔ چوں کہ مسلمانوں کی اکثریت نچلے متوسط طبقے اور مزدور طبقوں پر مشتمل تھی لہذا 'مسلمانوں'، کا حکمراں طبقہ کی حیثیت سے تصور کرنا غلط ہوگا۔

اس طرح جہاں داری کا بغور مطالعہ کرنے سے، خاص طور سے نصیحت ۹ اور ۱۱ کا جائزہ لینے سے، یہ ظاہر ہوگا کہ انتظامیہ پر تو اعلیٰ مسلم طبقوں کا تسلط اتنا تھا لیکن ملک کا اقتصادی نظام مکمل طور پر اعلیٰ ہندو طبقوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ساہوکار، باربردار تاجر اور بیوپاری تھے اور لین دین، قرض، کا نظام، جو اصلیت میں

رائج سکوں کی بہ نسبت اشیاء کی زیادہ بڑی تعداد پر اپنا تسلط رکھتا تھا، پوری طرح سے ہندو ساہو کاروں کے ہاتھوں میں تھا۔ خواہ کوئی بھی اس سرزمین پر حکومت کرتا، یہ امیرانہ ہندو ساہو کاری اور تجارتی اجارہ داری ناقابل شکن تھی۔

افسر بیگم نے صحیح تبصرہ کیا ہے کہ "ہندوؤں کے معاملہ میں برنی کے دماغ میں خلل تھا۔ لیکن جس حقیقت نے اسے پاگل بنا دیا تھا وہ یہ تھی کہ دہلی سلطنت کسی مسلمان کو بحیثیت مسلمان کے کسی قسم کے مراعات حاصل نہیں تھیں۔ اسے ایک ایسے اقتصادی نظام میں اپنے لیے ذریعہ معاش تلاش کرنا تھا جس پر ہندو طبقوں کا تسلط تھا اور جیسا کہ برنی اظہار افسوس کرتا ہے مسلم سلاطین کسی بھی حالت میں ایک ایسے نظام کو چنوتی دینے کے لیے تیار نہیں تھے جس کے بغیر ان کی حکومت کام نہیں کر سکتی تھی۔

۹۔ سیاسی نظریات میں برنی کی ٹھوس خدمات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ دین اسلام اور سماجی ضرورتوں کی روشنی میں ادارۂ بادشاہت کے بارے میں اس کا تجزیہ ہے۔ وہ بلا جھجک بادشاہت کے غیر اسلامی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ بادشاہت کے اصول اور روایات قرآن کے احکامات رسولؐ کے اصولوں اور خلفائے راشدین کی روایات کے برخلاف ہیں۔ لیکن زمانہ کی ضرورتوں نے اس کے وجود کی تائید کی کیوں کہ اس کے بغیر سماج کا نظام ختم ہو گیا ہوتا۔ کچھ بھی ہو برنی دل سے ایک 'ادارتی بادشاہت' کا خواہاں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلطان بہت ہوشیاری سے اپنے مشیروں کا انتخاب کرے اور ان کے مشورے کو مشعل راہ بنائے۔ اس کا بنیادی اصول ہے "سلطانوں کے لیے کوئی رائے نہیں" جہانداری میں تقریباً ہر ادارہ کی روشنی میں سلطان کے فرائض کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۰۔ فتاوائے جہانداری دہلی سلطنت کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں بھی ہماری معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ کسی بھی لحاظ سے مذہبی ریاست نہیں تھی۔ شریعت اسلام اس کی بنیاد نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد سلطان کے بنائے ہوئے ضوابط تھے۔ برنی ضوابط کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "انتظامیہ کی اصطلاح میں ضابطہ اس کو کہتے ہیں جب سلطان مملکت کی بہبود کی خاطر اپنے اوپر ایک لازمی فرض کی حیثیت سے عائد کرتا ہے اور جس سے وہ کبھی بھی ذرہ برابر نہیں ہٹتا ہے" (نصیحت ۱۴) ظاہر ہے کہ ایسے قوانین حکمراں شاہی خاندان اور اعلیٰ مسلم ریا بلکہ ترک جتھوں کے حق میں ہوں گے جن کی اعلیٰ ترین فوجی اور انتظامی منصوبوں پر اجارہ داری ہوگی۔ بہرصورت اس کی بنیاد غیر مذہبی اور دنیاوی تھی۔ یہ کسی بھی طرح کی دینی کتابوں یا ان کی علماء کی کی ہوئی تشریحات پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد سلطان (یا سلطان اور اس کے مشیروں) کے اس فیصلہ پر تھی کہ اس کی مملکت اور عوام کی بہتری کس میں تھی۔ برنی اس سلسلے میں ہمیں کسی قسم کے شک وشبہ میں نہیں چھوڑتا ہے کہ اختلاف

کی صورتوں میں ضوابط شریعت کو رد کر دیتے تھے۔ لیکن اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے اس پر غور کرنا چاہیے۔ شریعت کی کیا نوعیت تھی (جس کے بارے میں برنی ساکت ہے) اور اس کے بعد میدان اختلاف کا جائزہ لینا چاہیے۔

شریعت یا دستور اسلام کی بنیاد قرآن اور رسولؐ کی حدیث ہیں (یعنی رسولؐ نے کیا کہا اور کیا کیا) چوں کہ قرآن اور حدیث ان تمام مسائل کا حل پیش نہیں کرتے تھے جن سے ایک ایسا سماج دوچار تھا جو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا لہٰذا ان عظیم فقہا نے جو شریعت اسلام کی تشکیل کر رہے تھے دو زبردست اصول قائم کر دیے۔ پہلا اصول قیاس کا تھا یا قرآن اور حدیث کے قائم کیے ہوئے اصول کا یکساں صورت میں اطلاق۔ دوسرا اصول استحسان یا عوام کی بہبود کا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ مقدس کتابوں کو سمجھنے اور ان کی تشریح کے لیے عقل اور تجربہ ضروری ہے۔ لیکن مسلم فقیہہ رومی قانون دانوں کے برخلاف یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ مقدس کتابوں کا سہارا لیے بغیر ہی عقل کسی بھی قانون شریعت کی بنیاد ہو سکتی تھی۔ انھوں نے ایسے مسائل پر ساکت رہنا پسند کیا جن کے بارے میں مقدس کتابوں کے اصول، قیاس اور استحسان کے استعمال کے باوجود، کوئی رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں شریعت میں ایسی چیز نہیں تلاش کرنا چاہیے جو اس میں کبھی رکھی ہی نہیں گئی تھی۔

اسلام کی اول پانچ صدیوں کے دوران شریعت کے اصول مباحثہ کا بہت گرم عنوان تھے۔ لیکن برنی سے ایک صدی پہلے تمام مباحثے اختتام پذیر ہو چکے تھے۔ جہاں مصالحت ممکن تھی وہاں اسے حاصل کر لیا گیا تھا لیکن جہاں مصالحت محال تھی وہاں اختلاف کو ایک طے شدہ حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا تھا اور قاضی مقدمہ طے کرتے وقت اور کوئی مسلمان اپنے خود کی ہدایت کرتے وقت کسی بھی تسلیم شدہ فقیہہ کی پیروی کر سکتا تھا۔ شریعت کی درسی کتابوں نے ان مسائل پر جن پر اجماع (اتفاق رائے) ناممکن تھا عظیم فقہا کی آراء کو ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ شامل کر کے مسئلہ کو سہل کر دیا۔ برعظیم ہدایہ اس موضوع پر ایک جامع رسالہ تھا اور میں اس کی بنیاد پر عالم اسلام کے مختلف حصوں میں بکثرت درسی کتابیں نمودار ہوئیں۔

غرض کہ شریعت یا فقہہ پر لکھی گئی کسی بھی کتاب کے ابواب کو اب آسانی سے دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ ابواب جو 'عبادات'، یا دینی ریاضات سے متعلق ہیں اور دوسرے وہ جو 'معاملات'، یا انسانی امور سے متعلق ہیں۔ شریعت کی تمام کتابوں نے 'عبادات' کے متعلق قانون قائم کرنے پر زور دیا ہے لیکن اس معاملہ میں مسلم دینی شعور نے انھیں مستند تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ محض رسمی اور میکانکی قانون تھے جنھوں نے زندگی کے روحانی عنصر کو نظر انداز کر کے مذہب کو بے معنی مقررہ فرائض کی ادائیگی تک محدود کر دیا۔ لیکن عبادت انسان اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے۔ حکومت اس میں مداخلت کرنے کی مجاز نہیں۔ وہ اہم قوانین جن پر ہمیں

یہاں غور کرنا ہے قوانین فوج داری، قوانین دیوانی اور قوانین عامہ ہیں۔

قانون روم کی طرح شریعت اسلام میں بھی قانون فوج داری بے ترقی یافتہ رہا ہے۔ مجموعی طور پر فقہہ کسی بھی قانون فوج داری کو رسولؐ کی احادیث پر مبنی کرنے سے بہت ہچکچاتے تھے لہٰذا وہ اپنے کو ان ہی جرائم (حدود) کی بحث تک محدود رکھتے تھے جن کے لیے قرآن نے ایک سزا تجویز کر دی ہے دوسری بدعنوانیاں، خواہ وہ کتنی ہی سنگین ہوں، شریعت کے لیے جرم نہیں تھیں اور ان کے بارے میں شریعت کا سکوت ان سب کو قانون مملکت کے لیے چھوڑ دیتا تھا۔

اس مسئلہ پر کوئی اختلاف رائے نہیں تھا کہ قرآن کی مجوزہ سزائیں بہت سخت تھیں اور یہ عام خواہش تھی کہ ان سے گریز کیا جائے، اور ان سے دو عذر رکھ کر گریز کیا جاتا تھا۔ پہلے تو برنی کے پیش کیے ہوئے اصول کے مطابق، شک کی بنیاد پر سزاؤں سے گریز کرو۔ شریعت میں قوانین شہادت اس قدر سخت بنا دیے گیے تھے کہ اس طرح کے جرائم ثابت کرنا عملاً ناممکن تھا جو عام جگہ پر سرزد ہوئے ہوں۔ ہر جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار شہادتوں کی ضرورت تھی اور ان کے بیانات میں خفیف سا اختلاف ہونے پر بھی استغاثہ کا مقدمہ خارج ہو جاتا تھا۔ دوسرے قرآن میں جن جرائم کا حوالہ دیا گیا ہے ان کی ہر ممکنہ طور پر بہت محدود تشریح کی گئی تھی۔

قرآنی حدود (سزاؤں) کا ایک مختصر سا جائزہ لینے پر ہمارے سامنے صحیح صورت حال کی تھوڑی سی تصویر آجائے گی (۱) چوری۔ چوری کے لیے قرآن نے ہاتھ کاٹنے کی سزا رکھی ہے لیکن یہ فیصلہ صادر کیا گیا کہ بالفرض کوئی شخص کسی ایسی منقولہ جائداد پر ناجائز طور سے قبضہ کر لیتا ہے جس پر اس کا کسی بھی طرح حق ہے تو اس کا یہ جرم چوری (سرقہ) کے مساوی نہیں ہوگا۔ اس طرح کسی شریک کا تجارت میں غبن کرنا چوری نہیں ہوا۔ نیز سرکاری خزانہ سے چوری کرنا بھی چوری نہیں کیوں کہ تمام مسلمان سرکاری خزانہ میں شریک تھے۔ اسی طرح یہ فیصلہ صادر ہوا کہ خورد و نوش کی اشیاء کا چوری کرنا بھی چوری نہیں تھا اور نہ ہی خورد و نوش سے متعلق چیزوں کا چرانا چوری کے تحت آتا تھا جیسے لکڑی اور کوئلہ۔ اس طرح۔ شہادت اور سزا دونوں کا۔ پورا میدان ضوابط کے لیے رہ گیا۔ اور حکومت جرم کی حد کے مطابق سزا سناتی تھی اور ہر ممکنہ طور پر سزاؤں کو کم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اولین مقصد یہ تھا کہ جرم کے دوبارہ ارتکاب کو روکا جائے۔ لیکن جب حالات کا تقاضہ یہ ہوتا کہ سنگین سزا دی جائے تو اس میں کوئی پس و پیش نہیں برتا جاتا تھا۔ خواہ قرآن اس سزا کی اجازت نہ دیتا ہو۔ مثال کے طور پر شاہراہ پر پڑنے والے ڈاکوؤں کو لے لیجیے۔ اس صورت میں سزائے موت دی جاتی تھی۔ آپ دہلی کے چوروں سے واقف ہوں گے۔ ایسے چور جنھیں سزا دی گئی لیکن ان میں سے کسی کے ہاتھ کٹے ہوئے نہیں تھے (۲) قتل: یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قرآن مقتول کے ورثا کو قاتل کی موت اور رقم کی صورت میں ایک خونبہا قبول کرنے (یعنی دیت) دونوں

میں سے کسی کے بھی انتخاب کا حق دیتا ہے۔ اس طرح کے اصول سے جیسا کہ گجرات کے پندرہویں صدی کے ایک سلطان نے تبصرہ کیا) دولت مندوں کو غریبوں کو قتل کرنے کی کھلی چھوٹ مل جائے گی۔ لہٰذا یہ فیصلہ صادر کیا گیا کہ سلطان تمام مقتولوں کا وارث تھا اور اسے کسی بھی طرح کی دیت، کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی سلطان کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ سزائے موت سے کم کوئی سزا دے۔ لہٰذا مختلف طرح کے قتلوں میں تفریق کی گئی اور ان میں سے ہر ایک کے لیے مناسب سزا تجویز کر دی گئی۔ لیکن سلطان مقتول کے ورثاء کو 'دیت' قبول کرنے کی اجازت دیتا تھا بشرطیکہ اس صورت میں عدلیہ کا مدعا بہتر طور پر حاصل ہو رہا ہو (۳) حرام کاری اور غیر منکوحہ کے ساتھ زنا کاری۔ 'کنز' جو کہ ہدایہ کا ایک بہتر کارآمد خلاصہ ہے، اس طرح وضاحت کرتی ہے...

اگر زنا کار شادی شدہ ہیں تو ان پر ایک کھلے میدان میں اس وقت تک پتھر برساتے رہنا چاہیے جب تک کہ ان کی موت واقع نہ ہو جائے اور عینی شاہدوں کو پتھر پھینکنے میں پہل کرنا چاہیے لیکن اگر انھیں ان کے اپنے ہی اقبال جرم پر سزا سنائی گئی ہے تو امام کو پہلے پتھر پھینکنا چاہیے۔ مرد ہو تو کھڑا کر کے اس پر پتھر برسانے چاہئیں لیکن عورت کو ایک گڑھا کھود کر پستان تک اس گڑھے میں دبا دینا چاہیے اور اس کے بعد اس پر سنگباری کرنا چاہیے۔ اگر زنا کار غیر شادی شدہ ہیں تب آزاد اشخاص کے تو ایک سو کوڑے لگانا چاہیے اور غلاموں کے پچاس کوڑے میں کوئی گانٹھ یا کانٹا نہیں ہونا چاہیے اور کوڑے کی ضرب درمیانی ہونا چاہیے، نہ تو بہت زیادہ اور نہ ہی بہت کم۔ مرد کا اوپر کا ستر کھلا رہنا چاہیے اور اسے کھڑا کر کے کوڑے لگانا چاہیے اور کوڑے سر، چہرہ اور عضو تناسل کو چھوڑ کر جسم کے مختلف حصّوں پر پڑنا چاہیے۔ امام ابو یوسف کی رائے کے مطابق اس کے سر پر بھی کوڑے لگانا چاہیے لیکن امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ کوڑے کی ضربیں صرف اس کی پشت پر لگنا چاہیے۔ عورت کو بٹھا کر کوڑے لگانا چاہیے۔ اس کے (اوپری) ستر کو کھلا نہیں رکھنا چاہیے لیکن اس کی چادر اور دوسرے ڈھانپنے والے کپڑے اتار لینا چاہیے...... وہ اشخاص جو زنا کے بارے میں غلط الزامات لگاتے ہیں ان میں سے آزاد اشخاص کے لیے اسّی کوڑے ہیں اور غلاموں کے لیے چالیس کوڑے۔"

ان سخت قوانین کو نافذ کرنے کی کوئی بھی خواہش نہیں تھی حتیٰ کہ شریعت کی تائید کرنے والوں کے حلقہ میں بھی ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ برنی اپنی فیروز شاہی میں شمس الدین التمش کے عہد کے ایک زبردست عالم سید نورالدین مبارک غزنوی کی اس رائے کو نقل کرتا ہے کہ طوائفوں کو پیشہ کرنے کی اجازت ہونا چاہیے ورنہ وہ بدمعاش جو اپنی ہوس کی تسکین کے لیے ان کے پاس جاتے ہیں، مسلم گھرانوں کی خواتین کی عصمت پر دست درازی کریں گے۔ یہ طرز فکر قرون وسطیٰ کے علماء کے عام خیالات کی نمائندگی کرتا ہے۔ زنا قابل سماعت (عدالت) جرم نہیں تھا۔ واقعہ کو ثابت کرنا مشکل تھا اور شریعت کے طریقۂ کار کے قواعد مکمل طور پر ملزم کے حق میں تھے۔ ہم نے دہلی میں زنا کاروں پر سنگ باری کا کوئی واقعہ نہیں سنا ہے۔ حالاں کہ علاؤالدین خلجی کہتا ہے کہ

اس طرح کے (زناکاری) کے مقدموں میں وہ مرد کو توخصی اور عورت کو قتل کروادیتا تھا۔ ضوابط کی مجوزہ شرائط کے تحت رقاصاؤں، طوائفوں، قحبہ خانوں، مے خانوں اور قمار گاہوں سب کو اپنے پیشہ اور جگہ میں بنے رہنے کی اجازت تھی حالاں کہ عوام میں اس پر اختلاف رائے تھا کہ حکومت کو اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟

(۴) الحاد: شریعت کی کتابوں کے مطابق الحاد کی صورت میں مردوں کے لیے سزائے موت اور عورتوں کے لیے عمر قید ہے۔ لیکن 'الحاد' کی کبھی واضح تشریح نہیں ہوئی۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا تھا کہ ان تمام مسلمانوں کو ملحد قرار دیا جائے جو راسخ عقیدگی کی راہ سے منحرف ہو چکے ہیں۔ اس کی انتہائی مثال اسماعیلی تھے۔ دوسری طرف یہ عام خیال تھا کہ انسانوں کے داخلی افکار کے بارے میں کوئی تحقیق نہیں کرنا چاہیے۔ الحاد کے لیے شاذ و نادر ہی سزائیں دی جاتی تھیں (مرتد مسلم فرقوں سے نسبت کی صورت کے علاوہ) اور تمام صورتوں میں مسئلہ ضوابط کے دائرۂ عمل میں آتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ قوانین فوجداری کا مکمل دائرہ، دلائل اور قانونی طریقۂ کار کے ذریعہ، جس کے بارے میں مختصراً بحث کی جا چکی ہے، حکومت کے دائرۂ عمل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہ کہا گیا کہ خود رسولؐ نے حدود سے گریز کرنے کی کوشش کی تھی۔

شریعت کی اہم خوبی اس کے قوانین دیوانی ہیں جو قرون وسطیٰ میں سب سے بہتر قوانین تھے۔ قرآن سے ہمیں بہت سے قانون نہیں ملتے ہیں لیکن رسولؐ کی حدیث کو، براہ راست اور قیاس کے اصول کے مطابق اس کے اطلاق دونوں کے ذریعہ قوانین دیوانی کے دائرہ میں جائز اور صحیح تصور کیا جاتا تھا۔ مزید برآں روایت کا اصول بھی تھا یعنی اس بات کا علم کہ رسولؐ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں کس طرح کام کیے جاتے تھے؟ نیز مسلم فقیہوں کی ذہانت نے بھی قوانین دیوانی میں، جو ان کا اولین موضوع فکر تھا، کئی اصولوں کا اضافہ کیا۔ یہ توقع کی جاتی تھی کہ سلطان اور اس کے ضوابط شہریوں کے ان ذاتی حقوق میں مداخلت نہیں کریں گے جن کی شریعت نے وضاحت کر دی ہے۔ پھر بھی اس سلسلے میں کم از کم تین مستثنیات تھے۔ پہلے تو یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ رواج یا عرف قانون شریعت کو منسوخ کر سکتا تھا۔ چنانچہ قرآن نے جو تمام مسلم مستورات کو حقوق وراثت دیے ہیں انھیں اکثر رواج نے ممنوع قرار دیا۔ شریعت اور مقامی رواج کے درمیان اختلاف کی صورت میں حکومت مداخلت کر سکتی تھی۔ دوسرے جہاں شریعت ساکت تھی وہاں ضوابط کو جگہ پر کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ سامانی سلطانوں نے (گردیزی کے زین الاخبار کے مطابق) اس دریافت کے بعد کہ شریعت نہروں اور آبی حقوق کے بارے میں ساکت تھی، اس موضوع پر ایک کتاب قانون تیار کروائی۔ آخری یہ کہ جب ذاتی حقوق قوانین عامہ سے ٹکراتے تھے تو مسئلہ حکومت کے دائرۂ عمل میں آجاتا تھا۔ ہندوستان میں زمین سے متعلق حقوق اس کی بہترین مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ ایک اخلاقی حق جس پر کسی

نے بھی اعتراض نہیں کیا یہ تھا کہ کاشت کار اپنی مشقت سے پیدا کی ہوئی چیز کا مستحق ہے۔ لیکن اس پر کس حد تک لگان لگتا تھا، لگان وصول کرنے کا طریقہ کیا ہوگا اور درمیانی لوگوں کی حیثیت کیا ہوگی؛ خواہ وہ موروثی مال گزاری وصول کرنے والے ہوں یا حکومت کے عہدیدار، یہ وہ مسائل تھے جنھیں ضوابط کو طے کرنا تھا۔ اس حقیقت نے کہ قرون وسطیٰ کی مملکتوں نے وراثت اور شادی کے حقوق میں مداخلت نہیں کی ایک بالکل غلط تاثر پیدا کر دیا ہے کہ شریعت حکومت پر حاوی تھی۔

قوانین عامہ کے سلسلے میں قرآن نے صرف ایک اصول پیش کیا ہے کہ مسائل کا فیصلہ عام مشورہ سے کرنا چاہیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسولؐ اور خلفائے راشدین کی سیاسی روایات کا اتباع شاہی حکومت کے لیے لازم تھے؟ برنی نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا ہے جس کے لیے اس نے دو دلیلیں دی ہیں جنھیں بہت زیادہ صاحب فکر مسلمان غالباً پسند نہیں کریں گے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ رسولؐ وحی الٰہی سے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور خلفاء راشدین رسولؐ کے شخصی اثر سے فیضیاب تھے۔ ہم اس خوش نصیبی سے محروم ہیں تو آخر ہم کس طرح خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں؟ علاوہ ازیں زمانہ خراب ہے "ایسا اسلام اور ایسے مسلمان اب باقی نہیں ہیں جن پر ابوبکر اور عمر کی طرح حکومت کی جا سکے۔" (نصیحت ۱۸) اگر یہ استدلال درست ہے تو پورے دین اسلام کی جواز خطرہ میں پڑ جائے گی رسولؐ کی روایات کی پابندی اس لیے لازم ہے کیوں کہ رسولؐ فیضان الٰہی سے منور ہونے کے باوجود ایک انسان تھے بہرصورت قرآن اس سلسلے میں بہت واضح اور فیصلہ کن اعلان کرتا ہے: "تمہارے لیے رسول اللہ ایک عمدہ مثال ہیں۔" ایک ایسی مثال جسے پس پشت نہیں ڈالنا ہے بلکہ جس کی پیروی کرنا ہے۔ برنی کے استدلال کو سیاست سے دوسرے دائروں تک لے جایا جائے تو اسلام کی پوری عمارت ہل جائے گی۔

برنی کی دلیلیں صحیح نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا بنیادی اصول اپنی جگہ درست ہے۔ خلیفہ، دوم کی حیثیت میں (بحیثیت حکمراں) ایک تضاد تھا۔ کئی ممالک ان کے زیر حکومت تھے لیکن وہ صرف مدینہ کے عوام کے سامنے جواب دہ تھے۔ تیسرے اور چوتھے خلفاء کے زمانہ میں اس تضاد کی وجہ سے بہت دشواریاں پیش آئیں۔ جب حضرت علیؓ نے مدینہ چھوڑ کر عراق کا رخ کیا تو رسولؐ کی شہری مملکت ختم ہو گئی۔ مدینہ کی جمہوریت کی بہت سی روایات اپنی نوعیت کی وجہ سے امویوں اور عباسیوں کی زبردست سلطنتوں میں قابل عمل نہیں تھیں۔ جمہوریہ مدینہ کی عوامی حکومت جو ایک چھوٹے سے شہر میں، جہاں ہر شخص ایک دوسرے کو جانتا تھا، مسجد نبوی کے اردگرد مرکوز تھی، ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی تھی۔ جمہوریت ایک نئی شکل میں تو آسکتی تھی لیکن اسے ایک شہری مملکت کی شکل میں نہیں زندہ کیا جا سکتا تھا۔ اس شکل میں تو اسلام نے ایسا کمال دکھایا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ تبدیلی کا رخ پستی کی طرف نہیں بلکہ ترقی کی طرف تھا۔ اگر اسلام کے اصول بنی نوع انسان کے لیے بہت قیمتی تھے تو ہمیں

اس پر تاسف نہیں کرنا چاہیئے کہ ان کی توسیع کے لیے اتنی زبردست قیمت ادا کرنی پڑی۔ تمام ہم عصر برنی کے اس خیال میں شریک ہیں کہ مسلمان صرف ساسانی بادشاہوں کی سیاسی روایات پر چل کر ہی زندہ رہ سکتے تھے۔ تاہم یہ خیال غلط تھا۔ برنی سے چار صدی قبل ایران کے مفکرین نے اپنے سلطانوں کی رہبری کی خاطر ساسانی اور قبل ساسانی فرمانرواؤں کی تاریخ کو تاریخی اسناد کا حوالہ دیے بغیر از سر نو مرتب کر لیا تھا۔ برنی کا افسانوی ایران ایرانی نشاۃ ثانیہ کی تخلیق تھا۔ اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

اگر شہری مملکت کی علاقائی مملکت میں تبدیلی کی وجہ سے خلفائے راشدین کی روایات پر چلنا محال ہو گیا تھا تو دوسرے معاملات۔ مال گزاری، درآمدی محصولات، افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہوں وغیرہ۔ میں بھی جغرافیائی حالات، پیداوار کے طریقوں، پھلوں اور فصلوں کی نوعیت، سماجی حالات اور اسی طرح عالم عرب اور غیر عرب دنیا کے فرق کی وجہ سے قدیم اسلام کی روایات پر نہیں چلا جا سکتا تھا۔

برنی کا یہ خیال صحیح ہے کہ شریعت نے اور نہ ہی خلفائے راشدین کی معروف روایات نے مسلم سماج کو ایسے قانون دیے جن کی بنیاد پر قرون وسطیٰ کی وسیع سلطنتوں کے انتظامی ڈھانچے کی تعمیر کی جا سکتی۔ اس طرح کی سلطنتوں کو ایسے ضوابط کی ضرورت تھی جو سلطان کے شخصی اختیارات پر مبنی ہوں لیکن جنھیں وہ اپنی مجلس شوریٰ کے مشورے کے بعد بنائے۔ برنی سلطان کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ اگر قدیم قوانین اچھی طرح کام دیتے رہے ہیں اور وہ زمانہ کے حالات کے لیے موزوں ہیں تو وہ ان پر عمل کرے۔ لیکن یہ بدلتی ہوئی دنیا ہے اور نئے حالات کا تقاضہ ہوتا ہے کہ قانون بھی نئے ہوں۔ ان نئے قوانین کو بہت غور و فکر سے بنانا چاہیئے۔ برنی تفصیل سے یہ بیان کرتا ہے کہ سلطان کی مجلس کو کس طرح کام کرنا چاہیے! ارکین مجلس کا انتخاب بہت ہوشیاری سے کیا جائے۔ ان کے رتبے یکساں ہوں اور وہ تمام رازہائے مملکت سے واقف ہوں۔ انھیں بولنے کی مکمل آزادی ہونا چاہیے اور کسی کی جان اور عہدہ خطرہ میں نہیں ہونا چاہیے۔ سلطان کو آخر وقت تک اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ درحقیقت اس کا یہ اولین فرض تھا کہ وہ اپنی مجلس کو اتفاق رائے (توفق آراء) قائم کرنے دے۔ برنی کا خیال ہے کہ کچھ مخصوص حالات کو چھوڑ کر (مثلاً جس وقت مجلس جذبات میں بہہ جاتی ہے) یہ اتفاق اس بات کی ضمانت ہے کہ فیصلہ صحیح تھا۔ قانون سازی ایک مسلسل عمل تھا لہٰذا برنی سلطنت کے طریق عمل کے دوام کے لیے سلطان کے بجائے مجلس کو ذمہ دار بنانا چاہتا تھا۔ وہ تمام سلطانوں کو خود رائی کے خلاف تنبیہ کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے قوانین پر قائم ایک شاہی مملکت حکمران طبقہ کی مملکت ہے۔ لیکن یہ کسی بھی معنی میں مذہبی مملکت نہیں ہے۔ تجربہ اور عقل اس کی بنیادیں ہیں۔ اس طرح کی مملکت میں سلطان اس معنی میں مقتدر اعلیٰ ہے جس کی ہابس اور آسٹن نے وضاحت کی ہے وہ اپنے انعامات اور سزاؤں سے ان قوانین کی اطاعت حاصل کرتا

ہے جو اس نے بنائے ہیں اور ساتھ ہی ان قوانین کے لیے بھی جو اس نے اپنے پیش رووں سے لیے ہیں. وہ ایک برتر انسان ہے اور کسی دوسرے انسان کی برتری تسلیم نہیں کرتا ہے۔ عوام کی 'بھاری' تعداد اس کی اطاعت کرتی ہے لیکن مایوس ہونے کے بعد اس کے عوام کے پاس ہمیشہ یہ اختیار تھا کہ وہ اس کا خاتمہ کر دیں۔

۱۱. برنی نظریۂ تخالف کی شرح کرتے وقت بہت زور بیان دکھاتا ہے جیسا کہ اس نظریہ کے سلسلہ میں اس کے زمانہ کے منطق کی تعلیم تھی کہ 'دو ضدوں کا اتحاد ناممکن ہے'، اس کی تطبیق کے چند پہلو قابل غور ہیں. برنی کے خیال کے مطابق تمام متعارض قوتیں دوامی ہیں ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی ایک قوت کچھ عرصہ کے لیے دوسری قوت کو اپنے قابو میں کر لے لیکن کوئی بھی قوت اپنی ضد کو مکمل طور پر خارج نہیں کر سکتی ہے. انسانی زندگی کے سلسلے میں وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ "دنیا کی تمام سلطنتوں کا ایک مملکت میں متحد ہونا یا تمام باطل مذہبوں کا خاتمہ محال ہے۔" (نصیحت ۱۱) اس کا مطلب یہ ہوا کہ سلطانوں اور مذہبوں کی دائمی جنگ کی وجہ سے ہماری انسانی امیدوں کا خاتمہ ہو جائے گا. آج ہمارا عقیدہ اس امید میں نہاں ہے کہ تمام (مخالف) ضدیں ایک اعلیٰ اتحاد میں مدغم ہو کر گم ہو جاتی ہیں یعنی 'نظریہ' اور 'ضد' 'امتزاج' کی طرف رہنمائی کرتے ہیں. اور ہم اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ایسے اصول ہیں جن کے مطابق ریاستوں کو ایک پر امن عالمی اتحاد میں ملایا جا سکتا ہے اور مذاہب پر امن تعاون کی فضا میں ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں اور کام کر سکتے ہیں۔

یہ قابل افسوس بات ہے کہ برنی نے بادشاہت پر اصول تخالف کا اطلاق کیا. ایک طرف تو وہ بادشاہت کو غیر اسلامی کہہ کر اس پر لعنت ملامت کرتا ہے اور سلطانوں کو دوزخ کا کندہ بناتا ہے لیکن پھر وہ دوسری انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور سلطانوں کو 'خدا کی متعارض صفات' میں شریک بناتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ خدا کا 'نائب' اور 'نقیب' ہے. برنی کے تعلیم یافتہ ہمعصروں میں سے کوئی بھی شخص اس دعوے سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا. خدا کی صفات متعارض معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ صرف ہمارے لیے متعارض ہیں. ان کا تعارض حسی ہے حقیقی نہیں. خدائے تعالیٰ کی وحدت تمام تناقضات سے بالا ہے. اسی طرح انسانوں کی، خواہ وہ سلطان ہوں یا عام شہری، 'متعارض خصوصیات' قابل فخر بات نہیں. تمام متعارضات محرومیاں ہیں اور تمام محرومیاں بدنصیبی ہیں. مملکت کی انتہائی خوبی۔ اور سلطان کی خوبی جہاں تک کہ وہ مملکت کی خاص خصوصیتوں کا مظہر ہے. اس کے اختیارات کے مخالف مظاہر میں نہیں بلکہ اس کے مقصد کی بنیادی وحدت میں پوشیدہ ہے. برنی کی بنیادی غلطی اس کے اس تصور میں نہاں ہے کہ خدا متعارض صفات کا مجموعہ ہے. اس کے بعد دوسری غلطیاں جو اس سے سرزد ہوئیں وہ اسی تصور کا ایک لازمی نتیجہ تھیں۔

اس سلسلہ میں ایک آخری بات اور پیش ہے۔ برنی کا یہ نظریہ کہ حکمراں طبقہ کے حقوق خدا کے لیے مقدور

کیے ہوئے اصول نسب پر مبنی ہیں. مسلم عہد کی ناقابل عبور دشواریوں کی طرف لے جاتا ہے. توسیع اسلام نے اشراف کے قدیم تاریک خیال طبقۂ امراء کو ختم کردیا اور کوئی نیا طبقۂ امرا اس کی جگہ نہ لے سکا. کسی نے بھی فرماں رواؤں کی ولدیت کے بارے میں تفتیش نہیں کی اور جائز سلطان اور غاصب میں کوئی تفریق کرنا عملاً ممکن نہیں تھا. مخالف گروہ، جو زیادہ تر کم اصل جاں بازوں پر مشتمل تھے، اقتدار کے لیے مقابلہ کرتے تھے اور ہر وہ گروہ جو حکومت پر قبضہ کرلیتا تھا، معزول گروہ کو نہایت بے رحمی سے ختم کردیتا تھا "محض اپنی جانوں کو بچانے اور ان کے تحفظ کی خاطر وہ سابقہ سلطان کے بہت سے خاندانوں، طبقوں اور قبیلوں کو ہر اس ممکن طریقہ سے جو ان کے ہاتھ آتا ہے، ختم کردیتے ہیں اور انھیں مفلس وعسیر کردیتے ہیں" (نصیحت ۲۲) برنی نے خود ایسا کافی کچھ دیکھا تھا. خود ایک حل دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس مقصد سے یہ بیان کرتا ہے کہ سلطان محمود مجبوروں کے ساتھ کسی طرح انسانیت سے پیش آیا. لیکن وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ جب تک معزول حکمران طبقہ کے افراد کو ان کی زندگیوں سے محروم نہیں کردیا جاتا . . . تو وہ مستقل بغاوتیں کرکے نئی حکومت چلنے نہیں دیں گے. حکمران طبقوں کی اس مستقل جدوجہد کے سلسلہ میں برنی کے پاس واقعی کوئی حل نہیں ہے. زمانہ کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ تخت شاہی کو کسی ایک مخصوص خاندان ہی میں برقرار رکھنا ممکن نہیں تھا. برنی نے قبل اسلام کی مملکتوں کے سلسلے میں تو اس اصول کی تعریف کی ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے حکمران طبقوں کی بدنصیبی کے لیے وہ اس حل کے حق میں سفارش نہیں کرتا ہے. مغلیہ سلطنت ابھی بہت دور تھی.

برنی نے جس طرح کا طرز فکر پایا تھا اس کی مطابقت سے وہ ایک غیر مذہبی، غیر اسلامی، قدرخاں کے قراخطائی سماج کا تصور کرتا ہے جس کے درمیان کوئی نبی نہیں اور نہ ہی کوئی آسمانی کتاب ہے اور جو تجربہ، روایت اور عقل سے توربنمائی حاصل کرتا ہے لیکن جو اسلام کی مساوات کے اصول سے محفوظ ہے. اس طرح کے سماج کو وہ غیر مشروط طور پر پسند کرتا ہے کیوں کہ اس میں ایک مستقل حکمران طبقہ اور ایک مستقل شاہی خاندان ہے. کسی بھی شخص کو برنی پر اسلام کی حدود کے باہر کے کسی مذہبی تعصب کے لیے تہمت نہیں لگانا چاہیے.

برنی کی قیمتوں کی روک تھام پر متعدد بحثوں کا اس کے علاؤالدین کے نظام کے بیان کو ساتھ رکھ کر مطالعہ کرنا چاہیے. اس کے ایک بنیادی مطالبہ پر پہلے ہی بحث کی جاچکی ہے جو کچھ اس طرح ہے کہ حکومت کو اس طرح کے اجارہ داروں کو کچل ڈالنا چاہیے جو نقل وحمل اور قرض کے کاروبار پر تنہا اپنے تسلط کے ذریعہ بازار میں قیمتیں مقرر کرتے ہیں اور احتکار اور ذخیرہ اندوزی میں ملوث ہوتے ہیں. اس کا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایسے اقتصادی نظام میں، جس میں بار آور لاگت (نرخ بر آورد) کے اصول پر مبنی

کو بار آور محنت کے صلہ کا یقین ہو، اجرتوں اور قیمتوں کو مقرر کر کے، سماجی حفاظت، کا دستور قائم کیا جائے۔

۱۲۔ اسلام کی مذہبی زندگی کا بہترین عنصر اس کے تصوف میں پوشیدہ ہے اور ہندوستان کی تاریخ میں مسلم تصوف کو ادب اور زندگی دونوں میں جو اسلوب ان دو پشتوں کے دوران ملا جن کی نمائندگی ضیاء الدین برنی اور اس کے والد کر رہے تھے، وہ اسے تاریخ کے کسی اور دور میں نہیں ملا۔ اس عہد کے نمایاں صوفی مشائخ میں شیخ فرید الدین گنج شکر، شیخ نظام الدین اولیاء اور شیخ نصیر الدین چراغ کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ قاضی حمید ناگوری بھی جو کہ شیخ فرید الدین کے دوست تھے قابل ذکر ہیں۔ ان کا شمار تمام ماضی اور مستقبل کے جید مسلم صوفی مصنفین میں ہونا چاہیے۔ حمید ناگوری کی تصانیف کی دستیابی مشکل ہے لیکن مذکورہ بالا تینوں عظیم مشائخ کے ملفوظات امیر حسن سنجری کی فوائد الفواد، امیر خورد کی سیر الاولیاء اور حمید قلندر کی خیر المجالس میں محفوظ ہیں۔ امیر خسرو اور امیر حسن سنجری شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے اور نامی گرامی صوفی شاعر تھے۔ برنی حالانکہ شیخ نظام الدین اولیاء کا مرید تھا اور اسے امیر خسرو اور امیر حسن سے قریبی دوستی کا بھی دعویٰ تھا پھر بھی نہ تو حضرت شیخ (نظام الدین اولیاء) کی تعلیمات اور نہ ہی اس کے عہد کا صوفی ادب اس کی روح کی بیرونی سطح کو چھوتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں اس کا تصور قطعی، میکانکی اور ارضی ہے۔ وہ مسلم زندگی کے روحانی عناصر کے لیے بالکل اجنبی ہے اور اسے ہم عصر مسلم مذہب اور تہذیب کا نمائندہ نہیں تصور کرنا چاہیے۔

۱۳۔ یہ برنی کا لائق تعریف کارنامہ ہے جس کا ذکر ضرور کرنا چاہیے کہ مذکورہ بالا نہایت تنگ دائرہ کے اندر وہ غیر معمولی طور پر کریم النفس تھا۔ اس نے تعذیب کے خلاف بہت شدت سے احتجاج بلند کیا۔ اسے سیاسی مجرموں کی عورتوں اور بچوں کی بے دردانہ عقوبت انگیزی کے دستور سے، جو اس کے زمانہ میں عام ہو چکا تھا، کافی صدمہ پہنچا۔ وہ اپنے دور کے وسیع پیمانے پر ہوئے قتل و خون کے ان حادثات کا بڑی حقارت سے ذکر کرتا ہے جن کا مدعا خوف و دہشت کے ذریعہ سلطنت کا وقار قائم کرنا تھا۔ شریعت سیاسی سزاؤں کے مسئلہ پر ساکت تھی لہذا برنی نے عقل اور انسانیت کی بنیاد پر ان کی باضابطگی کے لیے کچھ اصول دریافت کرنے کا عزم کیا۔ بیشتر قاری اس کے نتائج کی طرف مائل بہ اتفاق ہوں گے۔ دینی سزاؤں کا، جن کا وہ بلا ضرورت مطالبہ کرتا ہے، اس کے ہمعصر ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں تھا جہاں تمام اقوام تمام مذہبی پیشواؤں کا احترام کرتی تھیں۔

۱۴۔ برنی نے جس وقت فتاوائے جہانداری کی تصنیف کی اس وقت وہ کافی ضعیف ہو چکا تھا۔ غالباً یہ اس کی آخری تصنیف ہے اور اس کی صلاحیتیں ظاہری طور پر جواب دے رہی تھیں لیکن اس کی تمام صلاحیتیں متوازی طور پر زائل نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی غور و فکر کی صلاحیتیں یقیناً اختلال پذیر نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے

دماغ میں اس کے افکار اتنے ہی صاف تھے جتنا کہ آٹھ سال قبل. لیکن اس کا زور بیان وہ نہیں رہا تھا اور فیروز شاہی کے ادبی معیار کے مقابلہ میں اب اس کا معیار کافی پست ہو گیا تھا۔ دوسری کمزوریاں بھی ظاہر ہوتی ہیں، ہمارا مصنف یہ فراموش کر دیتا ہے کہ وہ کیا لکھ چکا ہے اور اس کی تکرار سے قاری اکتا جاتا ہے. نیز وہ تاریخی حقائق کے سلسلے میں بارہا اپنی تردید کرتا ہے۔ اس کی وجہ بھی غالباً اس کی یادداشت کی کمزوری ہے. اصل نسخہ خالی جگہوں سے پر ہے لیکن برنی مکرار کی عادت کی وجہ سے کوئی خاص بات نہیں چھوٹی ہے.

ڈاکٹر افسر بیگم نے پشاور یونی ورسٹی جاتے وقت ٹائپ عبارت میرے پاس چھوڑ دی تھی. میں نے صرف ٹائپ کی غلطیوں کو درست کیا ہے کچھ حواشی جن کا میں نے اضافہ کیا ہے ان کے ختم پر اپنے نام کا ابتدائی حرف (یعنی "ح") قوسین میں لکھ دیا ہے. افسر نے اپنا اصل کام (ترجمہ اور تعلیقات) لندن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز میں پروفیسر سی. ایچ فلپس، ڈاکٹر پیٹر ہارڈی اور پروفیسر ڈاکٹر مس لمبٹن کے زیر نگرانی اپنے پی ایچ ڈی مقالہ کے لیے تیار کیا تھا. نتیجۃً ترجمہ لفظی اور غیر سلیس ہوا. کیوں کہ فارسی عبارت کی تمام کمیاں اور خامیاں اور مکررات منطقی طور پر انگریزی ترجمہ میں منتقل ہو گئے. لہٰذا میں نے فارسی عبارت کے مخصوص مزاج کے پیش نظر افسر کو مندرجہ ذیل مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے پورا ترجمہ از سر نو تیار کرنے کا مشورہ دیا. (الف) جب تک بنیادی موضوع بحث سے متعلق نہ ہوں برنی کی طویل تاریخی مثالوں کا زیادہ سے زیادہ اختصار کیا جائے (ب) مکررات چھوڑ دیے جائیں (ج) گالیوں کا ترجمہ جنھیں برنی بار بار دہراتا ہے صرف ایک یا دو بار کیا جائے لیکن اس کی طرف وضاحت سے اشارہ کر دیا جائے کہ مصنف ان کا عادی ہے (د) برنی کی پیچیدہ دلائل میں محض جملوں کی نئی ترتیب سے محکم منطقی ربط پیدا کیا جائے (ہ) غیر ضروری صفات، جہاں تک ہو سکے حذف کر دی جائیں (و) جہاں جہاں برنی کے مباحث طویل اور بے لطف ہوں ان کی تلخیص قوسین میں دیدی جائے (ز) اور آخر میں یہ کہ ترجمہ کو حتی الامکان سلیس اور شگفتہ بنایا جائے اور اصل عبارت کی سختی سے پیروی کرتے ہوئے ترجمے کو وہ "توانائی" دینے کی کوشش کی جائے جو خود برنی کا مدعا ہوتی اگر یہ تصنیف اس نے آٹھ دس سال قبل تیار کی ہوتی. زیر نظر کتاب ۲۴ "نصیحتوں" کے عنوان سے چوبیس ابواب میں منقسم ہے. جس "نصیحت" میں ایک سے زیادہ موضوع زیر بحث ہیں. اس کو انگریزی ترجمہ میں قوسین کے اندر علاحدہ عنوان کے تحت فصلوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے.

فتاوائے جہانداری عہد سلطنت کی سب سے زیادہ فکر انگیز تصنیف ہے اور افسر کے ترجمہ نے برنی کے افکار کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے.

یہ فرض باقی رہ گیا ہے کہ میں اپنی اور اپنی قدیم شاگرد کی طرف سے چند دوستوں کا شکریہ ادا کروں پروفیسر

شیخ عبدالرشید اور مولانا ابرار فاروقی نے ترجمہ پر نظرِ ثانی کر کے اور یہاں سے دوسرے مطلوبہ مواد بھیج کر فارسی عبارت کی توجیہہ و تعبیر میں افسر کی مدد کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر ہارڈی کو جنھوں نے افسر کے ساتھ فتاوائے جہانداری کے مطالعہ میں کافی وقت صرف کیا ہے ترجمہ کی موجودہ شکل پسند آئے گی (بہت سی دیگر اشیاء کے ساتھ خلیق نظامی صاحب کا میں ان سطور کے لیے ان 'پانچ منٹی ہدایات'، کے لیے ممنون ہوں جن کی بنیاد پر یہ مقدمہ لکھا گیا، اگرچہ میری بیان کردہ رایوں کے لیے وہ کسی بھی طرح ذمہ دار نہیں ہیں۔ علی گڑھ کے تمام علمی اور فکری کام کرنے والے ہمارے لائبریرین سید بشیرالدین صاحب اور ان کے عملہ کے احسان مند ہیں، ان احسانات کا لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ علی گڑھ میں بشیرالدین اور لائبریری کے ساتھ میری یہ پینتیس سالہ وابستگی میرے لیے ذاتی طور پر ایک مبارک ترین اور مسرت افزا فیضان رہی ہے۔

محمد حبیب

پروفیسر سیاسیات، علی گڑھ

فتاوائے جہانداری

(حکومت کے اصول)

از

خیر خواہ بارگاہ سلطانی

ضیاء برنی

شکر اور ستائش اس پروردگار کی جس نے دین کے محافظ سلاطین اور طاقت ور حکمرانوں کو عدل وانصاف کے وصف سے آراستہ کیا اور دنیا کے عوام کو ان کے احکام کا مطیع اور ان کی حکومتوں کا دوامی پرستار بنایا اور جس نے اپنے رحم وعنایت سے زمین کو آباد کیا اور ساتھ ہی نظم ونسق بھی قائم کیا۔

صلوٰۃ وسلام خواجۂ کائنات پیغمبر محمد مصطفٰےؐ[1] کی روح پاک پر، جو انس وملائک کے نبیوں کے نبی ہیں۔ ان پر درود اور سلامتی تمام مومنین کے لیے۔

اور سلام ہو ان کے صحابہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ بن ابی طالب اور حسنؓ اور حسینؓ پر۔

---

[1] پیغمبر اسلام کو کئی القاب دیے گئے ہیں۔ برنی عام طور سے ان کے لیے 'مصطفٰے' کے لقب کو ترجیح دیتا ہے، میں نے ان کے لیے 'محمدؐ' کے لقب کا انتخاب کیا ہے یا اکثر جگہوں پر 'the Prophet' رسول' لکھا ہے۔

اوران خلفائے راشدین پر سلام ہو جنھوں نے پیغمبر اسلام کے جانشین ہو کر دنیا کو علَم اسلام کے زیر نگیں کیا۔

خیر خواہ بارگاہ سلطانی ضیاء برنی کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہی دعاء ہے ...[۲]

نصیحت ۱

(سلطان کا ذاتی تحفظ)

(اس نصیحت کے اتنے زیادہ ابتدائی صفحے غائب ہیں کہ اس کے مضمون کے بارے میں یقین سے کہنا ناممکن ہے لیکن بقیہ اقتباسات سلاطین کے ذاتی تحفظ سے متعلق ہیں۔

جب کبھی کوئی سلطان اپنی سیاسی مہمات شروع کرنے سے پہلے اپنے کو خدا اور اس کے نازل کیے ہوئے قرآن کی حفاظت میں سونپ دیتا ہے تو خدا اسے ابلیس کی ترغیب ناقص تدبیروں اور غلط منصوبوں کے نتائج سے محفوظ رکھتا ہے[۳]

لیکن سلاطین کو خدا کی عبادت کے علاوہ بھی اپنے تحفظ کے لیے ضروری عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔ دانش مند سلطان اپنے کو شرانگیز لوگوں کے مکر و فریب اور سازشوں سے محفوظ نہیں سمجھتا ہے لہٰذا تمام قدیم اور جدید دانش مند سلاطین نے اپنے اردگرد محافظین اور پہرداروں کو بخوبی جمع کر رکھا تھا۔

---

[۱] یعنی فیروز شاہ تغلق کا دربار

[۲] فارسی مخطوطات کا پہلا صفحہ عام طور سے سیدھے ہاتھ سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا اگلا صفحہ اسی ورق کا حصّہ نہیں ہوتا اور یہ ممکن ہے کہ پہلا صفحہ تو رہ جائے لیکن بعد کے صفحات نکال لیے جائیں۔ یہاں پہلا صفحہ ایک نامکمل جملہ پر ختم ہوتا ہے جب کہ اگلا صفحہ ایک جملہ کے اختتام سے شروع ہوتا ہے "..... اور اس کے تمام منصوبے غلط ہیں۔" یہ اندازہ لگانا ہم پر رہ جاتا ہے کہ برنی نے اپنے 'پیش لفظ' میں کیا لکھا ہوگا۔ تاہم اگر فتاوائے جہانداری کا دوسرا نسخہ مل جاتا ہے تو شاید اس میں برنی کا 'پیش لفظ' مکمل طور پر شامل ملے۔

[۳] اس کے بعد جو تشریح کی گئی ہے اس میں اسماعیل سامانی کو اپنے پیروؤں سے یہ کہتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ وہ خوف زدہ نہ ہوں کیونکہ وہ سورۂ قرآن (۵۸) "واقعی اللہ نے سن لیا ہے" کی حفاظت میں تھا۔ اس سورۃ میں دوسری باتوں کے علاوہ اللہ منافقین کو یہ تنبیہ کرتا ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ان کی سازشوں (باقی اگلے صفحہ پر)

کہ وہ ان باغیوں اور دغا فریب دے کر مار ڈالنے والوں سے محفوظ رہ سکیں جو شدید جذبہ یا اپنے حاسدانہ اور فتنہ جو مزاج کے غالب آنے پر تمام نتائج سے بے پروا ہوتے ہیں کیونکہ اپنے شر پسند مزاج کی وجہ سے نتائج سے یکسر بے خبر ہو کر یہ لوگ اکثر اوقات اپنے کو (فتنوں کی) آگ میں جھونکنے کے لیے اور اس خطرہ کا بے خوف ہو کر مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں کہ ان کے سر گاجر مولی کی طرح کاٹ کر الگ کر دیے جائیں۔ وسیع تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب یہ بدبخت اپنے فاسد جذبات سے بے قابو ہوتے ہیں تو ان کے ذہنوں میں خمیازہ کا کوئی خوف نہیں آتا۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ وجوہ کی بناء پر انھیں سلطان سے ناراضگی ہو جاتی ہے اور بدلہ لینے کی پیاس ہمیشہ انھیں بے چین رکھتی ہے لہٰذا اپنے غصہ کو بجھانے اور اپنے جذبۂ انتقام کو مطمئن کرنے کے لیے اور اس پر قابو پانے کے لیے کسی موقع کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔

اس نصیحت کی تشریح کے لیے صفاری برادران یعقوب بن لیث، جس کا انتقال ۸۷۸ء میں ہوا۔ اور اس کے بھائی عمرو (۸۷۸ء - ۹۰۳ء) کے بارے میں ایک اچھا خاصا مفصل بیان دیا گیا ہے اور عمرو کی امیر اسمٰعیل سامانی کے ساتھ جدوجہد کا ذکر کیا گیا ہے۔

اگر برتی پر یقین کر لیا جائے تو یہ بیان ایک ناپید کتاب تاریخ سامانیان (سامانی خاندان کی تاریخ ۸۳۷ء - ۹۹۹ء) پر مبنی ہے۔ یہ بیان غلطیوں سے بھرا ہوا ہے[1] مثال کے طور پر ہمارے مصنف نے بالکل غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ یعقوب بن لیث کو خلیفہ کی فوج نے پکڑا تھا اور وہ

بقیہ حاشیہ :- سے واقف ہے۔ قرآن کی تنبیہ اس بیان کے ساتھ ختم ہوتی ہے کہ "اللہ نے کہا ہے کہ میں اور میرے ہادی غالب آئیں گے"۔

[1] صفاری خاندان کے مفصل بیان کے لیے دیکھیے گردیزی (Gardezi) کی زین الاخبار (ڈاکٹر ناظم کا ایڈیشن ص ۲۱-۱۰) میر خوند کی روضۃ الصفا (نول کشور ایڈیشن ج ۴ ص ۹-۵) خواند میر کی حبیب السیر (ج ۲، ص ۱۲۹، تہران ایڈیشن ۱۲۷۱ھ) اور نظام الملک کا سیاست نامہ (شیفر Schefer کا ایڈیشن، ص ۱۷-۱۱) انگریزی زبان میں مختصر بیانات (Sir Percy Sykes) کی (History of Persia) (ج ۲، ص ۲۱-۱۷) اور Professor Browne کی Literary History of Persia (ج ۱، ص ۳۵۴-۳۵۳) میں بھی ملیں گے۔ ان محققین کی تحقیقات سے یہ معلوم ہوگا کہ ان دو صفاری بھائیوں کے بارے میں ہمارے مصنف کی واقفیت کتنی غلط ہے۔

بدترین حالات میں قید میں مرگیا۔ یہاں یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ صفاریوں کا حوالہ دینے میں برنی کا کیا مقصد ہے لیکن نصیحت ۲۱ میں اس نے یہ موضوع دوبارہ چھیڑا ہے جس کے بعد اس کی صفاری برادران سے نفرت کی وجہ کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا ہے۔ یعقوب بن لیث نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک ٹھٹیھرے (صفار) کی حیثیت سے کیا تھا۔ حالاں کہ برنی اور دوسرے مصنفین کا خیال ہے کہ وہ ایک بڑھئی تھا۔ یعقوب، پیشہ اصل پر شرمندہ نہیں تھا اور اکثر اوقات فخر سے اس کا حوالہ دیتا تھا۔ تاریخ اسلام میں صفاری خاندان وہ پہلا شاہی خاندان ہے جس کی اصل مزدور طبقہ سے ہوئی تھی۔ یہ خالص ایرانی الاصل خاندان تھا اور اسے ایران کے کسی بھی گزشتہ شاہی خاندان سے زیادہ قوت اور خودمختاری حاصل تھی۔ برنی کی ان دونوں بھائیوں سے نفرت کی وجہ ان کی کم اصلی تھی۔ اس پر مزید یہ کہ انھوں نے اشراف اور موجودہ معاشرتی نظام کو للکارا تھا۔ بارتھولڈ (Barthold) اپنی تصنیف 'ترکستان' (ص ۲۲۶ - ۲۲۵) میں لکھتا ہے کہ "سامانیوں اور صفاریوں کے درمیان جدوجہد کے بارے میں جن مورخین سے ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کی ہمدردی یقینی طور پر اول الذکر کے ساتھ ہے۔ ان فوجی مطلق العنان کے مقابلہ میں جو عوام کی صفوں میں سے اٹھے تھے، سامانی اپنی اصل کے لحاظ سے قدرتی طور پر طاہریوں کے شروع کیے ہوئے کام کے سلسلے کو جاری رکھنے والے اور قانون اور نظم و نسق کے محافظ تھے جس کے قیام و نگہداشت خاص طور سے معاشرہ کے اعلیٰ طبقے دلچسپی رکھتے تھے۔ طبری کے بیان سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مال دار اور دہقان (جاگیردار رؤسا)، خواہ ان کے اسماعیل کے ساتھ کیسے ہی تعلقات رہے ہوں، عمرو کے خلاف اس کی جدوجہد میں اس کے وفادار حمایتی ثابت ہوئے"۔

نصیحت ۲

سلطان کی دینداری کے اثرات کے بارے میں

سلطان محمود نے کہا ہے: اے محمود کے فرزندو[1]! تمہیں قطعی طور پر یہ جان لینا چاہیے کہ کسی مسلمان

---

[1] محمود کے فرزندو! محمود کے فرزندو کی اصطلاح سے یہاں اور ہر جگہ تمام مسلمان سلاطین، مراد ہیں۔ غزنوی خاندان کے آخری شہزادوں کو غوری بھائیوں 'غیاث الدین اور شہاب الدین' نے ۲-۱۲۰۱ میں نیست و نابود کر دیا تھا (طبقات ناصری، ص ۲۷-۲۶)

سلطان کے سیاسی اور انتظامی معاملات کی کامیابی اور ناکامیابی اسکے اچھے اور برے مذہبی عقیدے پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر سلطان کے عقیدے میں استقامت ہے اور اسے اس پر قطعی اعتقاد ہے کہ پیغمبران کرام نے عوام الناس کو وحی کے توسط سے آئی ہوئی مقدس کتابوں کے ذریعہ جو بھی زیادہ صحیح اور سچ ہے اور ان کے متن کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تو یہ مذہب کا صحیح بنیادی اصول ہے اور اسے سچے عقیدے کا نام دیا جاتا ہے۔ سلطان کے عقیدے کی برکت اور اس کی استقامت کی وجہ سے اس کے سیاسی منصوبے کامیاب ہوتے ہیں، اور خدا اس کی سلطنت کے عوام کی مرادیں بھی پوری کرتا ہے۔

اگر دین رسولؐ میں سلطان کا عقیدہ مضبوط اور غیر متزلزل ہے تو اس صورت میں اگر وہ مذہبی ریاضت میں بے حد نہیں لگا رہتا ہے اور روزہ نماز سے متعلق نوافل و مستحبات پورے ادا نہیں کر پاتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح اگر سلطان کے مذہبی عقائد میں کوئی غلطی یا نقص نہیں ہے تو اس کے مضبوط عقیدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے لیے تعیشات اور لطف اندوزی کے وہ وسائل معاف ہیں جن سے وہ ایک انسان ہونے کی وجہ سے محظوظ ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر کہ وہ اسلام کی حفاظت کرتا ہے اور اسے فروغ دیتا ہے اس کے اعمال نامہ سے وہ تمام گناہ مٹا دیے جاتے ہیں جو اس سے فطرت انسانی کی وجہ سے سرزد ہوئے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ سنن و نوافل میں کوتاہی اور گناہ آلود زندگی کی وجہ سے کسی سلطان کو ابدالوں[۱] کا منصب عطا ہو اور اگر وہ پاکیزہ خیال ہے اور مذہبی ریاضت کے لیے وقف ہے تو وہ دنیا کا قطب[۲] ہو جائے؟

سلطان کے عقیدے کا امتحان اس سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی سلطنت کے باشندوں کو

ف ۔ ۲ ۔ صوفیائ کے رتبے۔ غوث۔ قطب، ابدال، اوتاد، اخیار، نقبا، وغیرہ۔ ازمنہ وسطیٰ کے اسلامی تصوف کے ایک عام طور سے تسلیم شدہ دعوے کے مطابق دنیا کو مسلمان صوفیا یا اولیاء نے منظم رکھا تھا۔ ولی کے معنی دوست، کے ہیں اور قرآن کہتا ہے "بے شک اللہ کے دوستوں کے لیے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ پشیمانیاں۔" (سورہ ۱۰، آیت ۶۲) یہ کہا جاتا تھا کہ صوفیاء کے مدارج کے پائیں چار ہزار صوفیاء تھے جنھیں مکتومین کہا جاتا تھا اور جو ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ سب سے برتر صوفی غوث یا قطب یا قطب الاقطاب کہلاتے تھے۔ ان کے درمیان ابدال، اوتاد، نقباء اور اخیار کے مدارج تھے۔ صوفی مصنفین کا ان کی تعداد اور مدارج کے بارے میں اختلاف تھا۔ شیخ علی ہجویری کے مطابق اخیار ۱۰۰ تھے۔ ان پر تین نقباء اور سب سے اوپر ایک قطب یا غوث ہوتا تھا۔ (کشف المحجوب، ولایت کی تصدیق کا بیان، ص ۱۶۸، لاہور ۱۹۱۶ء کا ایڈیشن) (ح)

شریعت[1] کے راستہ پر رکھے۔ اگر وہ اپنی (جسمانی) خواہشات کی وجہ سے گناہوں میں ملوث ہو جب بھی اپنے سلطانی وقار اور تمکنت سے وہ شریعت کے احکام کی عظمت کو اس طرح قائم رکھے اور شرعی اوامر ونواہی کو اس سختی سے نافذ کرے کہ اس کی سلطنت میں کوئی بھی شخص قانون کے خلاف کھلم کھلا کچھ بھی نہ کر سکے۔ دین کے محافظ سلطان کے وقار کا ذکر بیان سے باہر ہے۔ کیوں کہ اس کے دین کے تحفظ اور فروغ دینے کی وجہ سے ہی مسلمان ذہنی سکون کے ساتھ اپنے کو عبادات میں لگا سکتے ہیں، اسی وجہ سے شرع محمدی کے احکام صوبوں میں رائج ہوتے ہیں اور سچا عقیدہ دوسرے عقائد پر غالب آتا ہے اور مسلمانوں اور ذمیوں (غیر مسلمین) کے ناموس اور زندگیوں کی حفاظت رہتی ہے اور انھیں خطرہ نہیں رہتا، اسلامی عقیدے کے رسم ورواج کی عظمت اوج ثریا تک پہنچ جاتی ہے۔ ان کے کارناموں کے صلے، جو گنتی اور شمار سے باہر ہیں، دین کے محافظ سلطان کے نام کر دیے جاتے ہیں جو کہ ان اچھے کاموں، نیکیوں اور عبادت وریاضت کا موجب ہے۔ اگر وہ ذاتی طور پر سنن ونوافل اور حتیٰ کہ فرض روزہ نماز کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے اور اس کا ذہن انسانی گناہوں سے آلودہ ہے تب بھی دین کے تحفظ کے عوض اس کے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے عدل، مہربانی، طاقت اور سطوت خدا کے بندوں کے لیے جو نیکیاں اور ریاضتیں ممکن بناتی ہیں ان کے مقابلہ میں اس کی تنہا جان کے گناہوں کی کیا حیثیت؟

(مسلمان سلاطین کو اپنے ذہنوں میں شیطان کو مندرجہ ذیل خیال بٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ "کیوں کہ ہم اپنی زندگیاں عیش وعشرت اور لذتوں سے لطف اندوز ہونے، دعوتوں اور محفلوں کو آراستہ کرنے اور سلطنت کے خزانہ کو اپنی ذاتی ٹھم ٹھام اور سلطانی عظمت ووقار کو برقرار رکھنے پر خرچ کر رہے ہیں تو یہ سب ہم سنت[2] رسولؐ کے خلاف کر رہے ہیں پھر کس طرح ہم سخت سزاؤں

---

[1] شریعت کے لغوی معنی 'راستہ' کے ہیں۔ یعنی 'رسولؐ کا راستہ'۔ برنی اسے یہاں اور دوسری جگہوں پر ان مذہبی قوانین کے معنی میں استعمال کیا ہے جنھیں عالی مرتبہ مجتہدین یا فقہاء اسلام نے مرتب کیا اور جو سلطنت کے قوانین یا ضوابط سے الگ ہیں جو سلطان اور اس کے افسران بناتے ہیں۔

[2] سنت۔ سنت کے معنی روایت کے ہیں یعنی ماضی میں جو ہوا اس کی تقلید کرنا، تین اہم ترین سنتیں ہیں سنت اللہ، سنت رسولؐ، اور سنت امت، سنت رسولؐ کے بارے میں ہمارے علم کی بنیاد رسولؐ کی فرمائی ہوئی اور عملی زندگی میں برتی ہوئی باتوں کی روایتیں یا معتبر بیانات ہیں۔ اس لحاظ سے حدیث، خبر اور روایت کی عربی (باقی صفحہ پر)

کے دباؤ سے یا نیک کام کے لیے اصرار کر کے عوام کو ان کاموں سے پرہیز کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں جنھیں شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے۔؟"[۱]

ریاست کی پالیسی سلطان کی ذاتی زندگی سے جدا ہوتی ہے بیشک سلطانوں کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ وہ ان قوانین کی پابندی کا نمونہ پیش کریں جو وہ دوسروں پر نافذ کر رہے ہیں لیکن یہ واقعہ کہ وہ خود گناہوں میں مبتلا ہو رہے ہیں ان کی حکومتوں کے کاموں کی انجام دہی سے غیر متعلق ہے۔

علماء نے سلاطین کے صحیح عقیدے اور مضبوط مذہبی اعتقادات کے معیاروں کی واضح طور پر اور تفصیل سے تشریح کر دی ہے۔

ان معیاروں میں ایک یہ ہے کہ اپنے دارالسلطنتوں اور شہروں میں اپنے صوبوں اور قصبوں میں وہ سخت مزاج محتسب[۱] اور دیانت دار افسران عدلیہ (امراء داد)[۲] کا تقرر کرتے ہیں اور ان کے منصب کو مختلف طریقوں سے قوت بہم پہنچاتے ہیں تاکہ یہ عہدیدار مسلمانوں میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نیکی کے لیے حکم دینے اور بدی کے لیے ممانعت کرنے)" کا وقار قائم کر سکیں اور اپنی سخت سزاؤں کے ذریعہ تمام کھلے بجے، اور بار بار اعلانیہ گناہ کرنے والوں کی زندگیوں کو زچ کر سکیں۔ ان افسروں کو ان تمام اشخاص کی تخویف و تنذیر کرنا چاہیے جو گناہ کو ایک فن اور پیشہ بنا لیتے ہیں۔ شراب کی دکان کرنے والوں، طوائفوں اور جواریوں کو اپنے گناہوں کی اعلانیہ نمائش کرنے کی ممانعت کر دینا چاہیے۔ اگر ممانعتیں، سخت احکام، تحقیر و ملامت انھیں باز نہ رکھ سکے اور وہ اپنے مسلمان اور سچے مذہبی ہونے کے دعوؤں کے باوجود صاف طور سے اور اعلانیہ اپنے شرمناک اور گندے گناہوں کو ترک نہیں کرتے اور اگر دین کا احترام اور سلطان کے احکام کا خوف انھیں باز رکھنے سے قاصر ہے تو ان میں سے جو مالدار ہیں انھیں جائیداد سے محرومی کی سزا اور غریب غرباء کو قید کی اور دوسری سزائیں دینا چاہیے۔ شراب کی دکان لگانے والوں کو دارالسلطنت[۳] (دہلی) سے باہر بھیج دینا چاہیے تاکہ وہ ایک گوشہ میں زندگی بسر کر سکیں اور اگر وہ مسلمان ہوں تو ان کے ساتھ بہت سختی سے پیش آنا چاہیے۔ بندوبست اس

بقیہ حاشیہ:۔ اصطلاحات ہم معنی ہیں۔ میں نے ترجمہ میں ان کے لیے 'Traditions' (روایتیں) استعمال کیا ہے۔

[۱] [۲] محتسب اور امیر داد کے لیے اس نصیحت کے اختتام پر نوٹس دیکھیے۔

[۳] یہاں اور دوسری جگہوں پر جہاں کہیں برنی نے دارالسلطنت کا حوالہ دیا ہے اس سے مراد دہلی ہے نہ کہ غزنی

طرح کیا جائے کہ کوئی بھی مسلمان شراب کی تجارت کا پیشہ نہ اختیار کر سکے۔ تمام مخنثوں کو لاتیں مار مار کر عورتوں کی طرح بناؤ سنگار کرنے اور عورتوں ہی کی طرح آہ وزاری کرنے اور دوسرے گناہوں سے ہاتھ رنگنے سے باز رکھنا چاہیے۔ ان کے ساتھ اتنی شدت سے سختی برتی جائے کہ وہ شہر (دہلی) چھوڑ دیں اور دیہی علاقوں میں جاکر اپنی گزر بسر کے لیے زراعت یا دوسرے جائز پیشے اپنا لیں۔ ان گروہوں نے ناپاک گناہوں کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے اور اسلام کے دار السلطنت (دہلی) میں ان کے پیشوں کا کھلم کھلا رواج دین کے وقار کے خلاف ہے۔ تمام شہروں میں عام بدفعلیوں کی ممانعت ہونی چاہیے اور ان گناہ گار گروہوں سے کہنا چاہیے کہ وہ شہروں کو خالی کریں اور دیہی علاقوں میں گوشوں اور خلوتوں میں جاکر روپوش ہو جائیں۔ شہروں میں موسیقی کے لیے عمارتوں (طرب آباد) کی تعمیر اور ان کے عام استعمال کی اجازت نہیں ہونا چاہیے اگر اس طرح کی جگہیں تعمیر ہو چکی ہیں تو سخت اقدامات کے ذریعہ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہیے۔

مختصر یہ کہ انھیں شریعت کی رو سے کسی بھی ممنوعہ چیز کو کھلم کھلا پیشہ کے طور پر اختیار کرنے یا نمائش کی اجازت نہیں دینا چاہیے لیکن ان گناہوں کے عادی لوگ چھپ کر یا خلوت میں اپنے آپ کو ان سے آلودہ کرتے ہیں تو اس کے سلسلے میں عام طور سے زیادہ سخت تحقیقات نہیں کرنا چاہیے۔ اگر شریعت کی جانب سے ممنوع قرار دی گئی کسی بات کو محتسب یا امیر داد دیکھ لیتے ہیں یا یہ عوام کے علم میں آجاتی ہے تو اسے قطعی طور پر کچل دینا چاہیے لیکن پھر بھی مخفی اور نجی (معصیتوں) کو ظاہر نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کی اشاعت ہو۔

جہاں تک ممکن ہو سکے سنت کے لیے مہلک بدعتوں[1] کو کچل ڈالنا چاہیے۔ بدعتیں جہاں بھی دیکھی جائیں ان کی سرکوبی کو فرض سمجھنا چاہیے۔ مسلمانوں سے محلہ محلہ، گلی گلی اور گھر گھر جاکر پانچ بنیادی ارکان کی تعمیل کی تاکید کرنا چاہیے یعنی کلمہ شہادت پڑھنا، پنج گانہ فرض نماز پڑھنا، ماہ صیام میں روزہ رکھنا، زکوٰۃ

---

[1] بدعت۔ فنی اعتبار سے بدعت کے معنی جدت کے ہیں یعنی کچھ ایسا کرنا جو کہ رسولؐ یا ان کے صحابہ نے نہیں کیا یا کچھ ایسا سوچنا جیسا کہ انھوں نے نہیں سوچا۔" تمام جدتیں خطائیں ہیں" "کل بدعۃ فی ذلال" اس کے باوجود بہت سی جدتوں سے گریز نہیں کیا جا سکا لہذا بدعتیں یا جدتیں دو قسموں میں منقسم ہو گئیں یعنی بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔ لیکن اس کے بعد بھی عام فلاح و بہبود کے علاوہ کوئی خارجی معیار نہیں تھا اور متعصب لوگ زندگی میں تقریباً ہر چیز کو اپنی مرضی سے "بدعت" کہہ کر اس پر لعن طعن کر سکتے تھے۔

دنیا اور حج کرنا، وہ لوگ جو اپنی فرض نمازوں میں پابند نہیں ہیں ان کی مختلف طریقوں سے تنبیہ کرنا چاہیے اور ایسے لوگ جو اپنی نمازوں کو کلّی طور سے نظرانداز کرتے ہیں انھیں سخت اقدامات کے ذریعے نماز کی ادائگی کے لیے مجبور کرنا چاہیے ۔ مال داروں سے کہنا چاہیے کہ وہ غربا کو زکوٰۃ دیں اور ان کی کوئی معذرت نہیں سننا چاہیے۔ اور جہاں تک ان لابرواہ لوگوں کا معاملہ ہے جو ماہ رمضان میں کھلم کھلا کھاتے پیتے ہیں یا اس ماہ میں نجس گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس طرح دین کے احترام کا لحاظ نہیں کرتے ہیں یا سلطان کے احکام سے خائف نہیں ہوتے ہیں تو انھیں گرفتار کرکے اور باندھ کر بارگاہ سلطانی میں لانا چاہیے اور سزا کے طور پر انھیں لمبی قید میں ڈال دینا چاہیے ، دور دراز کے مقامات کے لیے جلاوطن کر دینا چاہیے یا ان کا قتل کر دینا چاہیے۔ کلمۂ حق کو بلند کرنے کی خاطر، مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے عزت و احترام کا جذبہ پیدا کرنے اور اسلام کی شان وشوکت کے استحکام کی غرض سے دین حق اور شرع مصطفوی کی اہانت کرنے والوں کو رقابو میں رکھنا چاہیے) مسلمانوں کو اسلامی عقائد کی شاہ راہ پر گامزن کرانا چاہیے اور غیر مسلموں کو ان کے زیر حکومت لانا چاہیے جو توحید پر ایمان رکھتے ہیں۔

لڑائیوں اور جنگوں میں سلمان سلاطین کا اصل مقصد شہادت کی خواہش ہونا چاہیے اور ان کے دلوں میں اسی کی تمنا ہونا چاہیے۔ بہادری کے نقطۂ نظر سے انھیں دشمن پر قابو پانے کی کوشش کرنا چاہیے لیکن دین کے نقطۂ نظر سے انھیں شہادت کے راستہ کی تمنا کرنا چاہیے۔

(اس کے بعد برنی یہ کہتا ہے کہ سلطان محمود اپنے ہیتیں کیے ہوئے اصول پر قائم رہا۔ ذیل کی عبارت میں برنی کے بیانات کا تاریخ کے سلطان محمود کی اصل پالیسی سے کوئی سروکار نہیں لیکن وہ اس کے خود کے متعصب رویہ کی بہترین مثال ہیں)

سلطان محمود کی سلطنت میں تفسیر، حدیث اور تمام توجیہات تاویلات سے محفوظ فقہ کے علاوہ عوام کو دوسرے علوم کی تعلیم دینے کی اجازت نہیں تھی. مختصر یہ کہ ان تمام علوم کے علاوہ جن کی بنیاد 'قال اللہ' (اللہ نے فرمایا ہے) اور قال الرسول' (رسول نے فرمایا ہے) کی شہادت پر تھی۔ دوسرے تمام علوم ممنوع تھے ۔

جس وقت سلطان محمود نے خوارزم فتح کیا تو اس نے سنا کہ وہاں معتزلہ مسلک عام تھا اور بہت سے علما معتزلہ[1] تھے. اس نے معتزلہ علما کی خوارزم سے جلاوطنی کا حکم دیا۔ اس حکم کی منادی کے بعد اگر کسی نے معتزلہ مسلک کی تقلید کی یا اس کا نام بھی زبان پر لایا تو اسے باندھ کر غزنی بھیج دیا جاتا تھا. قسم اس

---

[1] معتزلہ اور شیخ بو علی سینا کے لیے اس نصیحت کے اختتام پر نوٹس دیکھیے۔

خدا کی جس نے سلطان محمود کی ہر مشکل میں مدد کی کہ اگر ابن سینا جس نے یونانی فلسفہ کا احیاء کیا اور جو اسلامی ممالک کے تمام فلسفیوں کا رہنما تھا، سلطان محمود کے ہاتھوں پڑ جاتا تو وہ اس کی بوٹی بوٹی کر دیتا اور اس کا گوشت چیلوں اور گدھوں کو کھلاتا۔ ابن سینا کو خوارزم سے روپوش ہوئے بارہ سال گزر چکے ہیں،

جب سومنات کا بت (سومناتھ) توڑنے گجرات گیا تو اس نے سیوڑا[1] نام کے ایک گروہ کے بارے میں سنا۔ وہ بنیوں کی بیویوں کو بھگا لے جاتے تھے۔ (اور لوگوں کو دہریت[2] کے راستہ پر لے آتے تھے محمود نے ان تمام لوگوں کے قتل کا حکم دیا۔

برنی اس کی تصدیق کرتا ہے کہ سلطان محمود قبر میں دو نامکمل خواہشات لے کر گیا۔ پہلی خواہش گمراہ فرقوں، غلط مذہبوں اور باطل عقاید سے پر شہر بغداد پر قبضہ کرنے کی خواہش تھی تاکہ وہ غلط اصولوں کی تعلیم دینے والوں، فلسفیوں، دہریوں اور شریعت کے تمام مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار سکے۔ یہ بیان تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سلطان محمود کے زمانہ میں بغداد بدعتوں کا مرکز نہیں رہا تھا، دوسری خواہش ہندوستان پر دوبارہ حملہ کرنے کی تھی تاکہ ہندو مذہب کا پوری طرح تصفیہ کر دیا جائے۔ ہمارا مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ "اگر محمود نے اپنی تمام طاقت، سطوت اور اپنے خدام اور سپاہ وحشم کے ساتھ ہندوستان پر ایک بار اور حملہ کر دیا ہوتا تو اس نے تمام برہمنوں کو بزور شمشیر ختم کر دیا ہوتا جو کہ اس وسیع و عریض زمین پر کفر کے احکام اور شرک کی روایتیں قائم رکھے ہوئے ہیں اس نے دو لاکھ یا تین لاکھ ہندو رہنماؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوتا اور ہندوؤں کو قتل کرنے والی تلوار کو اس وقت تک میان میں واپس نہ رکھا ہوتا جب تک تمام ہندوستان کے علاقہ نے اسلام قبول نہ کر لیا ہوتا اور کلمۂ شہادت نہ پڑھ لیا ہوتا۔ (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کیونکہ محمود شافعی مسلک سے تعلق رکھتا تھا اور امام شافعی کے مطابق ہندوؤں کے لیے "موت یا اسلام" کا حکم ہے۔ برنی کے تعصب آمیز الفاظ کا ترجمہ در ترجمہ کرنے سے کوئی حاصل نہیں۔ ہندوؤں کے سلسلہ میں برنی کے دماغ میں فتور تھا۔ بہرحال اس نے اپنے تعصب کو نصیحت ۱۱ میں اپنی پوری قوت سے پیش کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بے لاگ اعتراف بھی کیا ہے کہ (الف) ہندی مسلم سلاطین اس پالیسی پر نہیں چلتے ہیں جس

---

[1] کسی دوسرے معروف مورخ نے ایسے عجیب لوگوں کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

[2] دہریت۔ دہریت کی اصطلاح قرآن کی اس آیت سے لی گئی ہے" اور وہ کہتے ہیں: کوئی زندگی نہیں ہے بجز ہماری اس دنیاوی زندگی کے۔ ہم جیتے ہیں اور ہم مر جاتے ہیں اور ہمیں کوئی تباہ نہیں کرتا ہے"۔ بس وقت (دہر) (سورۂ ۴۵: آیت ۲۴)

کا وہ خواہاں ہے اور اب ہندو خوش حال ہیں۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے بارے میں امام شافعی کے نظریات برنی کے اقوال کے بالکل برعکس ہیں۔ امام شافعی پر امن مذہبی تعلیم کی آزادی میں یقین رکھتے تھے جو رسولؐ کی مکہ والوں کے ساتھ ہوئی صلح حدیبیہ کی رو سے قائم ہوئی تھی۔ اس موضوع پر نصیحت ۱۱ کے حاشیہ میں بحث کی گئی ہے)

(اس نصیحت کی وضاحت کے لیے خلیفہ ہارون الرشید اور ایک مشہور و معروف صوفی فضیل بن عیاضؒ کی ایک ملاقات کا بیان کیا گیا ہے۔ برنی اپنی زبردست لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملاقات کو مدینہ میں دکھاتا ہے جبکہ اگر ایسی کوئی ملاقات ہوئی بھی ہوگی تو مکہ میں ہی میں ہوئی ہوگی جہاں فضیل رہتے تھے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس ذکر کو امام اسمعیؒ کی تاریخ خلفائے عباسیہ سے لیا ہے لیکن اس میں بہت شبہ ہے اسے مصنف کی تحریروں تک رسائی بھی تھی۔

محتسب، امیر داد، معتزلہ اور ابن سینا پر نوٹس، ۶۔ محتسب۔ برنی اکثر محتسب اور ان کے فرائض کا حوالہ دیتا ہے۔ ماوردی نے اپنی الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ، ص ۴۰۵-۲۷۶) میں محتسب کے کاموں اور جس طرح اس کا دفتر (دیوان احتساب) عباسی خلافت کے آخری ایام میں کام کرتا تھا، اس پر گفتگو کی ہے۔ اس جگہ ان کاموں کی طرف صرف ایک صاف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ محتسب کسی بھی شخص کے مکان میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ قرآن بغیر اجازت کسی بھی مکان میں داخل ہونے کو قطعی طور پر منع کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے معاملہ پر غور نہیں کر سکتا جس کے لیے عدالتی تحقیقات کی ضرورت ہو اور شہادتوں کو پرکھنا پڑے۔ ایسے تمام معاملات قاضی کی عدالت میں جاتے تھے جس کا محتسب

لہ فضیل بن عیاض قدیم دور کے ایک مشہور و معروف صوفی ہیں (دیکھیے مثال کے طور پر کشف المحجوب، فضیل بن عیاض کی سوانح کے بارے میں نوٹ، ص ۷۸، لاہور شرح ۱۹۳۱، اور شیخ فریدالدین عطار سے منسوب تذکرۃ الاولیاء، نمبر ۱۱) جب کہ تمام دوسرے مصنفین یہ کہتے ہیں کہ فضیل نے ہارون اور اس کے وزیر دونوں کو ڈانٹا ڈپٹا لیکن برنی کی تصویر کشی کے مطابق فضیل نے ایک درباری کی طرح خلیفہ سے گفتگو کی۔

ٹہ ابو سعید عبدالملک بن کریب الاسمعی ۷۴۰ء میں بصرہ میں پیدا ہوا اور وہیں ۸۲۸ء میں انتقال کر گیا خلیفہ ہارون رشید اسے اپنے بیٹے امین کے معلم کی حیثیت سے بغداد لایا۔ وہ اپنی بچیوں کے ساتھ بصرہ واپس چلا گیا۔ وہ بنیادی طور پر ماہر لسانیات تھا۔ عباسی خلفاء کی تاریخ پر کوئی بھی کتاب اس نام کے ساتھ منسوب نہیں ہے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۱، ص ۴۹۰)

ماتحت ہوتا تھا۔ کھلے طور پر ناگوار باتوں، گلیوں کوچوں کی اخلاقیات اور ایسے ہی دوسرے معاملات کے سلسلہ میں محتسب کے اختیارات ثابت شدہ باتوں تک محدود تھے۔ مثلاً وہ ایک مسلمان بیوہ کو اپنی عدت کی مدت (اس کے شوہر کی موت کے چار ماہ اور دس دن) ختم ہونے سے پہلے شادی کرنے سے روک سکتا تھا اور ایسے شخص کو جو مناسب اہلیت نہیں رکھتا تھا فتوے دینے سے روک سکتا تھا۔ بلدی زندگی کے تمام اقسام کے معاملات ان کے دائرہ اختیار میں آتے تھے۔ جیسے کھلم کھلا شراب نوشی کی ممانعت، دکان داروں کو گلیوں میں رکاوٹیں ڈالنے اور بھیڑ لگانے سے روکنا، پینے کے پانی کا انتظام، وزن، پیمائش اور اجرتوں کی نگرانی، غلاموں اور مویشیوں کے ساتھ ظلم و تشدد کی روک تھام وغیرہ، لیکن اس کے فرائض بہت کم ہی خالصتاً اخلاقی اور ترغیبی نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح شوہروں کی خواہاں بیوائیں اگر اس سے اپیل کرتی تھیں تو وہ صرف ان کے سرپرستوں کی توجہ اس طرف مبذول کرا سکتا تھا۔ ماوردی اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کے زمانے میں دفتر احتساب اپنا تمام تر اثر کھو چکا تھا" کیوں کہ سلطانوں نے معمولی لوگوں کو محتسب کے منصب پر مقرر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے یہ عہدہ ناجائز روزی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ (ص ۴۰۴) "انگریزی زبان میں خاص طور سے ماوردی کی بنیاد پر محتسب کے بیان کے لیے لیوی کی کتاب سوشیالوجی آف اسلام دیکھیے (ج اول، ص ۳۰۷۳، ۳۶۷) (ح)

۸۔ امیر داد، برنی اور ازمنہ وسطیٰ کے دوسرے ہندوستانی مصنف اکثر امیر داد کا حوالہ دیتے ہیں جن میں سب سے اہم امیر داد بیگ حضرت (مرکزی امیر داد) تھا۔ امیر داد، جو کہ ریاستی قوت کے ساتھ ایک سیکولر عہدیدار تھا، کو قاضی پر برتری حاصل تھی اور وہ ایسے مقدموں کو ہاتھ میں لیتا تھا جن کے سلسلہ میں قاضی بے بس ہوتا تھا۔ جیسے حکومت کے عہدیداران کے ایک دوسرے کے اور عوام الناس کے خلاف جرائم۔ ازمنہ وسطیٰ کے قانونی طریقہ کار نے ایک قاضی کے فیصلہ کی دوسرے قاضی کے یہاں اپیل کی اجازت نہیں تھی لیکن کسی قاضی کے فیصلہ کی اپیل ریاست سے کی جا سکتی تھی اور اس طرح کی اپیلیں امیر داد کے پاس جاتی تھیں۔ ہندوستان کے امیر داد کے کام عباسی دور خلافت کے دیوان مظالم کے کاموں ہی کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تمام عہدیدار اپنے انفرادی اور مخصوص تقرری کے احکام کے بموجب ہی اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے پابند تھے اور یہ احکامات مقامی حالات کے مطابق اکثر بدل جاتے تھے۔ (ح)

۹۔ معتزلہ۔ ڈاکٹر ایچ۔ ایس ہائیبرگ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج دوم، ص ۷۸۰) کے مطابق "معتزلہ اس زبردست مکتب دینیات کا نام ہے جس نے اسلام کے نظری اعتقادات کی تخلیق کی۔" ایسا کہا جاتا

ہے کہ اس کی بنیاد واصل بن عطا اور عمرو بن عبید نے ڈالی تھی جن کی کارگزاریوں کا دور خلیفہ ہشام اور اس کے اموی جانشینوں (۷۲۴ء-۷۴۸ء) کے ہم زماں تھا۔ معتزلہ عظیم عباسی خلفا اور خاص طور سے خلیفہ مامون کی سرپرستی میں پورے عروج پر پہنچے۔ معتزلہ نے کئی دانش مندانہ باتیں کہیں اور کئی تکلف وہ حد تک متنازع فیہ مسائل کھڑے کیے۔ لیکن ایک زندہ و جاوید مکتب فکر کی حیثیت سے ان کا وجود عظیم عباسیوں کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

یہ روایت غالباً صحیح ہے کہ ابوالحسن اشعری (۸۷۳ء-۹۳۵ء) کو تقلید پسندی کے احیاء کرنے اور معتزلہ مکتب فکر کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی، پھر بھی آنے والی کئی صدیوں تک تقلید پسند علما معتزلی نظریات کو ان کی تردید کے مظاہرہ کے خاطر دہراتے رہے۔ سلطان محمود کے دور تک معتزلہ مکتب فکر بالکل معدوم ہو چکا تھا۔ برنی اپنی لاعلمی کی وجہ سے معتزلیوں کو ان نمایاں فلسفیوں اور ماہرین علوم سے خلط ملط کر دیتا ہے۔ جو خوارزم میں جمع ہو گئے تھے۔ معتزلی نظریات اور ان کی تردید کا خاصا طویل ذکر شہرستانی (۱۰۷۴ء-۱۱۵۳ء) کی تصنیف کتاب الملل والنحل میں مل جائے گا (فارسی ترجمہ، ص ۱۰۸-۴۰) شہرستانی کے مطابق اس کے زمانے میں مغربی اسلامی سرزمین پر بہت تھوڑے معتزلہ رہ گئے تھے۔ (ح)

۱۰۔ ابن سینا۔ حقیقتاً کیا ہوا تھا اس کی تصویر برنی کے ذہن میں بہت مبہم ہے اور اپنی تاریخوں میں اس نے بہت لاپرواہی برتی ہے۔ "شیخ بوعلی سینا بن عبداللہ بن سینا جو مسلمان اطبا میں سب سے بڑا طبیب گزرا ہے، ۹۸۰ء میں بخارا کے علاقہ میں اخشنا نام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ سامانی سلطنت میں مال گزاری کے محکمہ کا افسر تھا۔ اس کا طالب علمی کا دور قابل ذکر تھا۔ وہ رات میں سوتا نہیں تھا اور تمام دن مطالعہ کرتا تھا۔ اگر وہ کسی مسئلے کے سلسلہ میں الجھن میں پڑ جاتا تھا تو وہ مسجد میں جا کر اس وقت تک عبادت کرتا رہتا تھا جب تک کہ اس کے ذہن میں حل نہ آ جائے۔ اگر وہ کام کی زیادتی کی وجہ سے کمزوری محسوس کرتا تھا تو قوت کے لیے دوا کے طور پر شراب پی لیتا تھا" تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ بوعلی سینا نے تمام علم عقلیہ اور نقلیہ حاصل کر لیے تھے اور اپنے تمام ہمعصر علماء سے سبقت لے گیا تھا"۔ لیکن سامانی سلطنت کا زوال ہو رہا تھا لہٰذا بوعلی سینا بائیس سال کی عمر میں خوارزم میں آ بسا۔ یہاں خوارزم کے شاہ علی بن مامون بن محمد نے اس کا خیر مقدم کیا۔ چار دوسرے نمایاں ماہرین علوم یعنی ابوریحان البیرونی، ابوسہل مسیحی، ابونصر اور ابوالخیر خمار بھی خوارزم کے دربار میں موجود تھے۔ سلطان محمود نے خوارزم کے شاہ کے پاس ابوالفضل میکالی کو بھیج کر یہ حکم بھیجا کہ وہ تمام ماہرین علوم کو غزنی بھیجے لیکن شاہ خوارزم نے میکالی دربار میں باریابی دینے سے پہلے ماہرین علوم کو محمود کے پیغام سے مطلع کر دیا۔ البیرونی

اور ابوالخیر نے غزنی بھیجے جانے کو فوقیت دی لیکن ابن سینا اور ابو سہل نے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ ابو سہل قسمت کے ریگستان میں گرمی اور پیاس، کی شدت سے چل بسا لیکن ابن سینا کسی طرح جرجان پہنچ گیا۔ اور وہاں اس نے جرجان کے مہذب فرماں روا قابوس بن وشمگیر سے امان چاہی۔ اسی دوران سلطان محمود نے ابن سینا کی دلکڑی اور کاغذ، پر تصویروں کا گشت کرانے کا حکم جاری کر دیا اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ وہ جہاں بھی پایا جائے گرفتار کر کے غزنی بھیج دیا جائے۔ ان ہی میں سے ایک تصویر قابوس وشمگیر کو بھیجی گئی۔ ابن سینا نے یہ محسوس کر کے کہ اس کے میزبان کی تصویر سیاسی طور پر زوال پذیر ہو رہی ہے، مغرب کی طرف مزید کوچ کیا۔ اس کی بقیہ زندگی، جو اپنے اتار چڑھاؤ میں طوفانی تھی، ولیی حکمرانوں کی خدمت میں گزری۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ غصّے میں بھرے ہوئے سپاہیوں نے جو اسے مار ڈالنا بھی چاہتے تھے، اس کے مکان کو لوٹا، لیکن اپنے زمانۂ وزارت میں اس نے زندگی کا پوری طرح لطف اٹھایا غروب آفتاب کے بعد وہ طالب علموں اور نمایاں علماء کو پڑھاتا تھا جو اس سے درس لینے دور دراز کے مقامات سے آتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ اپنا عشائیہ، مطرب نشاط میں طلب کرتا جب سلطان محمود اور اس کے بیٹے مسعود نے ۱۰۲۹ء میں عراق کی طرف کوچ کیا۔ اس وقت ابن سینا علاؤ الدولہ کا وزیر تھا۔ سلطان اور وزیر دونوں ہی محمود کے خوف سے نیشاپور بھاگ گئے لیکن بہت تیزی سے بڑھنے والی دق کے شروع کے آثار کی وجہ سے جو اس کی موت کا باعث بنتا تھا۔ محمود واپس ہو گیا اور مسعود کو جانشینی کے لیے لازمی جنگ کی تیاری کی غرض سے اصفہان کو علاؤ الدولہ کے لیے چھوڑنا پڑا۔ یہ عظیم عالم سلطان محمود کے بعد سات سال تک زندہ رہا۔ جب علاؤ الدولہ ہمدان کی طرف چلا تو اس نے شیخ کو اپنے ساتھ لیا۔ راستے میں شیخ کو قولنج کی شکایت بڑھ گئی اور ہمدان پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ شفا ناممکن تھی، اس نے مزید دوائیں لینا ترک کر دیں، اپنے کردہ گناہوں کے لیے توبہ کی، اپنے مال و اسباب کو غرباء میں تقسیم کیا اور اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا۔ تین دن تک اس نے قرآن کی تلاوت کی اور اس کے بعد ۱۰۳۷ء میں رمضان کے ایک جمعہ کے دن وہ رحلت کر گیا۔

(دیکھیے خواندمیر کی حبیب السیر، اصل فارسی، ج دوم، ص ۱۶۳-۱۶۰)

شیخ کی سب سے اہم تصانیف کتاب الشفا اور القانون فی الطب ہیں۔ حالاں کہ موجودہ زمانے میں پہلے طبیب کی حیثیت سے اس کا احترام کیا جاتا ہے لیکن بوعلی سینا کی تصانیف ازمنہ وسطیٰ کے علوم کے تمام میدانوں کا احاطہ کرتی ہیں " وہ صدیوں تک اور آج بھی اسلامی شرق کے کچھ خطوں میں تمام علوم کا "الشیخ" اور "الرئیس" مانا جاتا ہے منطق اور نظریہ علم سے متعلق مباحث میں وہ الفارابی

کے بہت قریب ہے۔ اس کی طبیعیات مجموعی طور پر ارسطو کی روایت پر مبنی ہے" (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج سوم، ص، ۴۲۰ - ۴۱۹ - (رح)

نصیحت ۳

صلاح و مشورہ کے فیوض کے بارے میں

سلطان محمود کہتا ہے: اے فرزندگان محمود! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ انبیا تمام مخلوق سے بہتر اور برتر ہیں اور ہمارے پیغمبر محمدؐ کا رتبہ ان سب سے بلند تر ہے۔ اور پھر بھی ان کے عقل کل ہونے اور وحی الٰہی کے تسلسل کے باوجود ہمارے پیغمبرؐ کو خدا نے حکم دیا" اور اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کرو[له]" پھر آخر کس طرح سلطان، جنھیں الٰہی فیضان حاصل نہیں اور جن کے فیصلے ان کے ہیجانی جذبات کی وجہ سے بے اثر ہو جاتے ہیں، اپنے تجربہ کار افسران اور مخلص خیر خواہوں سے مشورہ کیے بغیر اپنی حکومتوں کے معاملات کو انجام دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ انسان کے جذبات کے سب سے بڑے مقصد خود رائی اور تسلط ہیں۔ خاص طور سے سلطانوں کے ساتھ ایسی ہی بات ہے جن کے ضمیر ان کے جذبات کی زیادتی کی وجہ سے ایک ہزار پاگل ہاتھیوں کی قوت کے برابر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر سلطان اپنے ضمیر کے اس پاگل پن کو دبا دیتا ہے، خود رائی سے کنارہ کشی کر لیتا ہے اور سلطنت کے معاملات اپنے مشیروں کے صلاح و مشورہ سے طے کرتا ہے تو خدا کی عنایت و مہربانی اس کی پیشانی پر درخشاں ہوگی اور اس کی تمام ریاستی مہمیں کامیابی پر ختم ہوں گی۔ قدیم اور جدید دونوں دور کے دانش مند لوگ، اس سے واقف رہے ہیں کہ سلطنت کو آلائشوں سے پاک کرنا، یعنی شورشوں کو کچلنا، زبردست مہموں کا تہیہ کرنا، ضوابط بنانا اور ریاست کی پالیسیوں کے آخری نتائج بھانپنا، ان دانش مند اور تجربہ کار لوگوں کے مشورہ کے بغیر ممکن نہیں ہے جو حکومت کے بہی خواہ اور سلطنت کے منتخب لوگ ہیں۔

(اس کے بعد برنی حکومت کے فرائض کی ایک طویل اور تھکا دینے والی فہرست درج کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ان کے متعلق صلاح و مشورہ ضروری ہے)۔

له قرآن، سورہ III، آیت ۱۵۹۔

محمود نے وصایائے جمشیدی میں پڑھا ہے جب جمشید نے اپنی اولاد کے لیے لکھا تھا: اے کیومرث کے بیٹو، تم میں سے جو بادشاہ ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے تایا یعنی آدمؑ کے بیٹے شیث اور ان کی اولاد کو نبوت عطا کی گئی تھی جب کہ بادشاہت ہمارے جد کیومرث اور ان کے بیٹوں کو دی گئی تھی، لہٰذا خداوند تعالےٰ نے شیث اور ان کی اولاد کی الٰہی فیضان سے رہنمائی کی ہے اور اسی وجہ سے ان کے اقوال اور افعال میں کوئی بھی غلطیاں نہیں ہیں لیکن ہمیں، جو کہ کیومرث کی اولاد ہیں اور شاہی منصب پر فائز ہیں، خدا نے حکومت کی شمشیر دی ہے اور ہمارے قلوب کی رہنمائی کے لیے اس نے ہمیں باہنر وزراء دیے ہیں تاکہ ہم اپنی پالیسی اور اپنی شمشیر کی ضربوں سے دنیا کو آباد،

ل جمشید۔ ایران کا پہلا شاہی روایتی خاندان پیش دائیان (ابتدائی قانون بنانے والے) کے نام سے موسوم ہے۔ جمشید اس کا آخری فرماں روا تھا۔ روضۃ الصفا سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "جم یم اس کا نام تھا اور شید (آفتاب) اس کا لقب تھا" اس کے اندر ہندوستانی دیوتا یم کو دیکھنا مشکل نہیں ہے۔ اپنے آخری ایام میں اس کا تنزل شروع ہوگیا، شراب میں چور رہنے لگا اور الوہیت کا دعویدار بن گیا، وغیرہ وغیرہ اور سیستان اور پھر وہاں سے ہندوستان بھاگ جانے کے باوجود اسے اس کے کٹر دشمن ضحاک نے، جو کہ شام کا شہزادہ تھا پکڑ لیا اور اس کے دو ٹکڑے کرا دیے (دیکھیے روضۃ الصفا، ج اول، ص ۱۶۷ تا ۱۷۲، فارسی اس کے علاوہ، سائکس کی پرشیا بھی، ج اول، ص ۱۳۴)

لے کیومرث۔ کیومرث، جس کا ہمارا مصنف بار بار حوالہ دیتا ہے، ایرانی روایات کے مطابق پیش دائیان شاہی خاندان کا بانی تھا۔ روضۃ الصفا کا بیان ہے کہ عوام نے دنیا کے معاملات میں افراتفری کو دیکھتے ہوئے کیومرث کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ فردوسی لکھتا ہے کہ، "پہلا بادشاہ جس نے انسانوں پر حکومت کی کیومرث تھا جو تمام بادشاہوں کا رہبر تھا" کیومرث کے معنی ہوتے ہیں 'نوع انسان کا باپ'، لیکن ایرانی اور اسرائیلی روایات میں تال میل پیدا کرنے کی غرض سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ کیومرث آدمؑ کا بیٹا اور پیغمبر شیث کا جڑواں بھائی تھا۔ اسے حکم الٰہی سے اور موروثی جانشینی کے اصول کی بنیاد پر بنایا گیا تھا اور اس کے انتخاب کے واقعہ کو فراموش کر دیا گیا۔ روضۃ الصفا کے مطابق "تاریخ کے عالموں میں اس کی نسل کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ علماء کا ایک مکتب اسے آدم کا سب سے بڑا بیٹا کہتا ہے اور امام غزالی نے اپنی تصنیف نصیحت الملوک میں اس توضیح کی حمایت کی ہے۔" (دیکھیے روضۃ الصفا ج اول، ص ۱۶۶)

خوش حال اور منظم رکھیں۔ شیطان کے ورغلانے اور خود اپنے جذبات کی ترغیب کی وجہ سے سلاطین کے فیصلوں میں زبردست کوتاہیاں اور نقص رہ جاتے ہیں۔ اگر سلطان محض اپنے دماغوں میں آئے ہوئے کن ہی خیالات کے مطابق احکام دیتے ہیں تو ان سے زبردست غلطیوں کا سرزد ہونا یقینی ہے۔ اسی وجہ سے سلاطین نے دانش مند لوگوں کو مشورہ کے لیے رجوع کیا۔ اگر ان کے یا ان کے کچھ مشیروں کے ذہنوں میں کوئی غلط خیال داخل ہو جاتا ہے تو یہ دوسروں کے ذہنوں میں نہیں آئے گا کیوں کہ کسی غلطی پر شاذ ہی کبھی اتفاق رائے ہوتا ہے ... مزید برآں سلاطین کی غلطیاں اور فروگذاشتیں دوسرے آدمیوں کی غلطیوں اور خطاؤں کی طرح نہیں ہیں کیونکہ سلاطین کی فروگذاشتوں کی وجہ سے تو پوری دنیا ہی تہہ و بالا ہو جائے گی (اس کے علاوہ سلطان اپنے اعلیٰ منصب کی وجہ سے یہ فرض کرنے کی طرف مائل ہوگا کہ اس سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی) لہٰذا دانش مندوں نے کہا ہے "سلطانوں کے لیے کوئی رائے نہیں" (کسی سلطان کو اپنی ذاتی رائے نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس کی رہنمائی اس کے مشیروں کو کرنا چاہیے)

(اے فرزندگان محمود! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دانش مندوں نے بارہا سلطانوں اور وزیروں کے صحیح فیصلہ کے لیے (ذیل میں درج) معیار تجویز کیے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ مشیروں کو ہر دو جانب کی بھلائی کو ملحوظ رکھنا چاہیے یعنی بادشاہ کی بھلائی اور ویسے ہی رعایا کی بھلائی۔ دوسرا یہ کہ مشیروں کو کسی مہم کی ناکامیابی اور کامیابی دونوں کے امکان کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ انھیں صرف کسی ایک صورت پر ہی نظریں نہیں لگائے رہنا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ مہم کی کامیابی سے سلطان اور اس کی رعایا کے دین کو ضرر نہیں پہنچنا چاہیے۔ چوتھا یہ کہ جو پالیسی اختیار کی گئی ہے وہ قطعی فائدہ سے ہم کنار کرے نہ کہ محض ایسا عارضی فائدہ ملے جو بالآخر تباہی پر ہی ختم ہوتا ہے۔ پانچواں یہ کہ فتح و کامرانی سے نیک نامی ملے نہ کہ بدنامی۔ چھٹا یہ کہ دشمنوں کو دوست بنا لینا چاہیے اور نہ کہ دوستوں کو دشمن بنا لیا جائے۔ ساتواں یہ کہ جو بیڑہ اٹھایا گیا ہے عوام اس کی طرف مائل ہوں اور اس کی کامیابی کے خواہاں ہوں۔ یہ نہیں کہ یہ بیڑہ عوام کو برافروختہ یا غضبناک کردے۔ آٹھواں یہ کہ جو فیصلہ لیا گیا ہے وہ بے وقوفوں، بے عقلوں اور غلط خیالات کے لوگوں کے خیال میں غلط ہونا چاہیے جو اپنے پندار میں اسے غلط سمجھیں گے۔ نواں یہ کہ بیٹھے شدہ فیصلہ آرام و تسکین کا باعث بنے اور نہ کہ دائمی مصائب اور آزمائشوں کا۔ دسواں یہ کہ یہ فیصلہ تمام دانش مندوں کی منظوری حاصل کرے اور اس سلسلے میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہو۔ کسی صحیح فیصلہ کے لیے گیارہواں معیار یہ ہے کہ اس کا تصوّر اور نفاذ جذباتیت کے متضاد ہو۔

آصف برخیا نے، جو پیغمبر سلیمان کا وزیر اور اس کی خالہ کا بیٹا بھی تھا اچھی صلاح کی عظمت اور وقار کے متعلق کہا ہے: "اچھی صلاح خدا کی اپنی مخلوق پر بہت بڑی نعمت ہے" اس کی اہمیت اس حقیقت میں پنہاں ہے جو کچھ واقع ہونے والا ہے وہ لوح محفوظ[1] میں درج ہے اور اس کے بارے میں اچھے مشیروں کے ذہنوں میں الہام ہوتا ہے۔ جب تک کہ کسی انسان کو ابدی روحانی مسرت کے لیے نہ پیدا کیا گیا ہو اس کا ذہن اس صحیح فیصلہ سے (خدا کے ذریعے) فیضیاب نہیں ہوگا جو دینی و دنیوی فلاح کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور مشیروں کے لیے اس سے زیادہ بڑی اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے اپنی بصارت اور قوت ادراک سے وہ نامعلوم مستقبل کے بارے میں لوح محفوظ پر کندہ عبارت کو دیکھ لیتے ہیں، انھوں نے جو دیکھا ہے اس کے بارے میں وہ دلائل پیش کر سکتے ہیں اور اپنی اندرونی بصیرت سے وہ پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں کہ کیا مقدور ہوا ہے۔ کیا یہ پیغمبروں کے مقام[2] کا ایک حصہ نہیں ہے محمود کے فرزندوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے منتخب شدہ انسانوں میں سے دو اشخاص روئے دنیا کے بادشاہ ہوئے ہیں، ایک تو سلیمان اور دوسرے سکندر[3]۔ سلیمان یقینی طور پر نبی تھے۔ البتہ سکندر

---

[1] لوح محفوظ۔ قرآن کی اس آیت کی طرف حوالہ ہے "بے شک لوح محفوظ میں قرآن مجید ہے"۔ سورہ ۸۵ آیات (۲۱-۲۲) الٰہی تصور جو انسان پر نازل ہوا اور جس کا نزول ہوتا ہے۔ قرآن اور اس سے پہلے کی مقدس کتابوں میں ہے۔ الٰہی تصور الٰہی ذہن میں جس کا نزول نہیں ہوتا وہ لوح محفوظ ہے۔ اسلامی روایت کے مطابق لوح محفوظ تک کسی انسانی آنکھ کی رسائی نہیں ہو سکتی حتی کہ سلطان کے درباریوں کی آنکھوں کی بھی وہاں تک رسائی نہیں۔ (ح)

[2] مقام، اور حال، مقام، ایک صوفی اصطلاح ہے جو حال، کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ خدا تک نفس کی روحانی رسائی کا مفصل خاکہ کھینچنے کے لیے اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ تمام صوفیا کے مطابق نکتہ آغاز توبہ تھا بلکہ عروج جہاں تک پہنچا جا سکتا تھا اللہ کی نشا کے آگے رضا کا تھا۔ اب نفس انسانی کے سفر کی ہر منزل کا دو طرح سے معائنہ کیا جا سکتا تھا یعنی اس کی ترقی کی روشنی میں اور یہ جس مقام پر تھا اس کی یا اس کے حال، کی روشنی میں۔ یقیناً اس دور کے کسی بھی ممتاز صوفی نے یہ تسلیم نہیں کیا ہوگا کہ سلطان کے مشیر کسی مقام، پر تھے اور وہ بھی کوئی اور نہیں بلکہ پیغمبروں کے مقام، پر۔ ان کا مقام، قبل توبہ کا تھا اور ان کا حال گناہ گاری کا تھا۔ (ح)

[3] سکندر اعظم۔ ایرانی روایات کے سکندر اور تاریخ یونان کے سکندر اعظم کو پوری طرح ایک نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایرانی عوام کے پاس سکندر کی کوئی زندہ یاد نہیں تھی اور نہ ہی اس کے لیے کوئی روایتی نفرت ہی تھی۔ انھیں سکندر کے بارے میں خارجی ذرائع سے واقفیت حاصل ہوئی تھی۔ باقی واقفیت فردوسی اور شعرائے (باقی صفحہ پر)

کے بارے میں اختلاف رائے ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ولی تھے کیوں کہ دونوں کے لیے فرماں روائی اپنے روحانی منصب کو بلند کرنے اور اپنی رعایا کے لیے خیر و عافیت حاصل کرنے کا ذریعہ تھی خدا نے انھیں علی الترتیب نبوت اور ولایت کے علاوہ جو زبردست نعمت عطا فرمائی وہ ان کے کامل دیانت سے مزین وزیر تھے۔ چنانچہ آصف سلیمان کا وزیر تھا اور ارسطو سکندر کا، ان دونوں وزیروں کے فیصلے صحیح، اور غلطیوں سے مبرا ہوتے تھے لہٰذا دونوں سلطنتوں میں بہتر اور سودمند باتوں کے علاوہ کوئی دوسری چیزیں رائج نہیں ہوئیں۔ اس طرح ان دونوں بادشاہوں کے دور نوع انسان کی قدیم اور جدید تاریخ میں عجوبہ، اور روحانی مسرت حاصل کرنے کے علاوہ دونوں وزیر پرانے اور نئے دور کے وزیروں کے لیے مثالی نمونہ بن گئے ہیں۔ ان کی خوبیاں اور کامیابیاں روز محشر تک انسانوں کے قلوب پر نقش رہیں گی۔ اس کے علاوہ اردشیر بابکان[1] اور نوشیرواں[2] کی زبردست شہرت دوستوں اور دشمنوں دونوں میں پھیلی حالانکہ وہ دین حق سے پھر گئے تھے۔ عرب اور ایران کی تواریخ میں لکھا گیا ہے کہ دونوں کی سلطنتوں کے عروج و اقبال کی یاد، جو ابرسام اور بزرجمہر[3] کے دانش مندانہ مشوروں کی مرہون منت تھی، نوع انسان میں باقی رہے گی۔ ابرنی نے اگلے دو پیراگرافوں میں جو لکھا ہے اسے انگریزی میں زیادہ آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی غلط فیصلہ، یعنی جو فیصلہ مشورہ پر مبنی نہیں ہو، بارآور ہوتا ہے تو اس طرح کی کامیابی استدراج ہے۔ اگر اس طریقہ پر مستقل جمے رہے تو اس دنیا اور آخرت دونوں میں تباہی یقینی ہے۔ غلطی غلطی ہی ہے یہ کامیاب ہی کیوں نہ ثابت ہوتی ہو۔ اسے الٹ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مشورہ کے بعد کیا ہوا کوئی صحیح فیصلہ ناکامیاب ہے تو اس کی ناکامیابی مشیت ایزدی سے جوڑنا چاہیے)

بقیہ حاشیہ: اور سب سے زیادہ نظامی گنجوی نے اپنے دو سکندر ناموں کے ذریعہ کروائی۔ اس موضوع پر پروفیسر براؤن نے اپنی (Literary History of Persia) میں گفتگو کی ہے۔ (ج اول، ص ۱۱۸-۱۴۰)

[1] اردشیر بابکان۔ اردشیر بابکان یا   نے ۲۲۴ء سے ۲۶۶ء تک حکومت کی۔ اس نے ایران سے پارتھائی حکومت کا خاتمہ کیا اور مشہور ساسانی خاندان کی بنیاد ڈالی۔

[2][3] نوشیرواں (۵۳۱-۵۷۸ء) اور بزرجمہر۔ نوشیرواں ساسانی خاندان کے عظیم بادشاہوں کے سلسلہ کا آخری بادشاہ تھا، وہ اپنے عدل کے لیے مشہور تھا لیکن اس کا عدل طبقاتی عدل محسوس ہوتا ہے۔ اس کی عوام الناس کی بہتری کے اقدام کے خلاف مزاحمت کی وجہ سے ان میں بے اطمینانی پھیلی اور ایران پر اسلام کی فتح ناگزیر ہو گئی (باقی صفحہ پر)

(محمود اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ دانش مند وزیر تلاش کریں) ایک سلطان کے لیے ایک ایسے دانش مند وزیر سے زیادہ باعث فخر اور امتیاز کوئی دوسری شے نہیں ہو سکتی جسے صحیح فیصلہ کا فیضان حاصل ہو۔ دانش مند وزیر کے بغیر بادشاہت ناکام رہتی ہے، اور بزرگ کہہ گئے ہیں کہ دانشمند وزیر کے بغیر بادشاہ ایسا ہی ہے جیسے بغیر بنیادوں کا محل اور جیسے بغیر نمک کی روٹی، اگر وزیر دانشمند ہے تو سلطان کی کم فہمی سلطنت کو تباہی و بربادی کی طرف نہیں لے جاتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ سلطان پیش کیے جا سکتے ہیں جو اپنے زمانۂ طفلی میں اپنے موروثی تخت پر فائز ہوئے اور ان کے وزیروں نے سلطنت کے معاملات لیکن اگر وزیر کی رائے میں کوتاہی ہے تو سلطنت کی تباہی و بربادی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ آخر میں یہ کہا جائے گا کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک منصب وزارت کا مستحق نہیں ہو سکتا جب تک کہ سلطنت کے خواص و عوام اس کی دانش مندی اور تدبر کے بارے میں متفق الرائے نہ ہوں۔

مآثر عمری میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے بارہا ممبر پر کھڑے ہو کر یہ خطبہ پڑھا "کس طرح میں اللہ کا شکر ادا کروں کہ اس نے مجھے پیغمبر کی سلطنت کا حکمراں بنایا اور خلافت کے معاملات میں اتنے زیادہ عظیم الرتبہ صحابہ (جن میں سے ہر ایک بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہے کیوں کہ ان کے قلوب پر پیغمبر اسلام کی قربت حاصل ہونے کی وجہ سے الہامات ربانی کا نزول ہوتا ہے) میرے مشیر کار بن گئے ہیں۔ رب نے مجھے ان کے مشورے سے رسول اکرم کے دین اور سلطنت کے معاملات طے کرنے کے قابل بنایا ہے۔ اور اس نے انھیں میرے لیے مہربان اور مشفق بنایا ہے تاکہ ملک کے معاملات سے متعلق اگر ان کے ذہنوں میں کوئی خیال آئے تو وہ اسے مجھ سے پوشیدہ نہ رکھیں۔"

زمانۂ قدیم کے وزیروں نے اچھے مشیروں کے لیے کچھ معیار تجویز کیے ہیں۔ پہلا ہے خوفِ خدا۔ اگر مشیر میں بلا کا تمرد ہے اور خوف خدا نہیں تو اس پر صحیح فیصلہ کا کبھی القا نہیں ہو گا جو اچھے اور قطعی نتائج کو جنم دیتا ہے۔ دوسرا ہے قدیم سلطانوں کے بارے میں علم۔ مشیر کو قدیم سلاطین کے حالات اور ان پالیسیوں

بقیہ حاشیہ: جہاں تک بزرجمہر (یا بزرگمہر) کا سوال ہے سر پرسی سائکس لکھتا ہے کہ، اس غیر معمولی شخص نے پہلی مرتبہ شاہی توجہ اس وقت حاصل کی جب وہ اس کے بیٹے ہرمز کے اتالیق کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ہرمز نے پہلے تو اتالیق کے شوق اور جوش کا برا منایا لیکن آخر میں اس کا دلی احترام اور لحاظ کیا۔ بزرگمہر کو جلد ہی وزیر بنا دیا گیا اور نوشیرواں کی بہت سی اصلاحات تنہا اس کی صلاحیت سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ (پرشیا، ج اول، ص ۴۶۰)

کا علم ہونا چاہیے جن کی وجہ سے وہ آفات سے بچا رہا. اگر اسے یہ علم نہیں تو اس کا فیصلہ ناقص ہوگا ۔ تیسرا ہے ایک معتبر عہدیدار کی حیثیت سے ملکی معاملات کے بارے میں عملی واقفیت. اس طرح کا تجربہ فیصلہ کو پختگی بخشتا ہے ۔ چوتھا ہے مکمل سوجھ بوجھ. ذہین شخص تھوڑے سوچ بچار سے یہ دریافت کر لیتا ہے کہ اس کے مقاصد کس طرح حاصل ہوں گے. اگر کسی شخص میں صحیح مردم شناسی کی صلاحیت نہیں ہے، تو وہ حکومت کی مہمات کے فرائض کے سپرد کرنے میں زبردست غلطیاں کرے گا. پانچواں ہے حرص کی کمی. اگر کہیں مشیر حریص اور لالچی ہوا تو اس کے حرص کی وجہ سے اس کے ذہن میں صحیح فیصلہ کا القا نہیں ہوگا۔ چھٹا معیار یہ ہے کہ مشیر راسخ القلب اور بیدار مغز ہو. کمزور قوت ارادی اور سست ذہن والوں کے قلوب میں صحیح فیصلہ کا خیال نہیں آتا اور نہ ہی بزدلوں کو اس کا القا ہوتا ہے ۔ ساتواں یہ ہے کہ مشیر کار میں عزت نفس، فیاضی اور عفو و درگزر ہونا چاہیے. ناعاقبت اندیش اور خوددار لوگوں سے صحیح فیصلہ کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ آٹھواں یہ ہے کہ ہر مشیر کے لیے سلطان کی سچی اطاعت ایک ناگزیر شرط ہے کیوں کہ یہی دوسری خوبیوں کی بنیاد ہے خاص طور سے دانش مندوں کے قلوب میں.

بزرجمہر نے کہا: پالیسی اور فیصلہ کی اصطلاحات ان سلطانوں اور وزیروں کے حوالہ سے استعمال کی جاتی ہیں جن کے فیصلے ملک کی مہمات اور بڑے بڑے معاملات طے کرنے کے متعلق ہوتے ہیں. غیر سرکاری لوگوں کے فیصلوں کو جو اپنے ذاتی معاملات میں اپنے دوستوں سے مشورہ لیتے ہیں، پالیسیاں نہیں کہنا چاہیے. اسی طرح پیغمبر اور سلاطین کی اولاد کو تو 'آل' کہا جاتا ہے. لیکن عام لوگوں کی اولاد کو نہیں...

بڑے بڑے سلطانوں نے مشوروں کے سلسلے میں کئی شرائط کی پابندی کی ہے اور اس معاملہ میں بہت محتاط رہے ہیں. لہذا ان کے مشیروں کی رائے شاذ ہی کبھی غلط ثابت ہوئی ہے.

6895

(۱) مشورہ کی پہلی شرط ہے مشیروں کی رائے کا صاف گوئی سے اظہار یعنی مجلس رائے[۱] میں تمام مشیروں کو چاہیے کہ ان کے ذہنوں میں ملکی مہمات کے نفاذ کے سلسلے میں جو بھی خیال آئے اسے اور

---

[۱] مجلسِ رائے. 'مجلس رائے' وہی 'مجلس خاص' ہے جس کا برنی اور دور سلطنت کے دوسرے مورخین بارہا حوالہ دیتے ہیں. 'مجلس عام' یا 'بار عام' میں سلطان علانیہ ملک کے کام انجام دیتا تھا 'مجلسِ رائے' میں سلطان اور اعلیٰ عہدیدار کے درمیان جنھیں اس نے طلب کر رکھا تھا، رازدارانہ معاملات پر گفتگو ہوتی تھی. برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان گفتگوؤں کا لب لباب دیا ہے. اس طرح کی صلاح اس وقت ضروری ہوتی ہے جب کہ تمام اعلیٰ اختیارات ایک ہی شخص کے ہاتھوں میں ہوں. برنی اس تصنیف میں 'مجلس خاص' کے لیے دوسرے متوازی نام بھی دیتا ہے.

اپنے خیالات کے حق میں معقول وجوہات اور دلائل کو بلاخوف وخطر بیان کریں اور آپس میں بے لاگ تبصرہ کریں۔ بالآخر جب ان کے ذہن متفق ہوجائیں اور کوئی اعتراض باقی نہ رہے تو انھیں اپنی پالیسی کے نفاذ میں جٹ جانا چاہیے۔ اسے مشاورتی طریقہ کار میں 'توفق آراء' کہا جاتا ہے۔ کسی بھی فیصلہ پہ اس وقت تک بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک کہ اس پر اتفاق رائے نہ ہوجائے۔

(۲) دوسری شرط، مشیروں کی خدمات مستقل قرار دینا چاہیے اور انھیں اپنے تجربہ، اپنی وفاشعاری اور اپنے منصب میں سلطان کی نظر میں ایک دوسرے کو تقریباً ہم پلّہ ہونا چاہیے۔ اگر ایک مشیر فہم و ذکاوت میں پورا ہے اور دوسرے ناقص ہیں، ایک بڑے رتبہ پر ہے اور دوسرے معمولی رتبوں پر تو ایسی صورت میں جو فیصلے لیے جائیں گے ان میں ناموزونیت کا خطرہ ہوگا۔

(۳) تیسری شرط، تمام مشیروں کو سلطنت کے اسرار ورموز سے واقف ہونا چاہیے اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہو جس پر اعتماد نہ کیا جاسکے۔ اگر کسی مشیر کو سلطنت کے اسرار کے متعلق معلومات نہیں ہیں تو وہ کسی صحیح فیصلہ پر نہیں پہنچ پائے گا جیسے کہ کوئی طبیب مریض کی بیماریوں اور ان کی صحیح علامتوں کی تشخیص کے بغیر کوئی مناسب علاج تجویز نہیں کرسکتا۔

(۴) چوتھی شرط، مشیروں کو اس کے علاوہ کہ انھیں سلطان منتخب کرتا ہے اور وہ اس کی قربت میں رہتے ہیں۔ ان کی زندگیوں اور عہدوں کے تحفظ کی پوری ضمانت ہونی چاہیے تاکہ وہ مجلس رائے میں خوشامد کی طرف رجوع نہ ہوں۔ انھیں اپنے اصل خیالات کا بہت کھل کر اظہار کرنا چاہیے اور انھیں اس کا یقین ہونا چاہیے کہ ان کی آزادانہ گفتگو ان کی وفاداری کو اور زیادہ قائل کرائے گی۔ انھیں سلطان کی بدمزاجی سے خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جب تک سلطان کا خوف ان کے سینوں کو توڑتا مروڑتا رہے گا تو سچی صلاح ان کے قلوب سے نکل کر ان کی زبان پر نہیں آئے گی

(۵) پانچویں شرط، سلطان کو شروع میں مجلس خاص سے اپنے خیالات پوشیدہ رکھنا چاہیے، پہلے تو اسے اپنے مشیروں کے خیالات سے واقف ہوجانا چاہیے، ان کے نظریات سننا چاہیے جن کا وہ اظہار کرنا چاہتے ہیں اور ان کے فیصلہ کا انتظار کرنا چاہیے۔ اگر سلطان مجلس خاص میں اپنے خیال کا اظہار کرکے ہی شروعات کرتا ہے تو مشیر ضرور ہی، طوعاً وکرہاً اس کے فیصلہ کی تعریف کریں گے اور اپنے خود کے نظریات کو دبادیں گے۔ کسی کو بھی سلطان کے فیصلہ کی مخالفت کرنے یا اس کے خلاف دلائل پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ تجربہ نے اس حقیقت کو صحیح ثابت کردیا ہے۔

(۶) چھٹی شرط، ملکی معاملات پر گفتگو صاف ترین وقت پر ہونا چاہیے۔ خاص طور سے گفتگو کھانے اور

پینے سے پہلے ہونی چاہیے. بہت سے سلطان صلاح ومشورے کے دنوں میں روزہ رکھتے تھے اور اپنے مشیروں سے بھی روزہ رکھنے کو کہتے تھے. اس امید پر کہ ان کے قلوب میں صحیح فیصلہ کا القا ہو سلطان اور ان کے صالح کار خدارسیدہ بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دیتے تھے. انھوں نے خیرات تقسیم کر کے اور خدا سے گریہ وزاری اور دعا کر کے مدد الٰہی طلب کی. وہ ان مشوروں کو بے کار رسمی کارروائی نہیں سمجھتے تھے بلکہ حکومت کے تمام کاموں کی روح رواں خیال کرتے تھے. اور آخر میں یہ کہ ایسے لوگ جو یہ نہیں جانتے کہ مناسب فیصلوں کا کیا مطلب ہوتا ہے اور جو اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ افسران کے ذہن اچھے اور برے کا فیصلہ کرنے کے سلسلہ میں الہام ربّانی سے فیضیاب ہوتے ہیں، انھیں مجلس خاص کے قریب نہیں پھٹکنے دینا چاہیے.

(۷) ساتویں شرط، اگر مشیروں کا 'توفق آراء' ان کی ہوائے نفس کے مخالف نہیں ہے اور ان کے فیصلہ کے نفاذ میں خطرے پیش آتے ہیں تو اس اتفاق رائے پر احتیاط سے از سر نو غور کرنا چاہیے. یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ کوئی ایسا فیصلہ نقائص سے خالی نہیں ہوگا جو کہ ہوائے نفس اور ذہن کے لیے خوش نما طریق کے موافق ہے. مشوروں کے متعلق اس باریکی کو سمجھنا خواہشات کے مارے ہوئے حریصوں کی قوت ادراک سے باہر کی بات ہے. صرف ژرف نگاہ وزیر ہی اسے سمجھ سکتے ہیں، سلاطین سے جو بھی غلطیاں سرزد ہوئیں وہ صرف اس حقیقت کی بناء پر کہ ان کے فیصلے ہوائے نفس سے میل کھاتے تھے. اور اس وجہ سے بہتر اور خوش آیند نظر آتے تھے لیکن، چوں کہ جن فیصلوں کو وہ بہتر سمجھتے تھے وہ حقیقتاً غلط ثابت ہوئے اور وہ اپنے مشیروں کی خوبیاں اور خامیاں پہچاننے میں ناکامیاب ہو گئے تھے لہٰذا وہ ناعاقبت اندیشانہ اور غلط فیصلوں پر چل کر اپنی سلطنتوں کو حوادث کی نذر کر کے ختم ہو گئے. ابھی کہی گئی صورت حال کے بارے میں طویل تشریحات دی جا سکتی ہیں لیکن اس جگہ اختصار کی خاطر میں نے صرف اتنا ہی لکھ دیا ہے... (اگلے دو پیراگراف چھوٹی ہوئی جگہوں کی وجہ سے بے کار ہیں لیکن بچے کھچے جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف پہلے ہی کی تکرار تھے. یہ ہدایت سلطان محمود کی مدح وستائش پر ختم ہوتی ہے.)

(اس ہدایت کی پہلی مثال کے سلسلے میں برنی خلیفہ حضرت عمرؓ کی بزرگ صحابہ سے حکومت کے معاملات میں مشورہ لینے کی مشہور ومعروف پالیسی کا حوالہ دیتا ہے. وہ واقدی[1] کی تاریخ مختصر کی بنیاد پر ایک

---

[1] واقدی. واقدی ایک مشہور ومعروف عرب مورخ تھا جو ۱۳۰ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوا تھا. وہ مامون کے دور خلافت میں قاضی تھا اور اسے ہارون رشید نے بھی قاضی مقرر کیا ہوگا. اس نے خلیفہ مامون کو اپنی (باقی صفحہ پر)

خاص واقعہ کا بھی حوالہ دیتا ہے۔ جب ابو عبیدہ ثقفی کو، جسے ایرانیوں کے خلاف ایک لشکر کے ساتھ بھیجا گیا تھا، شکست ہوئی اور وہ جنگ میں کام آ گئے تو خلیفہ کو اس نسامت اعمال پر تکلیف کا اتنا زیادہ احساس ہوا کہ انھوں نے بذات خود ایرانیوں کے خلاف جنگ کی کمان سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بزرگ صحابہ کے اصرار پر انھوں نے اس معاملہ پر گفتگو کی اجازت دے دی اور یہ طے پایا کہ سعد بن وقاصؓ کو سپہ سالار بنا یا جائے۔ سعد نے ایرانیوں کو قادسیہ کی مشہور جنگ میں شکست دی (نومبر ۶۳۵ء) اور ایران کے دار السلطنت مدائن پر قبضہ کر لیا۔

(دوسری مثال اس کے برعکس ہے۔ معاویہ کے خلاف جدوجہد کے دوران خلیفہ حضرت علی نے مدینہ سے کوفہ کی جانب کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ مقتدر صحابہ نے جن میں برنی سعد بن وقاص، عبداللہ بن عمر، عثمان بن زید، مغیرہ بن شعبہ اور ابو ایوب انصاریؓ کے نام گنائے ہیں، خلیفہ حضرت علی کے مکہ جانے کی مخالفت کی لیکن وہ انھوں نے ان کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔)

نصیحت ۴

عزم درست، اس کے اور استبداد اور ستیہش کے درمیان فرق کے بارے میں

عزم درست خلعت سلطانی اور شاہی پوشاک ہے اور مذہبی سلطانوں کی فنی اصطلاح میں عزم

بقیہ حاشیہ: مرضی کا عامل مقرر کیا تھا اور اس کی فوقیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ عظیم الرتبہ خلیفہ ان فرائض کو ذاتی طور پر انجام دیتا تھا۔ ابن قدیم کی مشہور 'فہرست' میں 'تاریخ مختصر' نام کی کسی کتاب کو واقدی کے ساتھ منسوب نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اس طرح کا خلاصہ واقدی کی 'تاریخ الکبیر' کی بنیاد پر کیا گیا ہو گا۔" صرف اس کی کتاب 'المغازی' ہی ایک جداگانہ کتاب کی حیثیت سے باقی رہ گئی ہے۔" لیکن ابن سعد نے اپنی 'طبقات' اور طبری نے اپنی 'مغازی' میں واقدی کی گم شدہ تصنیف میں سے بہت کچھ معلومات حاصل کی ہیں (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج چہارم، ص ۱۱۰۵، نیز ابن خلکان کی بیوگرافیکل ڈکشنری، سلین کا ترجمہ، ج سوم، ص ۶۱

ؔ برنی کا یہ بیان غالباً صحیح ہے (دیکھیے الفخری، مترجم C.E.J. Whitting، ص ۷۵، نیز Muir کی Caliphate، ص ۹۸)

(باقی صفحہ پر)

درست استبداد اور مطلق العنانی سے بہت مختلف ہے حالاں کہ وہ یکساں نظر آسکتے ہیں۔

وہ حکمراں جنھوں نے ہمارے زمانے سے پہلے دنیا کو اپنے عدل اور مہربانی سے محفوظ اور منظم رکھا ان کا کہنا تھا کہ عزم درست حکومت کی ایک لازمی شرط ہے۔ اگر کوئی سلطان حکومت کی مہموں میں عزم درست دکھاتا ہے اور انتظام معاملات میں کسی کمزوری یا بدنظمی کا دخل نہیں ہونے دیتا تو اس کے منصوبے بہت جلد اور بہ آسانی پورے ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اس کے دوستوں اور دشمنوں کے قلوب میں اس کی عظمت اور زیادہ مضبوطی سے بیٹھ جائے گی۔ اس کے ارادہ میں یقین، جو ملکی معاملات کا ستون ہوتا ہے، دور اور نزدیک کے لوگوں کے ذہنوں میں زیادہ گہرائی سے نقش ہو جائے گا، اس کے حریفوں کو اس سے جو خوف ہوگا اس میں کمی نہیں آئے گی اور محکومین کو یہ یقین ہوگا کہ اگر سلطان نے ایک مہم چلائی ہے تو وہ اسے پورا کیے بغیر اس سے اپنا ہاتھ نہیں کھینچے گا۔ سلطان کی قوت ارادی میں عوام کا یہ اعتماد انتظامیہ کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کے برعکس اگر سلطان کو ارادہ میں کمزوری کی شہرت مل جاتی ہے اور معاملات کی انجام دہی میں اس کا پس و پیش اور غیر مستقل مزاجی عوام کے سامنے آجاتے ہیں تو اس کے خیرخواہوں کا اس کی مہربانیوں کے قیام و بقا پر سے اعتماد اٹھ جائے گا، اس کے دشمنوں کو اس کا کوئی خوف نہ رہے گا، رعیت کو اس کے احکام اور امتناعات پر مناسب عملدرآمد کے بارے میں کوئی یقین نہیں ہوگا، عوام کو اس کے اقوال و افعال کا کوئی احترام نہیں رہے گا اور اپنے ہم رتبہ لوگوں میں اس کا کوئی وقار نہیں رہے گا۔

فارسی لفظ 'عزم' کے معنی 'کسی کے رخ کو عمل کی طرف موڑنا' ہیں اور 'عزم' اور 'قصد' مرادف اصطلاحات ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے رخ کو کسی عمل کی طرف کر لیتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے 'عزم کر لیا ہے' یا اس کا 'قصد کر لیا ہے'۔ اب 'عزم' یا 'قصد' اچھے یا برے کے لیے ہو سکتے ہیں، فلاح یا انتشار یا پھر دینی یا دنیاوی معاملات کے لیے بھی ہو سکتے ہیں اور اس کا نتیجہ مفید یا مضر کچھ بھی ہو سکتا ہے، ممکن یا ناممکن چیزوں، مشکل مہمات یا سہل معاملات کے لیے بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے، اس سے خوش حالی بھی آسکتی ہے اور تباہی بھی، شہرت بھی مل سکتی ہے اور بدنامی بھی، نفع نقصان کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بہ الفاظ دگر خیالی 'ارادہ' کا کوئی اخلاقی

بقیہ حاشیہ: لہ ان صحابہ کو حضرت علیؓ کا مشیر شمار کرنے میں برنی غالباً غلطی پر ہے۔ سعد بن وقاص، عبداللہ بن عمر اور عثمان بن زید علی اور معاویہ کے درمیان ہونے والے تنازعہ میں قطعی طور پر غیر جانب دار تھے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج سوم، ص ۷۸۰)۔ مغیرہ بن شعبہ کو خلیفہ حضرت عمرؓ نے کوفہ کا والی مقرر کیا تھا اور رجب ۵۰ یا ۵۱ھ میں اس کا انتقال ہو گیا تو اس کی جگہ اس کے باپ کے بیٹے مشہور و معروف زیاد نے سنبھالی (Muir کی Caliphate، ص ۲۲۰ اور ۲۹۵) (ح)

وصف نہیں ہوتا لیکن جب یہ دا قعتاً عملی طور پر سرگرم ہوتا ہے تو یہ اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔

اب سنیے سلطانوں نے اپنے 'عزم' کے بارے میں اپنے ذہنوں میں اس طرح تصویر قائم کی ہے۔ کوئی بھی چیز جس کا وہ قصد کرتے ہیں اس پر قائم رہتے ہیں اور ترک نہیں کرتے وہ ان کے لیے 'عزم سلطانی' ہے یعنی جب سلطان کسی چیز کا قصد کر لیتے ہیں تو اس سے کبھی رخ نہیں موڑا جاتا ہے یا موڑا جا سکتا ہے جس طرح کہ کوئی تقدیر کے فیصلہ سے منہ نہیں چرا سکتا اور شیطان نے ان کی داڑھیوں اور مونچھوں کا مضحکہ اڑایا ہے اور ان کے تاریک ذہنوں میں یہ بات بٹھادی ہے "تم اس زمین کے خدا ہو، تمہیں اپنے عزم سے نہیں ہٹنا چاہیے کیوں کہ اگر تم اپنا عزم بدلو گے تو لوگ خداؤں کی حیثیت سے تمہاری پرستش نہیں کریں گے"۔

پھر سنیے کہ سلطانوں کے ہر ایک عزم کو، اگر اس کا مقصد بہتری، فلاح و بہبود اور نیک نامی ہے یا یہ فائدہ مند مقاصد کے لیے ایک آلہ ہے بشرطیکہ بادشاہ کا مقصد ممکنات کی حدود میں آتا ہے، 'عزم درست' سمجھنا چاہیے۔ اس طرح کے قصد میں ثابت قدمی ان کے لیے باعث فخر بنی ہے، اس کے برعکس 'ستیہش' اور 'استبداد' کی اصطلاحات ان تمام شاہی عزائم کے لیے استعمال کی گئی ہیں جن کا مقصد ضرر رساں یا خراب ہوا ہے یا پھر جنہیں حاصل کرنا ناممکن رہا ہے یا جو حقیقتاً تباہی، عوام کی نفرت، مصیبت اور آفت کا باعث بنی ہیں، یہ صحیح لکھا اور کہا گیا ہے کہ اس طرح کے سیہشانہ اور استبدادانہ عزائم ترک کرنا سلطانوں کی مذہبی آبرو کی بنیاد ہے اور دین اور ملک کے بلند رتبہ لوگوں نے اسے ارادہ کی کمزوری سے تعبیر نہیں کیا ہے اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان سلطان اپنی بے خوفی کی وجہ سے اپنے ناقص اور مضر عزائم پر مستقل جما رہا ہے اور مطلق العنانوں اور فقیروں[1] کے نقوش قدم پر چلا ہے تو عالم اسلام کے علما، دین اور دانش مندوں نے اسے 'ستیہش' اور 'استبداد' کہا ہے، 'عزم درست' نہیں کہا ہے۔

سلطانوں کا یہ فرض ہے کہ کسی مہم یا پالیسی کے بارے میں اپنے ذہنوں کو تیار کرنے سے پہلے اور عوام میں ان کی اشاعت کرنے سے پہلے اس کی کامیابی اور ناکامیابی کے آثار اور اپنے خود کے رتبہ، مذہب، ملک، فوج اور عوام پر اس کے اثر پر بخوبی غور و فکر کریں۔ اپنے مشیروں کے ساتھ رازدارانہ نشستوں میں ایسے مہم کے تمام رخوں پر گفتگو کرنا چاہیے جیسے اس کا آغاز اور انجام، اس کے ضمنی اثرات، اس کی سہولت

---

[1] برنی دوسرے مسلم مصنفین کی طرح ایران کے قبل اسلام کے بادشاہوں کے لیے کسریٰ اور بازنطینی شہنشاہوں کے لیے 'فقیر' کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔

اور اس کی مشکلات اور استقلال اور پسپائی کے متبادل نتائج آیا اچھے مقاصد کے لیے ان کی مہمات ممکن ہیں اور انھیں عبور کیا جاسکتا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے انھیں بصیرت کی نگاہیں استعمال کرنا چاہیے اور نہ کہ وحشتناک اور حاکمانہ نگاہوں سے جو ہمیشہ آخری نتائج کے لیے بند رہتی ہیں۔ انھیں یہ بھی یقین کرلینا چاہیے کہ دانش مند لوگ انھیں ناممکن تو نہیں سمجھتے یا ان کے پورا ہونے کے خیال سے لرز تو نہیں جاتے ہیں۔ اس طرح کی کسی مہم کو چلانے کے سلسلہ میں سلطانوں کو اپنے عزم کا عام اعلان کر دینا چاہیے، اس پر ثابت قدم رہنا چاہیے اور کوشش اس بات کی کرنا چاہیے کہ ان کے اغراض و مقاصد جتنی جلد ممکن ہوسکے حاصل ہوجائیں۔ اگر انھیں اپنا تمام خزانہ بھی خرچ کرنا پڑ جائے تو انھیں خرچ کر دینا چاہیے تاکہ وہ 'عزم سلطانی' کے اصول کو مناسب موقع پر اختیار کرسکیں۔۔۔

عالم اسلام کے سلطانوں کو مہمات اور اپنے معاملات کے انتظام کا قصد کرتے وقت پیغمبر اور خلفاء راشدین کے 'عزائم' اور 'قصدوں' پر نظر ڈالنا چاہیے۔ انھیں قرآن کی آیات اور حدیث میں آنے والے 'ناسخ' اور 'منسوخ' کے اصول پر بھی نظر رکھنا چاہیے[۱]۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ شریعت کے احاطہ تک میں جیسے اللہ کی ذات کے علاوہ کسی دوسرے سے منسوب کرنا کفر ہوگا، احکام منسوخ کیے گئے ہیں یعنی اصل احکام منسوخ کیے گئے ہیں اور لوگوں سے نئے احکام کی تعمیل کرنے کو کہا گیا ہے۔ شاہی مشوروں کا مقصد دین اور ملک کی فلاح و بہبود ہے۔ قادر مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے "ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا اسے بھلا نہیں دیتے ہیں (بلکہ) اس کے مقابلہ میں بہتر یا اسی طرح کی ایک لے آتے ہیں"[۲] اگر کوئی سلطان عوام کی بھلائی کی خاطر اپنی مہم اور قصد کو ترک کر دیتا ہے اور 'عزم شاہی' کے غلط نظریہ کی رو سے کسی مطلق العنان اور ظالم و جابر فرماں روا کے طریقہ کو اختیار نہیں کرتا ہے تو اسے ارادہ کی کمزوری کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے ہوائے نفس کو اپنی مہمات کا قائد بناتا ہے، جب کہ اس کی بادشاہت کی عظمت اور قوت جواب میں اس کی ہوائے نفس کو مضبوطی

---

[۱] 'ناسخ' اور 'منسوخ'، آیات قرآن۔ مسلم علماء میں اس موضوع پر بہت زیادہ اختلاف ہے۔ قرآن کے پرزور اور صاف اعلان کی روشنی میں۔ ایک مشہور آیت جسے برنی نقل کرتا ہے۔ اس اصول کو عام طور سے تسلیم کرلیا گیا ہے کہ قرآن کے کچھ احکام نے سابقہ قرآنی احکام کو منسوخ کر دیا ہے (ایسے ہی پیغمبر کے سابقہ احکام اور پچھلی وحیاں بھی) لیکن اس مسئلہ پر اختلاف رہا ہے کہ کون سے احکام منسوخ کیے گئے ہیں (ح)

[۲] سورہ ۲، رکوع ۱۳، آیت ۱۰۶۔

بخشی ہے اور وہ ایسی مہمات چلاتا ہے جو اس کے اور عوام کے زوال کا باعث ہوتی ہیں تو اس طرح وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی اور اپنے عوام کی بلی چڑھادے گا۔ تب پھر عزم سلطانی، کا نظریہ اس دنیا میں یا اس کے بعد آخرت میں اس کے کس کام آئے گا۔؟

پھر بھی اگر سلطان اپنی بھلائی اور عوام کی بہتری کے لیے کوئی مہم شروع کرتا ہے اور عقل اور تجربہ کو اس کے قرین مصلحت ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس کے بعد وہ اپنے مقصد میں ڈھیلا پڑجاتا ہے اور اپنی مہم کو ترک کردیتا ہے تو اسے بلا شک شبہ کمزور ارادہ کی شہرت ہی ملے گی۔ اس کے بعد کسی کو بھی اس کی مہمات میں کوئی مزید اعتماد نہیں ہوگا اور اس کے وقار کو ٹھیس پہنچے گی کیونکہ آئندہ عوام کے قلوب پر اس کے احکام کا بہت ہلکا اثر ہوگا۔

اس نصیحت کے سلسلے میں یہ مثالیں دی گئی ہیں (۱) امام واقدی کی تاریخ کی بنیاد پر خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کے اس بہت دانش مندانہ اور مدبرانہ فیصلہ کا حوالہ دیا گیا ہے کہ 'مرتدین، کے ساتھ کوئی مصالحت نہ کی جائے[۱]

(۲) خلیفہ معتصم نے بازنطینیوں سے عموریہ کو حاصل کرنے میں جس عزم کا مظاہرہ کیا اسے پسند کیا گیا ہے۔ تاریخ خلفائے عباسی کی سند پر اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے[۲]

(۳) ژالہ باری کے باوجود سومناتھ کے لیے کوچ کرنے میں محمود کا استقلال[۳]

(۴) شاہ ایران خسرو پرویز[۴] کا رسولؐ عربی کے ساتھ گستاخانہ رویہ۔ شاہ ایران نے اپنے وزیر کی اس

---

[۱] یہ قدیم تاریخ اسلام کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ مرتدین نے زکوٰۃ اور عبادات میں کمی کا مطالبہ کیا لیکن خلیفہ حضرت ابوبکرؓ نے مصالحت کی تمام تجاویز سے انکار کردیا کیونکہ اگر اسلام در رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد مصالحتوں سے شروع ہوا تو ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب مصالحتوں کی وجہ سے اس کی موجودہ شکل ختم ہوجائے گی۔ انہوں نے جہاد کا فیصلہ کیا اور فتح حاصل کی۔ (دیکھیے Muir کی caliphate، ص ۳۸۔۱۸ اور الفخری، ص ۷۱۔۷۰)

[۲] دیکھیے Muir کی caliphate ص ۵۱۶۔۵۱۵ اور الفخری، ص ۲۳۰۔۲۲۹۔

[۳] بیرونی کا بے بنیاد خیال ہے جو شہادتوں پر مبنی نہیں ہے۔ کئی مورخین نے سومناتھ کے لیے کوچ کا تذکرہ کیا ہے لیکن کسی نے بھی ژالہ باری کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

[۴] خسرو پرویز۔ ساسانی شہنشاہ خسرو پرویز (۶۲۸۔۵۹۰ء) نے اپنے دور کا آغاز اچھی طرح کیا لیکن آخر میں تنزلی کی طرف مائل ہوگیا۔ اسے اس کے افسران نے معزول کردیا اور اسے سخت اذیتیں پہنچا کر مار ڈالا (دیکھیے سائکس کی پرشیا) (باقی صفحہ پر)

صلاح کو پرے ڈال دیا کہ رسولِ اکرم کو تنہا چھوڑ دیا جائے اور اس کی بجائے رسولِ اکرم کی گرفتاری کا حکم دیا جس پر عمل کرنا ناممکن پایا گیا۔ بیشتر اس کے کہ معاملات اور آگے بڑھتے خسرو پرویز کو اس کے بیٹے نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

(۵) یزید بن معاویہ کا اپنے مشیروں کی صلاح کے خلاف مدینہ میں تعینات اپنے ماتحت عہدیداروں کو یہ حکم دینا کہ وہ امام حسینؓ بن حضرت علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے بیعت لیں۔

نصیحت ۵

سلطان کے عدل کے بارے میں

سلطان محمود نصیحت کرتا ہے: اے محمود کے فرزندو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آدمؑ کے وقت سے لے کر ہمارے زمانہ تک تمام قدیم اور جدید ملتوں کے خواص و عوام اس خیال سے متفق ہیں کہ عدل مذہب کی اور مذہب عدل کی ضروری شرط ہے۔ کیونکہ بنی آدم ایک دوسرے سے تعلق رکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ان آپسی میل جول میں کوئی شخص طاقت ور یا کمزور، مسلم یا غیر مسلم، عقلمند یا احمق، تعلیم یافتہ یا جاہل، شہری یا دیہاتی مقیم یا مسافر، چال باز یا سیدھا سادہ، حکمراں یا محکوم، نابالغ یا بالغ ہو سکتا ہے۔

اب ملاحظہ ہو کہ عدل ایسا میزان ہے جس پر لوگوں کے اچھے یا برے فعلوں کو جانچا جا سکتا ہے۔ عدل صحیح اور غلط دعووں کے درمیان تمیز کرتا ہے۔ عدل، ظلم، تشدد، زبردستی غبن اور لوٹ مار کو فاش کر دیتا ہے۔ لہٰذا عدل کے بغیر لوگوں کے معاملات میں استحکام نہیں ہو سکتا۔ کوئی بھی دین، جو احکام الٰہی کی بنیاد پر قائم ہے عدل کے بغیر نہیں چل سکتا۔ قدیم اور جدید دونوں دور کے مفکرین نے کہا ہے کہ مذہب اور عدل جڑواں ہیں۔ یہ اس لیے کہ قیامت کے روز دولت، جائداد، عورتوں، غربا کے بچوں، مطیع و مجبور، نوجوان، منکسر اور بے یار و مددگار لوگوں کی حفاظت کی غرض سے عدل ظالم، جابر اور طاقت ور غبن کرنے والوں، لوٹ کھسوٹ کرنے والوں باغیوں، غداروں، اباحتیوں[1] اور کافروں کے بازو کاٹتا ہے۔ عدل مذہبی منشور کے ذریعہ ظلم و جبر

بقیہ حاشیہ: ج اول، ص ۸۷، ۸-۴۷ اور روضۃ الصفا، ج اول، ص ۲۶۶-۲۲۵)

[1] اباحتی۔ اباحتی کے لغوی معنی وہ لوگ ہوں گے جو ممنوعہ چیزوں کو جائز قرار دیتے ہیں۔ برنی اور (باقی صفحہ پر)

کی روک تھام کرتا ہے۔ اگر زمین پر عدل وانصاف نام کی کوئی شے نہیں ہو تو زر اور زن کی اباحت ہو جائے گی۔ دو افراد کی املاک کے درمیان تمیز باقی نہیں رہے گی، کوئی وقت یا جگہ افراتفری سے خالی نہیں رہے گی اور کوئی ابن آدم اپنے گوشے میں عافیت سے پانی کا ایک پیالہ نہیں پی سکے گا۔ یا ایک رات بھی ٹانگیں پھیلا کر اور بے خطر نیند نہیں لے سکے گا۔ اور آخر میں زبردست بحران اور ابتری کی وجہ سے دنیا سے خوش حالی ختم ہو جائے گی۔

ایک طاقت ور اور مقتدر حکمراں کو عوام میں عدل قائم کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر اس سرزمین کے تمام دانش مند با اختیار منصفین کے بغیر ہی محض پالیسی یا عقل کے فرمان کے ذریعہ کسی دیہات یا مکان کو چلائیں گے تو انھیں کامیابی نہیں ہوگی۔ عدل معاشرتی تنظیم اور شہری نظم کی بنیاد ہے اور عوام میں مضبوط حکمراں اسے انجام دیتا ہے۔ عدل قائم کرنے کی ضرورت ہی سلطانوں کی برتری اور ان کے اختیارات اور عظمت کا صحیح جواز ہے۔ اپنے شاہی اختیارات اور جاہ و جلال سے ہی سلطان طاقتوروں کو عوام کے ساتھ اپنے لین دین میں زیادتی کرنے سے روک سکتا ہے اور اس کے بعد بہتر طریقے سے تسکین قلب حاصل کر سکتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ: اس کے ہمعصروں نے اسماعیلی گروہوں کے لیے اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے جن کے خلاف یہ الزام تھا کہ انھوں نے اباحت کی اجازت دے رکھی تھی۔ لہٰذا امیر خسرو نے سلطان علاؤالدین خلجی کی ان اسماعیلیوں کو دی ہوئی ہولناک سزاؤں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے: "اباحتیوں کو ان کے فعلوں کے لیے قتل عام کی سزا سنائی گئی۔ اس کے بعد شریعت کے سعادت مند حامی نے تمام اصحاب اباحت کو اپنے سامنے بلوایا۔ دیانت دار محتسبوں کو ان میں سے ہر ایک کی گرفت کرنے اور ان کی مجلسوں کی مکمل تحقیقات کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ یہ پتہ چلا کہ ان بے شرم ذلیلوں میں ماؤں نے اپنے خود کے بیٹوں کے ساتھ اور خالاؤں نے اپنے بھانجوں کے ساتھ مباشرت کی تھی۔ باپ نے اپنی بیٹی کو اپنی زوجہ بنا لیا تھا اور بھائیوں اور بہنوں کے درمیان ناجائز تعلقات تھے۔ ان تمام لوگوں مردوں اور عورتوں سب کے سروں پر سزا کا آرہ چلایا گیا۔۔۔ لوہے کے دانتوں والے آرہ نے ان کے سروں پر اونچے اونچے قہقہے لگائے جن میں سے خون کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ جو ایک حزب نہاں سے ایک ہو گئے تھے اب کھلے عام آرہ سے دو ہو گئے تھے اور وہ جان جس نے دوسری جان سے وصل کی خواہش کی تھی اسے اپنے ہی تن سے جدا ہونے کے لیے مجبور کر دیا۔" (خسرو کی خزائن الفتوح، ترجمہ پروفیسر حبیب، ص ۱۲) ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی میں ایسی ہی سزاؤں کا ذکر کرتا ہے (اصل فارسی، ص ۳۳۶) یہ الزام وسیع طور پر لگایا تو گیا تھا لیکن یہ کسی بنیاد کے بغیر ہی لگایا گیا تھا۔ اسماعیلی تحریک کے مختصر ذکر کے لیے پروفیسر برنارڈ لیوئس کا بہت عمدہ رسالہ The origins of Islamism دیکھیے زبانی صفحہ پر

اور ہر شخص اپنے کو اپنے فن، پیشہ اور گزر بسر کے ذریعہ کے لیے وقف کر سکتا ہے اور اس طرح دنیا آباد اور خوشحال ہو سکتی ہے۔ عدل کے بغیر کوئی بھی شخص دوسرے شخص کی مدد نہیں کر پائے گا یا اسے بچا نہیں پائے گا۔ اور کوئی بھی شخص اپنے کام سے کسی قسم کا نفع نہیں اٹھا پائے گا۔ آخری بات یہ کہ اگر لوگوں کے معاملات کو مرکوز میں منظم نہیں کیا جاتا ہے تو دینی کاموں یا اسلامی احکام میں کوئی استحکام نہیں ہوگا اور سزا و جزا سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوگا۔

مزید یہ کہ نوع انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ کی عبادت تھا۔ جیسا کہ قادر مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے، "ہم نے انس و جن کو اس کے سوائے پیدا نہیں کیا کہ وہ ہماری عبادت کریں"[۲]۔ برنی یہاں ایک نظریہ کا حوالہ دیتا ہے جس کی بعد میں اس نے تفصیل سے وضاحت کی ہے، کہ اسلام نے جن صفات کو متعین کیا ہے وہ ان خصوصیات کے براہ راست ضد ہیں جنھیں ایک سلطان کو اپنے فرائض کو مناسب طریقے سے نبھانے کے لیے اپنے اندر پیدا کرنا ہی ہے۔ یہ خصوصیات صفات الٰہی سے ملتی جلتی ہیں۔ لہٰذا سلطان اپنے لیے صفاتِ الٰہی کا دعویٰ کرتے ہیں اور برنی کے خیال میں اس طرح کے دعویداروں کے لیے مناسب جگہ "تاریکی در تاریکی" ہے۔ اب اگر کچھ علماءِ دنیا[۳] مسلم سلاطین کے لیے صفات الٰہی کے دعویٰ کو جائز خیال کرتے ہیں تو اس کا جواز یہ ہے کہ سلطان لاچاروں کی مدد کر سکتا ہے اور مجبور و مظلوم لوگوں کے مطالبات پورے کر سکتا ہے۔ سلطان کے اختیار و اقتدار کی وجہ سے عدل کا نفاذ نقطۂ کمال تک پہنچتا ہے۔ کسی باغی یا غدار کو کمزور و لاچار پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ ایمان اور شریعت کو چھیڑنے والوں کو

بقیہ حاشیہ: O. Leary کی History of the Fatamid Caliphate میں بھی اسماعیلیوں اور قرمطیوں کی ابتدا کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے (ص ۱-۵۰)

[۱] بہتر فرقے۔ 'بہتر فرقے' کی اصطلاح اسلام کے بہتر گروہوں یا دنیا کے بہتر مذاہب دونوں کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ برنی اسے آخری معنیٰ میں استعمال کرتا ہے۔

[۲] سورہ ۵۱، آیت ۵۶

[۳] علماءِ دنیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے مسلمان مفکروں نے علما کو دو گروہوں میں منقسم کیا تھا (الف) دینوی اور (ب) دنیاوی۔ وہ تمام علما جو اپنے دینی علم کو ذریعہ معاش بنا لیتے تھے انھیں 'علماءِ دنیا' کے تحت رکھا جاتا تھا اور ان پر یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ انھوں نے مادی فوائد کے لیے اپنے دین کو بیچ دیا تھا۔ خاص طور سے اس وقت جب کہ وہ ریاست کی خدمت میں قاضی، صدر وغیرہ کی حیثیت سے داخل ہو جاتے تھے کیوں کہ اس منصب پر پہنچ کر انھیں (باقی صفحہ پر)

نکیل دیا جاتا ہے اور انھیں ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے، شاہی احکام بہتر فرقوں پر نافذ کیے جاتے ہیں اور سلطان کے صحیح احکام کے باعث اسلام کی شان بلند ہوتی ہے اور اس طرح مذہب کے احکام کی بدولت نظم عالم کو قیام و بقا حاصل ہے۔

چوں کہ تمام نیکیاں، عبادات اور بھلائی اور مہربانی کے کام صرف عدل کے نفاذ سے ہی ممکن ہو پاتے ہیں۔ اس لیے رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے: "ایک لمحہ کا انصاف ستر سال کی ریاضتوں سے بہتر ہے۔" اس طرح کا مبالغہ دین کے کسی دوسرے کام کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کیوں کہ سلطان کے عدل ہی نے تمام نیک کاموں کو ممکن بنایا ہے اس لیے سلطان کے نام میں ایک جزائے الٰہی لکھا گیا ہے جو کہ لوگوں کے اپنے نیک اعمال کے ذریعہ حاصل کیے ہوئے اجر کی مجموعی تعداد کے برابر ہے اور اس جزا میں تغیر نہیں اور وہ کسی بھی صورت میں اس سے محروم نہیں ہوگا۔

افلاطون الٰہیؒ نے کہا ہے: سلطان اپنے اقتدار کی قدر نہیں جانتے ہیں جو کہ ایک عظیم نعمت ہے۔ وہ اپنے منصب اور اس کی نسبت سے حاصل ہونے والے اختیارات کو محض دنیاوی خواہشات کی تسکین اور زندگی کے ان لطائف اور لذتوں کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جن کے سلسلے میں وہ

بقیہ حاشیہ: سلطان اور اعلیٰ عہدیداروں کی خواہشات کے مطابق فتاویٰ جاری کرنا ہوتے تھے۔ اسلامی صوفی ادب ریاست کی خدمت میں رہنے والے علما کی لعنت ملامت سے پر تھے (ح)

ــــ افلاطون الٰہی۔ تمام یونانی تصانیف کا عربی میں زیادہ تر ترجمہ عظیم عباسیوں کے دور ہی میں ہوا۔ افلاطون اور ارسطو کی سیاسی تصانیف کا مسلمانوں پر کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ قرون سابقہ کے ان دو عظیم مفکرین نے شہری ریاست کو سیاسی تنظیم کی آخری شکل قرار دیا تھا اور تمام غیر یونانیوں کو جاہل کہہ کر خارج از بحث کر دیا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کے مسلمانوں کے لیے اس طرح کے اصول بے معنی تھے پھر بھی یہ معلوم تھا کہ وہ سیاست پر فکر کرتے تھے اور ہر ایرانی مصنف اپنی پسند سے کسی بھی بیان کو ان سے منسوب کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اس کے برعکس سائنس کے متعلق مضامین پر ارسطو کی تصانیف اور خاص طور سے اس کی منطق مسلم سیکولر غور و فکر کا نکتۂ آغاز بنی۔ افلاطون کا اثر اتنا وسیع نہیں تھا لیکن اس کا نظریہ علم اور نظریہ اشکال کا اسلامی فکر کے اعلیٰ ترین احاطہ میں، خاصا اثر تھا۔ اسے 'الٰہی' کہا گیا کیوں کہ 'الٰہیات' کے میدان میں وہ مسلمانوں کا رہنما تھا۔

دیکھیے کتاب الملل والنحل، فارسی ترجمہ، ص ۲۷۰ ۔ ۲۶۴ (ح)

وحشی جانوروں اور درندوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس وقت اختیارات سلطانی کو خواہشات کی تسکین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو سلطان اس قدر اپنی ہوائے نفس کے قابو میں آجاتے ہیں کہ وہ خدا کی رحمت اور غضب میں فرق نہیں کر پاتے۔ اور اپنے بے لگام نفس کی وجہ سے اور اختیارات کا تجاوز کر کے وہ صرف اپنی مرضی سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ تاہم عدل عامہ بادشاہت اور اعلیٰ ترین خلافت میں قیادت کی ایک ضروری شرط ہے اور اگر سلاطین کی فطرت میں عدل کا وصف ہے تو پیغمبروں کی خوبیوں کے علاوہ کوئی دوسری خوبیاں سلطانوں کی خوبیوں سے زیادہ اعلیٰ نہیں ہو سکتیں۔

قدیم اور جدید ملتوں کے مذہب اور ریاست کے عظیم اثرتب ٹوٹ کر رہ گئے ہیں۔ انسان کو انسانی معاملات کے متعلق کسی بھی معاملہ میں انتہا تک پہنچنے یا زیادتی برتنے کو نہیں کہا گیا ہے۔ ایک طویل عرصہ گزرا انھوں نے یہ اصول قائم کیا تھا کہ تمام کاموں میں اعتدال بہتر ہے۔[1] تمام کاموں میں اعتدال کے فرض کو شریعت اور عقل نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس کے باوجود عدل نافذ کرنے میں سلطان کے لیے انتہا پسند ہونا ضروری ہے۔ اگر سلطان میں عدل خلق صفت نہیں ہے اور اگر اس کی دوسری تمام صفات عدل و انصاف کی خواہش سے فیض رسانی نہیں کرتی ہیں تو اس کے بیٹوں، اعزہ و اقارب، غلاموں، تابعداروں، دوستوں، تابعیوں اور حکومت کے عہدیداروں کے طریقہ کار ہیں، جو کہ ریاست کے کاموں میں اس کے ہم دست اور شریک کار ہیں، اس کے عدل کا اثر ظاہر نہیں ہو پائے گا اور جب تک کہ سلطان کے تمام عہدیدار عادل اور انصاف پسند نہیں ہیں تو عام لوگ بھی ایک دوسرے کے ساتھ لین دین میں عدل کا احترام نہیں کریں گے۔ کوئی سلطان اسی وقت عادل کہلائے گا جب کہ اس کے ملک میں کوئی بے انصافی باقی نہیں رہتی ہے۔ اور تمام ظالموں کو کچل دیا جاتا ہے۔ اگر تنہا ایک بھی شخص ظالمانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے اور سلطان کے علم میں آنے کے باوجود اس کے مظالم جاری رہتے ہیں تو سلطان عادل اور غیر جانب دار نہیں ہے۔ سلطان اور اس کے عہدیداروں کے عدل نافذ کرنے کی پہچان یہ ہے کہ مملکت میں شاذ ہی قہر و آفات نازل ہوتے ہیں اور اس پر آسمانی نعمتیں آتی ہیں۔

اخراجات کے معاملہ میں سلطان کے لیے ناانصافی معاف ہے۔ سلطان اپنے لیے اور اپنے حواریوں کے لیے ریاست کے خزانہ سے جو دولت لیتا ہے وہ ضروری ہے کیوں کہ بادشاہت اس وقت تک قائم

---

[1] ارسطو نے اپنی اخلاقیات میں یہ اصول رکھا ہے کہ دو انتہاؤں کے درمیان اعتدال ایک خوبی ہے لیکن بہت سے مفکرین نے ارسطو سے بالکل جداگانہ ہو کر یہی اصول قائم کیا ہے۔ برنی بہت شوق سے اس خیال کو بیان کرتا ہے۔

نہیں رکھی جا سکتی جب تک کہ سلطان اور اس کے عہدیدار شان و شوکت سے نہیں رہتے ہیں۔ پھر بھی سلطان کو ہر خرچ سے پہلے یہ غور کر لینا چاہیے کہ آیا یہ ضروری ہے اور اپنے حواریوں کی ریاستی خزانہ سے کفالت کرتے وقت اسے یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ روز محشر میں جواب دہ ہے۔ اگر سلطان ان باتوں کو ملحوظ نہیں رکھتا ہے اور اپنے اوپر اپنے پیروؤں پر لاپرواہی سے دولت صرف کر کے صرف اپنے کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی حیثیت ایک زبردست روحانی خطرہ کی ہو جائے گی۔ اسے قطعی طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جب کہ دوسرے لوگ اپنی لذت و تعیش پر ریاستی خزانہ سے پیسہ خرچ کرتے ہیں، وہ روز محشر میں (عوام کے پیسہ کی اس بربادی کے لیے) جواب دینے سے قاصر ہو جائے گا۔[1]

لیکن جہاں تک سادات علماء دین، مشائخ[2] باکمال، دانش مند یا باہنر لوگوں، قابل و لائق اشخاص، مسافروں، لاچار، اور ضرورت مندوں کے لیے سلطان کی بخششوں اور مدرسوں اور صوفیاء کی خانقاہوں[3] کے لیے اس کی امداد معاش کا معاملہ ہے اور ایسے تمام مواقع پر جہاں اخلاص کی ضرورت ہے وہاں، غرضکہ ان تمام باتوں پر جتنا صرف کیا جائے گا اتنا ہی سلطان کو اس دنیا میں زبردست کامیابی حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی زبردست اجر ملیں گے۔ ایسے معاملات میں خرچہ کی زیادتی یا کفایت شعاری میں کمی پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اسی اصول کی بنیاد پر یہ کہا گیا ہے کہ اچھے کاموں میں کوئی زائد خرچ

---

[1] اس پیراگراف کی دلیل کو صرف سلطان علاء الدین خلجی اور بیانہ کے قاضی مغیث الدین کے درمیان ہونے والی گفتگو کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے (تاریخ فیروز شاہی، اصل فارسی، ص ۲۹۴-۲۹۳)

[2] شیخ (جمع مشائخ)۔ اس زمانہ کے صوفیاء کی فنی اصطلاح کے مطابق شیخ سے مراد وہ صوفی ہے جسے اس کے پیر نے ایک خلافت نامہ دے کر کسی تسلیم شدہ سلسلے میں مرید بنانے کی اجازت دی ہے۔ اگر شیخ سید تھا (یعنی آلِ رسول میں سے) تو وہ خواجہ کہلانے کا مستحق تھا۔ (ح)

[3] خانقاہ مولینا جامی کے خیال کے مطابق (نفحات الانس فارسی، ص ۳۲-۳۱) مسلم صوفیاء کے لیے پہلی خانقاہ ایک عیسائی فرماں روا نے ملک شام میں رملا کے مقام پر تعمیر کروائی تھی۔ دور سلطنت میں ہمیں دو طرح کی خانقاہیں ملتی ہیں۔ ایک تو جماعت خانہ جو صرف ایک ہال پر مشتمل ہوتا تھا جس میں تمام مرید رہتے تھے اور دوسری خانقاہ جو بڑی عمارت ہوتی تھی اور جس میں کم از کم نمایاں صوفیاء کے لیے علاحدہ علاحدہ کمروں کا انتظام ہوتا تھا۔ چشتی صوفیاء نے خانقاہ میں رہنے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن سہروردی صوفیاء اپنی خانقاہوں کی حمایت کرتے تھے۔

نہیں ہو سکتا۔

اس نصیحت کے سلسلہ میں ذیل کی مثالیں دی گئی ہیں (۱) غیر مسلم گروہوں اور بڑے بڑے جاگیرداروں نے شام کے والی ابوعبیدہ جراح[1] کے سامنے اس غربت کے خلاف احتجاج کیا جس میں خلیفہ حضرت عمر زندگی بسر کر رہے تھے۔ ابوعبیدہ نے انھیں اپنے جمع کیے مال غنیمت سے لدے ہوئے سات ہزار اونٹوں کے ساتھ مدینہ بھیجا۔ انھوں نے دیکھا کہ مدینہ کے باہر تین دن مال غنیمت تقسیم کر کے خلیفہ خالی ہاتھ اپنے گھر واپس چلے گئے۔

(۲) برنی تاریخ عباسی کی ایک عبارت نقل کرتا ہے جس کے مطابق ایک مرتبہ خلیفہ مامون نے عید کے سلسلہ میں اتنے تحائف عطا کیے کہ خلافت کے جمع کیے تمام خزانے خالی ہو گئے اور کچھ عرصہ تک حکومت قرضہ پر چلی۔

(۳) خلیفہ مامون نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے اتفاقیہ عبداللہ اور اس کے خدمت گار کی گفتگو سن لی جس سے اسے یقین ہو گیا کہ عبداللہ بخیل ہے۔ اس لیے اس نے ایک محضر طلب کیا اور عبداللہ کی نامزدگی کو منسوخ کر کے اپنے برادر معتصم کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

نصیحت ۶

افسران اور خواص کے مراتب کے بارے میں۔

سلطان محمود نے کہا ہے: اے محمود کے فرزندو اور سرزمین عالم کے حکمرانو! تمہیں صاف صاف معلوم ہونا چاہیے کہ سلطان کے بنیادی فرائض دو بڑی بڑی سرخیوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں پہلا فرض تو یہ ہے کہ سلطان اپنے تمام محکومین کے لیے اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے سلسلے میں شفقت

---

[1] مشہور سپہ سالار خالد بن ولید کی بازنطینی فوج کے خلاف یرموک کی فیصلہ کن جنگ میں فتح حاصل کرنے (۶۳۶ء) اور خلافت کے لیے شام حاصل کرنے کے بعد انھیں حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ ابوعبیدہ جراح کو ذمہ داری سونپ دیں۔ (Muir کی Caliphate، ص ۱۳۰ اور الفخری ص ۷۲) اسلامی تاریخ کی کئی تصانیف میں حضرت عمرؓ کے ایسی شاندار فتح کے بعد خالد کو برطرف کرنے کے اقدام پر بحث کی گئی ہے۔

مہربانی، فراخ دلی اور حسن سلوک دکھائے. دوسرا یہ سلطنت کے خواص کے تئیں اپنی ذمہ داریاں نبھائے۔ خواص کے دعوے مختلف اقسام کے ہوتے ہیں. مثال کے طور پر سیادت، علم، تقویٰ، امتیاز شہریوں کی نسل سے ہونا اور اس کے علاوہ دوسری خوبیاں جیسے حوصلہ، تجربہ، فنی مہارت اور آداب میں تفوق، سلطان کی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر وصف کے اعتراف میں اسے انعام واکرام سے نوازے جس طرح سلطان اپنے مختلف مراتب کے احاریوں کو ان کی وفاداری کے صلہ میں تحائف و انعامات عطا فرماتا ہے اسی طرح اسے اپنی سلطنت کے خواص میں بھی جو حکومت کی خدمت میں نہیں ہیں ان کے اوصاف کی بنیاد پر مدارج اور مراتب قائم کرنا چاہیے اور ان کے متعینہ دعووں کے مطابق انھیں انعام عطا کرنا چاہیے۔

رسولِ اکرم نے فرمایا ہے: 'ہر سچے طالب کو اس کا حق دو'. ایک سلطان عوام اور خواص یعنی اپنے بیٹوں، بھائیوں، رفیقوں، وفادار افسروں، درباری خدمت گاروں اور سلطنت کے منتخب لوگوں کو واضح مدارج اور مراتب پر رکھ کر ان کے ساتھ پوری دانش مندی سے پیش آتا ہے. اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کی بخششوں اور تحفوں میں اس کے افسران کے وقار اور رتبہ میں کوئی شتر گربگی نہیں ہوگی. اس کے انتظامات افراتفری کا شکار نہیں ہوں گے۔ سچے دعویدار انعام سے محروم نہیں رہیں گے اس کے محکومین کے دلوں میں اس کے لیے محبت بڑھے گی اور سب کے نتیجہ میں اس کا نظم ونسق پائیدار ہو جائے گا.

اردشیر بابکان کا کہنا ہے جس کے اقوال وافعال معاملات حکومت میں ایران کے کسریٰ کے لیے نظیر تھے: تنہا اسی کو ایک عادل سلطان مانا جائے گا. جو عوام کے ساتھ اپنے معاملات میں ان کے مدارج و مراتب کا لحاظ رکھتا ہے تاکہ اس کے تمام محکومین اس کے وفادار خیر خواہ بن جائیں. ایسی صورت میں اگر سلطان پر کوئی آفت پڑتی ہے تو اس کے محکومین اپنے قلوب میں اپنے کو اس کا شریک اور اس کے ساتھ مبتلائے مصیبت محسوس کرتے ہیں. وہ اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب تک سلطان کا دماغ چین سے نہیں بیٹھ جاتا تو اس کے محکومین اپنے دلوں میں چین یا سکون محسوس نہیں کرتے. ایسی خوش نصیبی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سلطان خواص میں عام مدارج و مراتب قائم نہیں کرتا ہے اور ہر خاص آدمی کو اس کے حسب ونسب کے مطابق اس عظمت اور اختیار میں سے ایک حصّہ نہیں دے دیتا ہے جو خدا نے اسے عطا کیا ہے کیوں کہ خدا نے تمام دنیا کو اس کی دہلیز کا محتاج بنا دیا ہے. اور اس کی بارگاہ عوام کی ضروریات کے حصول کے لیے ایک قبلہ ہے.

لیکن جہاں تک ایک زمانہ ساز کی بات ہے، جو کسی اچھائی یا خوبی کو دیکھے بغیر اپنے تئیں صرف

ان کی وفاداری کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو کثیر تعداد میں اپنے گرد جمع کرلیتا ہے، اسے سلطان نہیں غاصب کہنا چاہیے اس طرح کا غاصب اپنے پیروؤں کے ذریعہ ملک پر حکومت کرتا ہے۔ وہ وار کرتا ہے چھینتا ہے ضبط کرتا ہے اور عطا کردیتا ہے اور اس طرح ہر روز وہ اپنے حواریوں کو زیادہ عنایات سے نوازتا ہے، یہ سوچ کر کہ اس کی سلطنت کا دارومدار ان ہی پر ہے وہ ان کے دبدبہ اور وقار کو بڑھاتا ہے اور ان کے حقیقی نقائص اور خوبیوں کا کوئی لحاظ کیے بغیر ان کی خوش حالی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اس طرح کے زمانہ ساز فرماں رواکی آنکھیں قادر مطلق کی طرف سے پھر جاتی ہیں۔ وہ تمام وقت صرف اپنے معاونوں اور حواریوں کے لیے وقف رہتا ہے اور بالآخر معاملات اس حد کو پہنچ جاتے ہیں کہ وہ تمام گرے ہوئے، ذلیل، ہیچ، ناقص اور بے کار آدمیوں کو جن کی اصل بری اور نچلی ہوتی ہے، صرف اس بنا پر اپنی ریاست کے اساطین میں شامل کرلیتا ہے کہ اس نے ان میں حقیقی طاقت اور اثر کے ساتھ ساتھ اپنے لیے سچی وفاداری بھانپ لی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سرزمین سے ہر مفروضہ طبقے سے ایسے ہزارہا غاصب نمودار ہو چکے ہیں اور انھوں نے طرف داروں کی ایک جماعت کی مدد سے تھوڑے عرصہ تک حکومت کی ہے اور اس کے بعد اپنے پیروؤں کے ساتھ جہنم رسید ہو گئے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اس دنیا سے اس طرح اٹھے ہیں کہ لوگوں کی گفتگوؤں یا دلوں میں ان کے نام و نشان باقی نہیں رہے۔ لیکن ان تمام حکمرانوں نے، جن کی آنکھیں قادر مطلق کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ اعلیٰ نسب، تقویٰ، شرافت، دانش مندی، ہنر اور اخلاقیات کی بنیاد پر عام مراتب اور مدارج قائم کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی حکومتوں کے ذرائع اور اپنے اختیارات کی تمام حدود کے استعمال کے ذریعہ سرخوبی کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی کے وقت انھوں نے ہر شخص کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا ہے۔ خدا کے بندوں میں ان کی یاد روز محشر تک باقی رہے گی اور یہ حقیقت اس بات کا کافی ثبوت مہیا کرتی ہے کہ انھیں آخرت میں نجات ملے گی اور بڑا رتبہ حاصل ہوگا۔

اے محمود کے فرزندو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ماضی کے دانش مندوں نے جب دروازہ کے نگراں سے لے کر دربار کے تمام اعلیٰ افسران کے عہدوں کی تخلیق کی تو اس تدبیر کو سامنے رکھا کہ خدمت گار کا درجہ اور رتبہ واضح ہو جائے تاکہ ان کی لیاقت اور ان کی اطاعت کے مطابق تمام عہدیداروں کے مطالبات کو دربار سلطانی مدنظر رکھ سکے (اس کے بعد برنی اپنے پسندیدہ خیال کی طرف پلٹ آتا ہے سلطان کے دربار کے عالی نسب لوگ اس کے لیے عزت و وقار کا باعث ہوں گے لیکن اگر اس نے کم اصلوں پر عنایات کی تو ہر دو عالم میں اس کے لیے باعث ذلت ہوں گے)

اگر سلطان مدارج ومراتب طے کرنے سے متعلق دائمی احکام کے مطابق خوبیوں کو نہیں نوازتا ہے تو اسے عقل، اور مذہب دونوں کی کئی ناپسندیدہ چیزوں کو روا رکھنا پڑے گا

پہلے تو نااہلوں کو اونچا اٹھانے اور ہمیشہ سے اہل لوگوں کو ذلیل کرنے سے حکومت کی پالیسی میں شخصی رجحان داخل ہوگا اور اس طرح یہ دینی و دنیاوی تباہی کا باعث ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اگر کم اصلوں کو عزت دی گئی اور شرفا، اور ورانتا آزاد لوگوں پر ترجیح دی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثر کم اصلوں کو تو حکومت کے عہدے مل جائیں گے اور عالی حسب لوگوں کو ان کی خدمت اور اطاعت کرنا ہوگی اس کے بعد سلطان کے لیے مطلق العنان اور جابر ہونا ضروری ہوجائے گا۔

تیسرے یہ کہ کم اصلوں کو ترقی دے کر اور عالی حسب لوگوں کو گرا کر سلطان خود اپنی کم اصلی کا ثبوت دیتا ہے۔

چوتھے یہ کہ سلطان کے معاونوں اور حواریوں یعنی وزیروں، صوبیداروں، منصفوں، افسروں اور فوج کے سپہ سالاروں کو باوصف ہونا چاہیے اور انھیں کسی ادنیٰ بات میں نہیں پڑنا چاہیے اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ خوبی و وصف کی بنیاد پر مدارج ومراتب قائم نہیں کیے جاتے اور پستی اور نکمے پن کو فاش نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا خواص کے مدارج ومراتب کی اشاعت سلطان کے لیے لازمی ہے (یہاں یہ مفہوم مضمر ہے کہ اگر کوئی مدارج نہیں ہوں گے تو کوئی ترقی یا تنزلی ممکن نہیں ہوگی)

تجربہ کار لوگوں کا کہنا ہے کہ جو خوبیاں کسی شخص کو دربار سلطانی میں عزت و وقار کا مستحق بناتی ہیں وہ دو قسموں کی ہوتی ہیں

پہلے تو 'کامل خوبی' ہے جسے عقل کی کسوٹی پر اور تجربہ کے آئینہ میں پرکھا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ بہت سے ادنیٰ لوگوں کا ظاہرہ قابل تعریف ہوتا ہے 'کامل خوبی' سے مزین اشخاص کے مدارج ومراتب کی اشاعت حکومت کے احکام جاری کرنے میں سلطان کے لیے مفید ہوتی ہے۔ اس طرح خوبیوں کا حامل شخص اپنا انعام پالیتا ہے اور اپنے متعینہ حقوق سے واقف ہوجاتا ہے۔ مزید براں، ان خوبیوں کی نمائش محض ذاتی کوششوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ دوسروں کے پست چال چلن کو اونچا اٹھانے کا ایک آلہ بن جاتی ہے۔ دوسری طرف بدیوں میں پڑے ہوئے لوگوں کی جھوٹی توقعات دور ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا ہر ایک خوبی کے مدارج کی اشاعت (محتاط جانچ کے بعد) بہت زیادہ فائدہ مند ہوتی ہے اور اگر ہم غور کریں تو ہر خوبی کے کم، درمیانی اور اعلےٰ درجے ہوتے ہیں مثلاً نسل میں، نسب میں، علم میں، اچھے

برتاؤ کی حکمت اور افضلیت میں، فنون لطیفہ میں اور ہنر کی گوناگوں اقسام میں، یہ خصوصیات اور اوصاف کامل خوبی، کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی خوبی کے مدارج یعنی کم، درمیانی اور اعلیٰ درجہ کے مطابق خوامما دربار سلطانی میں قدرشناسی کے مستحق ہوتے ہیں۔

خوبی کی دوسری قسم 'سلطان سے نسبت' کی ہے۔ جب خدا کسی ایک کو ملک کا امیر بناتا ہے تو وہ اسے ہر دوسرے فرد سے زیادہ احترام اور وقار عطا کرتا ہے اور زمین پر بسنے والوں کو اس کا تابعدار بناتا ہے۔ سلطان کا اعلیٰ رتبہ اس کے بیٹوں، بھائیوں، عزیزوں، خیرخواہوں، طرف داروں، درباریوں اور غلاموں کے لیے معزز درجے لاتا ہے۔ اس قسم کی خوبی کو مطلق نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کے 'اضافی' ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر عالی حسبی خوبیٔ مطلق تو ہے لیکن سلطان سے نسبت عالی حسبی سے زیادہ بڑی خوبی ہے۔ اس طرح اختیارات کا قانونی جواز اچھے نتائج لاتا ہے اور مذکورہ بالا گروہ ضرورت کے تحت ریاست کے معاملات میں سلطان کے شرکار اور دوست بن جاتے ہیں۔ سلطان سے نسبت ان کے حقوق کی بنیاد بن جاتی ہے اور یہ خوبیاں اضافی ہونے کے باوجود دوسری خوبیوں پر، جو کہ مطلق ہیں برتری حاصل کرلیتی ہیں۔

لیکن بحث کا موضوع تو اب پیش کیا جارہا ہے اگر وہ لوگ جو سلطان سے نسبت کی خوبی رکھتے ہیں۔ ادنیٰ، رذیل اور کم اصل ہیں تو وہ کس طرح ریاست کے عہدوں اور اونچے درجوں کے حق دار ہوسکتے ہیں؟ اس موضوع پر بہت کچھ کہا جاچکا ہے۔ خوبیوں کے حامل تمام یا بیشتر لوگ کم اصل ہوں گے یہ تو استثنائی بات ہے اور مستثنیات کے بارے میں کوئی ضابطہ نہیں ہوسکتا۔ کچھ بڑے لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ 'ریاستی اختیارات پر قبضہ ادنیٰ خوبیوں والوں کو بھی خوبیوں کا مالک بنا دیتا ہے' پھر بھی خوبی کے مدارج و مراتب کی اشاعت سلطان کے لازمی فرائض میں سے ایک ہے اور ایسے تمام امتیازات کی بنیاد نسل کی حقیقت ہے۔

(اس نصیحت کے سلسلہ میں دو مثالیں پیش ہیں (۱) 'تاریخ مآثر صحابہ' کی سند پر برنی وضاحت سے کہتا ہے کہ کس طرح خلیفہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو طبقوں اور درجوں میں منقسم کیا[1] (۲) برنی ہمیں باور

---

[1] خلیفہ حضرت عمرؓ نے تمام مسلم امت کو (جیسا کہ برنی خیال کرتا ہے) ذاتوں یا درجوں میں بانٹ نہیں دیا تھا بلکہ انھوں نے تو صرف مال غنیمت کی خاص طور سے ایرانی شہنشاہوں کی جمع کی ہوئی دولت کی تقسیم کے لیے ایک اصول معین کیا تھا۔ ایک ایرانی صوبہ دار نے خلیفہ کو بتایا کہ ایرانی شہنشاہوں کے تنخواہوں کے (باقی صفحہ پر)

کرانے کے لیے امام ثعلبی کی (تاریخ عباسیہ) سے یہ نقل کرتا ہے کہ خلیفہ مامون نے بھی خلافت کے تمام خدمت گاروں میں اور بغداد کے (نمایاں) باشندوں میں خواص کے مدارج کو معین کر دیا تھا۔

نصیحت ۷

فوج کے بارے میں

سلطان محمود نے کہا: اے محمود کے فرزند! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک بڑی طاقت ور شاندار فوج اور اس کے حسن انتظام کے بغیر کسی قدیم یا جدید حکمراں یا سلطان کے لیے ذیل کے مقاصد میں سے کسی کو بھی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوا ہے۔ بادشاہت کی محافظت، انتظامیہ کا چلانا، عوام کے دلوں میں اپنی فتوحات کی عظمت کا قیام اور جہاں گیری، باغیوں اور عیاروں کو کچلنا اور متمردوں اور سرکشوں کی سرکوبی، حریفوں کے لڑائی جھگڑوں، ہم رتبہ لوگوں کی مخالفت اور طاقت ور کی عداوت کی فرکوبی، پیغمبر اسلام کے دین اور ریاست کے دشمنوں کا خاتمہ کرنا، حکم شریعت کی نافرمانی کرنے والوں کی بیخ کنی اور غلط مذاہب پر سچے دین کے اقبال کا قیام، بہتر فرقوں میں شریعت کے احکام کا نفاذ، تلوار کی ضربوں سے کافروں سے ملک و صوبے فتح کرنا اور فاتحوں، مجاہدوں اور مسلمانوں میں دوسرے مستحق لوگوں کے لیے بے شمار مال غنیمت کا حصول اور ملک کے دشمنوں اور حکومت کے نافرمانوں کے لیے تمام راہوں کا سدّباب۔

کیخسرو نے، جو تمام آباد دنیا کا حکمراں تھا، یہ اصول قائم کیا کہ "بادشاہت فوج سے ہے اور فوج بادشاہت سے، بادشاہت دو ستونوں پر قائم ہے۔ پہلا ستون تو انتظامیہ ہے اور دوسرا فتوحات۔ فوج دونوں ستونوں کا سہارا ہے کیوں کہ اگر کوئی بھی فوج نہیں ہے یا فوج مختصر، پست ہمت اور غیر منظم ہے تو نہ تو اچھا انتظام ہو سکے گا اور نہ ہی فتوحات ممکن ہوں گی۔ اسی وجہ سے اسی کے پیش نظر عظیم بادشاہوں نے کہا ہے کہ ایک

بقیہ حاشیہ: رجسٹر کس طرح تیار کیے جاتے تھے اور اس کی تجویز کو اپنا لیا گیا۔ "اس کے بعد عمر نے طے کیا کہ ایمان میں تقدم اور میدان جنگ اور جہادوں میں رسول اکرم کی مدد کو ملحوظ رکھتے ہوئے تنخواہ مقرر کی جائے گی۔" خلیفہ نے کاتبوں کو ہدایت کی "رسول اکرم کے چچا عباس اور بنی ہاشم سے شروع کرو اور اس کے بعد جو آتے ہوں انھیں ان کے درجوں کے مطابق رکھو اور خطاب کے خاندان کو وہاں رکھو جہاں اللہ نے اسے جگہ دی ہے۔" (الفخری، ص ۸۱-۸۰) (باقی صفحہ پر)

حکمراں کو ہمیشہ فوج کی طرف مخصوص دھیان کرنا چاہیے. کیوں کہ صرف اسی صورت میں فوج کے تمام امور مناسب طور سے انجام دیے جا سکتے ہیں. اگر سلطان فوج کی طرف سے غافل ہوا تو وہ اپنے ہی ہاتھوں سے فوج اور مملکت کو تباہ کر دے گا. اس کے علاوہ اگر سلطان کا دل صرف خزانے بھرنے ہی میں لگا رہتا ہے تو فوجی امور مناسب طریقے سے نہیں سنبھالے جا سکیں گے اور نہ ہی خزانے بھرے جا سکیں گے. حتیٰ کہ جو کچھ سلطان کے پاس ہے وہ بھی جلد ہی ختم ہو جائے گا. لیکن اگر سلطان کی توجہ فوج پر مرکوز ہے تو اسے ڈھنگ سے سنبھالا اور مسلح و آراستہ کیا جا سکتا ہے اور علاوہ ازیں فوج کے بل پر اتنی زیادہ دولت جمع کر سکتے ہیں جو کسی اور خزانہ میں رکھی بھی نہیں جا سکتی سالہا سال سے یہ حقیقت دانش مندوں پر روشن رہی ہے اور تجربہ نے بھی صحیح ثابت کیا ہے.

ایران کے مورخین لکھتے ہیں کہ انھوں نے جمشید سے دریافت کیا. بادشاہت کی بنیاد کیا ہے؟ جمشید نے جواب میں کہا، سپاہیوں کی کثرت اور عدل و مہربانی کی فراوانی. انھوں نے تین بار یہی سوال کیا اور جمشید نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا. اس کے بعد انھوں نے اس سے پوچھا کہ آپ کے پاس عدل اور احسان پر سپاہیوں کی بڑی تعداد کو فوقیت دینے کی کیا معقول وجہ ہے؟ جمشید نے جواب میں کہا: اگر دنیا کو فوج کی

بقیہ حاشیہ: لے کیخسرو- ایرانی روایات کے مطابق شام کے فرماں روا ضحاک نے جس نے آخری پیشدادیاں شہنشاہ جمشید کا خاتمہ کیا تھا. ایران پر ایک ہزار سال تک بہت خراب حکومت کی. اس کے بعد ایران کے ایک لوہار کاوہ نے اس کے خلاف ایک کامیاب بغاوت کی اور اپنے پیشہ کی وردی کو ایک باغیانہ جھنڈے (درفش کاویانی) کی حیثیت سے استعمال کیا لیکن کاوہ نے محسوس کیا کہ انسانوں پر حکومت کرنا اس کے لیے موزوں کام نہیں لہٰذا اس نے پرانے شاہی خاندان کے ایک فرد موسوم فریدوں کو بغاوت کا سردار بنا دیا- فریدوں نے ضحاک کا خاتمہ کیا اور ایران میں دوسرا شاہی خاندان قائم کیا جو کاوہ یعنی لوہار کی نسبت سے کیانی کہلایا. کیخسرو نے (جو کیکاؤس کے بیٹے سیاوش کا بیٹا تھا) اس خاندان کے سب سے زبردست بادشاہ کی حیثیت سے ناموری حاصل کی. اس نے ترکی شہنشاہ افراسیاب کا خاتمہ کر ڈالا. مشہور و معروف رستم اسی کے افسروں سے میں سے ایک تھا. روضۃ الصفا کے مصنف کا کہنا ہے کہ "اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ کیخسرو کی خوبیوں اور نیک کاموں کی تعریف میں جو بھی اسمائے صفت استعمال کیے جائیں وہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں گے."
(دیکھیے روضۃ الصفا، ج اول، ص ۱۹۸-۱۹۶ اور فردوسی کا شاہنامہ، ص ۲۷۹-۲۰۳)

محکومی میں نہیں رکھا جاتا۔ باغیوں کی نافرمانی، فرماں برداری میں نہیں بدلی جاتی اور فوج کی تعداد اور قوت کے ذریعہ نظم و نسق برقرار نہیں رکھا جاتا تو نہ عدل کا نفاذ ممکن ہو سکے گا اور نہ ہی کسی کو شاہی عنایات سے نوازا جا سکے گا۔

سکندر نے ارسطو سے سوال کیا: "فوج کی بڑی تعداد اور مناسب تنظیم، جو بادشاہت کی بنیاد ہے، کن باتوں پر منحصر ہے۔؟"

ارسطو نے جواب میں کہا، "کسی بھی فوج کو چار طریقوں سے بڑھایا اور مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ پہلے تو فوجی امور کو سلطان کی مکمل اور پوری توجہ حاصل ہونا چاہیے۔ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں اسے ان امور کو انجام دینے میں کوتاہی نہیں کرنا چاہیے اور اسے قطعی طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ فوج پر منحصر ہے۔"

دوسرے، فوج کثیر خزانوں کے تصرف سے بڑھائی اور عمدگی سے منظم کی جا سکتی ہے۔ جب تک فیاضی سے پیسہ خرچ نہیں کیا جاتا، فوج بڑی یا منظم نہیں ہو سکی۔

تیسرے افسران کو اپنے سپاہیوں پر مشفق اور مہربان ہونا چاہیے اور ان کے پاس ایسے اوصاف ہونے چاہییں جو دانش مندوں نے تجویز کیے ہیں۔ سلطان تو صرف موقع موقع سے فوج سے ملتا جلتا ہے لیکن افسروں کو دن رات ہی ان کے ساتھ رہنا اور ربط رکھنا ہوتا ہے۔ اگر ان میں قیادت کی خوبیاں کم ہیں تو فوج کو ڈھنگ سے نہیں رکھا جا سکتا۔

فوج کی بڑی تعداد اور طاقت کی چوتھی شرط عارض اصل (مرکزی عارض) کی برتری ہے جسے فوج کے تمام عام اور خاص امور سپرد کیے جاتے ہیں۔ عارض اصل کو عارض ممالک[1] بھی کہا جاتا ہے۔ عارض اصل کو سلطان

---

[1] عارض ممالک۔ دور سلطنت میں عارض ممالک کا خطاب وزیر جنگ کو دیا جاتا تھا۔ وہ ریاست کے چار بڑے وزیروں میں سے ایک ہوتا تھا اور اس کا اہم ترین کام یہ ہوتا تھا کہ کم از کم سال میں ایک بار ہر ایک سپاہی کے بارے میں تحقیق (عرض) کرے، سپاہی کو اسی وقت تنخواہ اور اس کے خریدے ہوئے ساز و سامان کی ادائیگی ہوتی تھی۔ جب وہ اس تحقیق میں اہل ثابت ہو جائے۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر کسی سپاہی کا گھوڑا یا اس کے ہتھیار خود اس کی کسی غلطی سے تلف نہیں ہوئے ہیں تو حکومت ان کی کمی کو پورا کرے گی۔ فوج کے تمام غیر فوجی امور عارض ممالک کے تحت آتے تھے۔ دور سلطنت یا مغلیہ میں سپہ سالار کے ہم رتبہ کوئی افسر نہیں ہوتا تھا۔ عارض اصل، عارض ممالک، یعنی تمام سلطنت کے عارض، ہی سے بنا ہے مغلیہ دور میں عارض کی جگہ بخشی کا عہدہ قائم کیا گیا جو قطعی طور پر ایک غیر فوجی افسر تھا ہر صوبہ کے لیے ایک بخشی ہوتا تھا اور نیز تمام سلطنت کے لیے ایک بخشی ہوتا تھا۔

کا اتنا ہی اعتماد حاصل ہونا چاہیے جتنا کہ وزیر کو اور اسے سلطان کا انتہائی وفادار ہونا چاہیے۔ اعتماد قابلیت دیانت، دلی محبت، سچائی، عالی نسبی، وقار، ایمان کے صحیح ہونے اور ایفائے عہد میں اس کا ثانی نہیں ہونا چاہیے عارض اصل جتنا زیادہ وفادار اور اوصاف سنیہ کا حامل ہوگا اسی مناسبت سے فوج بھی بڑی اور طاقت ور ہوگی اور اس کے قابو میں رہے گی۔ اس کے علاوہ اگر فطری سوجھ بوجھ اور تمام ممکنہ اوصاف سے مزین عارض اصل کا تقرر ہو جاتا ہے تو یہی اوصاف اس کے ماتحت افسروں میں بھی دیکھے جائیں گے۔ ایسا عارض کم اصل فاتر العقلوں، لپنڈوں، کاذبوں اور بدمعاشوں کو فوج کی کمان سپرد نہیں کرے گا۔ وہ صرف ایسے ہی افسروں کو اعلیٰ فوجی کمانیں دے گا جن کا چال چلن اور برتاؤ اچھا ہے اور جو تجربہ کار اور قابل اعتماد ہیں۔ اگر فوج میں نیچے سے اوپر تک اچھے، دانش مند اور مہربان افسر موجود ہیں تو فوجی مہم کتنی ہی زبردست اور مشکل کیوں نہ ہو وہ سلطان کی خواہشات کے مطابق کامیاب ہوگی اور دور رس لوگوں کو اس کی کامیابی کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا۔

ارسطو کا جواب سننے کے بعد سکندر نے اس سے دوبارہ سوال کیا: فوج میں سلطان کی مخصوص توجہ کی کیا حدود ہونا چاہیے؟ ارسطو نے جواب میں کہا "سلطان کی فوجی امور میں ایسی مخصوص توجہ ہونا چاہیے کہ اسے اپنے گھوڑے اور ہتھیار ہر شہسوار کو دینے کی خواہش ہونے لگے تاکہ وہ اس کی فوج میں 'مرتب' کی حیثیت سے داخل ہو سکے۔ اگر وہ فوج میں کوئی نقص دیکھے یا سنے تو اسے چین کی نیند نہ آئے اور اس وقت تک سکون نہ آئے اور کسی دوسری شے کی طرف توجہ نہ ہو پائے جب تک کہ وہ تمام موجودہ ذرائع کی مدد سے وہ نقص دور نہ کرے۔"

اس کے بعد سکندر نے ان خوبیوں کی تشریح چاہی جو سر لشکر کے لیے ضروری ہیں۔ ارسطو نے جواب میں کہا کہ "سر لشکر کے لیے دس خوبیاں ضروری ہیں۔ پہلی خوبی خوف خدا۔ اگر اس میں خوف خدا نہیں تو اس کو دس شہسواروں کی کمان بھی نہ سپرد کی جائے۔ اور اگر وہ اس مدلل بات کو نظر انداز کرتے ہیں اور ایک ایسے افسر کو مقرر کرتے ہیں جسے کوئی خوف خدا نہیں تو وہ خود ہی دیکھ لیں گے کہ وہ کیا گل کھلاتا ہے؟ دوسری سلطان کی وفاداری۔ اگر کوئی شخص سلطان کا وفادار نہیں ہے تو اسے کوئی فوجی عہدہ، جو کہ بادشاہت کا ستون ہے، نہیں دینا چاہیے۔ تیسری ذہنی توازن۔ اگر سر لشکر کے پاس متوازن ذہن نہیں ہے تو اس حقیقت کی بنا پر وہ بددماغ ہو جائے گا کہ بہت سے افراد اس کے احکام کے پابند ہیں یہ اس کے اور اس کے ماتحتوں دونوں کے لیے مضر ثابت ہوگا۔ چوتھی عالی نسبی۔ اگر افسر عالی نسب نہیں ہے تو سپاہی اس سے محفوظ نہیں رہیں گے اور وہ دین یا مملکت کی حمایت میں کوئی مہم نہیں چلا پائے گا۔ پانچویں

نمک حلالی۔ سرلشکر کو اتنا نمک حلال ہونا چاہیے کہ وہ ہر وقت ایک نئی شاخ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ چھٹی جنگی تجربہ۔ اگر سرلشکر کو جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے تو وہ اپنی اور اپنے لوگوں کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ ساتویں خوبی، سرلشکر کو ایک اچھی جماعت (خیل) سے وابستہ ہونا چاہیے اور اسے اس جماعت سے پیرو بھی حاصل کرنا چاہیے ایسی صورت میں وہ اعتماد حاصل کر سکے گا اور سپاہی اس کی عزت بھی کریں گے علاوہ ازیں اس کی جماعت اور اس کے پیرو اس کے اچھے طریق کار کی ضمانت ہوں گے۔ آٹھویں خوبی سرلشکر کو حوصلہ مند، ہوشیار اور امور سے واقف ہونا چاہیے۔ نویں اسے فراخ دل ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے سپاہیوں کو ننگا نہ دیکھ سکے۔ فوج کا دائمی استحکام شکستہ حال لوگوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ دسویں خوبی قول کی سچائی اور ذہن کی پاکیزگی ہے تاکہ سپاہیوں کو اس کے اقوال و اشغال پر بھروسہ ہو اور وہ کسی شخص کی موجودگی یا غیر موجودگی میں اس کی مستورات یا بچوں پر نگاہ نہ ڈالتا ہو۔ اگر کسی سرلشکر کے پاس مندرجہ بالا خوبیاں ہوں گی تو اس کی کمان میں ہر شخص مطمئن اور محفوظ ہوگا۔'

آثار الوزرا کی بنیاد پر برنی ایک مرتبہ پھر یہ کہتا ہے کہ تمام بدنظمیاں اس لیے کھڑی ہوتی ہیں کیوں کہ کم اصلوں کو اعلیٰ عہدے مل جاتے ہیں۔'

عارض کو والدین سے بھی زیادہ مہربان ہونا چاہیے اور اسے اپنے آدمیوں کے جرائم پر نقاب ڈالنا چاہیے۔ اسے اپنے سپاہی کو ٹھیک اس طرح سزا دے کر درست کرنا چاہیے جس طرح کہ ایک مشفق باپ اپنے نافرمان بیٹے کو کرتا ہے۔ اسے زیادہ مظالم نہیں توڑنا چاہیے اور نہ ہی بے حد سخت سزائیں دینا چاہیے۔ اور ہر سزا دیتے وقت اسے مصالحت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔ اسے خلاف ورزیوں میں مناسب اور نامناسب میں تمیز کرنا چاہیے تاکہ وفادار اور بہادر افسروں کو بہت معمولی غلطی پر عزت سے ہاتھ نہ دھونا پڑیں۔ اسے خطاکاروں اور مجرموں کو، جو اپنے جذبات کا شکار ہوئے تھے ان کے مقام سے محروم کرنے، کچھ کوڑے لگوانے اور قید میں رکھنے کے لیے، سہم الحشان (فوجی پولس) کے حوالے کرنے کی سزاؤں پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اسے وقتاً فوقتاً فوج کے جرائم اور نقائص کے بارے میں سلطان کو مطلع کرتے رہنا چاہیے اور عارض کو حتی الامکان یہ کوشش کرنا چاہیے کہ سلطان فوجی عملہ کو سزائے موت اور سخت و بے رحمانہ سزائیں نہ دے۔ اسے سلطان اور فوج کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں بنانا چاہیے۔ اسے سپاہیوں کی بدنصیبیوں کو اپنی ذاتی بدنصیبیاں خیال کرنا چاہیے اور اپنے آدمیوں کے رنج و الم اور مسرتوں میں برابر کا شریک ہونا چاہیے اس پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنے ذہنی سکون آرام اور چین حاصل کرنے کے لیے ان کی مناسب امداد کرے۔ تمام معاملات اور حالات میں عارض کو فوج کے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہیے کہ فوج کا اس پر اعتماد کم نہ ہو، اس کا رعب اور احترام ان کے دلوں پر

منقش ہوجانا چاہیے اور فوجی دستوں کو اس پر اپنے اعتماد کی وجہ سے اپنے کو اس کی جماعت کا پیرو، غلام اور خدمت گار سمجھنا چاہیے۔ مختلف مزاجوں اور طرح بطرح کی خصوصیات کے ہزارہا آدمیوں سے مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق پیش آنے کے لیے کسی بزرجمہر یا کسی آصف کی طرح غیر معمولی طور سے ذہین ہونا ضروری ہے۔ دور ماضی کے حکمراں اپنی فوجوں کو جمع کرنے اور ان کی نگہداشت کرنے میں بے انتہا محتاط ہوتے تھے اور اس معاملہ میں جو کہ ریاست کا اہم ترین کام ہے عقل اور تجربہ کے دیے ہوئے کسی بھی اصول کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ صرف اسی طرح وہ چار سو ہزار یا پانچ سو ہزار منتخب جنگجو جمع کر پاتے جنھیں وہ اسلحہ اور تمام ساز و سامان سے لیس رکھتے تھے۔ اپنی فوج کی قوت پر ہی وہ دنیا فتح کرتے رہے اور ملکوں اور حکمرانوں کو اپنی فرمانروائی میں لے آئے۔ انھوں نے دین و مملکت کی خاطر بڑی بڑی مہمات سر کیں۔ ان کے اچھے کاموں کی وجہ سے ان کے نام روز محشر تک روشن رہیں گے۔ حکمرانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے عظیم سلطانوں کی ہدایات پر چلیں نہ کہ ایسے لوگوں کے مشورہ پر چلیں جنھیں امور حکومت کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں اور جو ڈھنگ سے کسی قصبہ یا گاؤں پر بھی حکومت نہیں کر سکتے۔ ایسے اشخاص کو علم کی تمام شاخوں، مثلاً قانون، ادب، خطابت، قواعد، اور شاعری پر عبور حاصل ہو سکتا ہے لیکن امور حکومت اور فتوحات کے لیے علم کی جن شاخوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کے بارے میں ان کی واقفیت بہت ہی معمولی بلکہ درحقیقت بالکل بے کار ہوتی ہے۔

(تاریخ خلفائے عباسی کی سند پر خلیفہ ہارون الرشید سے مندرجہ ذیل پانچ ضوابط منسوب کیے گئے ہیں)

ضابطہ اول۔ فوج میں سپاہیوں کی بھرتی کی فہرست ہر سال سلطان کے علم میں لانا چاہیے اور تخت سلطانی کے سامنے یہ بات صاف صاف رکھ دینا چاہیے کہ کسے اور کہاں سے بھرتی کیا گیا ہے۔

ضابطہ دوم۔ سلطان کو صحیح طور سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ افراط اور قلت کے سالوں میں سپاہیوں کو ساز و سامان بہم پہنچانے اور ان کے ذہنوں کو ان کے خاندان کی ضروریات کے سلسلے میں بے فکر رکھنے کے لیے کس قدر رقم کی ضرورت ہے۔

ضابطہ سوم۔ سال میں دو بار سپاہیوں کے گھوڑوں اور ہتھیاروں کا معائنہ ضروری ہے۔ سپاہیوں کا معائنہ ایسے اشخاص کو کرنا چاہیے جن کے بارے میں خورد برد کرنے یا دروغ گوئی کرنے کا شبہ نہ کیا جا سکے۔ تاکہ مورچوں کے وقت یا دوران جنگ کوئی شور و غل نہ ہو۔ یہ جائزہ (عرض) ایسے اوقات اور جگہوں پر ہو کہ اسے ایک ہی سلسلے میں ختم کیا جا سکے[1]۔ جائزہ کا حکم سب کے لیے ہونا چاہیے۔

---

[1] ہمارے مستند مصنف اکثر ان سپاہیوں کا ذکر کرتے ہیں جو دو بلی جائزے کے لیے آیا کرتے تھے (باقی صفحہ ۸۰ پر)

ضابطۂ چہارم ۔ نمازیوں اور مجاہدوں کا فنِ شہسواری میں امتحان ہونا چاہیے تاکہ ان میں وہ لوگ شامل نہ ہو جائیں جنھیں فنِ جنگ سے کوئی واسطہ نہیں اور جو کاری گروں کے دوسرے گروہوں یا دوسرے پیشوں سے متعلق ہیں۔

ضابطۂ پنجم۔ فوج کی تعداد اور استحکام بڑھانے کے لیے منتخب، ممتاز، عالی نسب، بہادر اور باوصف افسر ہونا چاہیے۔

محمود کو اپنے غلاموں میں سے ۳۰،۰۰۰ شہسوار جمع کرنے اور منظم کرنے کے لیے بارہ سال تک جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ ان ۳۰،۰۰۰ غلام شہسواروں میں سے ۱۵،۰۰۰ ہندو ہیں اور ۱۵،۰۰۰ چین اور خطا[1] ممالک سے لیے گئے تھے۔ اگر ان کے خاندان کے تمام بزرگوں اور نوجوانوں کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد غالباً ایک لاکھ نفوس تک پہنچے گی۔ ایسے غلاموں کی فوج جمع کرنے سے فائدے بھی ہوئے اور نقصان بھی۔

پہلے تو غلاموں کی بڑی تعداد کی وجہ سے سلطان بہت طاقت ور اور باعظمت نظر آتا ہے۔ اگر کسی سلطان کے پاس فوجی سامان بکثرت ہے اور ہاتھیوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے تو یہ اس کی طاقت اور عظمت کا اعلان ہے۔ اس طرح اس کے دور و نزدیک کے دشمن دہشت زدہ رہتے ہیں۔ غلام سپاہیوں کی ایک بڑی جماعت بھی یہی اثر چھوڑتی ہے۔ سلطان کے کثیر التعداد اور بخوبی لیس غلاموں کی وجہ سے لوگوں کی آنکھوں میں اس کی قدر بڑھ جاتی ہے۔

دوسرے غلام اپنے خصوصی امتیاز کو قائم رکھنے اور سلطان کے ادنیٰ خدمت گاروں پر حوصلہ اور شجاعت میں اپنی برتری قائم کرنے کی غرض سے جنگوں اور قلعوں کے محاصروں میں دوسرے سے پہلے کود پڑتے ہیں، اور جان و دل سے ہر مہم کی کامیابی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ بہتے دریاؤں اور بھڑکتے شعلوں میں اپنے کو گیند کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ اس کے بعد باقی تمام فوج کے لیے بھی تقلید ضروری ہو جاتی ہے۔ غلاموں کی (منتخب دستے کی حیثیت سے) قدر و قیمت صاف ظاہر ہے۔

بقیہ حاشیہ: قلعہ تغلق آباد پر کھڑے ہو کر کوئی دیکھے تو ایک بوسیدہ دیوار سے گھرا ہوا کئی مربع میل طول و عرض میں پھیلا ہوا ایک میدان ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں جائزہ لیا جاتا ہو۔ جائزہ ایک ہی وقت میں ختم کرنا ہوتا تھا تاکہ ایک فوجی کے ہتھیار اور شاید گھوڑے بھی کوئی دوسرا دوبارہ نہ پیش کر سکے۔

[1] ترا خطا پر ایک نوٹ اس نصیحت کے اختتام پر دیا گیا ہے۔

تیسرے ان کی تنظیم پر نظر ڈالنے سے افسروں کا غرور اور تکبر کم ہو جاتا ہے[1]۔ جب غلام بکثرت ہوں تو کوئی فرقہ یا گروہ ان کے خوف سے حکومت پر غلبہ حاصل کرنے کا خیال نہیں کر سکتا۔ انھیں معلوم ہے کہ غلاموں کی ایک رقیبانہ تنظیم ہے اور وہ کسی بھی ایسے شخص کو دوست نہیں بنائیں گے یا اس کی پیروی نہیں کریں گے جو ان کے گروہ سے متعلق نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی کم فائدے کی بات نہیں ہے۔

غلاموں کو جمع کرنے اور انھیں ایک ساتھ رکھنے کے نقصانات حسب ذیل ہیں۔ بیشتر غلام لاپرواہ اور بے شرم ہوتے ہیں۔ خوف خدا اور موروثی اسلام کی خصوصیات، جو کہ مسلمانوں کی رگوں اور نسوں میں بسی ہوئی ہیں، ہندوؤں کے ذہنوں میں پیدا نہیں کی جا سکتیں خواہ انھیں بچپن سے لے کر سن بلوغ تک پہنچنے میں مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہوئے کئی سال گزر چکے ہوں۔ جہاں تک منگولوں کا معاملہ ہے، ان کے ساتھ کچھ سالوں تک ہی عنایات کی جائیں تب بھی ان کے ذہنوں میں تسلط، بغاوت اور وحشیانہ منصوبوں کے علاوہ دوسرے خیالات نہیں داخل ہو سکتے[2]۔ ان غلاموں کے ایک ساتھ بڑی تعداد میں مسکن بنانے کی وجہ سے جو اندیشے پیدا ہوئے ان کے باعث محمود مستقل پریشان رہا۔ ان کا تعلق ایک گروہ سے ہے۔ ان کے ذہن ایک ہیں۔ اور ان کی بغاوت کے خلاف کوئی مستقل ضمانت نہیں ہو سکتی۔ غلاموں کی بغاوت بہت بڑا خطرہ ہے اور یہ باعث تشویش اور خوفناک ہوتا ہے۔ ایک زمانہ ہوا لوگوں نے یہ کہاوت بنائی تھی۔ بسی گھر کی آگ بجھانا مشکل ہے۔

محمود کے فرزندوں اور عالم اسلام کے سلاطین کو فوج کی تنظیم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اصول معلوم ہونا چاہیئے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سو ہی کی کمان سنبھالنے کے لائق ہے اور انتہائی کوششوں اور دوسروں کے تعاون سے صرف ایک سو آدمیوں ہی کو مناسب ڈھنگ سے رکھ سکتا ہے تو اسے ایک ہزار یا دو ہزار آدمی سپرد نہیں کرنا چاہیے۔ وہ حکمراں جو عقل اور تجربہ کو حقارت سے دیکھتے ہیں انھیں

---

[1] فیروز شاہ تغلق نے جیسا کہ بخوبی معلوم ہے، بہت بڑی تعداد میں غلام جمع کیے تھے۔ اس کا مقصد کیا تھا؟ کیا برنی کا اشارہ اس طرف ہے کہ اس جماعت کے قیام کا مقصد حکومت کے خدمت گاروں کے تکبر کو قابو میں رکھنا تھا

[2] برنی کے خیال کے مطابق علاؤالدین نے ایک ہی دن میں تیس ہزار منگولوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کی جائداد ضبط کرنے کی ہدایت جاری کی (تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۳۶) برنی اس ظالمانہ اقدام کی مذمت کرتا ہے کیوں کہ بیشتر لوگ جنھیں قتل کیا گیا ان کا مبینہ سازش میں کوئی ہاتھ نہیں تھا تاریخ فیروز شاہی میں منگولوں کے متعلق ایسی

ان شہسواروں کو جنھیں انھوں نے نالائق افسروں کے سپرد کر رکھا ہے، سنبھالنے کی امید نہیں رکھنا چاہیے. اور نتیجہ کے طور پر پیدا ہونے والی بدنظمی اور عصبیت کو انھیں اپنے ہی کاموں کا پھل سمجھنا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص ایک ہزار یا دو ہزار سپاہیوں کی کمان سنبھالنے کا اہل ہے اور انھیں اچھی طرح سامان سے لیس اور منضبط رکھ سکتا ہے اور اس کی سلطان کے لیے وفاداری ثابت شدہ اور مصدقہ ہے تو اسے ایک سو یا پچاس آدمیوں ہی کی نگرانی نہ دی جائے کیوں کہ اس سے اس کا دل ٹوٹ جائے گا اور فوجی افسروں کی مایوسی کوئی اچھی بات نہیں۔ جب کوئی شخص اپنی خوبی کا صلہ نہیں پاتا اور نااہل لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر دیکھتا ہے تو یہ یقینی ہے کہ اس کی وفاداری کو ٹھیس پہنچے گی اور وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہے گا۔

دوسرا اصول، اگر سلطنت کے لیے پچاس ہزار شہسوار ضروری ہیں تو سلطان کو صرف پچاس ہزار ہی پر اکتفا نہیں کر لینا چاہیے اسے کم از کم اس کے نصف زیادہ مستقل طور پر اور پوری طرح لیس رکھنا چاہیے۔ لہٰذا جس وقت یہ پچاس ہزار سپاہی اپنی جگہوں پر ہوں گے تو سلطان اپنے بھرتی کیے ہوئے زائد آدمیوں کی وجہ سے کسی ناگہانی اور اتفاقی صورت حال میں اپنے کو لاچار محسوس نہیں کرے گا۔ ناتجربہ کار اور غیر قابل اعتماد شہسوار صرف بے کار ہی نہیں بلکہ مشکل کے وقت خطرناک بھی ثابت ہوتے ہیں اور ایسے وقت میں انھیں شامل نہیں کرنا چاہیے۔

(سلطان کو ہر اس شخص کو اپنا دشمن سمجھنا چاہیے جو اسے فوج میں یا فوج پر تصرف میں کمی کی تجویز دے خواہ وہ اس کا بھائی یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔)

تمہیں سال میں دو مرتبہ ذاتی طور پر دیوان حشم (وزارت جنگ) کے کام کا معائنہ کرنا چاہیے موجودہ سپاہیوں کی اصل تعداد دریافت کرو اور اگر ایسے مواقع پر فہرست میں مندرج سپاہیوں سے زیادہ اشخاص تمہارے معائنہ میں نہیں آتے ہیں تو تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ فوجی امور کا مناسب ڈھنگ سے انتظام نہیں ہو رہا ہے جو چیز ایک جگہ سے مفقود ہو جاتی ہے وہ دوسری جگہ سر اٹھاتی ہے اور پہلے زیادہ[1]۔

بقیہ حاشیہ: کسی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔

[1] ظاہر ہے کہ جن سپاہیوں کو سلطان بھرتی نہیں کرے گا۔ انھیں باغی بھرتی کریں گے۔ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ برنی کے زمانہ میں اتنے زیادہ سپاہی تھے کہ سلطان ان سب کو روزگار نہیں دے سکتا تھا۔ اس زمانے کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ ایسے باغی جن کی کامیابی کی ذرہ برابر بھی توقع نہیں ہوتی تھی وہ بڑی سہولت (باقی صفحہ پر)

اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ دنیا مستحکم نہیں رہ پاتی۔ لہٰذا تمہیں اپنی فوج کی تنظیم بہت مضبوط کرنا چاہیے۔ یہ حکم جاری کرو کہ وہ اپنے کو فوج کے لیے آدمی بھرتی کرنے میں مصروف رکھیں۔ آدمی کم بھی بھرتی ہوں تب بھی افسران عرض کو اس معاملہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے اور بھرتی کے لیے دروازہ بند نہیں کر دینا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر کسی طرح تمہاری مملکت کے بھرتی کرنے والے عہدیداروں، فوجی افسروں اور صوبہ داروں پر یہ بات صاف ہو جائے کہ تم خاص طور سے اپنی فوج بڑھانے کے خواہاں نہیں ہو یا تمہاری کفایت کی خواہش ایسا کرنے سے روکتی ہے تو تمہاری فوج میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اور یہاں تک کہ جو فوج تمہارے پاس ہے وہ بھی مستحکم نہیں رہے گی اور دن بہ دن گھٹتی جائے گی۔

تیسرا اصول، فوج کو کبھی خالی ہاتھ نہ چھوڑا جائے۔ اسے مال گزاری جمع کرنے، سرحدوں کا تحفظ کرنے جنگل کاٹنے، قلعے بنانے اور شکار کھیلنے میں مصروف رکھنا چاہیے۔ یہ ان افسروں کی وجہ سے خاص طور سے ضروری ہے جو قیادت کے لیے بہت آرزومند ہیں یا جن سے شورشوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر سلطان اپنے امور سلطنت کی طرف سے مطمئن ہے اور اس کی سیاسی حالت قابل اطمینان ہے تو اسے دوسری مہمات پر فتوحات کو سبقت دینا چاہیے اور اپنے بہادر اور معتبر افسروں کے ساتھ معرکوں اور جہادوں کے لیے کوچ کرنا چاہیے۔ کوئی بھی ماہر فن یا پیشہ ور جب تک اپنے فن کی مستقل طور پر مشق نہیں کرتا تو وہ اس میں اپنا ملکہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح اگر فوج کو اس کے کام میں مصروف نہیں رکھا جاتا تو اس کے دل میں دوسری خواہشات انگڑائیاں لینے لگیں گی اور اس کے دماغ پر دوسری امنگوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

فوج کے لیے آرام کے بھی اپنے فوائد ہیں۔ لیکن اس کی حدود معین ہیں۔ فوج کو اتنا زیادہ آرام نہیں دینا چاہیے کہ یہ شورشوں کے لیے آمادہ ہو جائے یا اس کے ذہن میں بے سر پیر کی امنگیں گھر کر جائیں۔

اس نصیحت کے سلسلہ میں مزوک اباحتی[1] کی مثال دی گئی ہے جس نے ایرانی شہنشاہ اور مشہور نوشیرواں کے باپ قباد پر اثر قائم کر لیا تھا۔ برنی کہتا ہے کہ اس کا تذکرہ تاریخ اکاسرہ پر مبنی ہے یہ فردوسی کے شاہنامہ میں دیے گئے تذکرہ سے ہر لحاظ سے مختلف ہے۔ بہر حال یہ برنی کے تصورات

بقیہ حاشیہ: سے اپنی تقدیروں کی اطاعت کے لیے سپاہی بھرتی کر لیتے تھے۔

[1] مزوک کے لیے اس نصیحت کے اختتام پر ایک نوٹ دیکھیے۔

یعنی عورتوں اور مال و اسباب کی مشترکہ ملکیت کی وضاحت کر دیتا ہے جس کا اس نے اکثر حوالہ دیا ہے۔ مزوک نے قباد کو اپنے زیر اثر لانے کے بعد اسے فوج میں ہر سال ایک تہائی کی کمی کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ پہلے دو سالوں کی کمی کے بعد فوج تقریباً بالکل ختم ہوگئی۔ چناں چہ قباد لاچار تھا اور اب مزوک اپنے مسلک کی تعلیم دے سکتا تھا۔" اس کے بعد حرامی مزوک نے اباحت کے مسلک کا افشار کیا اور عوام کو اپنے باطل مذہب کی دعوت دی۔ اس نے بازاروں اور عوام میں ایک عام اعلانیہ جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ "آدم کے بیٹوں میں حقوق ملکیت، زر نقد، عورتوں، بچوں، غلاموں اور باندیوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ تمام نوع انسان کی مشترکہ میراث ہیں۔ بھائی بہن ایک دوسرے کے لیے ممنوع نہیں ہیں۔ آدم کے زمانہ میں بھائی اپنی بہنوں سے شادی کرتے تھے۔ اب وہی نظام ہے جو آغاز دنیا کے وقت تھا۔" لیکن مزوک کی طاقت کچھ ہی دن کی تھی۔ دل شکستہ قباد مر گیا۔ اور نوشیرواں نے تخت نشین ہونے کے بعد مزوک اور اس کے پیرووں کو کچل کر رکھ دیا۔

قراخطائیوں اور مزوک اباحتی پر نوٹس

(۳) قراخطائین۔ برنی بار بار قراخطائیوں (یا خطائیوں) کو محمود کا ہمعصر دکھانے کی غلطی کرتا ہے۔ حالاں کہ طبقات ناصری کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہوسکتی تھی کہ قراخطائی محمود کے دور کے بعد ایک صدی سے زیادہ مسلمان سلاطین کی نگاہوں میں نہیں آئے تھے۔ بیشتر مسلم مورخین قراخطائیوں کی ابتدا کے بارے میں خلط مبحث کر دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر برٹشنیڈر (Dr. Bretshnieder) نے چینی دستاویزات کی بنیاد پر اس بات کو صاف کر دیا ہے۔ "دسویں صدی کی ابتدا میں خطائین کے سردار موسوم یی بی اپاؤکی (Ye be Apaoki) نے تمام خطائین قبیلوں کو زیر کر کے اپنے کو منگولیا کے زیادہ تر حصہ کا مالک بنا لیا اور ۱۹۱۶ء میں تے تسو (Tai tsu) کے چینی لقب کے ساتھ اپنی بادشاہت کا اعلان کیا (۹۱۶-۹۲۷) فاتح تے تسو کے بیٹے نے شمالی چین کے ایک حصہ کو فتح کیا اور اپنے شاہی خاندان کو لیاؤ (Liao) کا خطاب دیا۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلم مصنفین نے اور یورپی سیاحوں نے چین یا شمالی چین کے لیے جس خطائی نام کا استعمال کیا ہے اس کا اختراع خطائین لفظ سے کیا گیا ہے۔ لیاؤ خاندان کے خاتمہ سے کچھ سال قبل شاہی خاندان کا ایک شہزادہ بچ کر مغرب کی طرف نکل گیا اس نے ایک فوج جمع کی اور مشرقی اور مغربی ترکستان کو فتح کر لیا اور خوارزم اسے خراج دینے لگا مغربی ایشیا

میں اس کی سلطنت قراخطائی کہلائی جانے لگی اور تقریباً ایک صدی تک قائم رہی۔ اس کے حکمرانوں نے اسلامی ممالک میں بڑا بحران پیدا کیا۔ چنگیز خاں نے اسے نیست و نابود کر دیا۔"

Medieval Reseaches from Eastern Asiatic Sources، ص ۲۰۹-۲۰۸)

طبقات ناصری میں (ص ۳۲۷) خطائی خاندان کے فرمانرواؤں کی فہرست دی گئی ہے جس میں ایک حکمراں ملکہ کا نام بھی شامل ہے لیکن اصل چینی نام غلط نقل الفاظ اور نقل نویسوں کی غلطیوں کی وجہ سے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ قراخطائی سلطنت سلطان محمود کے دور بادشاہت کے ایک صدی سے بھی زیادہ بعد میں قائم ہوئی اور محمود کے عصر کے کسی بھی مصنف نے قراخطائین کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ فتاوائے جہانداری کی تصنیف سے سوا سو سال پہلے ان کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔

سلطان محمود کے دربار میں چینی غلام نہیں تھے۔ ہندو سپاہیوں کا ایک دستہ تو تھا لیکن وہ غلام نہیں تھے۔ (ح)

۸۔ مزدک۔ برنی کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ مزدک کو نوشیرواں نے ختم کیا تھا۔ تمام مصنف اس پر متفق ہیں کہ ساسانی شہنشاہ قباد (۵۳۱-۴۸۸ء) کو معزول و مقید کیا گیا اور اس کے بھائی کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن وہ اپنی رہائی اور تخت دونوں حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور اس نے اپنے دوسرے دور میں مزدک کا خاتمہ کر دیا۔ برنی کا خیال ہے کہ قباد بالکل صفر نہیں تھا کیوں کہ اس نے مغرب میں رومیوں سے اور مشرق میں سفید ہنوں سے جنگ کے دوران شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ "اس کی موت کے وقت آخری معرکہ میں ناکامیابی کے باوجود ایران کا اقبال اور اقتدار کافی بلند تھا اور اس نے سفید ہنوں اور رومیوں سے جنگ کی مہارت رکھنے والی ایک ایسی فوج اپنے پیچھے چھوڑی جو جنگ آزمودہ مشاق سپاہیوں کی ایک شاندار جماعت تھی۔" (سائکس، پرشیا، ج اول، ص ۴۴۸-۴۴۱)

مشرقی عالم اسلام کے متعصب اور پختہ عقیدہ لوگوں کے خیال میں مزدک مثالی اشتراکیت پسند (اباحتی) تھا اور اس کی بدکرداری اور بد دینی کی روایت نے وقت کے ساتھ نشو و نما پائی۔ اس جگہ 'مزدک روایت' کی صرف تین منزلوں پر تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔

فردوسی (۱۰۳۲-۹۳۲ء) کا شاہنامہ مزدک کو شخصیت، کردار اور اہلیت کی ایک عمدہ سند دیتا ہے۔ فردوسی نے مزدک یا اس کے پیروؤں سے کوئی بدکاریاں، جادو یا فریب منسوب نہیں کیے ہیں۔ ہدف 'زرتشتی مذہب کی اصلاح'، کا دعویٰ ان سے منسوب کیا ہے جو ان کے خیال کے مطابق تنزل کی طرف جا چکا تھا۔ پہلے ایک قحط کے دوران مزدک نے قباد کی اجازت سے بھوکے غرباء کو

یہ ہدایت کی کہ وہ دولت مندوں کی کٹھیوں اور ریاست کے اناج کے گوداموں تک اپنی بھوک مٹائیں۔ دوسرے اس نے مندرجہ ذیل بنیادی باتیں پیش کیں۔ "پانچ چیزیں ایسی ہیں جو دانش مندوں تک کو صحیح راستہ سے ہٹا دیتی ہیں یعنی حاجت مندی (نیاز)، حسد (رشک)، نفرت (خشم)، بابرا (انتقام) لیکن جنسی ہوس (آز) اگر تم اپنے کو ان پانچ شیطانی ہوسوں سے آزاد کر سکتے ہو تو یہ ورزگار کا راستہ تمہارے لیے صاف ہو گا۔ ان پانچ بدیوں کا سبب بلا شرکت غیرے بیویاں اور نجی جائدادیں ہیں جنھوں نے دنیا میں سچے مذہب، کو تباہ کر دیا ہے۔ اگر بلا شرکت غیر بیویاں اور نجی جائدادیں آدمیوں کے درمیان حائل نہ ہوں تو سچے مسلک کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا سماج میں آدمیوں کے درمیان حائل ان دو رکاوٹوں کو ہٹا دینا چاہیئے تاکہ آدمیوں کی بدہوسیاں مفقود ہو جائیں" افلاطون نے بھی اپنی 'ریپبلک' میں تقریباً یہی بات کہی ہے اور ممکن ہے مزدک نے عظیم ترین یونانی مفکر سے یہ بنیادی خیال لیا ہو۔ لیکن عملی اصول کی حیثیت سے ایک ایسا طریقِ عمل زمینداروں اور ایرانی مذہبی پیشواؤں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ رجعت پسند ولی عہد نوشیرواں نے نمایاں پیشواؤں کو ایک ساتھ جمع کیا اور مزدک کو ایک بڑے مناظرہ میں شکست ہوئی کیوں کہ وہ ایسے دو سوالوں کے جواب نہیں دے سکا جن کا کوئی بھی وہ شخص جواب نہیں دے سکتا جو، بورژوائی سوسائٹی کے اصولوں کو بجا اور صحیح سمجھتا ہو۔ پہلا سوال تھا کہ اگر کوئی نجی جائداد نہ ہو تو سماج کے اعلیٰ ترین طبقوں کو کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے؟ دوسرا، اگر عورتیں بھی مشترکہ ہوں تو باپوں سے پیدا بیٹیوں کی نسل کی کس طرح نشاندہی ہوگی؟ قباد کو رجعت پسند پیشواؤں نے اپنی طرف کر لیا اور اس نے مزدک اور اس کے پیرووں کو سزا کے لیے نوشیرواں کے حوالہ کر دیا۔ فردوسی نے مزدک کے تقریباً ایک لاکھ پیرو بتائے ہیں۔ ان میں سے تقریباً تین ہزار کو سخت ترین سزاؤں کے لیے علیحدہ رکھا گیا۔ انھیں 'باغ مزدک' میں سر کے بل اس طرح گاڑ دیا گیا کہ ان کی ٹانگیں چھوٹے پودوں کی طرح زمین کی سطح سے نکلی رہیں۔ مزدک کو بلا کر دکھایا گیا کہ اس کے پیرووں کا کیا حشر ہوا ہے۔ اس کے بعد اسے ایک اونچی دار پر سر کے بل لٹکا کر تیروں سے ختم کر دیا گیا۔ فردوسی آخر میں کہتا ہے "اگر تمہارے پاس عقل ہے تو تم مزدک کے راستہ پر نہیں چلوگے" مزدک نے مستقل حقوق کو للکارا اور ناکام رہا لیکن فردوسی اس کی شخصیت پر سیاہی نہیں پھیرتا ہے۔

ملک شاہ سلجوقی کے مشہور وزیر نظام الملک طوسی (۱۰۱۸-۱۰۹۲ء) نے اپنی شہرت یافتہ تصنیف 'سیاست نامہ' میں ان غلط بیانیوں کو جمع کیا ہے جو ایک صدی کے دوران پھیل گئی تھیں اور ان میں کچھ اپنے خیالات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ نظام الملک اسماعیلیوں اور قرمطیوں کا سخت ترین

دشمن تھا۔ اس نے اعلان کیا۔ وہ قبل اسلام کے ایک فرقہ یعنی 'فرقہ مزدک' میں سے تھے جو اسلام میں بھی داخل ہو گئے۔ عظیم وزیر کو تاریخی اسناد کا ذرا بھی لحاظ نہیں تھا اور اس نے بلا جھجک مزدک کی سیرت کو سیاہ کرنے اور اس کی تعلیمات کو غلط بیانی سے پیش کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس طرح اب مزدک افلاطونی نہیں رہا اور ہمارے سامنے اس کی تصویر ایک نجومی، فریبی اور عیار کی پیش کی گئی۔ ان تمام کہانیوں پر جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور جنھیں مزدک کے لیے گڑھا گیا ہے تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے لیکن جہاں تک مزدک کی تعلیمات کا سوال ہے نظام الملک لکھتا ہے: "مزدک نے اعلان کیا کہ 'جائداد تمام آدمیوں کے لیے ایک مشترک عطیہ ہے کیوں کہ وہ خدا کی مخلوق اور بنی آدم ہیں وہ تنگی میں کیوں رہیں؟ انھیں ایک دوسرے کی جائداد میں شرکت کرنے دو تاکہ وہ سب مساوی ہو جائیں اور کوئی بھی مفلس یا محتاج نہ رہے'... اس کے بعد اس نے کہا کہ 'تمہاری عورتیں تمہاری جائداد کی طرح ہیں۔ تمہیں اپنی عورتوں کو دوسرے سے بھی متعلق سمجھنا چاہیے تاکہ تمام نوع انسان کے لیے خواہشات کی تکمیل کے دروازے کھلے رہیں اور ہر شخص اپنی جنسی ہوس اور لذت کی پیاس کو بجھا سکے۔ مزدک کی عورتوں اور بچوں کی اس اشتراکیت کی وجہ سے آدمی اور خاص طور سے عام لوگ اس کی طرف کھنچے۔ مزدک نے اس طرح کی رسوم قائم کیں جیسی کہ ذیل میں دی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص بیس مہمانوں کو اپنے گھر دعوت دیتا ہے تو وہ انھیں روٹی، گوشت، شراب، پھل اور موسیقی پیش کرے۔ آخر میں ہر ایک مہمان اس کی بیوی کے ساتھ مباشرت کرے اور ان میں سے کوئی بھی اسے غلط نہیں سمجھے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی کسی عورت کے پاس جاتا ہے تو وہ اس کے دروازہ پر اپنی ٹوپی چھوڑ جائے اور کوئی دوسرا آدمی اندر جانا چاہے تو وہ ٹوپی کو دیکھے اور اس وقت تک انتظار کرے جب تک کہ پہلا آدمی واپس نہیں آ جاتا ہے" (شیفر Schefer، ص ۱۹۹۔ ۱۶۸)

اب دیکھیے کہ سیاست نامہ کا مزدک فردوسی کے مزدک کی بالکل الٹ ہے۔ فردوسی کا مزدک ایک نیا اور سچا مذہبی سماج قائم کرنا چاہتا ہے جن میں ان پانچ بدہوسیوں کو عورتوں اور جائداد کی اشتراکیت سے دور کر دیا جائے گا جو آدمی کے ذہن کو پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ نیز اس کی دلیل افلاطون کی طرح بنیادی طور پر منطقی ہے۔ یہ روایت کے خلاف عقل کو متاثر کرتی ہے۔ ہمارے دور میں جس میں افلاطون کی ریپبلک اتنی زیادہ مشہور ہے، اس حقیقت پر زور دینا ضروری نہیں ہے کہ عورتوں کی اشتراکیت، خواہ وہ عملی یا نہ ہو اس سے نرمی نہیں بلکہ جنسی تعلقات کی زیادہ سخت پابندی مراد ہوگی۔ اس کے برعکس سیاست نامہ مزدک پر ان ہوسوں کی فوری تسکین کی تعلیم کا الزام لگاتا ہے۔

جن پہ خود مزدک نے موجودہ غیر اصلاحی سماجی نظام میں لعن طعن کیا تھا

میرخوند (انتقال ۹۰۳ھ/۱۴۹۸ء) اپنی روضۃ الصفا میں مزدک کے دروازہ پر اور زیادہ جرائم رکھتا ہے اور اس کے مذہبی عقاید کو بھی سیاہ کرتا ہے۔ "اس فاسق کا مسلک اس طرح تھا۔ تمام جائداد اور عورتیں مشترک ہوں گی اور وہ تمام محرم عورتوں کے ساتھ مباشرت کو، جن سے مذہب اور روایت نے شادی کی ممانعت کی ہے، ایک نیک کام تصور کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آدمی نباتات، انڈے، دودھ، پنیر اور ایسی ہی چیزیں کھاکر اکتفا کریں اور جانور مارنے اور جانور کا گوشت و چربی کھانے کی ممانعت کردی۔ مزدک نے گرم کپڑے پہنے اور مذہبی ریاضات میں لگ گیا۔ اس وجہ سے مفلس، بدمعاش اور اوباش اس کے پیرؤوں میں شامل ہوگئے۔ اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔۔۔ کم اصل لوگوں نے اس کی مدد و حمایت سے دولت مندوں کی۔۔۔ عورتوں کو پکڑا اور کافی مال و اسباب لوٹا اس دور کے بچوں کی ولدیت نہیں معلوم کی جاسکتی تھی اور کسی بھی شخص کو یہ یقین نہیں تھا کہ اس جائداد اور مال و اسباب مستقل اس کے قبضہ میں رہیں گے۔" (ص ۲۵۸)

پروفیسر برنارڈ لوئس کا خیال ہے کہ "یہ تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مزدک نے جائداد کی اشتراکیت کا آغاز کیا لیکن اس میں شک ہے کہ اس نے عورتوں کی اشتراکیت کی تمہید کی"۔ سیاست نامہ کے مطابق مزدک اور اسماعیلیوں کے درمیان رابطے کی کڑی مزدک کی بیوہ خرمہ سے ملتی ہے جس نے 'خرم دینیہ' فرقہ کی بنیاد ڈالی جس سے ابومسلم اور سندباد آتش پرست وابستہ تھے، شیعہ مذہب سے جس کی خالص مصلحتانہ وجوہات تھیں۔ اس تحریک کا تقابل اس ضرب المثل سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'مزدک شیعہ ہے'۔ (The Origin of Islamism، ص ۹۷-۹۶)

اصل مزدک یعنی شاہ نامہ کے مزدک نے قحط سے خلاصی کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف جائداد کی تقسیم کی تدبیر تجویز کی تھی اور وہ بھی حقیقتاً قلت کے زمانہ میں صرف ذخیرہ میں بند اناج کی تقسیم تک محدود تھی۔ اس نے سماجی اصلاح کے اصول کی حیثیت سے، عورتوں اور جائداد کی اشتراکیت کا سوال بھی اٹھایا، لیکن عیاری، فریب اور بلکہ عملی نفاذ کا کوئی سوال نہیں تھا۔ عربوں نے جتنی آسانی سے ساسانی سلطنت کو ڈھیر کردیا اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے ایرانی امراء اخلاقی حیثیت سے کتنا گر چکے تھے۔ مزدک نے داخلی انقلاب کے ذریعہ جن مقاصد کو حاصل کی کوشش کی انہیں درحقیقت ایک خارجی فتح نے حاصل کیا یہ مقاصد حسب ذیل تھے جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے طبقوں کے استحصال کو، جو برداشت کے باہر ہوگیا تھا، محدود کرنا، عورتوں کو اس حد تک آزاد کرانا کہ

انھیں کم از کم کچھ انسانی حقوق تو مل جائیں جیسے حق وراثت، جائداد کو ملکیت میں رکھنے اور اپنی شادیوں میں کچھ آواز رکھنے کا حق۔

نظام الملک ایک عظیم وزیر تو تھا۔ لیکن اس کے پاس تاریخی تحقیقات کے لیے کوئی وقت نہیں تھا اور سیاست نامہ تاریخی غلطیوں سے پر ہے۔ وہ کٹر سنی تھا اور اس رائج الوقت عام تعصب کا کامل ترجمان تھا جس کے ذریعہ وہ زندہ رہا اور جس کے لیے وہ مر گیا ہم اس کا یہ خیال تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ اس کے عصر کے کٹر سنی اپنے دور کے اسماعیلیوں اور ساتھ ہی ساسانی مزدکیوں کو واقعی 'اباحتی اخوتین' مانتے تھے۔ لیکن دونوں صورتوں میں الزام بالکل بے بنیاد اور غیر مستند ہے۔ (ح)

نصیحت ۸

۱ برید کے بارے میں

(یہ نصیحت سونے اور چاندی پر ایک پیراگراف سے شروع ہوتی ہے۔ "بہت سے لوگ اپنی زندگیوں سے زیادہ سونے و چاندی کی طرف راغب پیدا کیے گئے ہیں۔" اس کے بعد سماجی نظام کے تمام نقائص فلسفیوں کی چوکھٹ پر رکھے ہوئے ہیں۔ "اس سرزمین پر جو بدنظمیاں اور گناہ نمودار ہوتے ہیں ان کی وجہ وہ لوگ ہیں جن کا اس پر عقیدہ نہیں ہے کہ اللہ کو تمام عالم اور اس کی باریکیوں کا علم ہے یا پھر جنھیں اس کے علم کے بارے میں شبہات ہیں اور اس پر قطعی یقین نہیں ہے کہ وہ علیم اور بصیر ہے۔" یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے نصیحت قلم بند کرنے سے پہلے اس کے موضوع کے بارے میں کچھ طے نہیں کیا تھا۔ یہ بھی دیکھنے میں آئے گا کہ جاںداری میں محاصل یا عام مالیات کے بارے میں کوئی نصیحت شامل نہیں غالباً برنی کا پہلے ارادہ تھا کہ یہ نصیحت محاصل کے لیے وقف کی جائے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کے دوران اس نے منصوبہ بدل دیا۔ برید کے تقررات کے معاملات کو برنی نے بہت طول دیا ہے اور بے حد دہرایا اکھرایا ہے لہٰذا کچھ پیراگرافوں کا خلاصہ کرنے اور دوسروں کو خارج کرنے میں میں اپنے کو حق بجانب سمجھتی ہوں۔ برنی کا ایک پسندیدہ موضوع یہ ہے کہ جس طرح کے آدمی ہیں ان کی حکومت کو اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں رکھا جاسکتا۔ اس موضوع کے سلسلہ میں تمثیل کے حصہ کی شکل میں بحث کی گئی ہے گو کہ اس کا نصیحت سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا میں نے اس نصیحت کو دو غیر متعلقہ حصوں میں تقسیم کرنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھا ہے)

جب خدا کسی شخص کو منصب سلطانی سے سرفراز کرتا ہے اور عوام کے معاملات کو اس کی قوت فیصلہ اور

عقلِ سلیم کو تفویض کرتا ہے تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ عوام کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ اس کا یہ رویّہ مذہب و مملکت کی بہتری اور عوام کی فلاح کا باعث بن سکے۔ لیکن یہ اس صورت میں ممکن نہیں ہوگا جب کہ سلطان آدمیوں کے نیک اور بداعمال سے لاعلم ہے۔ خاص طور سے اگر سلطان کی قربت میں رہنے والے اور ساتھ ہی ساتھ فوج کے سپہ سالار، افسر، منصف، صوبہ دار، درباری، مال گزاری وصول کرنے والے اور محاسب یہ شناخت کرلیں کہ سلطان ان کے نیک و بداعمال سے ناواقف ہے تو وہ عوام کے ساتھ اپنے معاملات میں سلطان کی طرف سے دہشت زدہ یا خائف نہیں رہیں گے۔ مزید یہ کہ اگر سلطان اپنے عوام کی حالت سے ناواقف ہے تو وہ ان کی خوش حالی کے لیے تدبیریں نہیں کر پائے گا۔ آخری بات یہ کہ کل جب روزِ محشر میں، جس پر ہمارا عقیدہ ہے اور جس پر ہم ایمان لاتے ہیں، وہ سلطان سے اس کے محکومین میں سے ہر ایک کی حالت کے بارے میں سوال کریں گے تب اگر وہ کچھ بھی نہیں جانتا ہے تو جواب کس طرح دے پائے گا؟ اور بالفرض سلطان یہ کہتا ہے کہ میں واقف نہیں ہوں اور میں واقف نہیں ہو سکتا تھا، تو یہ جواب نہیں سنا جائے گا کسی سلطان کو اتنے ہی زیادہ علاقہ پر حکومت کرنا چاہیے جس کے امور سے وہ واقف رہ سکتا ہے۔

لہٰذا یہ سلاطین کا فرض اور ذمہ داری ہے کہ وہ بریدٗ[1] مقرر کریں

(اس کے بعد برنی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ قرآن کی تاکید 'ولا تجسسو[2] اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا) کا اطلاق سلاطین پر نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے محکومین کے تمام نیک اور بداعمال کے لیے خدا کے آگے جواب دہ ہیں۔ اپنے محکومین کے سلسلے میں خدا کے سامنے ان کی وہی حیثیت ہوگی جو کہ ایک خاندان کے سربراہ کی اپنے خاندانی اراکین کے سلسلے میں ہوگی۔)

---

[1] برید۔ ہٹی کے مطابق یہ لفظ لاطینی لفظ Veredus 'یا ایرانی' بردان، یعنی تیز رفتار گھوڑے سے نہیں لیا گیا ہے بلکہ عربی 'بردھان' یعنی بوجھ سے لدے گھوڑے سے لیا گیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ معاویہ پہلا حکمراں تھا جس نے دور دراز تک پھیلی ہوئی خلافت کی خبر رسانی کے لیے دیوانِ برید قائم کیا۔ لیکن برنی کے زمانہ میں برید سے مراد خبر رسانی کا نگراں افسر نہیں تھا بلکہ افسر مراد تھا جو رازدارانہ معلومات جمع کر کے انھیں سلطان کے پاس بھیجتا تھا۔ جاسوسوں کے برخلاف برید اعلانیہ مقرر کیا جاتا تھا اور جس کے اختیارات اور دائرۂ عمل سے ہر شخص واقف تھا۔

[2] پارہ ۲۶، سورہ ۴۹، آیت ۱۲۔ پوری آیت اس طرح ہے "اے ایمان والو بچتے رہو بہت تہمتیں کرنے سے مقرر یعنی تہمت گناہ ہے اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور بد نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بھلا خوش (باقی صفحہ پر)

اور اب جب کہ اس مقدس یعنی رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے دور کے بعد اتنی پشتیں اور عرصہ گزر چکا ہے، اور بے ایمانی، گناہ گاری، ناپرہیزگاری، فریب، دغابازی، سفاکی، ناانصافی، بدظنی اور حسد اکثر ذہنوں میں سرایت کر گیے ہیں، نئی چیزیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں اور مذہب و مملکت میں مروج ہو گئی ہیں اور رسول اکرمؐ کی سنت کی جگہ بدعتوں نے لے لی ہے جن کے ذکر سے کتب خانے بھر جائیں گے تو ایسی صورت حال میں فرمانروائے سلطنت دیانت دار برید مقرر کیے بغیر اپنے فرائض کو ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو دنیا کا کام بدنظمی کا شکار ہو جائے گا اور ہر طرف فساد برپا ہو جائے گا۔

اس سرزمین پر کسی حکمراں کا عہدہ ایک بلند اقبال منصب ہے، لہٰذا اس کے بیٹے، بھائی، قریبی اعزاء اور مصاحبوں پر اپنی اپنی حیثیت کا نشہ چڑھ سکتا ہے۔ لیکن اگر انھیں سلطان کی ثابت قدمی کا یقین ہو اور یقینی طور پر معلوم ہو کہ ان کے نیک اور بد اعمال کی اطلاع اس کے کانوں تک پہنچنے والی ہے تو وہ چوکنے اور محتاط رہیں گے۔ اس میں صرف ان ہی کا بھلا نہیں ہوگا بلکہ سلطان کو بھی اپنے ہی خاندان کے لوگوں کو ان کے برے کاموں کے لیے سزائیں دینا پڑے گی اور اپنے حمایتیوں کو دشمن نہیں بنانا پڑے گا اگر حکمراں خوب باخبر ہے تو اس سے محکومین کو بھی فائدہ ہے جب کہ اس کی بے خبری دونوں طرفین کے لیے مضر ہے۔

برید مقرر کرنے میں دین دار سلطانوں کا ایک اور مقصد بھی رہا ہے۔ اگر دارالسلطنت یا صوبوں میں کوئی بغاوت کھڑی ہوتی ہے یا باغی (ملک کے) باہر سے آتے ہیں تو باغیوں کی تعداد، قوت اور اتحاد کے بارے میں سلطان کے پاس خبریں پہنچ جائیں گی اور فتنہ پردازوں کی روش اور طریقے ان کے عمل پیرا ہونے سے پہلے ہی افشا ہو جائیں گے۔ اگر اپنے برید اور جاسوسوں کے ذریعہ سلطان کو ایک (منصوبہ بند) بغاوت کی اطلاع وقت سے ہو جاتی ہے تو وہ تحریک کو اس طرح کچل سکتا ہے کہ مسلمانوں کے بغاوت میں واقعی ہتھیار سنبھالنے کے بعد اسے ان کے خون سے ہاتھوں پر داغ لگانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ کیوں کہ سزائے موت، مرمت اور دیگر سزائیں دینے میں اسے اس میں تمیز کرنا چاہیے کہ کیا منصوبہ تیار کیا گیا تھا اور کس پر عمل

بقیہ حاشیہ: لگتا ہے تم میں کسی کو کہ کھاوے گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو سو گھن آئے تم کو اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ معاف کرنے والا ہے مہربان"؛ برنی شاہی اقتدار میں شان ایزدی پیدا کرنے کی اپنی کوشش کے سلسلے میں اس آیت پر جو مفہوم ٹھونستا ہے اسے تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ اس نے دوسری نصیحت میں یہ کہہ کر زیادہ سمجھداری کا ثبوت دیا کہ جو نجی اور مخفی ہے اسے فاش نہ کرو اور اس کی اشاعت نہ کرو۔

ہوا۔ بغاوت کے لیے گفتگو کرنے اور سازش کے لیے ایک حکم ہونا چاہیے اور باغیانہ منصوبہ پر عمل پیرا ہونے کے لیے دوسرا حکم۔ نیز اگر سازشیوں کو معلوم ہے کہ سازشیں سلطان سے چھپی نہیں رہ سکتیں تو وہ خائف رہیں گے اور ساز باز کرنے کے لیے مجلسیں منعقد کرنے سے پرہیز کریں گے۔ ان کے دلوں میں برے ارادے ہی کیوں نہ ہوں وہ انھیں ظاہر نہیں کریں گے۔ اور ایک ساتھ شامل ہونے اور بغاوت کرنے کرنے کی جسارت نہیں کریں گے۔ سلطان اچھی طرح باخبر ہے تو یہ اس کے اور اس کے محکومین دونوں کے لیے مفید ہوگا۔

(برنی بہت وثوق سے لکھتا ہے کہ خلیفہ حضرت عمر کو بھی ایسے راست باز زمانہ میں جس میں وہ خود رہتے تھے برید اور جاسوس مقرر کرنا پڑے)

برید، جاسوس اور محاسب کے تقرر میں دین دار سلاطین کے مندرجہ ذیل نیک اور پاک ارادے ہوتے تھے۔

پہلے تو یہ کہ جب دور و نزدیک کے قاضیوں، صوبہ داروں، افسروں اور مال گزاری وصول کرنے والوں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے اچھے اور برے کام روشنی میں آنے والے ہیں تو وہ رعیت پر ظلم و تشدد نہیں کریں گے، رشوت اور تحائف نہیں قبول کریں گے یا سفارشوں کو نہیں مانیں گے گناہوں اور غلط کاموں میں پڑنے کے لیے وہ راہ راست نہیں ترک کریں گے اور ہمیشہ اپنی ہی تقدیر سے خائف اور لرزتے رہیں گے۔ اس آگاہی کی وجہ سے وہ باضابطہ اور ساتھ ہی فنی سزاؤں کے نتائج سے محفوظ رہیں گے۔ دوسرے جب عوام کو یہ یقین ہوگا کہ خواص اور عوام دونوں کے نیک اور بد اعمال کی اطلاع سلطان کو کردی جائے گی اور اس مقصد کے لیے عہدیدار مقرر کردیے گئے ہیں تو وہ مناسب طریقے سے رہیں گے، نہ تو بغاوت کریں گے، نہ ایک دوسرے پر قابو پانے کی کوشش کریں گے۔ اور نہ ہی کمزور کو دبائیں گے۔ تیسرے اگر مال گزاری وصول کرنے والے اور محاسب یہ جانتے ہیں کہ ان کے کام سلطان کے علم میں لائے جائیں گے تو وہ چوری یا غبن نہیں کریں گے اور اس طرح سلطان کی سزاؤں سے محفوظ اور ذلت اور توہین سے بچے رہیں گے۔ آخری یہ کہ اگر سلطان کے بیٹوں بھائیوں رشتہ داروں اور اعلیٰ افسروں کو یہ معلوم ہے کہ تمام باتیں سلطان کو بتائی جارہی ہیں تو وہ اپنے اعلیٰ رتبہ کی وجہ سے اپنے لوگوں یا اجنبیوں یا غلاموں اور خدمت گاروں کے ساتھ اپنے معاملات میں انصاف کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھیں گے (اس کے بعد سکندر اعظم اور سلطان محمود کے قائم کیے ہوئے برید طریقہ کا حوالہ دیا گیا ہے)

دین دار سلاطین نے برید کے تقرر کے بارے میں کئی شرائط کی پابندی کی ہے۔ سب سے

زیادہ اہم شرائط برید کی اہلیت اور صفات ہیں۔ اسے تقریر و تحریر میں سچا، قابل اعتماد، عالی نسب، مجرّد مند اور وقار و تمکنت کے بارے میں محتاط ہونا چاہیے اور لوگوں سے کم ہی گھلنا ملنا چاہیے تاکہ اس کا مقصد، یعنی سلطان کے لیے صحیح معلومات فراہم کرنا۔ حاصل ہوسکے۔ کیوں کہ سلطان صحیح اطلاع ملنے پر ایسا قدم اٹھا سکتا ہے جو اس کی اور عوام کی فلاح کا باعث ہو۔

لیکن بالفرض برید چور ہے، دیانت چھو کر نہیں گئی ہے، کم اصل اور رذیل ہے، ہر جگہ اکثر آتا جاتا ہے اور ہر دروازہ پر پہنچ جاتا ہے، بداطوار، کھاؤ، حریص اور بے پرواہ ہے تو سلطان کی عوام کی فلاح و بہبود کی تمام کاوشیں غلط سمت میں چلی جائیں گی۔ کیوں کہ بے ایمان اور کم اصل برید جو ساز باز اور ریشہ دوانیوں میں طاق ہے، ایسے جھوٹ گڑھتا ہے کہ سچ کا گمان ہو اور اس کی غلط اطلاعات کی تصدیق کی وجہ سے تمام کاروبار بدنظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جہاں فائدے پہنچانے چاہیے تھے وہاں تکلیفیں دی جاتی ہیں، سزا کے قابل شخص پر عنایت کی جاتی ہے اور عنایات کے مستحق لوگ سزایاب ہوتے ہیں۔ بے ایمان برید اپنے حرص، طمع اور بدچلنی کی وجہ سے جو اس کی خلق میں اور اس کی کم اصلی سے ہیں، خدا کی مخلوق کو دن رات خوف میں گرفتار رکھتا ہے۔ کسی کو وہ اس لیے ڈراتا ہے دھمکاتا ہے کہ وہ اسے گھوڑا دے، دوسرے سے باندی کی توقع رکھتا ہے اور تیسرے سے سونا مانگتا ہے۔ وہ جھوٹ کی تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بناتا ہے اور عداوت، بدلہ، غصہ اور مکافات سے کام لیتا ہے۔ کچھ عرصہ تک تو اپنی نیک نامی قائم کرنے کی غرض سے وہ کچھ خبریں بالکل صحیح صحیح دیتا ہے اور اپنے محکمہ کے فرائض بہت خوبی سے انجام دیتا ہے۔ لیکن ایمان داری کے لیے نام پیدا کرنے کے بعد یہ جھوٹے، کم اصل، رذیل اور بد دین برید لوگوں کے مکانوں کو لوٹتے ہیں، ان سے مختلف طریقوں سے پیسہ اینٹھتے ہیں اور طرح طرح کے بہانوں سے انھیں تکلیف پہنچاتے ہیں اور ان پر ظلم کرتے ہیں۔ وہ سلطان کو اپنے عوام کا اور عوام کو سلطان کا دشمن بنا دیتے ہیں۔ ایسے اشخاص کا تقرر مخلوق خدا کی خوش حالی کا نہیں بلکہ ان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا سلاطین کو چاہیے کہ برید، محاسب اور جاسوسوں کے تقرر سے پہلے ان کے نسب کی تحقیق کر لیں۔ جن افسروں کو وہ مقرر کریں ان کی اکثریت، نیک چلن، پیدائشی آزاد، اور زبان اور عمل میں سچی ہونی چاہیے۔ ایسے لوگ دنیاوی خواہشات سے پیٹھ نہیں موڑیں گے۔

ربرنی نے اس موضوع پر مزید جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ اس طرح ہے۔ خلفا راشدین اور صحابہ کرام نے دین کی خاطر دنیاوی عہدے سنبھال لیے تھے۔ "یہ کام ان کے ساتھ ختم ہوگیا"، اس دور میں حقیقی دینی

خوبی والے لوگ، حکومت کے عہدوں کو قبول نہیں کریں گے کیوں کہ" ان کی قابل تعریف خوبیاں ان قابل ستائش لوگوں کو دنیاوی امور کے قریب آنے یا حکومت کے عہدوں کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہیں"[1] لہذا سلطان کو اپنے بس بھر کوشش کرنا چاہیے کیونکہ اگر کامل خوبی کا مطالبہ کیا گیا تو حکومت کے عہدے خالی رہ جائیں گے۔" اس کے باوجود سلطان نسبتاً کچھ لوگوں میں زیادہ خوبی اور خوبی کے لیئے نیک نامی پائے گا جب کہ دوسروں میں شاذ ہی خوبی نظر آئے گی اور بقیہ تو بدکاریوں کے لیے بدنام ہیں ہی۔

(اس جگہ برنی سلطان محمود کے بارے میں ایک قصہ کا اضافہ کرتا ہے۔ اس نے اپنے وزیر حسن میمندی سے[2] برید کے عہدوں کے لیے دو سو اشخاص منتخب کرنے کو کہا اور بد اطواری کی صورت میں سزا کے متعلق ایک سخت دفعہ کا اضافہ بھی کیا۔ جب یہ لوگ اس کے تخت کے مقابل پیش کیے گئے تو اسے بتایا گیا کہ ایک[3]

---

[1] اشارہ صاف طور پر اس واقعہ کی طرف ہے کہ بہترین صلاحیتوں کے حامل مسلمان اور چشتی سلسلہ کے لوگ جس سلسلہ میں برنی بھی کم از کم رسماً ہی شامل کر لیا گیا تھا، سلطانوں کی خدمت میں داخل ہونے کو گناہ سمجھتے تھے۔

[2] برنی کے ذہن میں سلطان محمود کے وزیروں اور اعلیٰ عہدیداروں کی کوئی صحیح تصویر نہیں تھی۔ ازمنۂ وسطیٰ کی عام بولی میں خواجہ احمد ابن حسن میمندی کو عام طور سے سلطان محمود کا وزیر کہا گیا ہے۔ جب کہ وہ صرف سترہ سال محمود کی خدمت میں رہا۔" سابقہ وزیر ابو العباس فضل بن احمد اسفرائینی کے (ایذا کے ساتھ) قتل کے بعد سلطان محمود نے احمد ابن حسن میمندی کو اس کا جانشین مقرر کیا۔ احمد سلطان کا برادر رضاعی اور ہم جماعت تھا اور اس کا باپ حسن میمندی محکمۂ مال گزاری کی طرف سے محصول جمع کرنے کے لیے بست میں متعین تھا۔ عوام میں ایک خیال عام تھا جو قطعی صحیح نہیں۔ کہ حسن میمندی وزیر کا باپ، بھی وزیر تھا۔ خواجہ احمد ابن حسن میمندی اپنی دینی ریاضات اور عالمانہ اوصاف کے باعث ممتاز تھا۔ وہ پہلے محکمۂ انشا، اور رسالت کا نگراں تھا۔ لیکن سلطان محمود کی اس پر بڑی نظر عنایت تھی۔ اس کی دیگر ذمہ داریوں میں خراسان کی مال گزاری جمع کرنے کے کام کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس نے اپنے فرائض کو انتہائی حسن و خوبی سے انجام دیا جب سلطان محمود ابو العباس اسفرائینی سے ناخوش ہو گیا تو اس نے وزارت بھی مستقل طور پر خواجہ احمد ابن حسن میمندی کے مضبوط ہاتھوں میں دے دی۔ سترہ سال تک خواجہ ملک کے سیاسی اور فوجی امور دیکھتا رہا۔ اس کے بعد بہت سے امرا جیسے التون تش حاجب اور امیر علی خویشاوند نے سلطان کے سامنے اس کی شکایتیں شروع کر دیں۔ ان کے الفاظ سلطان پر اثر کر گئے۔ لہذا اس نے خواجہ کو برطرف کر کے ہندوستان کے ایک قلعہ میں مقید کر دیا جب سلطان مسعود محمود کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تو اس نے خواجہ کو رہا کر کے اسے ایک مرتبہ پھر وزیر بنایا۔ خواجہ ۱۰۲۷ء میں اپنی وفات تک وزارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ (حبیب السیر، ج دوم، ص ۱۴۰، فارسی، تہران اڈیشن)۔ (رح)

تیس نے تو خدمت کرنے کے لیے رضامندی دی تھی اور ستر نے معذرت چاہی تھی۔ اس پر محمود نے ان ستر کا تقرر کر دیا جنھوں نے خدمت کرنے سے انکار کیا تھا۔ اور دوسروں کی تقرری کے پروانوں کو پرزے پرزے کرنے کا حکم دیا۔ برنی اعتراف کرتا ہے کہ اس طرح کی چال بہترین سہی لیکن اسے صرف ایک بار آزمایا جا سکتا ہے)

(اس نصیحت کے سلسلہ میں مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کیا گیا ہے جس کے لیے برنی <u>تاریخ خلفائے</u> عباسی کو بطور سند پیش کرتا ہے۔ خلیفہ ماموں الرشید نے، جب وہ مرو ہی میں تھا، دینی زندگی اختیار کر لی اور شاگردوں کو حدیث کے سبق دینا شروع کر دیے۔ اس نے بادشاہت کے رسم و رواج کو پس پشت ڈال کر اور تمام بریدوں اور امیروں) کو برطرف کر کے صوبوں کی صوبہ داریاں، عاملوں، متقیوں، زاہدوں اور صوفیوں کو تفویض کر دیں۔ وزیر فضل بن سہل[۱] نے بہت نرم، صاف، بالواسطہ

---

[۱] واقعات مختصراً اس طرح ہیں۔ خلیفہ ہارون الرشید ماموں کو ایک فوج کے ساتھ مرو بھیجنے کے بعد ۸۰۸ء میں طوس (مشہد) کے مقام پر انتقال کر گیا۔ خانہ جنگی شروع ہو گئی اور ماموں کے جنرل طاہر نے بغداد پر قبضہ کرنے کے بعد ماموں کے حریف امین کو بے قابو کر کے اسے قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد مرو میں ماموں بغداد کے عباسیوں سے بہت دور تھا لہٰذا اس نے آٹھویں امام علی رضا کو، جو اس سے عمر میں بائیس سال بڑے تھے، اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ماموں نے اپنے وزیر فضل بن سہل کے اثر کی وجہ سے ایسا کیا۔ لیکن یہ واقعہ اس سے کہیں زیادہ تھا جسے عباسی یا خلافت میں حق جتانے والے دوسرے لوگ برداشت کر سکتے تھے۔ بغداد میں ابراہیم ابن مہدی (ماموں کے چچا) کے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا اور ماموں کے صوبہ دار حسن بن سہل (وزیر کے بھائی) کو واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ ماموں نے بالآخر صورت حال بھانپ لی اور وہ بغداد کی طرف چل پڑا۔ سرخس (شمالی ایران میں) میں وزیر فضل بن سہل کو تہ غسل خانہ میں قتل ہوا پایا گیا اور مشہد میں امام علی رضا انگور کھانے سے انتقال کر گئے۔ ماموں کی آمد پر بغداد میں بغاوت فرو ہو گئی لیکن اس پر بہت سے لوگوں نے اپنے وزیر کے قتل کا منصوبہ بنانے اور امام علی رضا کو زہر دینے کے الزامات لگائے۔ ان حالات میں یہ بات کچھ لگتی ہوئی نہیں ہے کہ فضل بن سہل نے ماموں کو یہ نصیحت دی ہوگی جو برنی نے اس سے منسوب کی ہے کیوں کہ فضل بن سہل کا مفاد اس میں تھا کہ ماموں کو معاملات سے لاعلم رکھا جائے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماموں مرو میں اپنے قیام کے آخری حصہ (۸۰۸-۸۱۷ء) میں امور سلطنت سے الگ تھلگ ہو گیا تھا لیکن ہم عصر فضل بن سہل کو اس کے لیے ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں ان نتائج کی طرف ماموں کی توجہ مبذول کرائی جو اس کے اقدام کے باعث پیدا ہو سکتے تھے۔ ماموں نے ان پر کان نہیں دھرے لیکن جب بغاوتوں نے ہر طرف سر اٹھایا تو ماموں نے اپنے دینی طریقوں کو ایک طرف رکھ دیا اور تب اس کے وزیر نے امور خلافت کو منظم کیا۔

(۲۔ خلافت راشدہ کا دور تاریخ عالم میں درمیانی وقفہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ نوع انسان اپنے قدیم طریقوں پر واپس آجاتا ہے)

(ذیل کے الفاظ، جو وہ فضل بن سہل کی زبان سے ادا کرواتا ہے، حقیقتاً بادشاہت کی ضرورت و معصیت کے متعلق برنی کے ذاتی نظریہ کا لب لباب ہیں)

"بادشاہت کے غلبہ اور اثر کے بغیر لوگوں پر حکمرانی ممکن نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص کسی دوسرے طریقہ سے عوام پر حکومت نہیں کر سکا ہے۔ صرف رسول اکرمؐ کے زمانہ سے اپنی قربت کی وجہ سے، اور جیسے ان کا (رسولؐ اکرم کا) ایک معجزہ سمجھا جا سکتا ہے، خلفائے راشدین اپنی دینی زندگی اور غربت کے باوجود ایک پشت تک ہی حکومت کر سکے۔ اور دنیا کو مناسب طور پر منظم رکھ سکے۔ لہٰذا آدم کے زمانہ سے دنیا کے آخر تک انھوں نے خلفائے راشدین کے اثر کو تمام عہدوں کے لیے ایک کامل نمونہ سمجھا گیا ہے خلفاء راشدین تمام بڑے یا چھوٹے معاملات میں حدیث کی اتباع کرتے تھے لیکن اگر عصر آخر کے سلطان نے حدیث کی اتباع کی تو وہ ایک دن بھی اپنی بادشاہت برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔

اس کے باوجود خلفائے راشدین میں سے تین نے، جنھوں نے رسولؐ اکرم کی سنت سے انحراف کے خوف سے دنیاوی سلاطین کے ضوابط یا رسوم میں سے کسی ایک کو بھی اختیار نہیں کیا انھوں نے رسولؐ اکرم کی سنت کی خاطر جام شہادت نوش کیا۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، اور حضرت علی کو ناعاقبت اندیش دین داروں نے شہید کر دیا۔ خلفائے راشدین کے علاوہ ماضی میں عالم اسلام کا کوئی بھی حکمراں رسول اکرم کی عسرت کی سنت کے مطابق زندگی بسر کر کے ملک کا نظم و نسق نہیں چلا سکا اور نہ ہی مستقبل کے لیے ایسی بات سوچی جا سکتی ہے کیوں کہ دنیا شیطانی آدمیوں سے بھری ہوئی ہے جن کے اندر شیروں، گوشت خور جانوروں اور شکاری درندوں کی خصوصیات ہیں۔ ان پر جابر سلطانوں کی دہشت اور طاقت کے بغیر حکومت اور تسلط قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ خلفائے راشدین کے مددگار اور حامی رسولؐ اکرم کے وہ صحابی تھے جنھوں نے ایمان کی تمازت اور اپنی بے مثل دین داری کی وجہ سے اپنی زندگیاں، دولت، بیویاں، بچے، جائداد اور مال اسباب اللہ کی راہ میں قربان کر دئے تھے انھیں رسولؐ اکرم کی صحبت ملی تھی اور انھوں نے فیضان الٰہی کی زیارت کی تھی اس لیے ان کے

اندر خدا اور اس کے رسولؐ کے لیے محبت کا اس قدر جذبہ تھا کہ ان کی نظروں میں تمام دنیا بھی ہیچ تھی۔ لہٰذا احکام الٰہی کی برتری کی خاطر وہ بھڑکتے شعلوں میں کود پڑے اور شہادت کے شوق میں سوئے تک نہیں۔ تمام مہاجرین اور انصار کرامات اور دینی بصیرت سے فیضیاب تھے۔ لہٰذا خلفائے راشدین کے لیے صحابہ کرام کے تعاون سے سلطانوں کی طرح حکومت کرنا ممکن تھا جب کہ وہ خود مفلسوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔

"اب جب کہ خلافت امیر المومنین (مامون) کے پاس آگئی ہے تو اس دور کو گزرے ہوئے دو سو سال ہو چکے ہیں اور سچے دین میں پختہ عقیدہ محدود افراد ہی میں باقی رہ گیا ہے۔ اسلام کا ظاہرا اور اس کی خصوصیت بہت زیادہ بدل چکی ہے۔ دنیا ایک مرتبہ پھر رسم و رواج کے پیروؤں کے ہاتھوں میں آگئی ہے اور وہ سب صرف اس دنیا کی بہتری دیکھتے ہیں۔ رسول اکرم کی آمد سے پہلے بنی آدم کی شجاعت اور حوصلہ صرف اس دنیا کے مقاصد کے لیے مخصوص تھے اور وہی اب ہے۔ بادشاہت کے دبدبہ، اثر اور قوت کے بغیر اور (دنیاوی) سلاطین کی ان شاہی روایات اور تدبیروں کو اختیار کیے بغیر جنھوں نے نافرمانوں کے سر کچل دیے اور باغیوں اور سر پھروں کو ناکارہ کر دیا۔ خلافت کے تسلط اور مسند کو قائم یا مستحکم نہیں کہا جا سکتا۔ حکومت، فتوحات اور بادشاہت۔ دینی عسرت کی زندگی کے متضاد ہیں۔ جب تک بادشاہت کا رعب اور دبدبہ قائم نہیں کیا جاتا ہے، لوگ ایک دوسرے کو غیر قانونی طریقہ سے دباتے رہیں گے۔ فرماں بردار نافرمان ہو جائیں گے۔ اعلیٰ ترین اقتدار کی عظمت معدوم ہو جائے گی اور حکومت کے احکام کا نفاذ ناممکن ہو جائے گا۔ کسراؤں کے وحشت انگیز طریقوں کو استعمال کیے بغیر اور جمشید کی شان و شوکت کو اختیار کیے بغیر بہتر مذاہب کو زیر کر لینا اور انھیں احکام کا مطیع کر لینا ممکن نہیں ہے۔

"ایسا اسلام اور ایسے مسلمان باقی نہیں ہیں کہ کوئی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرح ان پر حکومت کر سکے۔"

نصیحت ۹

۱۔ قیمتوں پر کنٹرول (نرخوں کا ضبط)

سلطان محمود نے کہا، اے محمود کے فرزندو اور سلاطین عالم اسلام! تمہیں یقینی طور پر معلوم

ہوجانا چاہیے کہ مملکت کی تمام پالیسیاں اور مہمات ایک دوسرے پر منحصر ہیں، مثال کے طور پر جس طرح فوج خزانہ سے ادائیگی کے بغیر مستحکم نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اشیاء کی کم قیمت کے بغیر اسے قائم ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اور جس طرح اشیاء کی ارزانی فوج کی مناسب تنظیم کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح ضروریاتِ زندگی کی سستی قیمت کے بغیر عوام میں خوش حالی، آب و تاب اور استحکام نہیں ہوسکتا۔ سلطان کا در اور بارگاہ عوام کا قبلہ ہیں لیکن جب تک وہ نوعِ انسان کی ضرورتوں کو مہیا نہیں کرتے ہیں تو دور و نزدیک کے اشخاص کے دلوں میں شاہی اقتدار کی عظمت اور اقبال کے لیے کوئی احترام پیدا نہیں ہوسکتا۔ خواص و عوام کی اکثریت اس بارے میں ایک ہی رائے رکھتی ہے۔ اگر ضروریاتِ زندگی کی اونچی قیمت کی وجہ سے ملک کے باشندے اور رعیت تکلیف میں پڑجاتے ہیں اور ان میں سے بیشتر یا تمام مصیبت اور تباہی سے دوچار ہوجاتے ہیں تو وہ اپنے عزیز وطن اور اپنے قدیم گھروں کو ترک کردیں گے اور اس ملک کی طرف رخ کریں گے جہاں ضروریاتِ زندگی ارزاں ہوں اور آسانی سے دستیاب ہوسکیں۔

لہٰذا پہلے کہی ہوئی بنیادی باتوں کی بنیاد پر سلطانوں پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ وہ فوج کی ضروریات کی قیمتیں، جیسے گھوڑے اور ہتھیار اور ساتھ ہی اناج اور کپڑے، جو خواص و عوام دونوں کی گزر اوقات پر اثر انداز ہوتے ہیں، کم کرنے کے لیے سخت جدوجہد اور بس بھر کوشش کریں۔ انھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی سلطنت کا استحکام فوج اور عوام کے استحکام پر، اور فوج اور عوام کا استحکام ضروریاتِ زندگی کی کم قیمتوں پر منحصر ہے۔ قحط کے دوران، جو کہ آسمانی قہر ہے، بارش نہ ہونے سے خوراک کی پیداوار میں شدید کمی آجاتی ہے۔ حکمراں اس کا ازالہ نہیں کرسکتے۔ قحط کے دنوں میں سلطان کی کوششیں ضرورتاً خراج اور جزیہ کی ادائیگی یا کمی اور خزانہ سے ہر ممکن مدد کی منظوری تک محدود رہتی ہیں۔ لیکن اس کی کوششیں قحط سے پیدا شدہ قیمتوں کو کم نہیں کرسکتیں لہٰذا وہ قابلِ معافی ہے۔ لیکن بکثرت بالیدگی کے دوران جب بارش کی نعمت آتی ہے اور فصلیں، پھل، کاشت کیے ہوئے کھیت اور باغات خوب پھلتے پھولتے ہیں تب بھی سوداگر کاروانی اور سوداگر بازاری اس سب کے باوجود زیادہ قیمتوں پر فروخت کرنے کا طریقہ ہی عام رکھتے ہیں۔ اونچی قیمتوں سے جو منافع ہوتا ہے اس کی وجہ سے تمام دولت مند لوگ تجارت اور احتکار اپنا لیتے ہیں، لہٰذا سلطانوں کا یہ اولیں فرض ہوجاتا ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے قیمتوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں اور ان میں کمی کے لیے سخت جدوجہد کریں۔ انھیں ایسے لوگوں کو اپنی ایجاد کردہ ترکیبوں سے خرید و فروخت کے معاملات طے کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہیے جن کے

چال چلن خراب ہیں اور جنھوں نے زیادہ قیمتوں پر فروخت کرنے ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا ہے۔؎ سلطان کو خود اپنے تخت کے سامنے پیداوار کی لاگت (نرخ براورد؎) کے مطابق تمام اشیا کی قیمتیں طے کردینا چاہیے۔ بریدا ور ایماندار و سخت منصفوں کو چاہیے کہ وہ خرید و فروخت کے معاملات کو قابو میں رکھیں اور ان کے بارے میں خوب تفتیش و تحقیق کریں۔ اناج، کپڑے اور دوسری اشیا کی کم قیمت کو انتظامی امور میں کوئی آسان کام یا کھیل نہیں سمجھنا چاہیے۔ تمام سلطانوں کو عوام کی ضروریات کی کم قیمت کو ملک کے اپنے بہتر انتظام اور نظام عدل کی بنیاد خیال کرنا چاہیے۔ انھیں منڈیوں کے گماشتوں اور شہروں کے شحنہ اور کوتوالوں کو یہ حکم دینا چاہیے کہ وہ دارالسلطنت میں کسی بھی حالت میں احتکار کی اجازت نہ دیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ احتکار کرنے والوں کا غلہ ضبط کرکے فروخت کردیں کیوں کہ رسولؐ اکرم نے ایسا ہی کیا تھا۔ وہ شخص جو احتکار کرتا ہے اور جس نے احتکار کو اپنا پیشہ

؎ اس نصیحت کو سمجھنے کے لیے برنی کی علاؤالدین خلجی کے اقتصادی ضوابط کی رُوداد کو ذہن نشین رکھنا چاہیے (تاریخ فیروزشاہی، ص ۳۱۹۔۳۰۳) لیکن دو دیگر امور کو بھی مدنظر رکھنا پڑے گا۔ پہلی بات تو یہ کہ برنی نے عام بازاروں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے باوجود کچھ عالم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علاؤالدین کے اقتصادی ضوابط خالص فوجی اقدام تھے۔ اس جگہ برنی اس بات کو بالکل واضح کردیتا ہے کہ قیمتوں پر کنٹرول فوج اور عوام دونوں کے بھلے کے لیے ہے۔ دوسرے برنی (تاریخ فیروزشاہی، ص ۳۰۵) اور امیر خسرو (ص ۱۲،۱۳) دونوں اس کی توثیق کرتے ہیں کہ جب تک علاؤالدین زندہ رہا اناج اور دوسری اشیاء کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن برنی بھی تاریخ فیروزشاہی میں یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ علاؤالدین خلجی کا مخصوص کارنمایاں تھا اور دوسرے سلطانوں کی دسترس سے بالکل باہر تھا۔ یہاں اس حقیقت کا صاف گوئی سے اعتراف کیا گیا ہے۔

؎ یہ برنی کا پسندیدہ خیال ہے کہ تمام اشیاء کی قیمتیں پیداوار کی لاگت (نرخ براورد) کے مطابق ہونا چاہیے۔ یا کارل مارکس کی زیادہ صحیح اصطلاح میں، براہ راست پیدا کرنے والے کی، سماجی اعتبار سے محنت کی ضروری مدت، کے مطابق۔

لہٰذا وہ تاریخ فیروزشاہی (ص ۳۱۲) میں لکھتا ہے "عام بازاروں کے متعلق پہلے کیے گئے ضوابط کے نفاذ کی غرض سے، جس سے عوام کو فائدہ حاصل ہوتا ہے سلطان علاؤالدین نے دن رات جدوجہد کی اور ہر شے کے بارے میں یہاں تک کہ سوئیوں، کنگھوں، موزوں، جوتوں، پیالوں، صراحیوں اور جام جیسی حقیر اشیاء کی برآورد کے بارے میں تحقیق کی۔ اس نے اپنی موجودگی میں ہر چیز کی قیمت اشیاء کی نرخ براورد اور پیدا کرنے والے کے منافع کے مطابق مقرر کردی (باقی صفحہ پر

پیشہ بنالیا ہے اس نے اپنے کو عوام اور ان کی ضروریات زندگی کے درمیان دیوار بنالیا ہے اور عوام پر انبساط کے فیوض کو محدود کر دیا ہے۔ اگر وہ حکومت کے احکام کے باوجود احتکار سے پرہیز نہیں کرتا تو اس کی جائداد بطور سزا ضبط کر لینا چاہیے اور اسے جلاوطن کر دینا چاہیے تاکہ یہ دوسروں کے لیے ایک تنبیہ اور عبرت رہے۔

بازار کے افسروں رؤسا، کو یہ ہدایت کرنا چاہیے کہ وہ دکان داروں کو اپنا پابند رکھیں اور قیمتوں کا تعین ان پر نہ چھوڑیں۔ انھیں قیمتیں مقرر کرنے کے لیے (جیسا کہ حکومت نے حکم دیا ہے) اور خرید و فروخت کے معاملات میں چھان بین کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا چاہیے، اس بڑی مہم میں، جس کی کامیابی اور ناکامیابی خواص و عوام دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے، انھیں کسی ڈھیلے پن کا مرتکب یا اپنے ہی بھلے کے لیے کام کرنے کی تحریص نہیں ہونا چاہیے۔ وہ قیمتوں کے معاملہ کو تفصیل طلب امر نہ سمجھیں۔ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان خریداروں یا فروخت کنندگان کی مدد کے لیے آئیں جو لاعلم، نوجوان، دیہاتی، لاچار اور کمزور ہیں۔ انھیں چاہیے کہ خرید و فروخت کے بازاری معاملات میں عدل کا نفاذ کریں۔ اور ٹھگوں، جعل سازوں، وعدہ شکن، اور غلط چیزوں کے فروخت کنندگان کو توہین آمیز سزائیں دیں، افسروں کو دکان داروں، بقالوں، کاریگروں اور دوسرے بے شرم لوگوں کی پابندی اور لاچاری کی نمود کے فریب میں آکر انھیں لاچار، شرمیلے نوجوان اور بے خبر لوگوں پر ظلم توڑنے کی غرض سے دکانوں میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دینا چاہیے یا پھر تجارتی لین دین کے انوکھے طریقوں، بدمعاشی، برے کاروبار، دیدہ دلیری اور بے حیائی کی طرف رجوع نہیں ہونے دینا چاہیے یا انھیں اپنے ہی کانچ کے دانوں کو ہیروں کا نام دے کر ہیروں کی قیمت پر فروخت نہیں کرنے دینا چاہیے اور فروخت کنندگان کے ہیروں کو پتھر اعلان کر دینا چاہیے تاکہ وہ انھیں پتھروں کی قیمت ہی پر خرید سکیں۔

اگر کوئی سلطان اپنے احکام کا نفاذ کرنے کے اختیار کے باوجود بدمعاشوں، دغابازوں، بے شرم اور بے خدا لوگوں کو اس طرح لاچار، غریب، ناتواں، مصیبت زدہ، نوجوان اور بے خبر لوگوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی چھوٹ دیتا ہے اور ضروری تحقیق و تفتیش کا حکم نہیں دیتا ہے اور بہتر فرقوں کے لین دین میں یکساں عدل نافذ نہیں کرتا ہے تو اسے "ظل الٰہی" یا صحیح حکمراں تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

سلطان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ خرید و فروخت اور دارالسلطنت کے لیے مقرر کی ہوئی قیمتوں کے

بقیہ حاشیہ: قیمتوں کا نرخ نامہ جو سلطان کے سامنے طے کیا گیا تھا اسے دیوان ریاست کے حوالہ کر دیا گیا۔"

سلسلہ کا ہر نقش اس کے تمام صوبوں میں بھی ظاہر ہو گا اس کے افسر اور رعیت اسے تسلیم کریں گے اور اس کی پیروی کریں گے۔[1]

اے محمود کے فرزندو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ فوج کی ضروریات اور عوام کی زندگی کی ضروریات کی ارزانی کے بہت سے دینی اور دنیاوی فوائد ہیں جو سلطان اور محکومین دونوں کی فلاح و بہبود کا باعث ہیں: (پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ فوج مستحکم اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ دوسرے، سلطان کا دارالسلطنت ہر صنعت و حرفت کے ہوشیار اور مشاق منتخب آدمیوں کے آباد ہونے کے باعث ایک عالمی دارالسلطنت بن جاتا ہے۔ تیسرے سلطان کے حریف اس کی فوج کی طاقت اور اس کی رعایا کی خوش حالی کو دیکھتے ہوئے اس کے ملک پر قابو پانے کا کوئی منصوبہ دل میں نہیں لاتے) چوتھے، عوام کی ضروریات کی کم قیمتیں سلطان کے لیے ایسی شہرت کا باعث ہوتی ہیں جو سالوں اور پشتوں عوام کے حافظہ میں رہتی ہے۔ نیز عوام میں غصہ اور حسد باقی نہیں رہتا اور آپسی محبت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ہر طرف رحمتیں امن اور نیک خواہشات ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس، زائد قیمتوں اور احتکار کی وجہ سے بے ایمانوں کے گنتی کے مکان تو بھر جاتے ہیں لیکن خریداروں کے ہزارہا مکان مفلسی اور مصیبت کا شکار ہو جاتے ہیں اور احتکار کرنے والوں اور اشیاء فروخت کرنے والوں کے لیے عوام کے دلوں میں دشمنی کے ساتھ انتقام کا جذبہ بڑھنے لگتا ہے۔ پانچواں فائدہ، کم قیمتیں سلطان کے خزانہ کے لیے جو کہ مسلمانوں کا بیت المال بھی ہے، فائدہ مند ہیں۔ اگر غلہ اور اشیاء کمیاب ہیں تو حکومت کے کام میں کثرت سے پیسہ خرچ کرنا پڑے گا اور اس طرح خزانہ خالی ہو جائے گا۔ ایسے حالات میں حکمراں اور محکومین کی حالت زبوں ہو جاتی ہے۔ عام حالات میں خزانہ رعیت سے وصول کیے گیے پیسہ سے پر کیا جاتا ہے لیکن جب اناج اور اشیاء، کمیاب ہوں گی تو خزانہ کا پیسہ رعیت کے مکانوں میں جائے گا اس کے علاوہ حکومت کے اخراجات میں کوئی حد و دیا پابندیاں تو ہیں نہیں کیوں کہ ایک شاہی کارخانہ تک میں کئی ہزار گھوڑوں کے لیے چارہ بھوسا مہیا کرنا ہوتا ہے۔ زائد قیمتوں سے جو نقصان ہوتا ہے اس کا دارالسلطنت پر براہ راست اثر پڑتا ہے اور پھر یہ اثر دارالسلطنت سے تمام ملک میں پھیل جاتا ہے۔ چھٹا فائدہ، یہ فائدہ بھی سلطان اور

---

[1] اپنی تاریخ فیروز شاہی میں برنی نے صرف دہلی کے حوالہ سے علاؤالدین خلجی کے اقتصادی ضوابط کا ذکر کیا ہے صوبوں کے بارے میں وہ ساکت ہے صرف اتنا کہتا ہے کہ وہاں سے غلہ حاصل کیا جاتا تھا اور تہا ناکوں کو یہ اختیار حاصل تھا یا ان کا فرض تھا کہ وہ غلہ لائیں۔ فتاوائے جہانداری کا یہ پیراگراف یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ علاؤالدین کے ضوابط کی ترویج سلطنت کے شہروں تک تھی۔

رعیت دونوں سے متعلق ہے۔ بادشاہت کا اعلیٰ ترین مقصد عدل وانصاف قائم کرنا ہے۔ لیکن جب کبھی دار السلطنت میں، جسے عدل وانصاف کا سرچشمہ ہونا چاہیے۔ خرید وفروخت کے معاملات میں کھلم کھلا ناانصافی ہوتی ہے اور سلطان ان کی اصلاح کا حکم نہیں دیتا ہے، اور جب کہ احتکار کرنے والوں اور اشیاء فروخت کرنے والوں کے مکان بغیر اپنی کسی محنت اور پریشانی کے عوام کے پیسوں سے بھر جاتے ہیں لیکن جن کی اپنی پسینہ کی کمائی ہے ان کے مکان بغیر کسی آفت سماوی یا بدنصیبی کے خالی ہوجاتے ہیں اور ہر روز ان کی مصیبت اور مفلسی میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور سلطان، جس کا کام عدل قائم کرنا ہے قیمتیں مقرر کرکے اور احتکار کرنے والوں اور اشیاء فروخت کرنے والوں کو تنبیہ اور سزا دے کر اپنا فرض انجام نہیں دیتا ہے تو ان سب وجوہات کی بناء پر سلطان کا انتظامیہ بدنظمی میں پڑ جاتا ہے، اسے ذمہ دار اور خدا کے یہاں سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے اور ہر چیز اس کی غفلت سے منسوب کردی جاتی ہے۔ ساتواں فائدہ، بادشاہت کے قیام میں ایک حکمت الٰہی یہ تھی کہ یہ "اپنے دولت مندوں سے لے کر اسے اپنے مفلسوں کو دینے" کا فرض انجام دے۔ مفلس زور ڈال کر دولت مندوں کے مال وجائداد پر اپنے حقوق کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ احتکار کرنے والے اور اشیا فروخت کرنے والے کوئی اور نہیں دولت مند ہی ہیں۔ احتکار کرنے والے اپنے کاروبار کے دوران مفلس ومحتاج سے ان کی گزر بسر کے تمام ممکن ذرائع لے لیتے ہیں اور فروخت کے بہانہ سے ان سے ہر چیز لے کر اپنے گھروں کو ہو لیتے ہیں۔ اس طرح مشیت الٰہی کی توہین کی جاتی ہے۔ کم قیمتوں سے اس سے بڑا کوئی فائدہ نہیں کہ خواص وعوام میں حکمت الٰہی کی مشیت میں سے ایک کا مظاہرہ ہوجاتا ہے۔ آٹھواں فائدہ احتکار اور زائد قیمتوں پر فروخت سماجی گناہ ہیں۔ وہ ذاتی گناہوں کی قسم میں نہیں آتے۔ کیوں کہ ان سے دوسروں کا نقصان ہوتا ہے[1] لیکن سلطان کے احکام اور کوششوں سے انھیں کچلا جاسکتا ہے۔ دانش مندوں سے اس خدمت کے انجام دینے کے عوض میں ملنے والا اجر الٰہی پوشیدہ نہیں ہے۔

نواں فائدہ۔ اس میں بھی حاکم اور محکومین کی خوش حالی شامل ہے۔ احتکار مندوؤں، مجوسیوں،

---

[1] مسلمان عام طور سے تمام اعمال کو، خواہ وہ بد ہوں یا نیک، دو قسموں میں بانٹتے ہیں۔ پہلے تو وہ اعمال جو خود آدمی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے اور اس کے خدا کے درمیان کا معاملہ ہیں۔ دوسرے وہ اعمال جو دوسروں کو متاثر کرتے ہیں۔ جہاں تک دوسروں کے حقوق کو گزند پہنچانے کا معاملہ ہے یہ خطرہ ہے کہ مغفرت الٰہی بھی آزار پانے والے شخص کی معافی سے مشروط ہوگی۔

کافروں اور مشرکوں کا پیشہ ہے[1] کوئی شخص جو اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور پھر بھی احتکار کو اپنا پیشہ بناتا ہے اور مخلوق خدا کو اپنی مکاری سے ان کی کفالت سے محروم کرتا ہے تو وہ اسلام سے لابلد ہے اور اس سے متاثر نہیں ہوا ہے۔ احتکار کے نتیجہ میں مسلمانوں کے مکانوں سے، جن کی عزت خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پابندی میں ہے، دولت نکل کر ہندوؤں اور مجوسیوں کے مکانوں میں چلی جاتی ہے جن کی جائداد، ازواج اور اولاد کو کچھ اسلامی فرقے مال غنیمت خیال کرتے ہیں[2]۔ لہذا وہ اشخاص، جن کی تذلیل اور معزولی دین کا عائد کردہ فرض ہے۔ احتکار کے ذریعہ مسلمانوں سے حاصل کی ہوئی دولت کے باعث عزت واحترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مسلمان، جنھیں خدا عزت وعنایت سے مالا مال کرتا ہے۔ اپنی مفلسی اور کم مایگی کی وجہ سے کمتر اور حقیر ہو جاتے ہیں۔ اگر سلطان کم قیمتوں کے سلسلہ میں، جدو جہد کرے تو جنھیں خدا نے عزت بخشی ہے وہ سماج میں زیادہ عزت حاصل کریں گے اور جنھیں خدا نے مطعون کیا ہے وہ زیادہ محتاج اور لاچار ہو جائیں گے۔ انتظامیہ کے سلسلے میں یہ بہت بڑا فائدہ ہے۔ دسواں فائدہ، اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی سستی قیمت کی وجہ سے ملک کی رعیت کا ہر گروہ طبقہ، ذات اور برادری صنعت وحرفت اور دیگر فنون اور پیشہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ امور حکومت کے استحکام میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کو موزوں کام کے لیے موقوف رکھتا ہے کیوں کہ اس طرح ملک کے انتظامی معاملات بہتر ہوتے ہیں۔ لیکن جب کبھی احتکار اور زیادہ قیمتوں پر فروخت کرنے میں بہت کافی فائدہ دیکھا جاتا ہے اور دوسرے پیشوں میں زیادہ منافع نہیں رہ جاتا

---

[1] احتکار۔ احتکار کا مطلب ہے جب قیمتیں کم ہوں اس وقت کسی شے کو باہر یا بازار سے خریدنا اور قیمتیں بڑھنے پر فروخت کرنا۔ احتکار دو صورتوں کے سبب ممکن ہو گیا تھا۔ پہلی۔ سڑکوں کا غیر محفوظ ہونا۔ موسم کی طوفان خیزیاں اور نقل وحمل کا خرچہ۔ دوسری۔ سوداگر کاروانی اور سوداگر بازاری کے اتحاد سے پیدا ہونی والی اجارہ داریاں۔ کئی مسلم عالم دین احتکار کے گناہ سے اس قدر خائف تھے کہ انھوں نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اناج کے کاروبار میں نہ پڑیں۔ بہر کیف ازمنہ وسطی میں اناج کی تجارت پوری طرح ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور علاؤالدین اپنے اقتصادی ضوابط شروع کرتے وقت ان کی تعمیل کے سلسلہ میں ہندو نائکوں پر منحصر تھا جن میں یکجہتی تھی اور چوں کہ تجارت مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی لہذا صرف وہی اناج کا احتکار کر سکتے تھے۔ برنی نے اس جگہ مجوسیوں یا پارسیوں کا جو اضافہ کیا ہے وہ بالکل فضول ہے (ح)

[2] امام شافعی کے مسلک کی طرف اشارہ ہے جن کے ان غیر مسلمین کے بارے میں نظریات کو جن کے پاس کوئی ایسی مقدس کتاب نہیں ہے جس کا قرآن میں ذکر ہو، برنی نے غلط سمجھا اور غلط پیش بھی کیا ہے۔ اس امر پر "نصیحت" کے اختتام پر ایک نوٹ میں بحث کی گئی ہے۔

تو لوگ ایک فطری تحریک کے تحت اپنا ہی پیشہ ترک کر دیتے ہیں۔ سپاہی کاشت کا کام اختیار کر لیتے ہیں۔ کاشت کار تجارت میں کافی فائدہ دیکھ کر اسے اپنا لیتے ہیں اور احتکار کرنے والے اپنی دولت کے اثر سے اعلیٰ عہدوں کی طرف ہاتھ بڑھانے لگتے ہیں۔ دکان دار افسر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ عالی نسب سوداگر بن جاتے ہیں اور سوداگر کاروانی حکومت میں امیر اور فوج کے سالار بننے کی چاہ کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر امور مملکت مستحکم نہیں رہتے۔ لیکن کم قیمتوں کی وجہ سے ملک کی رعیت میں کوئی بدنظمی یا افراتفری نہیں پھیلتی۔

انتظامیہ اور فتوحات کی صحیح نوعیت کے بارے میں جنھیں کوئی علم اور تجربہ نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ سلطانوں کو قیمتوں پر کنٹرول اور قیمتوں کو مقرر کرنے کے لیے جدوجہد نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ کم قیمتیں فراوانی پر موقوف ہیں^ﮯ۔ اور رسولِ اکرم نے فرمایا ہے خدا بخشنے والا ہے، اس طرح کی بحث بظاہر تو صحیح ہے۔ لیکن یہ دنیا بدلتی رہتی ہے اور زمانہ کی گردش کی وجہ سے بنی آدم ہر عہد اور قرن میں قدرتی طور پر مختلف طور طریق اختیار کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ان حالیہ نسلوں میں جو روزِ محشر کے قریب تر اور رسولِ اکرم اور صحابۂ کرام کے فضیلت مآب دور سے اتنا پیچھے ہٹ گئی ہیں، خوبیوں کی منتہا پستی کی انتہا میں تبدیل ہو چکی ہے، مادّی دنیا کی محبت ان بندوں کے سوائے جن کے لیے مشیت خدا کچھ اور ہے تمام لوگوں کے قلوب پر حاوی ہو گئی ہے، اور شیطان اور پست جذبات نے نوعِ انسان کے اکثر اشخاص پر غلبہ حاصل کر لیا ہے لہٰذا مستقل بارش اور پھلوں کی کثرت اور عمدہ فصلوں کے باوجود ان لوگوں پر غلہ اور کپڑے کی زائد قیمتوں کا لالچ اور طمع ان کے گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے ان پر غالب آجاتا ہے۔ وہ احتکار اور زائد قیمتوں پر فروخت کا طریقہ ترک نہیں کرتے اور نہ تو انھیں خدا کا خوف ہوتا ہے۔

ﮯ فراوانی کی صورت میں قیمتیں کم ہوں گی بشرطیکہ (الف) تجارت میں کھلا مقابلہ ہو اور (ب) نقل وحمل کی مناسب سہولتیں میسر ہوں۔ اس زمانہ میں یہ بہت آسان اقتصادی منصوبہ رہا ہوگا۔ لیکن برنی انسانوں کے چال چلن پر کیچڑ اچھالتا ہے اور نقل وحمل کی سہولتوں کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کرتا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں تجارتی اشیا، کا نقل وحمل مخصوص طبقوں کی موروثی تجارت تھا اور ان طبقوں کے اراکین ایک دوسرے سے مل کر قیمتوں کو اعلیٰ اجارہ دارانہ سطح پر رکھ سکتے تھے۔ برنی کا اولیں مطالبہ یہ ہے کہ ریاست کے حکمراں کو قیمتوں کے اجارہ کو کچل دینا چاہیے۔ اور ایسی قیمتیں مقرر کر دینا چاہیے جو تجارتی مقابلہ کی صورت میں رائج ہو سکتی تھیں۔ حکومت بآسانی ان قیمتوں میں، جن قیمتوں پر خود سوداگر کاروانی نے بیرون شہر یا دیگر شہروں سے اپنی تجارتی اشیاء خریدی تھیں، نقل وحمل کی لاگت اور معمولی تجارتی منافع کا اضافہ کر کے مناسب یا مقابلتی قیمتیں مقرر کر سکتی تھی (ح)

اور نہ سلطان کا۔ دولت مند اپنی مرضی کی قیمتوں پر مفلسوں کو غلہ اور کپڑا فروخت کرتے ہیں۔ احتکار اور زائد قیمتوں پر فروخت میں اپنی ہوشیاری کی وجہ سے وہ حکمراں کو، جو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مقرر کیا گیا ہے کسی بھی طرح تحقیق و تفتیش کرنے، قیمتوں پر کنٹرول کرنے اور نرخ مقرر کرنے یا تنبیہوں اور سزاؤں کے ذریعہ خرید و فروخت کے معاملات میں عوام میں عدل قائم کرنے یا ایسے ناانصافی کے خلاف اپنے عوام کے تحفظ کے لیے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع نہیں دیتے۔ روزِ محشر میں حکمراں اس سب کے لیے کیا جواب دے گا، اور اس کی غفلت کے لیے اس کے عذر کیسے تسلیم کیے جائیں گے۔

۲۔ اسلام کے اصولوں اور ادارۂ بادشاہت کے درمیان تضاد

محمود کے فرزندوں اور درحقیقت اس سرزمین کے تمام سلطانوں کو قطعی طور پر یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ محمود بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ رسول اکرم حضرت محمد بن عبداللہ قریشی کے نقش قدم پر چلنا ہی سچا دین ہے۔ لہٰذا جو اپنی زندگی کے طور طریق اور ذریعۂ معاش میں رسولِ اکرم کی رہبری اور قیادت اور ان کی سنت کی پیروی کرتا ہے وہ دین دار کہلاتا ہے اور اس کے لیے دین کا فیض اور نعمت ہے۔ اس کے برعکس شاہی حکومت صرف خسرو پرویز اور ایران کے عظیم شہنشاہوں کی حکمت عملی ہی پر چل کر کی جا سکتی ہے۔ جو شخص بھی ان کی حکمت عملی اور نظریوں کی تقلید کرتا ہے اور ان کی زندگی کے طور طریق کو اختیار کرتا ہے وہ بادشاہت اور حکومت حاصل کرلے گا۔ اس کے بعد عوام اس کے مطیع ہوں گے اور اس دنیا میں اس کے احکام جاری ہوں گے۔ رسولِ اکرم حضرت محمد کی سنت اور ان کی حیات اور رہن سہن کے طریقہ میں اور ایرانی شہنشاہوں کے رسم و رواج اور ان کی زندگی اور رہن سہن کے طور طریق میں مکمل تناقض اور قطعاً تضاد ہے۔

جب خلفائے راشدین کے عہد میں ملک ایران و شام فتح ہوئے تو ابوبکر، عمر، عثمان، اور علی سلطان، حکمراں اور اعلیٰ ترین حاکم بنے اور اپنے دین کی کاملیت کی وجہ سے انھوں نے اپنی زندگیوں کو خطرہ میں ڈال دیا۔ اور رسولِ اکرم کی حیات اور رہن سہن کے طریقہ، ان کے تقویٰ اور درویشی اور ان کے عوام کے ساتھ پیش آنے کے اصولوں سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹے۔ انھوں نے ایرانی شہنشاہوں کی سیاسی تدبیروں اور روایات کو اختیار نہیں کیا جو کہ حکومت اور بادشاہت کے لیے ضروری ہیں اور تمام قدیم اور موجودہ قرنوں میں تنہا وہی رسولِ اکرم کے معجزہ کی طرح درویشی اور جمشیدی کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ انھوں نے دنیا پر حکومت تو کی لیکن خود چیتھڑے پہنے، مفلس رہے، اور فاقے کیے۔ اس کے باوجود عمر، عثمان اور علی کو ناعاقبت اندیش، دین داروں نے شہید کر دیا۔

ان کے بعد عالم اسلام کے خلفاء وسلاطین کو دو متضاد صورتوں کا سامنا کرنا پڑا اور دونوں ہی دین و دولت دونوں کے لیے ضروری تھیں۔ اگر وہ رسول اکرم کی سنت اور ان کے طریقۂ حیات کی پیروی کرتے ہیں تو ان کے لیے بادشاہت اور حکومت دونوں ناممکن ہوں گی۔ اس کے برخلاف اگر وہ اپنے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پہننے اور اپنی زندگی کے عام طور طریق میں ایرانی شہنشاہوں کی پالیسی پر چلتے ہیں جو سرکشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے، باغیوں کو کچل دیتی ہے اور احکام سلطنت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے تو رسول اکرم کی سنتوں سے، جو ایمان کا سنگ بنیاد اور اساس ہیں، انحراف کرنا ضروری ہو جائے گا۔

سلاطین اور ان کے مصاحبین کے اطوار پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ نبوت دین کا کامل نمونہ ہے اور بادشاہت دنیوی اقبال کا انتہائی درجہ ہے یہ دونوں انتہائیں ایک دوسرے کی ضد اور نفی ہیں اور ان کا یکجا ہونا ممکنات کی حدود سے باہر ہے۔

خدا کی بندگی دین کی لازمی شرط ہے اور عجز، التجا، بیکسی، افلاس، انکسار، نفس کشی عسرت اور اشک بندگی کی ضروری شرائط ہیں۔ اس کے برعکس بادشاہت، جو کہ دنیاوی اقبال کا عروج ہے، کے لوازم طاقت، فخر، عدیم المثال حیثیت، عیش وعشرت، خودستائی، دوسروں کا استخفاف، شان وشوکت اور وقار وتمکنت ہیں۔ یہاں جو خوبیاں گنائی گئی ہیں وہ اللہ کے اوصاف ہیں، اور چوں کہ بادشاہ خدا کی نیابت اور خلافت ہے اس لیے بندگی کے اوصاف اختیار کر کے سلطان ہونا ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا عالم اسلام کے حکمرانوں کے لیے ایرانی شہنشاہوں کے طرز عمل پر چلنا ضروری ہو گیا تاکہ قرآن کی عظمت اسلام کی برتری، صداقت کی قوت، دین کے مخالفین اور حریفوں کی بیخ کنی، دین کے احکام کے نفاذ اور اپنے اقتدار کے قیام کو یقینی کر دیا جائے۔ انھوں نے اپنی طاقت قائم کرنے کے لیے خدا کے منکروں (ایرانی شہنشاہوں) کے طریقۂ عمل کو اختیار کیا ہے تاکہ دین کی ترقی وتحفظ اور کلام الٰہی کی بلندی کے لیے مستقل جہاد کے ذریعے بت پرستی اور شرک کو ختم کر کے اور دشمنان دین کو مار کر اور قتل کر کے اسلام کا اقبال بلند کرنے کے لیے وہ اپنے اقتدار اور طاقت کو استعمال کر سکیں۔

تاہم اسلام ایرانی شہنشاہوں سے سرزد ہوئی بے انصافیوں کو قطعاً ممنوع اور ناجائز قرار دیتا ہے۔

لیکن جس طرح سڑا ہوا گوشت کھانا ممنوع ہونے کے باوجود سخت ضرورت کے وقت مباح ہے اسی طرح ایران کے غیر اہل کتاب شہنشاہوں کی رسوم و روایات جیسے تخت وتاج، رتبہ کی یگانگت، فخر وتکبر، کم آمیزی، دربار سلطانی میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب، اونچے عالیشان محل، آداب دربار، لوگوں سے سلطان کو سجدہ کرنے کے لیے کہنا، خزانے بھرنا، ملک ومال کا غلط استعمال، سونے کے زیورات اور جواہرات اور ریشمی کپڑے زیب تن کرنا،

اور دوسروں سے بھی وہی پہننے کو کہنا، مصلحت ریاست کی بنیاد پر لوگوں کو سزائے موت دینا۔ بڑے بڑے حرم رکھنا، کسی حق کے بغیر لاپرواہی سے خرچ کرنا، مالک کو میراث کے کسی دعوہ کے بغیر قبضہ میں کرنا ان سب باتوں کو صداقت اور سچے ایمان کے نقطہ نظر سے سخت ضرورت کے وقت سڑے ہوئے گوشت کھانے کے مانند مباح تعبیر کرنا چاہیے۔ دیندار سلاطین کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے کاموں سے خائف اور پشیمان رہیں جو دین کے لیے خطرہ ہیں وہ راتوں کو گریہ وزاری کر کے خدا سے بخشش کی فریاد کریں۔ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہت کے تمام رواج اور طریقے رسولؐ اکرم کی سنتوں سے انحراف ہیں اور اس خلاف ورزی میں وہ اور ان کے پیرو اور ان کے خدمت گار سب شامل ہیں ربربی اس سے آگاہ کرتا ہے کہ رسولؐ اکرم چھری سے کاٹ کر گوشت تناول نہیں فرماتے تھے کیوں کہ یہ ایرانی شہنشاہوں کا طریقہ تھا)

لہٰذا اے محمود کے فرزندو، تمہیں یہ بخوبی معلوم ہو جانا چاہیے کہ ایرانی شہنشاہوں کی روایات کی تقلید کے بغیر بادشاہت ممکن نہیں ہے اور تمام عالم دین اس سے واقف ہیں کہ یہ روایات رسولؐ اکرم کی سنتوں اور ان کے اسوہ کے منافی ہیں۔

(چنانچہ کوئی بھی سلطان جو ان روایات کو اختیار کرتا ہے اسے اس وقت تک اپنے کو مسلمان تصور نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی نجات، کی کوئی معقول امیدیں وابستہ کرنا چاہیے جب تک کہ وہ خاص مقاصد کے حصول کے لیے اپنے اختیارات استعمال نہیں کرتا جن کا برنی اس طرح تعین کرتا ہے:۔ دین اسلام کا تحفظ کرنا، قرآن پاک کو بلند کرنا، دین کے اوامر و نواہی کا نفاذ کرنا۔ بت پرستی اور شرک کو کچلنا، بدعتوں اور ان کے بانیوں کو ختم کرنا، شریعت کی نافرمانی کرنے والوں کو نیست و نابود کرنا، بہتّر فرقوں کو شریعت کا پابند بنانا، ضرورت کے علاوہ کسی بُت پرست، مشرک یا بدعتوں کے بانیوں کی ملک میں عزت کرنے کی اجازت نہ دینا، مظلوموں کو بچانا اور عدل قائم کرنا۔

عالم اسلام کے سلاطین کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جب کہ پوری سلطنت میں کچھ لوگوں کا مندرجہ ذیل احکام سے لرز جانا ممکن ہے کہ "اللہ کا حکم ہے، رسولؐ اکرم کا حکم ہے، اور علما، دین کا حکم ہے"، لیکن زیادہ تر عوام صرف سلطان کے خوف، اس کے طاقت وجبر اور اس کی برہنہ شمشیر سے کانپتے ہیں۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا ہے کہ "قرآن کے نسبتاً سلطان سے خوف کھانے والے کہیں زیادہ ہیں"۔ کیوں کہ خوف قرآن سچے ایمان کا نتیجہ ہے اور سچا ایمان اس دور میں سرخ گندھک کی طرح کمیاب ہے۔ لہٰذا اگر سلطان اپنے طاقت وجبر سے بہتر فرقوں کے معاملات میں عدل و انصاف قائم نہیں کرتا ہے تو اس کی قوت اور اقتدار فضول تصوّر کیے جائیں گے۔

(اس نصیحت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی گئی ہیں (۱) امیر المومنین حضرت عمرؓ کی قائم کی قیمتوں کی سند میں، جنھوں نے مدینہ کے گرد وپیش میں پچاس ہزار دستے مقرر کیے تھے، تاریخ مآثر صحابہ کو نقل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک معقول خیال کا اضافہ کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے: "کم قیمتیں خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔ لیکن وہ سلطانوں کے عدل، عمدہ انتظام، اور کوششوں پر منحصر ہوتی ہیں، خدا دودھ اور چاول کا پیدا کرنے والا ہے لیکن انھیں برتن میں رکھنا اور پکانا آدمی کا کام ہے۔" (۲) اس کے بعد قبل اسلام کے ایرانی وزیروں کے غلہ کا ذخیرہ کرنے اور گھوڑوں کی بکثرت فراہمی کے اقدامات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن کوئی سند پیش نہیں کی گئی ہے۔)

نصیحت ۱۰

سلطان کے وقت (کی اہمیت) کے بارے میں

(اس نصیحت میں برنی نے پچھلی باتوں کی تکرار کی ہے۔ کچھ عام باتیں ہیں جو ہر اس شخص کے دماغ میں آجائیں گی جو اس موضوع پر غور وخوض کرنے کی کوشش کرے گا۔ مندرجہ ذیل پیراگراف کافی ہوگا)

سلطان کی اپنی عنایت کے اعتراف کے سلسلہ کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ وہ وقت کی اہمیت محسوس کرتا ہے اور اپنے وقت کو، جو کسی دوسرے کے وقت سے زیادہ قیمتی ہے، برباد نہیں کرتا۔ امور حکومت اور انتظامیہ میں اسے اس طرح مصروف رہنا چاہیے کہ خدا سے قربت حاصل ہوجائے اور اس طرح رضاء الٰہی کا وسیلہ اس کے ہاتھوں میں آجائے۔ وہ اپنی بیش قیمت زندگی کو لذتوں کی نذر نہ کرے۔ لیکن سلطان کے لیے اپنے فرائض منصبی کی طرف مناسب طریقہ سے متوجہ ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ دن اور رات دونوں کے لیے اپنے وقت کا سختی سے تعین نہیں کرتا اور ہر کام کے لیے ایک مدت مقرر کرتا ہے اور اس مقررہ مدت میں اس مخصوص کام کو چھوڑ کر کسی دوسرے کام کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ جہاں تک ممکن ہو اسے صرف حکومت کے کاروبار کی طرف ہی متوجہ ہونا چاہیے اور بیہودگیوں، عشق بازیوں اور بے کار باتوں میں اپنی بیش قیمت زندگی نہیں گنوانا چاہیے۔

(اس نصیحت کے سلسلے میں دو مثالیں دی گئی ہیں (۱) امام محمد اسحاقؒ کی تاریخ مآثر صحابہ کی سند پر یہ کہا گیا ہے

لہ امام محمد اسحاق:۔ امام ابو عبداللہ محمد اسحاق رسولؐ اکرم کی سیرت اور مغازی کے قدیم ترین مصنفین (باقی صفحہ پر)

کہ صحابی ابو حذیفہ نے بازنطینی شہنشاہ کو حضرت عمر کی روزانہ زندگی کے بارے میں حسب ذیل بیان دیا)

" اول صبح میں امیرالمومنین مسجد نبوی میں فجر کی نماز میں صحابہ کی امامت کرتے ہیں اور قرآن کے ایک طویل سورہ کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں کہ سامعین کے ذہنوں میں اللہ کی ذات سے امید اور خوف دونوں جاگ جائیں۔ اس کے بعد سورج کے طلوع ہونے تک، جو کہ ان کی نماز اشراق (گھٹنوں کے بل کھڑے ہوکر) ادا کرنے کا وقت ہے، وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور اپنے اوراد ادا کرتے ہیں۔

" اس وقت تک لوگ ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ امیرالمومنین ان کے سامنے اپنی مسند اس طرح سنبھالتے ہیں کہ ان کی پشت مسجد کے در کی طرف رہتی ہے۔ وہ صحابہ کو طلب کرتے ہیں اور ان کے خلیفہ بننے سے پہلے انھیں جو تقدم حاصل تھا اس کے مطابق وہ اپنی نشستیں سنبھالتے ہیں اس کے بعد صحابہ کے صلاح و مشورہ سے کارروائی (حسب ذیل ترتیب سے) شروع ہوتی ہے۔

" امیرالمومنین تمام عالم اسلام سے آئی ہوئی واقعات کی رُوداد اور صوبائی امراء کی عرض داشت پڑھتے ہیں۔ جو اشخاص ان کے تقریباً ہم رتبہ ہیں انھیں امیرالمومنین اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور ان کے احکامات ان الفاظ سے شروع ہوتے ہیں " از طرف عبداللہ، خلیفۃ المومنین اور خادم المسلمین "۔ عثمان بن عفان، جو رسولؐ اکرم کے ذوالنورین ہیں، امیرالمومنین کی طرف سے دوسرے تمام اشخاص کو لکھتے ہیں۔

" بعدازاں امیرالمومنین خراج، جزیہ اور مال غنیمت سے اگر کوئی رقم موصول ہوئی ہے تو اس کے بارے میں تفتیش کرتے ہیں۔ اکثر وہ اس رقم کو صحابہ کے مکانوں پر بھیج دیتے ہیں لیکن اہل بیت کرام اور بنی ہاشم میں رسولؐ اکرم کے اعزہ کو تقدم دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد امیرالمومنین مدینہ کے لوگوں کے ان قانونی جھگڑوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ کی حقیقت کے بارے میں تحقیق و تفتیش کرتے ہیں اور قانون خدا و رسولؐ کے مطابق فیصلہ سناتے ہیں اگر کسی مقدمہ کے حقائق صاف طور سے ثابت نہیں

بقیہ حاشیہ: میں سے ہیں۔ امام کے دادا یاسار کو ۶۳۳ء میں عراق سے پکڑ کر مدینہ لایا گیا تھا اور امام مدینہ میں جوان ہوئے اور اسی شہر میں اپنی کتابوں کے لیے مواد جمع کیا۔ لیکن کچھ علمائے دین کی تنقید کے باعث جنھوں نے انھیں شیعہ کہا، وہ مصر منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ بعدازاں خلیفہ منصور نے انھیں بغداد بلالیا اور وہیں ۷۶۰ء کے قریب ان کا انتقال ہوگیا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ امام نے رسول اکرم کی سیرت پر دو جلدیں تیار کیں اور خلفاء راشدین کی تاریخ بھی لکھی۔ بدقسمتی سے ان کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔ لیکن طبری نے اپنی مشہور تاریخ میں امام اسحاق کی تصنیف کے کافی اقتباسات محفوظ کیے ہیں۔ اور ابن ہشام نے بھی جو اپنے ایک شاگرد کے ذریعہ ابن اسحاق کی تصانیف سے واقف تھا، اپنی مشہور (باقی صفحہ ۱۱۰ پر)

ہو جاتے تو وہ انھیں مزید چھان بین کے لیے روک رکھتے ہیں۔

(بعد ازاں وہ بیت المال اور لشکر کی طرف توجہ کرتے ہیں)

"بیت المال سے وہ ان لوگوں کے لیے رقم کی ادائیگی کے احکام دیتے ہیں جو اس کے مستحق ہیں۔ گھوڑوں اور اونٹوں کی حالت کے بارے میں چھان بین کی جاتی ہے اور بیت المال کو ان کے چارہ اور دوسری ضرورتوں کے لیے احکام بھیجے جاتے ہیں۔ اگر کسی صوبہ میں فوجی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے تو امیر المومنین فوجی دستوں کو مسلح کر کے بھیجتے ہیں۔ قبائلی شیوخ اور فوجی سپہ سالاروں سے اس لشکر کی حالت کے بارے میں استفسار کیا جاتا ہے جسے امیر المومنین نے مدینہ کے گرد و پیش میں مقرر کیا ہے، اور مناسب احکام جاری کیے جاتے ہیں"

"اگر امیر المومنین کے سامنے کسی شخص کے اعمال بد کے بارے میں شکایت کی جاتی ہے تو ملزم اگر مدینہ ہی میں ہے تب اسے فوری طلب کیا جاتا ہے اور امیر المومنین (کافی تحقیقات کے بعد) مجرم کو خواہ وہ امیر المومنین کا بیٹا یا بھائی ہی ہو، ایسی سزا دیتے ہیں جو دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ اگر ملزم مدینہ میں نہیں ہے تو امیر المومنین مظلوم مدعی کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس ملزم کو طلب کرنے کے لیے کسی سخت قاصد کو روانہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد امیر المومنین مدد کے لیے مستحق لوگوں اور لشکر کے ہم رکاب سپاہیوں کے اعزہ کے بارے میں دریافت حال کرتے ہیں۔ وہ بذات خود اس بات کا معائنہ کرتے ہیں کہ آیا قبیلہ کی ضرورت پوری کی جا رہی ہے۔ انھوں نے صحابہ سے بھی گزارش کی ہے کہ وہ مستقل ایسے اشخاص کے بارے میں تحقیق کرتے رہیں جو مدد کے مستحق ہیں اور انھیں خلیفہ کے علم میں لاتے رہیں۔

"زوال کے وقت لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

"اگر امیر المومنین روزہ سے نہیں ہیں تو اپنے مکان چلے جاتے ہیں، اپنی نجی آمدنی سے سوکھی روٹی کھاتے ہیں اور مختصر سا قیلولہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مسجد واپس آ جاتے ہیں اور اول وقت میں نہایت سکون اور اطمینان سے نماز ظہر ادا کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ روزہ سے ہوتے ہیں تو اپنے مکان نہیں جاتے بلکہ مسجد کے ایک گوشہ میں اینٹ پر سر رکھ کر ایک ٹاٹ کے ٹکڑے پر لیٹ جاتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ: تصنیف سیرت رسول اللہ کی تکمیل میں ابن اسحاق کی تصانیف بھی استعمال کی ہیں (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج دوم، ۳۹۰، ۳۸۹) ظاہر ہے کہ یہاں بربنی ابو اسحاق سے منسوب کسی بعد کی تصنیف کا حوالہ دے رہا ہے قدیم اسلامی عہد کی کئی کتابوں میں ابو حذیفہ کی بازنطینی شہنشاہ کے ساتھ گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے۔

امیرالمومنین ہرروز دو اونٹوں کی قربانی کرتے ہیں اور ان کا گوشت پکواتے ہیں۔ بسا اوقات وہ قبل ظہر اپنے سامنے کھانا رکھ کر مسافروں، غریبوں اور محتاجوں کو کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ خود ہی ان کے سامنے کھانا چنتے ہیں اور کھانا شروع ہونے سے پہلے اور اس کے بعد خود ہی ان کے ہاتھ دھلاتے ہیں۔

"بعد نماز ظہر امیرالمومنین دوبارہ حکومت کے کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حدود اللہ[۱] اور شریعت کی خلاف ورزی کے خلاف بیشتر سزائیں اسی وقت . . . . دی جاتی ہیں کبھی کبھی نماز ظہر ادا کرنے کے بعد امیرالمومنین اپنے ہاتھ میں کوڑا لے کر پیدل ہی بازار کی طرف نکل جاتے ہیں ان کا رعب اور دبدبہ لوگوں میں سرایت کر گیا ہے اور دکان دار ان سے لرزتے ہیں۔ انھوں نے تمام تاجروں کو زائد قیمتوں پر فروخت کرنے، دھوکہ وفریب دینے، احتکار کرنے اور شرمناک طریقے اختیار کرنے کے خلاف تنبیہ کی ہے۔ اگر تمہیں ایسے جرائم کا ثبوت ملا تو شریعت کے احکام کے مطابق غلطی کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ اگر احتکار کا کوئی معاملہ ان کے سامنے آتا ہے تو وہ احتکار والی اشیاء کو ضبط کرنے اور فروخت کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اس سے حاصل ہونے والی رقم لشکر کے گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے چارہ خریدنے کے کام میں لائی جاتی ہے۔ اگر زائد قیمتوں پر اشیا فروخت ہوتی ہیں یا خرید و فروخت میں شرمناک فریب دہی ہوتی ہے تو وہ دکان داروں کو سخت سزا دیتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے دُرّے لگاتے ہیں۔

"نماز مغرب کے قریب امیرالمومنین گرم اور پسینہ سے شرابور مسجد واپس ہو کر دروازہ پر وضو کرتے ہیں اور نماز میں جماعت کی امامت کرتے ہیں۔ مغرب کی نماز ادا کر کے وہ نوافل اوّابین (بیس مرتبہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر) ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر وہ مسجد کے در کی طرف اپنی پشت کر کے بیٹھتے ہیں اور صحابہ ان کے گرد اپنی نشستیں سنبھالتے ہیں شب کے تیسرے پہر تک وہ رسول اکرم کے نیک اعمال، اوصاف، مشفقانہ برتاؤ اور ان مغازی کے بارے میں جن میں وہ شریک تھے، باتیں کرتے ہیں۔ صحابہ کرام رسولؐ اکرم سے اپنی جدائی پر روتے ہیں اور ان کے دل سے نکلے ہوئے آنسو آنکھوں سے رواں ہوتے ہیں۔ وہ کئی کئی بار رسولؐ اکرم کے روضہ پر حاضری دیتے ہیں اور ایسے مواقع پر رسولؐ اکرم کے لیے ان

---

[۱] حدود اللہ: قرآن کہتا ہے "یہ حدود اللہ ہیں لہٰذا ان کی خلاف ورزی نہ کرو اور اگر کوئی اشخاص اللہ کی عائد کی ہوئی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو وہ ظالم ہیں" (سورہ ۲، آیت ۲۲۹) وہ تمام جرائم جن کے لیے قرآن نے سزا تجویز کی ہے دوسرے جرائم سے مختلف ہیں کیوں کہ وہ حدود اللہ کو توڑتے ہیں (ح)

ان کے والہانہ لگاؤ کے باعث ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی روحیں ان کے جسموں سے نکلنے والی ہوں۔

"امیر المومنین جماعت کے ساتھ نماز عشاء ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے مکان جاتے ہیں اور اپنے خاندان کی ضرورتوں پر توجہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے مکان پر کوئی کام نہیں ہے اور اہل بیت کرام کے کسی فرد نے ان سے کوئی بھی کام کرنے کو نہیں کہا تو وہ اپنے ہاتھ میں کوڑا لے کر اپنے دو یا تین رفیقوں کو ان کے گھروں سے لے کر نصف، چوتھائی یا چوتھائی شب چوکیداروں کی طرح مدینہ میں گشت کرتے ہیں۔ اس گشت کے دوران وہ یتیموں، بیواؤں، بیماروں، محتاجوں اور مظلوموں کی حالت دریافت کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو ضرورت مند محسوس کرتے ہیں تو اسی جگہ اس کے لیے امدادی رقم مقرر کر دیتے ہیں اور یہ ہدایت کرتے ہیں کہ اگلی صبح بیت المال سے اسے پیسہ بھیجدیا جائے۔ امیر المومنین نے رسولؐ اکرم کے زیر سایہ تربیت پائی ہے اور وہ رسولؐ اکرم کے اوصاف سے منور ہیں۔"

(دوسری مثال خراسان کے ایک بادشاہ آرزو شاہ کے بارے میں ہے۔ وہ اس قدر سرکش تھا اور غلط مشورہ پر چلتا تھا کہ اس نے اپنی فوجیں جمع کیں اور گرمی کے اختتام پر جب کہ برسات[1] قریب تھی ایک دشمن کے خلاف کوچ کر دیا۔ لیکن دشمن ہوشیار تھا لہٰذا وہ آرزو سے جنگ کرنے کے لیے اپنے دارالسلطنت سے باہر نہیں آیا۔ فوراً ہی برسات شروع ہوگئی۔ بارش کی جھڑی لگ گئی اور ہر چھوٹا نالہ ندی بن گیا۔ آرزو کے سپاہی اس کے لشکر سے بھاگ نکلے اور خود دشمن کے قبضہ میں چلا گیا۔

نصیحت ۱۱

مرکز میں حق و صداقت کے قیام کے بارے میں

(۱) نظریۂ تناقص: منفیات کا اتفاق ناممکن ہے کیوں کہ دو منفی قوتوں میں سے کوئی بھی اپنی مخالف ضد کو

---

[1] برشکال۔ مانسون یا موسم برسات (برشکال، برکھا رت، برسات) ہندوستان کی ایک خصوصیت ہے۔ ایرانی صوبہ فارس میں معمولی سا مانسون آجاتا ہے لیکن باقی ایران، افغانستان، وسط ایشیا اور ترکستان میں مانسون بالکل نامعلوم تسے ہے۔ برطانوی قونصل خانہ کے محفوظ کیے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق اس علاقہ میں بارش کا اوسط تقریباً چار انچ سالانہ ہے اور اس کی نوعیت طوفانی ہے۔ ان علاقوں سے آنے والا کوئی بھی تارک وطن برنی کو اس معروف حقیقت کے بارے میں بتا سکتا تھا بہت سے لوگ منگولوں کی ہیبت سے عجم سے ہندوستان آئے تھے اس کے باوجود برنی اتنا بے خبر اور بھولکڑ ہے کہ وہ فتاویٰ جہانداری میں چار مرتبہ برشکال کا حوالہ برسات کے (باقی صفحہ پر)

قطعاً ناپید نہیں کرسکتی۔)

سلطان محمود نے کہا ہے: اے محمود کے فرزندو اور سلاطین عالم اسلام، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ چونکہ سلطان کی سرگرمیاں محض اپنی جسمانی خواہشات کی تسکین تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں امور حکومت بھی شامل ہیں لہٰذا وہ خدا کی صفات میں شرکت کا دعویدار ہوتا ہے۔ اس کی نجات اور روحانی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ اس طرح کے انتظامات رائج نہیں کرتا جن سے مرکز میں حق وصداقت قائم ہو۔ اور اس کی حکومت کی قوت سے رسولؐ اکرم کے دین کی بلندی ہو۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مرکز میں حق وصداقت کے قیام کا یہ مطلب نہیں کہ باطل قطعی طور پر معدوم ہوجائے اور دنیا میں صداقت ہی باقی رہے۔ اس کا جواز یہ ہے کہ خود قادر مطلق نے کہا ہے کہ "ہم نے ہر چیز کا جوڑ پیدا کیا ہے" یعنی تمام چیزوں کے (مخالف) جوڑے ہیں اور ایک چیز پیدا کرنے کے بعد اس کی ضد پیدا کردی گئی ہے۔ صداقت کی ضد میں انھوں نے باطل پیدا کردیا ہے اور امن کی ضد میں بدامنی، نیکی کے روز میں بدی پیدا کی گئی ہے۔ خدا کے زہد اور خشیت الٰہی کی ضد معصیت ہے اور اطاعت کی ضد نافرمانی ہے۔ اسی طرح رات و دن، نور و ظلمت، زمین و آسمان، دین داری و بے دینی، خدا پرستی اور اصنام پرستی مخالف جوڑوں میں اور ایک دوسرے کے پرتو تخلیق کیے ہیں۔

مندرجہ بالا بات کا مقصد اس طرح ہے۔ مرکز میں صداقت کے قیام کا یہ مطلب نہیں کہ باطل کو بالکل ناپید کردیا جائے۔ اگر تمام انبیاء اور مسلم سلاطین متحد ہوکر اس دنیا سے، جس میں کفر، بدامنی، گناہ اور بدکاری شامل ہیں باطل کا خاتمہ کرنے کی کوشش کریں تاکہ صرف صداقت قائم ہوسکے جس کا مطلب اسلام، امن اور اطاعت کا قیام ہے اور نیکی غالب آسکے تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ ایسا نہیں کرپائیں گے۔ یہ تو دائرہ امکان ہی میں نہیں کہ اس زمین پر نیکی ہی نیکی ہو اور کوئی بدی نہ ہو، صرف امن ہو اور بدامنی نہ ہو، صرف اسلام اور خدا پرستی ہو اور کفر اور اصنام پرستی نہ ہو، باطل کے وجود ہی میں صداقت منعکس ہوتی ہے، نیکی کا پرتو بدی کے وجود میں نظر آتا ہے۔ اسلام کفر کے وجود سے نمایاں ہوتا ہے اور خدا پرستی اصنام پرستی کے وجود سے نمایاں ہوتی ہے۔ پس یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ صداقت ہے اور یہ باطل، یہ نیکی ہے اور یہ بدی، یہ اسلام ہے اور یہ کفر، یہ خدا پرستی ہے اور یہ اصنام پرستی، تمام چیزیں اپنی ضدوں کی وجہ سے شناخت ہوجاتی ہیں۔

نیز اگر 'باطل' میں، جس کی علامات شر پسندی، کفر، اصنام پرستی، بدامنی اور گناہ ہیں، کوئی ایسی دانش مندی نہیں ہوتی جسے ہم نہ سمجھ سکتے تو خدا نے اسے پیدا نہ کیا ہوتا۔ جہنم بھی، جس کا پیٹ باطل لوگ ہی بھریں گے، نہ پیدا

تقسیم سلطنتیں: بجائے ہندوستان کے انسانوں کی شکل میں دیتا ہے۔

کی جاتی کیوں کہ قادر مطلق نے کہا ہے کہ ہم جہنم کو جنوں اور آدمیوں سے بھر دیں گے[1]۔

یہ تو انسانی تصور سے باہر ہے کہ حسب ذیل چیزیں قطعاً خارج کر دی جائیں اور دنیا سے مفقود ہو جائیں جیسے کفر، اصنام پرستی، بدکاری، شر، باطل، سیاہ کاری، دروغ گوئی، جعلی سکّے چلانا، نشہ، زنا، اغلام بازی، غصہ، معصوم لوگوں کو پھانسنا، ناانصافی، ظلم، دوسروں پر غیر قانونی طور پر قابو پانا، غبن، سرکشی، بدامنی، عدل کی حدود سے تجاوز، عداوت، بغاوت، نافرمانی، بے ایمانی، دھوکہ فریب، غلط بیانی، والدین کے حقوق مارنا، نافرماں برداری، جھوٹے الزامات تراشنا، بہتان لگانا، بدکلامی، بدگوئی، تہمت، ناپرہیزگاری، حسد، بدنیتی، خودداری کی کمی، بے شرمی، غداری، چوری، بغاوت انگیز رویہ، شاہراہ پر ڈاکہ زنی، سود خوری، احتکار، احسان فراموشی، حقوق تسلیم نہ کرنا، اشیاء میں ملاوٹ، غیر قانونی اور ناپسندیدہ کاموں کا ارتکاب یا کہ کافر، اصنام پرست اور بدمذہب، بددین اور بدعقیدہ، بدعتی، اور رسول اکرم کی شریعت کی نافرمانی کرنے والے باغی اور شر پسند بالکل نیست و نابود کر دیے جائیں یا کہ تمام ریاستیں ایک سلطنت میں متحد ہو جائیں اور تمام باطل مذاہب تہ و بالا کر دئے جائیں۔

انبیاء کی ہدایت اور تعلیم یا مسلم سلاطین کے اثر، طاقت اور دبدبہ سے بدی کا مکمل خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ اس کا جواز یہ ہے کہ انسان کی فطرت متضاد خوبیوں سے بنائی گئی ہے اس کے اندر اچھائیاں بھی ہیں اور گھٹیاپن بھی۔ روز ازل ہی میں قلم الٰہی نے اصل اعمال نامہ میں اسلام یا کفر پر چلنے والوں کے حصہ میں نیکی یا بدکاری، ہدایت یا گمراہی، اطاعت یا گناہ گاری لکھ دی۔ لہٰذا گناہوں اور بدیوں کا مکمل اخراج ناممکن باتوں میں ہے اور اس کا حصول ممکن نہیں۔ اسے محض حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ مرکز میں صداقت کے قیام، کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ صداقت باطل پر حاوی ہو جائے اور باطل صداقت پر حاوی نہ ہونے پائے تاکہ اصنام پرستی اور کفر کو ذلیل و رسوا کر کے صداقت اور اسلام کی بلندی و عظمت کا اعلان ہو جائے۔

اب پیش نظر جو بات ہے وہ یہ کہ جب کبھی سلطان نیک ارادوں اور مصمم حوصلہ اور ضروری انتظامات کے ساتھ بمعہ اپنے تمام حامیوں اور پیروؤں اور اپنی حکومت کے دبدبہ، طاقت و اثر اور اس احساس کے ساتھ کہ اس کے دین اور اس کی ریاست کا اولین مقصد رسول اکرم کے دین کا اقبال ہے، انتہائی جدوجہد کرتا ہے تو حسب ذیل مقاصد تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ دارالسلطنت اور صوبوں میں نیک کام کرنے کے احکام اور برے کام کی ممانعتوں کی اطاعت کی عادت نمایاں ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اسلام کی روایات

---

[1] قرآن، سورہ ۳۲، آیت ۱۳۔

وقتاً فوقتاً بلند و بالا ہوتی رہتی ہیں۔ نیکی اور صداقت شعاری بڑھ جاتی ہیں اور نوبت کی چوٹ پر اخلاص و اطاعت ظاہر ہو جاتی ہیں، گناہ اور ناپرہیزگاریاں، معصیتیں اور بدکاریاں دب جاتی ہیں اور چوری چھپے رہتی ہیں۔ عدل و مہربانی کا ہر سو چرچا ہوتا ہے اور جبر و ظلم بظاہر غائب ہو جاتے ہیں اور راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ سنت و جماعت کے علوم لوگوں کے قلوب کو عزیز محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اور ان کے ذہن بدعتوں، بدعتوں کے علم اور بدعتی تصانیف سے ہٹ جاتے ہیں۔ دیندار لوگ اور دین کے محافظ درجۂ امتیاز اور اعلیٰ منصب حاصل کرتے ہیں جب کہ بدارادوں، بدعقائد، بدمذاہب، بدعتوں کے بانی اور ایمان کے دشمن لوگ ذلیل، محتاج، قابل نفرین اور ہیچ ہو جاتے ہیں۔ دین کے نیک کام رائج ہوتے ہیں اور شریعت پر عقیدہ نہ رکھنے والے ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ وہ چیزیں جنھیں دین نے ناپسند کیا ہے اور ممنوع قرار دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کبھی تھیں ہی نہیں۔ خدا اور نبی کی محبت ملت اسلام کے دل میں مضبوط ہو جاتی ہے اور اس دنیا کی محبت، جو راہ صدق میں پریشانی کا ایک ذریعہ اور شر اور بدی کی طرف راغب کرنے کا باعث ہے، ہر ایک کے دل میں کم ہو جاتی ہے۔ دوسری دنیا کی تمنا لوگوں کے دل میں بڑھ جاتی ہے اور دنیاوی خواہشات سے تنفر اور ان سے توبہ کی ترغیب ہوتی ہے۔ انسان کی فطری خوبیاں اس کے برے رجحانات پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ صداقت حسین اور حسن سے آراستہ ہو جاتی ہے اور راست گو عزت پاتے ہیں اور جھوٹے ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ سادات، علمائے دین، مشائخ، متقی پرہیزگار، تارک الدنیا، زاہد، گوشہ نشین انسانوں کے دل و دماغ میں برتری، احترام اور امتیاز حاصل کرتے ہیں جب کہ جاہل، شرپسند، بے ایمان، بے شرم اور اپنی عبادات میں سستی دکھانے والے ذلیل، حقیر اور ہیچ ہوتے ہیں۔ جہاد اور معرکوں میں پاک ارادہ عیاں ہوتا ہے اور مجاہدوں اور فاتحوں کے قلوب میں شہادت کا جذبہ روشن ہوتا ہے۔ صداقت اور راست بازی تبسم بکھیرتی ہیں جب کہ بے ایمانی اور فریب اشک بار ہوتے ہیں۔ سچے اور نیک لوگ دین و دنیا کے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں جب کہ ظالم اور بد دماغ یا تو کچل دیے جاتے ہیں یا تبدیلئ خصلت سے وہ سچے اور نیک ہو جاتے ہیں۔ دولت مند خدا کے عاید کیے ہوئے فرائض ادا کرتے ہیں اور انعام و خیرات دینے اور مخیر اداروں کی تعمیر میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کو نظرانداز نہیں کیا جاتا کہ وہ تباہ ہو جائیں بلکہ انھیں بھوک اور برہنگی سے بچایا جاتا ہے۔ معیشت کے ایماندارانہ اور جائز ذرائع کی فراوانی ہوتی ہے اور وہ ذرائع معاش جو ممنوع اور ناپسند کیے جا چکے ہیں یا جن کے متعلق کسی قسم کا شبہ ہے کم ہوتے ہیں اور گوشہ نشین ہو جاتے ہیں تا کہ جس وقت انھیں غلط تشریحات اور بے ایمانی سے حق بجانب ثابت کیا جا رہا ہو تو انھیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ عیاری اور مکاری باعث ذلت ہوتی ہے۔ نیک اور مخیر کام قابل قدر قرار دیے

جاتے ہیں اور برے اور غلط کام زیر زمین جاکر ختم ہو جاتے ہیں۔ خرید و فروخت کے معاملات میں حق و انصاف ظاہر ہوتا ہے اور دلالوں کی کاوشوں کی وجہ سے زائد قیمتوں پر فروخت اور احتکار مفقود ہو جاتے ہیں۔ دکان دار دھوکہ فریب نہیں کرتے اور غلط خرید و فروخت کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں کیوں کہ نہ تو وہ مختلف حیلوں سے معصوم لوگوں کو دھوکہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی اشیاء میں ملاوٹ کر سکتے ہیں۔ خریدار اور فروخت کرنے والے دونوں دلالوں اور سرکاری افسروں کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں جبکہ دلال بذات خود بھی انصاف کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ گناہ اور بدکاری کے پیشوں کو لوگ اتنا ہی غلط سمجھنے لگتے ہیں۔ جتنا کہ کفر کو۔ اور ان کا خاتمہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مطیع اور فرماں بردار بے فکر ہو کر اپنے بستروں پر ٹانگیں پھیلاتے ہیں اور بے چین کی نیند لیتے ہیں جب کہ باغی اور سرکش سلطان کی شمشیر کے خوف سے دن رات لرزتے ہیں۔ امن اور تحفظ عام ہوتا ہے اور لوگوں کے دلوں سے پریشانیاں اور رنجشیں دور ہو جاتی ہیں۔ طاقت ور کمزور کو نہیں دباتے اور ظلم کے ہاتھ ٹوٹ جاتے ہیں۔ راہزنوں کے ہاتھ بطور سزا کاٹ دیے جاتے ہیں۔ خدا سے خائف اور دیانت دار افسروں کی ترقی ہوتی ہے جب کہ دغاباز اور فریبی برطرف کیے جاتے ہیں اور غیر دیانت دار افسروں کو ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔ آبائی آزاد شہریوں اور عالی نسب لوگوں کو عہدے دیے جاتے ہیں اور ادنیٰ اور کمتر لوگوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مکاری، حسد، بدگوئی اور بدنیتی انسانوں کے ذہنوں سے کھرچ دی جاتی ہیں اور ان کی جگہ خلوص اور نیک نیتی لے لیتی ہے۔ مسجدیں، خانقاہیں اور ضیافت خانے بھرے رہتے ہیں۔ بیٹے اپنے والدین کے فرماں بردار ہو جاتے ہیں اور مربیوں کے حقوق دوبارہ محبت سے ادا کیے جاتے ہیں۔ انسانوں کی گفتگو میں صداقت، باندیوں میں صحیح رویہ اور غلاموں میں وفاداری ظاہر ہوتی ہے۔ غریبوں اور حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ بیوائیں اور یتیم تنگی کا شکار نہیں ہوتے۔ مسافر بھوکے نہیں سوتے اور بے خانماں اور آوارہ لوگوں کو گھر واپس جانے کے لیے پیسہ دیا جاتا ہے۔ خواص و عوام کی گفتگو میں خدا کی عنایات کے لیے شکرانہ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور احسان فراموشی کم ہوتی ہے۔ ساہدوں پر پکا بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور وعدے پورے ہوتے ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں بغاوت کا تصور تک نہیں آتا۔ قوانین شریعت اور سلاطین کی طرف سے ملنے والی سزاؤں کے باعث وہ تمام چیزیں جو غیر منصفانہ ممنوع

ل؂ عہد سلطنت میں سلطان اور اعلیٰ عہدیدار دونوں غربا کا پیٹ بھرنے کے لیے ضیافت خانہ، جنھیں لنگر خانہ بھی کہا جاتا تھا، قائم کرتے تھے۔ صوفیاء اور قلندر بھی انھیں قائم کرتے تھے اور ان پر لوگوں سے ملنے والے تحائف خرچ کرتے تھے۔ (رح)

ناپسندیدہ اور اتمناعی ہیں انسانوں کو بری لگنے لگتی ہیں اور آخر میں دین کا احترام گناہوں اور شر کے کھلم کھلا دستور کو دور کر دیتا ہے۔

مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل کے بعد مرکز میں صداقت قائم ہو جاتی ہے۔

۲۱۔ برنی ہندو مذہب کے خلاف کھل کر مقابلہ کرنے کی وکالت کرتا ہے

مسلم سلطان توحید اور اسلام کی بلندی اور برتری اس وقت تک قائم نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے تمام حوصلہ کو یکجا کر کے کفر کو مٹانے اور اس کے قائدوں کو، جو کہ ہندوستان میں برہمن کہلاتے ہیں قتل کرنے کے لیے سخت جد وجہد نہیں کرتا، اسے کافروں کو بے قابو کرنے، ان پر قبضہ کرنے، انھیں غلام بنانے اور ان کا درجہ گرانے کے لیے مضبوط ارادہ کرنا چاہیے۔ سلطان اور اسلام کے مجاہدوں کی تمام طاقت اور قوت مذہبی معرکوں اور جہاد پر مرکوز ہونا چاہیے اور انھیں مہم میں اپنی جانوں کی بازی لگا دینی چاہیے تاکہ دین حق باطل عقیدوں کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہو گا جیسے باطل عقاید کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا کیوں کہ ان کا تمام سحر ٹوٹ چکا ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر مسلم سلطان باوجود اس قدرت اور منصب کے جو خدا نے اسے عطا فرمائے ہیں، ہندوؤں سے محض جزیہ اور خراج وصول کرنے پر اکتفا کرتا ہے اور کافروں اور کفر دونوں کو برقرار رکھتا ہے اور انھیں ختم کرنے میں اپنے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنے سے گریز کرتا ہے تو اس صورت میں سلاطین اسلام اور رائیان کفار کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا؟ کیوں کہ کافر رائیان بھی ہندوؤں سے جو انھیں کے باطل عقیدہ سے وابستہ ہیں، جزیہ اور خراج وصول کرتے ہیں اور اس طرح پیسہ حاصل کر کے اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ درحقیقت وہ محصول سو گنا زیادہ ہی وصول کرتے ہیں۔[1]

نیز یہ کہ اپنی شاہی طاقت اور اثر کے باوجود اگر سلاطین اسلام خراج اور جزیہ کے عوض میں کفار اور کفر برقرار رکھنے پر اکتفا کرتے ہیں تو اس دنیا میں رسول اکرم کی حسب ذیل روایت کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

"مجھے تمام لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ 'لا الہ الا اللہ' کی تصدیق نہ کر دیں۔ لیکن

---

[1] تاریخ فیروز شاہی اور موجودہ تصنیف دونوں میں برنی اس مفروضہ کے ساتھ بحث کرتا ہے کہ 'اہل کتاب' کے برخلاف ہندو جزیہ کی ادائیگی کے باوجود پر امن زندگی کے مستحق نہیں ہیں۔ اس کا طرز خیال امام ابو حنیفہ کے نظریات کے بالکل مخالف ہے لیکن برنی یہ جواز پیش کرتا ہے کہ امام شافعی نے ان کے لیے 'اسلام یا تلوار' کے سوائے کسی چارہ کار کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس موضوع پر امام شافعی کے نظریات پر اس نصیحت کے اختتام پر بحث کی گئی ہے۔

جب وہ اس کی تصدیق کر دیتے ہیں تو قانون اسلام کے تحت (جیسا کہ مسلمانوں میں ہے) ان کے مال وجائداد اور زندگیاں مجھ سے محفوظ ہیں۔"

ایک سو چوبیس ہزار انبیاء بھیجنے میں مشیت الٰہی یہ تھی کہ وہ کفار اور کفر کو مٹائیں اور یہی قدیم اور حالیہ سلاطین کا مقصد رہا ہے۔ لیکن ہمارے رسولؐ اکرم خاتم الانبیاء ہیں لہٰذا اب انبیاء کی تعلیمات کے ذریعہ کفر کا حساب چکانا کسی طرح ممکن نہیں ہے چنانچہ کفار و مشرکین کا خاتمہ اب اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ سلطان تمام ضروری انتظامات کے ساتھ اپنے حوصلہ اور عزم کو اس ایک مقصد پر مرکوز کرے تاکہ اسے دین حق کی بلندی و برتری قائم کرنے سے خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ لیکن اگر سلطان ہندوؤں سے، جو اصنام پرست اور گائے کے گوبر کی پرستش کرنے والے ہیں۔ محض جزیہ اور خراج لینے پر اکتفا کرتا ہے اور ہندو پر سکون ہو کر رسوم کفر برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں تو واقعی کفر کا حساب کبھی نہیں چکیگا۔ مرکز میں صداقت قائم نہیں ہوگی۔ اور کلام الٰہی کا احترام نہیں ہوگا (ایک اور پیراگراف جس میں ان باتوں کو ایسے ہی الفاظ میں دہرایا گیا ہے یہاں شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔)

تاہم یہ ممکن ہے کہ سلاطین اپنی مصمم کوششوں سے پہلے اپنی حکومتوں کو منظم کریں اور اس کے بعد اپنے بلند عزم سے اپنی طاقت ووقار اور اثر کو خطرہ میں ڈال دیں تاکہ دین حق باطل عقائد کو شکست دے کر حاوی ہو جائے۔ اسلامی روایات بلند ہوں اور پروردگار عالم نے جو بھی خاکہ مرتب کیا ہے وہ مرکز میں صداقت کے قیام کے ذریعہ منتقل ہو جائے۔ لیکن سلاطین کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مرکز میں صداقت کے قیام کا کیا مطلب ہے تاکہ وہ اپنی زندگیاں اس کی خاطر جدوجہد کے لیے وقف کر دیں۔ اسے اہم ترین مقصد تصور کریں جس کے حصول کے لیے انھیں اپنی جان کی اور اپنے حامیوں کی بازی لگانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس مہم میں جو کہ انبیاء، خلفاء، اولیاء، صدیقین اور ساتھ ہی امت اسلام کے قدیم اور حالیہ سلاطین کا مقصد رہی ہے۔ اپنی کوششوں کے صلہ میں سلاطین اس دنیا میں اپنے نیک کاموں کے لیے شہرت پائیں گے جو روز محشر تک قائم رہے گی اور آخرت میں ان کا درجہ انبیاء، صدیقین، اولیاء اور مقربین کے درمیان ہوگا اور انھیں اس یقینی فیضان الٰہی میں حصہ ملے گا، "جسے کانوں نے سنا نہیں ہے اور آنکھوں نے دیکھا نہیں ہے"۔ روحانی انعامات کے اضافوں سے، جن کے سلطان حقدار ہیں، بہشت میں ایسے حکمراں مختلف اچھی چیزوں سے فیضیاب ہوں گے جب کہ اس سرزمین کے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت زندہ رہے گی اور ان کے اچھے کام پشتہا پشت تک دہرائے جاتے رہیں گے مسلم سلاطین کی دینی حکمت اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ مرکز میں صداقت قائم کرنے کے لیے اپنی جانوں اور اپنے طاقت واقتدار کی بازی لگا دیں اور دن رات جدوجہد کریں۔ فرزندگان محمود اور سلاطین

اسلام کو معلوم ہونا چاہیے کہ سنی عقیدہ میں صداقت کے قیام کو شاندار علم اور ساتھ شاندار کام بھی تصور کیا جاتا ہے۔ انبیاء کے مقصد حیات کو تشفی کر کے یہ تمام اچھے کاموں سے اعلیٰ تر کام ہے۔

فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام! اگر تمہاری یہ خواہش ہے کہ تم خدا اور رسول اکرم کے سامنے شرمندہ نہ ہو اور تمہارے اعمال نامہ سے جو کچھ تم نے کہا اور کیا ہے جو کچھ تم نے پہنا اور کھایا ہے اس کے متعلق بری باتوں کے بجائے اچھی باتیں لکھی جائیں تو تمہیں اپنے شاہی عزم کے ساتھ کفار و مشرکین اور بدعقیدہ اور بد مذہبوں کی بیخ کنی کرنی چاہیے اور انھیں ذلیل و رسوا کرنا چاہیے تمہیں خدا اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھنا چاہیے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنے طاقت و اقتدار کی بازی لگا دینی چاہیے تاکہ تمہیں خدا اور رسول اکرم حضرت محمد اور تمام انبیاء اور اولیاء کی رضا و خوشنودی حاصل ہو جائے۔ تمہیں کفار سے محض جزیہ اور خراج وصول کرنے پر اکتفا نہیں کرلینا چاہیئے اور اپنے طاقت و اقتدار کے ہوتے ہوئے کفر کو محفوظ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ تمہیں دن رات کفر کو زیر کرنے کی سعی کرنی چاہیے تاکہ (روز محشر میں، تمہیں (قبروں سے) اٹھا کر انبیاء کے درمیان کھڑا کیا جائے اور تم ابد تک دیدار الٰہی سے فیضیاب ہوتے رہو اور تمہیں "خدا کے قریب ہی صدیقین کے درمیان جگہ ملے"

قدیم اور جدید ہر دو عصر کے (اسلامی، علماء دین اور عاقلوں کو یقین تھا کہ اگر مسلم سلاطین اپنی طاقت اور قوت اور اس راستے پر گامزن اپنے تمام حامیوں کی طاقت کے ساتھ جد و جہد کریں گے تو حسب ذیل مقاصد کی تکمیل ہو جائے گی۔ دین حق باطل عقاید پر پوری طرح حاوی ہو جائے گا۔ کلام الٰہی کا احترام ہوگا۔ کفر و شرک کی روایات کمزور پڑیں گی مسلمانوں پر عنایت ہوگی اور انھیں عزت ملے گی۔ کفار اور بددین محتاج اور ذلیل ہوں گے۔ غیر قانونی ریاست اور مخالف عقاید کے احکامات ختم کر دیے جائیں گے۔ بہتر فرقوں پہ قوانین شریعت نافذ ہوں گے اور خدا اور رسول کے دشمن مطعون ہوں گے۔ انھیں دور رکھا جائے گا، ان سے قطع تعلق کر لیا جائے گا اور ان پر رعب رکھا جائے گا۔

(۲۰- برنی یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین بے تعصب ہیں: (الف، ہندو خوش حال ہیں، (ب، مسلمانوں کو گناہ آلود پیشیوں کی چھوٹ ہے اور (ج، فلسفیوں کو تعلیم دینے کی اجازت ہے۔)

لیکن حقیقت و نتیجہ یہ ہے کہ مرکز میں صداقت تمام نہیں ہو سکتی۔ کلام الٰہی کی برتری و بلندی ممکن نہیں ہے اور دین حق بدعقاید پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پارہا کیوں کہ اس سرزمین پر اسلام کے حاصل کیے ہوئے طاقت و اقتدار اور اپنے آبائی دین اسلام کی سات صدیاں گزر جانے کے باوجود سلاطین اسلام اپنے دارالسلطنت اور مسلم شہروں میں رسوم کفر کے رواج کو پروان چڑھنے کا موقع دیتے ہیں۔ وہاں بتوں کی علانیہ

پرستش ہوتی ہے اور لوگ پہلے سے بھی زیادہ جوش وخروش سے کفر کی روایات کے پابند ہو رہے ہیں۔ کفار کھل کر اور بے خوف ہو کر اپنے باطل عقیدہ کے اصولوں کی تعلیم جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے بتوں کو سجاتے سنوارتے ہیں اور تیوہاروں میں ڈھول تاشے بجا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ وہ (کفار) صرف کچھ ٹنکے اور جزیہ ادا کر کے اپنے باطل دین کی کتابوں کی تعلیم دے کر اور ان کتابوں کے احکامات نافذ کر کے کفر کی روایات کو جاری رکھتے ہیں (ان حالات میں اسلام کی روایات کس طرح بلند کی جا سکتی ہیں یا نیکی کے نفوذ اور بدی کی ممانعت کے احکامات کس طرح موثر ہو سکتے ہیں؟

لیکن (ہندوستان کے) مسلم سلاطین کے قلوب کافروں کو ختم کرنے اور بت پرستوں اور مشرکوں کو مار گرانے کے جذبہ سے خالی ہیں۔ اس کے برخلاف اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ کفار اور مشرکین خراج ادا کرتے ہیں اور ذمّی ہیں ان کفار کا احترام ہوتا ہے، انھیں ممتاز کیا جاتا ہے، ان پر عنایت ہوتی ہے اور انھیں برتر کیا جاتا ہے۔ سلاطین انھیں نقارے، علم، زیورات، زربفت و کمخواب کے چوغے اور ساز سے آراستہ گھوڑے عطا کرتے ہیں اور انھیں صوبہ داریاں، اعلیٰ رتبہ اور عہدے دیے جاتے ہیں۔ اور اپنے دارالسلطنت (دہلی) میں جس کی حیثیت کی وجہ سے دوسرے مسلم شہروں کی حیثیت بڑھتی ہے، مسلم سلاطین صرف اسے روا ہی نہیں رکھتے بلکہ انھیں اس وقت بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے جب کفار ومشرکین، بت پرست اور گائے کے گوبر (سرگین) کے پجاری محلوں کی مانند بلند مکان تعمیر کرتے ہیں۔ زربفت کی پوشاک پہنتے ہیں اور سونے چاندی کے ساز سے آراستہ گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے ہیں۔ انھیں ہزارہا طاقت کے ذرائع میسر ہیں۔ وہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنی خدمت میں رکھتے ہیں اور انھیں اپنے گھوڑوں کے سامنے دوڑاتے ہیں۔ غریب مسلمان ان کے در پر ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور اسلام کی سلطنت میں جس کی وجہ سے اسلام کی عمارت بلند وممتاز ہوتی ہے، وہ رائے، رانا، ٹھاکر، سہا، مہتا اور پنڈت کہلاتے ہیں۔

ان حالات میں دین حق باطل عقاید پر کس طرح فتح حاصل کر سکتا ہے یا مرکز میں صداقت کس طرح قائم ہو سکتی ہے؟

...

نیز دین کا تحفظ کرنے اور رسولؐ اکرم کی شریعت مطہرہ کے احکامات کے نفاذ کا جذبہ اگر عالم اسلام کے سلاطین کی سرحدوں کو گرفت میں نہیں لیتا ہے تو وہ مسلمانوں کو ناپاک اور گناہ آلود تجارتیں اور پیشے کرنے اور ہر بازار اور کوچے میں شراب کی دکانیں، قحبہ خانے اور جوئے کے اڈے کھولنے اور موسیقی کی شاندار محفلیں منعقد کرنے کی چھوٹ دے دیں گے۔ لیکن سلطان ان گروہوں پر محصول لگانے

پراکتفا کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر گنہگار اور عام فسق وفجور قائم کرنے والے بے خوف وخطر ہر کوچے اور بازار اور شہر کے علاقے میں اپنے دھندے میں مصروف رہتے ہیں، نیک کام کرنے کا حکم اور بدی کی ممانعت، کا اصول، جوکہ دین اسلام کی روح ہے اور مسلم سلاطین کا فرض ہے۔ ایسی چیزوں کی کس طرح اجازت دے سکتا ہے؟ اور کس طرح (اگر ان چیزوں کی اجازت ہو تو) اسلام کا وقار بلند ہو سکتا ہے اور مرکز میں صداقت قائم ہو سکتی ہے؟

اس کے علاوہ اگر سلطان اسے پسند کریں گے اور اس کی اجازت بھی دیں گے تو فلسفی اور دوسرے بددین، جوکہ دین حق کے مخالف اور رسولؐ اکرم کے دشمن ہیں، کھلم کھلا اپنی کتابوں کی تعلیم دینے لگیں گے۔ وہ یونانی علوم کو، جوکہ قدیم اور آخری انبیاء کے روایتی احکامات کے دشمن ہیں، علم معقولات کا نام دیتے ہیں اور علوم شریعت کو علم منقولات کہتے ہیں۔ وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا ابدی ہے اور اس کے ابدی ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خدا کو تفصیلات کا علم نہیں ہے۔ انھیں قیامت، انسانوں کے (اپنی قبروں سے) اٹھنے، روز محشر اور جنت و دوزخ پر عقیدہ نہیں ہے حالاں کہ ان پر عقیدہ ایمان کی بنیاد ہے اور انبیاء کرام کی ایک سو ساٹھ مقدس کتابوں میں اسے بہت وثوق کے ساتھ جتایا گیا ہے۔ وہ صرف (اپنے نظریات کی) تعلیم نہیں دیتے بلکہ ان چیزوں کے انکار میں استدلالی کتابیں بھی تصنیف کرتے ہیں۔ اب اگر ایسے لوگوں کو سلطان کے دارالسلطنت میں عزت و وقار سے رہنے اور اپنے نظریات کی اشاعت کرنے اور منقولات پر معقولات کو ترجیح دینے کی اجازت دی جائے گی تو دین حق باطل عقاید پر کس طرح فتح پا سکتا ہے یا اسلام کی روایات بلند کی جا سکتی ہیں یا مرکز میں صداقت قائم کی جا سکتی ہے یا نیک کام کے حکم کا اثر اور ناجائز کام کی ممانعت قائم کی جا سکتی ہے؟

(۴) برنی اس بات کی وکالت کرتا ہے کہ تعلیم کمتر طبقوں کے لیے ممنوع ہونا چاہیے کیوں کہ تعلیم انھیں قابل اور لایق بنا دے گی)

(اس نصیحت کے سلسلہ میں برنی آخر خلفاء کی سند پر ایک تذکرہ بطور مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں جو بھی کہا گیا ہے وہ تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ یہ برنی کے ذاتی نظریہ کو ہی ظاہر کرتا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دو بیٹوں محمد امین اور مامون میں جانشینی کی جنگ کے دوران بغداد کا نظم ونسق ڈھیلا پڑ گیا اور نتیجہ میں دو برائیاں پیدا ہوئیں۔ پہلی برائی یہ کہ گناہ اور فسق وفجور عام ہو گئے۔ طرب داد شروع کیے گئے، شراب، جوئے اور رنڈی بازی کے پیشے فروغ پانے لگے۔ دوسری برائی یہ پیدا ہوئی کہ فلسفی منظر عام پر آ گئے۔ بہت سے فلسفی علماء دین کے بھیس میں بغداد آئے اور شہر میں اپنی حیثیت قائم کر لی۔ انھوں نے مسجدوں میں کھلم کھلا مسلمانوں

کو اپنے غلط نظریات اور باطل عقاید کے درس دیے، باطل دین کی کتابیں شائع کیں اور اپنے طالب علموں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا کر انھیں گمراہ کیا کہ کوئی بھی چیز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ عقل کے میزان پر ثابت نہیں ہو جاتی۔ غیر دنیاوی علماء دین جیسے امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ معین، عبداللہ مبارک اور دوسرے متقی اور دین دار لوگ شہر بغداد میں ممنوعہ چیزوں کو پھیلتے ہوئے نہیں دیکھ سکے[۱]..... انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی، آنے جانے والے لوگوں پر اپنے دروازے بند کر دیے، نماز جمعہ اور عیدین کی جماعتوں میں حاضری بند کر دی اور اپنے ہمسر لوگوں سے ترک تعلق کر لیا)

جب مامون اپنے بھائی کی شکست کے بعد بغداد میں داخل ہوا تو اس نے ایک محضر طلب کیا اور اپنے ہاتھ سے ایک منشور لکھا۔ برنی اس منشور کی عبارت نقل کرتا ہے جو کہ من گھڑت ہے۔ اس منسوب منشور میں ہر طبقہ کو دیے جانے والے انعامات اور سزاؤں کی تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے۔ ایک ایسے منشور کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری سا ہے جس کا وجود ہی نہیں تھا لیکن حسب ذیل پیراگراف خاصا دلچسپ ہے کیوں کہ یہ مسلم مزدور طبقہ کی طرف برنی کے رویّہ کو افشا کرتا ہے)

"ہر طرح کے اساتذہ کو یہ سختی سے حکم ہوتا ہے کہ وہ کتّوں کے حلق میں قیمتی تپھر نہ ٹھونسیں یا خنزیروں اور ریچھوں کے گلوں میں سونے کے گلوبند نہ پہنائیں، یعنی کمینوں، رذیلوں اور بچوں کو، دکان داروں اور کم اصلوں کو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ارکان اور قرآن کے ان کچھ پاروں اور کچھ دینی عقاید سے زیادہ کی تعلیم نہ دیں جن کے بغیر ان کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور ان کی عبادات کا درست ہونا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انھیں کچھ بھی نہ پڑھائیں کہ کہیں ان کمین نفوس کو عزت نہ مل جائے۔ دین و دولت کے امور میں جو بدنظمی پھیلی ہے اس کی وجہ ان کم اصل لوگوں کے افعال و اقوال ہیں جو ہنرمند ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ اپنے ہنر کی وجہ سے وہ والی، عامل، متصرّف، فرمان دہ اور فرماں روا بن جاتے ہیں۔ اگر اساتذہ نے نافرمانی کی اور تحقیق کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے کم اصلوں کو علم دیا ہے یا علم ادب یا تحریر کی تعلیم دی ہے تو انھیں اس نافرمانی کی پاداش میں سزا دینا ناگزیر ہوگا۔

امام شافعی اور مامون رشید پر نوٹ

۴: غیر مسلموں کے بارے میں امام شافعی کا نظریہ۔ قرآن میں اس بات کی طرف اشارہ ہی نہیں ملتا بلکہ اس کی

---

[۱] خلیفہ مامون اور مذکورہ بالا تینوں اشخاص کے مذہبی رویہ کے بارے میں اس نصیحت کے اختتام پر نوٹ ملاحظہ کیجیے۔

توضیح بھی کی گئی ہے کہ تمام عوام میں وقتاً فوقتاً انبیاء بھیجے گئے اور روایت کے مطابق ان انبیاء کی تعداد ۱۲۴۰۰۰ بتائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود مسلم فقہا نے (الف) اہل کتاب، یا قرآن میں جن مقدس کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے ان کے پیروؤں اور (ب) غیر مسلموں میں فرق کیا ہے۔ برنی کا درخشاں خیال یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ان غیر مسلموں کے ساتھ جزیہ کی ادائیگی کی شرط پر پرامن سلوک کی اجازت دی ہے جن کے پاس کوئی ایسی مقدس کتاب نہیں ہے جس کا قرآن میں ذکر ہو لیکن دوسرے مذہبی رہنماؤں نے ان کے ساتھ دائمی جنگ تجویز کی ہے۔ چنانچہ تاریخ فیروز شاہی میں (ص ۲۹۱) وہ قاضی مغیث کی زبان سے حسب ذیل بیان ادا کرواتا ہے " امام اعظم ابو حنیفہ کے علاوہ، جن کے مسلک پر ہم ہیں، دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے حق میں کوئی روایت نہیں ہے۔ دوسرے علمائے دین کے مطابق ہندوؤں کے سلسلہ میں "اسلام یا تلوار" کا حکم ہے"

یہاں حقیقتاً اشارہ امام شافعی کی طرف ہے جن کی اس موضوع پر تعلیمات کو برنی بہت غلط بیانی سے پیش کرتا ہے۔ جبکہ اس وقت بھی اسلام کرہ زمین کے ایک مختصر حصہ ہی میں محدود تھا اور یہ ظاہر تھا کہ اگر مسلمانوں نے تمام مشرکین کے خلاف تلوار اٹھائی تو آخر الذکر بھی ایسا ہی کریں گے اور کوئی بھی شخص اس طرح دور دراز تک پھیلے ہوئے اور ختم نہ ہونے والے تصادم کے نتیجہ کی پیش بینی نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ امام شافعی نے حقیقتاً کیا اصول قائم کیے۔ امام شافعی کی اصل تخلیقات اختلاف الحدیث اور رسالات ہیں۔ اول الذکر پہلی جنگ عظیم کے بعد مصر میں طبع ہوئی۔ ان کتابوں کا برنی کے زمانہ میں ہندوستان میں حاصل کرنا مشکل تھا۔ البتہ مشہور شافعی محدث اور دینیات کے مصنف ابو بکر احمد بیہقی (انتقال ۱۰۶۷ء) کی تصانیف اس وقت ہندوستان میں دستیاب تھیں۔ اپنی احکام القرآن میں (طباعت قاہرہ ۱۹۵۲ء) جو کہ فاضل شافعی محمد بن ادریس کی، جن کا انتقال ۲۰۳ھ میں ہوا ایک تصنیف کی دوسری اشاعت ہے، بیہقی لکھتے ہیں۔

۱۔ "شافعی نے فرمایا ہے: "خدا نے حکم دیا ہے: ان کے خلاف جنگ کرو جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور جو اسے منع نہیں کرتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے اور جو اہل کتاب دین حق میں شامل نہیں ہوتے ہیں ان سے اس وقت تک (جنگ کرو) جب تک کہ وہ جزیہ نہ دے دیں اور وہ مغلوب نہ ہو جائیں (ص ۵۱)؛ ...... اور (اس معاملہ میں) عرب اور غیر عرب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔" (ص ۵۳)

۲۔ لیکن مشرکین میں سے جو بت پرست ہیں ان سے برسر پیکار ہونے کے متعلق یہ فرض ہے ان سے جنگ کرو۔ اگر تمہیں ان پر قدرت ہے (اذ قدر علیہم) تاوقتیکہ وہ اسلام قبول کر لیں اور قرآن اور رسولؐ کی سنت ہمیں ان سے جزیہ قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں (ص ۵۳)

یوں کہ اس بنیادی اصول کی مشروط دفعہ یہ ہے کہ اگر تمہیں ان پر قدرت حاصل ہے" اور اگر اس دفعہ کو حذف کر دیا جائے تو امام شافعی کے اصول کے معنی ہی بدل جائیں گے۔ وہ مسلمانوں کو کسی مایوس کن کشمکش میں ہلاک ہونے کا مشورہ نہیں دے رہے تھے۔ علاوہ ازیں کسی زمانہ کے تاریک عرب کے قلب میں رہتے ہوئے امام یہ محسوس کرنے میں غلطی نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام عرب بت پرستی کا تصفیہ تو کر سکتا ہے لیکن اسے یہودیوں اور عیسائیوں سے مستقل معاہدے کرنے ہوں گے۔ یہی 'اہل کتاب' اور 'بت پرستوں' کے درمیان عملی تفریق کی بنیاد ہے۔ امام شافعی ہندوؤں کے سلسلہ میں خاموش ہیں لیکن وہ بہت وضاحت سے کہتے ہیں کہ "رسول اللہ نے مجوسیوں سے جزیہ قبول کرنے کی اجازت دی ہے" (احکام القرآن، ج دوم، ص ۵۳۔ اور ازمنہ وسطیٰ کے مسلم فقہا کے نقطۂ نظر سے ہندو اور مجوسی (زردشتی) ایک ہی قسم میں آتے تھے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔

۳۔ "امام شافعی فرماتے ہیں: "جنگ ان غیر مسلموں کے خلاف لازمی قرار دی گئی ہے جو اہل کتاب نہیں ہیں تاوقتیکہ وہ اسلام قبول نہ کر لیں اور اہل کتاب کے خلاف اس وقت تک جب تک کہ وہ جزیہ ادا نہ کر دیں۔ لیکن قرآن بھی فرماتا ہے کہ 'اللہ کسی شخص پر اس کے اختیار سے باہر کا فرض عاید نہیں کرتا ہے' (سورہ ۲، آیت ۲۸۶) لہذا مسلمانوں پر وہی فرض ہے جو ان کے اختیار میں نہیں ہے اور اگر وہ کسی معاملہ میں لاچار ہیں تو وہ کسی فرض کے پابند نہیں ہیں جو ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے کوئی سزا نہیں ہے اگر وہ مشرکین کے ایک گروہ کے ساتھ جنگ کرنے سے باز رہیں اور ان کے ساتھ امن قائم کریں۔ (ص ۶۲)۔۔۔" اور امام شافعی مزید فرماتے ہیں: "رسول اللہ نے حدیبیہ میں مکیوں کے ساتھ صلح کی۔ یہ صلح ان کے درمیان دس سال کے لیے تھی اور اس سفر کے دوران ان پر یہ وحی نازل ہوئی، 'ہم نے تمہیں قطعی فتح دی ہے تاکہ اللہ تمہیں معاف کر دے' (سورہ ۴۸، آیت ۲-۱) (احکام القرآن، ص ۶۲)

"اور امام شافعی فرماتے ہیں، ابن شہاب نے کہا ہے کہ 'اسلام کے لیے صلح حدیبیہ سے بڑی کوئی فتح نہیں تھی۔ اور شہاب نے نیز یہ بھی کہا کہ 'لوگ اسلام میں شامل ہو گئے اور سچے دین دار بن گئے'۔" (احکام القرآن ص ۶۲-۶۳)

اس طرح یہ ثابت ہوا کہ امام شافعی کی تعلیمات میں برنی کے تعصب کی تائید میں کچھ بھی نہیں ہے مزید برآں یہاں یہ کہنا ضروری ہو جاتا ہے کہ بیہقی کی احکام القرآن کے فاضل مصری ایڈیٹر پروفیسر عبدالغنی عبدالخالق کے مطابق بیہقی نے جو بیانات امام شافعی سے منسوب کیے ہیں وہ امام کی اختلاف الحدیث میں جوں کے توں ملتے ہیں۔ نصیحت ۱۱ میں برنی کے متعصبانہ رویہ کی تائید مسلم فقہا کے کسی بھی مکتب سے نہیں ملتی۔ امام شافعی کے لیے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں صلح حدیبیہ نے مسلمانوں کے لیے پرامن تبلیغ کا جو موقع فراہم کیا وہ مثالی ہے۔ (ح)

۵۔ خلیفہ مامون رشید کا تعصب،

اس نصیحت کے سلسلہ میں دی گئی مثال کے دوران برنی نے حقائق کے بیان میں جو غلطیاں کی ہیں ان سب کی طرف اشارہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ (الف) یہ صحیح ہے کہ اگست ۸۱۹ء میں مامون کے دارالسلطنت میں داخل ہونے تک بغداد میں بغاوت اور بدامنی دونوں تھے۔ لیکن برنی نے فلسفہ اور گناہ کے تسلط کی جو تصویر کشی کی ہے اسے کسی طرح صحیح ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ (ب) اپنی حسب عادت لاپرواہی اور گھٹیا مذہبی تعصب کی وجہ سے وہ معتزلہ کو واصل بن عطا کے پیرو) فلسفیوں سے خلط ملط کر دیتا ہے جو کہ ارسطو اور یونانی مفکروں کے پیرو تھے۔ اس وقت صرف معتزلہ کا بغداد میں عام اثر تھا لیکن فلسفی کسی شمار میں نہیں تھے۔ (ج) جو تھے سنی مسلک کے بانی امام احمد بن حنبل (۸۸۵-۷۸۰ء) اور امام یحییٰ معین جن کا انتقال غالباً ۸۴۸ء میں ہوا گہرے دوست تھے۔ ابن خلکان ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ دونوں امام شافعی کے شاگرد تھے (ملاحظہ کیجئے ابن خلکان' ج اول، ص ۴۴ برائے امام احمد بن حنبل اور ج چہارم، ص ۲۷، ۲۴ برائے امام یحییٰ معین) بہرصورت امام حنبل اعلیٰ ترین وضع کے بیشتر مسلم مفکروں کی طرح حکومت کی خدمت کو گناہ تصور کرتے تھے اور خود اپنے بیٹے کے گھر بھی کھانا تناول نہیں کرتے تھے کیوں کہ ان کا بیٹا ایک سال تک قاضی کی حیثیت سے حکومت کی خدمت انجام دیتا رہا تھا۔ نیز یہ کہ وہ معتزلہ کے مخالف تھے اور چوں کہ وہ ان کے اس نظریہ کی حمایت نہیں کرتے تھے کہ قرآن مخلوق تھا، لہٰذا مامون کے حکم پر ان کے بیڑیاں ڈال دی گئیں اور ۸۸۳ء میں مامون کے انتقال کے بعد ہی وہ مزید ذلت سے محفوظ ہو سکے۔ (ح) اس سلسلہ میں صوفی شیخ عبداللہ مبارک کو خواہ مخواہ کھینچ لیا گیا ہے۔ وہ تو اس واقعہ سے بیس سال قبل انتقال کر چکے تھے (تاریخ الاولیاء نمبر ۱۵، کشف المحجوب ص ۷)

لیکن برنی کی تاریخ سے لاعلمی کی غالباً بہترین مثال اس کی مامون رشید کی بحیثیت متعصب حکمراں کے تصویر کشی ہے جس کا وہ دلدادہ ہے۔ مامون معتزلہ کا بہت مربی تھا جو کہ علماء دین کا منحرف گروہ تھا اور جس سے برنی سخت متنفر تھا" کچھ امور میں المامون خاصا وسیع النظر تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے پیشروؤں کی معاویہ کے مناسب ذکر پر کچھ سال قبل لگائی پابندی کو ہٹا دیا اور یہاں تک کہ عیسائیوں کو انجیل اور اسلام کے تقابلی دعووں پر بحث کی اجازت دے دی۔ لیکن ایرانی رجحان کے سبب جس کی طرف وہ ہمیشہ ہی راغب تھا بالآخر وہ مسلمات سے منکر مگر وسیع النظر معتزلہ کے نظریات کا سراغ لگانے کے لیے بہت اشتیاق سے متوجہ ہوا۔ آخر میں اس نے مسلمہ ایمان کے کچھ متضاد عقاید میں اپنے یقین کا اعتراف کر لیا۔ ان میں وہ 'جبر' کی جگہ 'اختیار' پر عقیدہ رکھتا تھا اور اس وقت تک کے اس مکمل عقیدہ کی جگہ کہ قرآن ازلی اور ابدی ہے، وہ یہ تو تسلیم کرتا تھا کہ قرآن الہامی ہے لیکن اس کا عقیدہ تھا کہ وہ 'مخلوق' ہے۔ خود قرآن کی مجازاً وضاحت کی گئی اور جب تقلید پسندوں کے سامنے ایسی مشکلات پیش آئیں جو عقل کے خلاف تھیں یا جن سے معاشرہ کی نشو ونما محدود ہو سکتی تھی تو انھوں

نے ان سے بہ آسانی راہ فرار اختیار کیا۔" (موئر کی Calibhate، ص ۵۰۷،۵۰۶)

ڈاکٹر لیٹر اسٹین (Dr. Letterstein) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "مامون کے عقلی رجحانات نے اسے معتزلہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ ایک طرف اس نے تقلید پسندوں کی تعذیب کی اور معتزلہ کی بابت ان کے عقیدہ کی صحت کے بارے میں ان سے سخت سوال وجواب کیے اور دوسری طرف اس نے علویوں کا بہت پاس ولحاظ کیا۔ اس کا عہد شعر وشاعری اور علوم کا عصر زریں تھا۔۔ خلیفہ نے فلسفہ اور علوم قطعیہ میں بھی **خاص دلچسپی** ظاہر کی۔" (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج سوم، ص ۲۲۲)

مولانا شبلی نے اپنی 'المامون' میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ خلیفہ معتزلہ تھا اور اس متعصب گروہ کا مخالف تھا جس کا آئندہ ابوالحسن اشعری (۹۳۵-۸۷۳ء) کی قیادت میں غلبہ ہونا تھا اور جسے ضیاء الدین برنی کی شخصیت میں اپنا سب سے حقیر اور سطحی ترجمان ملا۔ جس مفروضہ منشور کو برنی نے نقل کیا ہے وہ خالص اس کی اختراع تھا لہٰذا اسے مسترد کر دینا چاہیے۔ (ح)

نصیحت ۱۲

عدل کے نظم ونسق کے بارے میں

(۱) فرماں روا کا فطری اور جبلّی جذبۂ عدل)

(اس نصیحت کا ابتدائی حصہ قلمی نسخہ سے غائب ہے لیکن بقیہ حصّہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا موضوع عدل کا نظم ونسق تھا۔)

(برنی یہ بتاتا ہے کہ حکماء کے مطابق کسی فطری اور جبلّی عادل کو حسب ذیل بیس خوبیوں سے شناخت کیا جاتا ہے)

(۱) اس کے قلب میں مظلوم سے قربت، کمزور کا تحفظ کرنے کی خواہش، غیر انصاف پسند سے نفرت اور ظالموں سے عداوت لکھی ہے۔

(۲) اس کے اندر انتقام یا بدلہ کا احساس نہیں ہوتا حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ اپنے ذاتی دشمنوں کے خلاف فیصلہ سناتا ہے۔

(۳) جہاں تک عدل کا معاملہ ہے وہ مصالحت کرنے یا غلطیوں کو برداشت کرنے یا مناسب حدود سے تجاوز کرنے سے معذور ہے۔

(۴) اس کا دل کانپتا رہتا ہے کہ کہیں کسی معصوم کو سزا نہ ہو جائے۔

(۵) عدل کے نظم و نسق سے متعلق جہاں بات ہے وہاں اس پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

(۶) وہ عدالتی فیصلہ سناتے وقت وہ لوگوں کی تنقید یا پسند کی کوئی پرواہ نہیں کرتا ہے۔

(۷) اسے اپنے یا اپنی حکومت کے نقصان کا کوئی خیال عدل کے نفاذ سے باز نہیں رکھ سکتا ہے۔

(۸) وہ خود فریبی سے بے بہرہ ہے اور اپنے اصولوں میں نرمی کا قائل نہیں ہے۔

(۹) وہ دوسروں کے صحیح دعوؤں کو پورا کرنے میں تو سختی سے کام لیتا ہے لیکن جہاں اس کا ذاتی تعلق ہوتا ہے وہ عفو و درگزر کو ترجیح دیتا ہے۔

(۱۰) اسے صرف اسی وقت قلبی سکون ملتا ہے جب وہ طاقت ور سے کمزور کے حقوق کو حاصل نہیں کر لیتا ہے۔

(۱۱) وہ دوسروں کی ذمہ داریاں اس خوف سے اوڑھنے سے گریز کرتا ہے کہ کہیں یہ ذمہ داریاں اس کے ذہن کو (بحیثیت ایک عادل کے) متاثر نہ کر دیں۔

(۱۲) وہ عدل و انصاف کا متلاشی ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس کا دل مہربانی اور شفقت سے لبریز ہوتا ہے۔

(۱۳) صرف خدا کی خاطر اسے جائز غصہ آتا ہے اور کوئی حیوانی جذبۂ عداوت اسے مشتعل نہیں کر پاتا۔

(۱۴) اعلیٰ حاکم کی حیثیت سے اسے جو اختیار حاصل ہوتا ہے اس سے وہ اپنے دل ہی دل میں نفرت کرتا ہے کیوں کہ اس کی رو سے اس پر مسلمانوں کی عزت اور جان کے خلاف احکام جاری کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

(۱۵) اس کا دماغ فطری طور پر فریبوں، دروغ گویوں، معذرتوں اور دغاؤں کو رد کر دیتا ہے کیونکہ اس کے سینے میں باطل اور صداقت کے درمیان تمیز کرنے کے لیے فہم و ذکا کی کسوٹی موجود رہتی ہے۔

(۱۶) اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے محکومین سے متعلق مقدمات وہ خود ہی فیصل کرے۔

(۱۷) ایسے حکمراں کی محبت اس کے محکومین کے قلوب میں نقش رہتی ہے اور اگر اس کے احکامات گزند بھی پہنچاتے ہیں تب بھی اس کے محکومین اس وجہ سے اس سے نفرت نہیں کرتے۔

(۱۸) اگر وہ مشرق یا مغرب میں کسی بے انصافی یا غلط حادثہ کی خبر سنتا ہے تو اس کا دل بے چینی سے دھڑکنے لگتا ہے۔

(۱۹) اس کا دماغ ہمیشہ ناانصافی کو ختم کرنے اور عدل قائم کرنے کے خیالات میں منہمک رہتا ہے۔

(۲۰) جب وہ بے امن لوگوں سے دوچار ہوتا ہے تو یہ نصیحت اس کی رہبری کرتی ہے کہ "منزا شہادت

پر مبنی ہونی چاہیے"۔ لیکن جس وقت وہ ظالموں، گناہ گاروں اور مجرموں سے نمٹ رہا ہوتا ہے، جن کی فطرت ہی غلط کام کرنا ہے تو وہ اپنے ذہن کو (ان کے جرم کے سلسلے میں) شبہات سے متاثر نہیں ہونے دیتا۔

(۲- مساوات خاص و عام)

('خاص مساوات' سے مراد فرماں روا کے مقابل تمام فریقین کی برابری ہے کیونکہ عدل اشخاص کا لحاظ نہیں کرتا، 'عام مساوات' سے مراد حاکم اور محکوم کی برابری ہے۔ کچھ بے ربط اور بار بار دہرائے گئے جملوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔)

قدیم اور جدید سلاطین کے خیال کے مطابق عدل کا مطلب یہ ہے کہ تمام فریقین کو برابر سمجھا جائے اور ان میں مساوات قائم کی جائے۔ لیکن دین حق کے قدیم علما دین نے فرماں رواؤں کے نقطۂ نظر سے مساوات کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ایک قسم کو انھوں نے 'مساوات خاص' سے موسوم کیا ہے، اور دوسری کو 'مساوات عام' کہا ہے۔ آخر الذکر سے فرماں روا کی (اپنے محکومین کے ساتھ) مساوات بھی مراد ہے۔

'مساوات خاص' کی فنی اصطلاح، جو صرف فریقین کی مساوات تک محدود ہے، اس معنی میں تمام دنیا پر آشکارا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ، سلطان، قاضی، والی، فرماں روا، فرمان دہ، درحقیقت کوئی بھی جس کے ہاتھوں میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، الزام لگانے والے اور ملزم دونوں کے درمیان مساوات قائم کرتا ہے۔ سماعت کے دوران وہ ان کے اقوال و افعال اور اپنے مقابل بیٹھنے اور کھڑے رہنے (کی رعایت) کے سلسلہ میں ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتا ہے اور کسی فریق کو کسی خاص وجہ سے فوقیت نہیں دیتا ہے۔ اپنے فیصلے سناتے اور نافذ کرتے وقت اسے طاقت ور یا دولت مند، یا حکومت اور اس کے عہدیداروں کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہوتا۔ کسی بھی فریق کے وقار، خوبی، عزت، رتبہ یا عظمت کا کوئی خیال اسے کھرے فیصلہ سے نہیں روک سکتا۔ عدل کے نفاذ میں وہ رشتہ داروں اور اجنبیوں، اشراف اور اراذیل، باروزگاروں اور بے روزگاروں، عہدیداروں اور شہریوں، دولت مندوں اور غریبوں، خواص و عوام، حامیوں اور مخالفوں، دوستوں اور دشمنوں سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ کسی بھی فریق سے کسی قسم کے تحائف، رشوتیں، عطیات، یا نشانیاں قبول نہیں کرتا ہے۔ خواہ وہ قیمتی ہوں یا سستے۔ عدل کے نفاذ میں اسے ریاست کی مصلحت یا اپنے ماں باپ، بھائیوں اور بیٹوں کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا اور اس کے ذہن میں اپنے ذاتی اقتدار کے تنزل یا عوام کی مخالفت اور عداوت کا کوئی خوف نہیں آتا۔ اسے کسی نیک بخت یا نیک صحن کا خیال نہیں ہوتا۔ وہ کسی کی چاپلوسی

نہیں کرتا اور کسی سفارش کا خیال نہیں کرتا. مندرجہ بالا اصولوں کو ملحوظ رکھنے ہی میں عدل ہے. جو شخص ان کے برعکس چلتا ہے اسے منصف نہیں کہا جا سکتا. عدل کی ایک ساعت کا انعام، جو کہ مندرجہ بالا شرائط پر مبنی ہے. ستّر سال کی ریاضت سے زیادہ ہے. ایک فرماں روا جسے (خدا نے) عدل کے وصف کے ساتھ پیدا کیا ہے یعنی جو اپنی ماں کے بطن سے منصف پیدا ہوا ہے اور عدل شروع سے جس کی زندگی کا ساتھی ہے. وہی کچھ عرصہ اس طرح کے عدل کے نفاذ کا بوجھ برداشت کر سکے گا اور اس کے روحانی انعام کی کوئی گنتی شمار نہیں. لیکن جس فرماں روا کو جبلّی عدل کے وصف کے ساتھ تخلیق نہیں کیا گیا ہے وہ مذکورہ بالا شرائط کا پابند نہیں ہو سکے گا.

دوسری قسم کے عدل سے مراد 'مساوات عام' ہے. یہ تقوی کی تکمیل کا ماحصل ہے اور خلفاء راشدین کا مخصوص وصف ہے. ابوبکرؓ، عمر خطابؓ، عثمانؓ اور علیؓ مرتضی کے ساتھ یہ ختم ہو گیا. لیکن مساوات عام کی تابندگی نے عمر بن عبدالعزیز کے عہد کو بھی ضیا بار کیا ہے[1] یہ اس طرح ہے. خلیفہ جسے اپنی ماتحت مملکت پر کسی جمشید یا خسرو کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں وہ فریقین کے درمیان 'مساوات عام' کے قیام کی ذمہ داریاں ہی انجام نہیں دیتا بلکہ فقرا اور رعیت کے غربا کی طرح زندگی بسر کرتا ہے. اپنے اعلیٰ اقتدار اور رتبہ کے باوجود وہ عسرت کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے. وہ اپنے شب و روز قرض، تکلیف اور مادی وسائل کی قلّت میں گزارتا ہے. اس کا کھانا اور لباس غریب ترین لوگوں کی طرح ہے. وہ بیت المال سے صرف اس قدر لیتا ہے جو اس کی زندگی کی کم سے کم ضروریات کے لیے ضروری ہوتا ہے اور وہ اپنے غلاموں کی طرح ہی کھاتا پہنتا ہے. اور یہ کارنمایاں، جس میں دو متضاد چیزوں یعنی خسروی اور عسرت کی ہم آہنگی نظر آتی ہے، رسول اکرمؐ کا معجزہ اور خلفاء راشدین کا قابل تعریف کارنامہ سمجھا گیا ہے.

محمود کے فرزندوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا عدل کے ذریعہ ارض و سماوات کو قائم رکھتا ہے. آدم کے وقت سے آج تک انصاف پسند انسانوں نے عدل کے ہی ذریعہ اس سرزمین کی بہبودی قائم رکھی ہے. ہر دین کے احکام کا نفاذ، خواہ وہ دین باطل ہوں یا دین حق، عدل کے اصولوں سے ہی ممکن ہو سکا ہے. حتیٰ کہ ان (قدیم) فرماں رواؤں نے بھی، جنھوں نے الوہیت کے دعووں سے اپنے چہروں کو سیاہ کیا تھا، اپنے عہد کے دین، عقائد اور رسوم کے مطابق عدل کی صورتیں قائم کیں.

(اس نصیحت کے سلسلے میں برنی امیرالمومنین حضرت عمر اور ایران کے شہنشاہ نوشیرواں کی مثالیں دیتا ہے. برنی نے نوشیرواں کے نام کے ساتھ جو ضوابط منسوب کیے ہیں ان کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے.)

مورخین نے لکھا ہے کہ خلیفہ دوم عمر خطاب اور ایران کا شہنشاہ نوشیرواں عادل اپنے عدل کے لیے

---

[1] کئی مسلم مورخین کا خیال ہے کہ اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (۷۲۰-۷۱۷ء) نے خلفاء راشدین کے اصولوں کی پیروی کی تھی.

بہت ممتاز تھے۔ عرب اور ایران کے دانش منداس پر متفق ہیں کہ اپنی مساوات خاص، کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے بعد عمر نے 'مساوات عام' کے اصول کے ساتھ بھی انصاف برتا۔ نوشیروان عادل نے مساوات خاص کے لیے بہت سخت جدوجہد کی لیکن اس کے پاس مساوات عام' کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ ملاحظہ ہو کہ 'مساوات خاص، 'مساوات عام' کی ایک ضروری شرط ہے۔ لیکن 'مساوات عام'، 'مساوات خاص' کی ضروری شرط نہیں ہے بعرب و ایران کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ عمر خطاب نے وہ سب کچھ کیا جو نوشیرواں نے کیا تھا لیکن نوشیرواں وہ نہ کرسکا جو عمر نے کیا تھا۔ کیونکہ ریاضت، تقویٰ، نفس کشی اور ایثار، مساوات عام، کی اولین شرائط ہیں۔

تمام مورخین اس سے متفق ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب کے بوسیدہ چوغے میں ان کے دور خلافت میں "ستّر" پیوند تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اپنے رتبہ اور اقتدار کی شان و وقار کے باوجود انھیں اپنے خاندان کی کفالت کے لیے معمولی مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ اکثر و بیشتر وہ اینٹیں بنا کر اپنی روزانہ کی کمائی کیا کرتے تھے۔ کرۂ زمین کے اہم حصے ان کے زیر اقتدار تھے لیکن انھوں نے بذات خود عسرت اور فاقے کے دن گزارے اور اپنی زندگی کے طور طریق میں وہ اپنی امت کے فقرا اور غربا کی طرح تھے۔ صحابہ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے: "مدینہ میں سب سے غریب گھر امیرالمومنین عمر کا ہے۔" 'مساوات عام' کے اصول کے بموجب انھوں نے بیت المقدس کے سفر میں اپنے غلام کے ساتھ سواری میں باریاں لیں۔ ایک دن وہ سوار ہوتے تھے اور غلام اونٹ کی نکیل پکڑتا تھا اور دوسرے دن غلام سوار ہوتا اور خود حضرت عمر نکیل پکڑ کر پیدل چلتے۔ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی اونٹ نہیں تھا حالانکہ وہ ستر ہزار عربوں کے ساتھ شام کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ انھوں نے ایران کے مرزبان اور عراق کے زمینداروں کی بھاری تعداد میں لائی ہوئی لذیذ قابیں، طرح طرح کی مرغوب اشیاء خورد و نوش اور تمام اقسام کے پھل صحابہ اور شیوخ کو بھجوا دیے۔ نہ تو انھوں نے اپنے فیاض ہاتھ کو ان چیزوں کی طرف بڑھایا اور نہ ہی اپنے بیٹوں کو ایسا کرنے دیا۔ وہ شہروں میں جامع مسجدوں کے صحنوں میں اپنے بیٹوں کے ساتھ قیام کرتے تھے اور کسی کے مکان میں مقیم نہیں ہوتے تھے۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ عمر خطاب نے مساوات خاص کے لیے کیا کیا، کس طرح انھوں نے اس کی شرائط کو کلّی طریقہ سے پورا کیا اور اس طرح کہ اس سے زیادہ حاصل کرنا ممکن نہیں اور کس طرح انھوں نے کسی رشتہ، کسی کی خاطر یا کسی لحاظ کا پاس نہیں کیا تو یہ تمام باتیں لوگ بخوبی جانتے ہیں اس لیے ان کا ذکر کیا۔ وہ اپنے ہی بیٹے کے خلاف فیصلہ سنانے میں نہیں ہچکچائے اور ان کی پدری شفقت انھیں شریعت کی مجوزہ سزا نافذ کرنے سے نہ روک سکی۔ دانش مند افراد سمجھ لیں گے کہ ایسا مکمل شخص جو مکمل عادل پیدا ہوا ہے اور جو اپنے بیٹے کو شریعت کے تجویز کیے ہوئے کوڑوں کی سزا دے کر اسے موت کے حوالہ کر دیتا ہے۔ وہ کسی بھی رشتہ دار

کو اپنے ہاتھوں کی گرفت کرنے یا شریعت کے احکامات نافذ کرنے سے روکنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

(۳) ۔ سلطان کی شکایتوں کی سماعت

(برنی کی دلیل جس سمت میں جاتی ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ 'مساوات عام' مسلم سلاطین کے بس سے باہر کی بات ہے۔ لیکن افضیں 'مساوات خاص' کے لیے سعی کرنی چاہیے اور خاص طور سے جو ظلم کے شکار ہیں ان تک ان کی ذاتی رسائی ہونی چاہیے [1])

اے محمود کے فرزندو اور سلاطین اسلام، تمہارا یہ فرض ہے کہ ہفتہ میں ایک دن اپنے تعیشات، شکار اور شہسواری سے پرہیز کرو، اس دن تم میدان میں ایک دربار عام منعقد کرو، خود کچھ بلند جگہ نشست کرو اور اپنے ہاتھوں سے مظلوموں کی شکایتیں وصول کرو۔ تمہاری بادشاہت کے وقار، نازک دماغوں اور اپنے اثر و اقتدار میں تمہارے . . . . اس طرح کے فرض کی انجام دہی میں تمہارے مانع نہیں آنا چاہیے کیوں کہ اس سے ان گناہوں کی تلافی ہو جاتی ہے جو تم سے بحیثیت سلطان کے سرزد ہوتے ہیں یہ تمہارا فرض ہے کہ تم مجرم سے سوال و جواب کرو۔ اگر تم پر یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ اس کا پہلا جرم ہے اور غلطی اور غفلت کی وجہ سے سرزد ہوا ہے تو ذلیل و خوار کر کے اسے مظلوم کے مطالبات کی تکمیل کے لیے مجبور کرو اور اس کے بعد توبہ کی شرط پر اسے معاف کر دو۔ لیکن اگر اس کے خلاف پے در پے الزامات ثابت ہو چکے ہیں اور تم یہ محسوس کرتے ہو کہ جرم اس کی فطرت میں سرایت کر گیا ہے تو اسے مظلوم کے مطالبات پورا کرنے کے لیے مجبور کرو اور اس کے علاوہ اجر بھی طلب کرو اور اسے اپنے ملک سے باہر نکال دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سلطنت سے اس وقت تک ظلم ختم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ظالموں کی بیخ کنی نہ کر دی

---

[1] نظام الملک نے اپنے سیاست نامہ میں سلطانوں کو یہی نصیحت دی ہے "سلطان کے لیے اس کے علاوہ کچھ مناسب نہیں ہے کہ وہ ہفتہ میں دو دن شکایتیں سننے کے لیے بیٹھے تاکہ وہ غلطیوں کے مرتکب لوگوں کو سزا دے سکے، عدل نافذ کر سکے اور اپنے کانوں سے اپنے محکومین کے بیان سن سکے۔ کچھ مقدمے جو بہت اہم ہوں اس کے سامنے رکھے جانے چاہیئے اور اسے ایسے تمام معاملوں کے متعلق ایک حکم دینا چاہیے۔ جب یہ خبر مملکت میں پھیلے گی کہ سلطان بذات خود مظلوموں کو اور داد رسانی کرنے والوں کو ہفتہ میں دو مرتبہ اپنے سامنے طلب کرتا ہے اور ان کی شکایتیں سنتا ہے تو تمام ظالم اپنے ناجائز کرتوتوں کی روک تھام کریں گے اور کوئی بھی شخص سلطان کے خوف سے ظلم و جبر کا راستہ اختیار نہیں کر سکے گا۔ (شیفر کا اصل نسخہ، ص ۱۰)

جائے تمہیں اس مقصد کے لیے اپنے عہدیداروں میں سے ایسے اشخاص پر مشتمل ایک جماعت کی تشکیل کرنا چاہیے جن میں دین کا جذبہ دنیاوی آرزو پر حاوی ہے تاکہ ان کے (عدل کے نفاذ کے سلسلہ میں) احکامات کے ذریعہ تمہیں اس دنیا میں شہرت اور آخرت میں نجات مل سکے۔ یہ تمام اصولوں کی روح رواں ہے۔ اگر سلطان اس بنیادی اصول کی اہمیت تسلیم کر لیتے ہیں تو انھیں اپنی دینی یا دنیاوی مہمات میں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔

(برنی ایک مرتبہ پھر اپنے پسندیدہ موضوعات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور سلاطین سے گزارش کرتا ہے کہ وہ بے ایمان دکان داروں کو کچل دیں)

نصیحت ۱۳

سلطان کا رحم اور سرزنش

(۱۔ اعتدال اور امتیاز کی ضرورت)

(اس نصیحت کے کچھ پیراگرافوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا کیوں کہ ان میں ایک ہی طرح کے خیالات کی ہوبہو ان ہی الفاظ میں تکرار کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ پیراگرافوں کی ترتیب بدل دی ہے تاکہ مصنف کے دلائل میں مناسب تسلسل رکھا جا سکے)

سلطان محمود یوں گویا ہوتا ہے: اے محمود کے فرزندو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عفو و درگزر اور انھیں نظرانداز کر دینا اور عیوب کی ستر پوشی بادشاہ کے فرائض اور ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔ اگر سلطان اتنا سخت ہے کہ نہ تو وہ اپنی رعیت کے جرائم معاف کرتا ہے، نہ ہی اپنے افسران کی کوتاہی کو نظرانداز کرتا ہے اور نہ ہی لاپرواہیوں اور غفلتوں سے آنکھیں پھیرتا ہے اور معاملات اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اس کے محکومین میں سے کسی کو بھی اس سے کوئی زیادہ امیدیں نہیں رہتیں۔ اور اس کے خود کے مددگاروں اور حامیوں میں اس کے خلاف سخت نفرت بھڑک جاتی ہے تو سلطان یا ریاست قائم نہیں رہ پائیں گے۔ دوسری طرف اگر سلطان باغیوں ظالموں، شرپسندوں، یعنی چوروں، گستاخوں، غبن کرنے والوں، لاپرواہوں، بے شرموں، بے فکروں اور بدکاریاں کرنے والوں کو سزائیں نہیں دیتا ہے، ان کی سرزنش نہیں کرتا ہے، ان پر جرمانہ نہیں کرتا ہے اور ضمانتیں نہیں لیتا ہے اور ان کے ہتھکڑیاں نہیں لگاتا ہے تو کچھ لوگ دوسروں کو نگل جائیں گے اور کسی کی بھی دولت، مال و جائداد، بیوی اور بچے محفوظ نہیں رہ پائیں گے۔ لہٰذا سلطان کو معافی اور

سرزنش دونوں کے مناسب مواقع سے آگاہ وباخبر ہونا چاہیے
علاوہ ازیں سلاطین کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سیاست کی اصطلاح کے صحیح معنی امور دنیا کو درست رکھنا ہے، ایسی صورت میں کئی طرح کی تدابیر کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ دنیا درست رہے، لوگ عدل وانصاف کے راستہ پر مستقل قائم رہیں، مرکز میں صداقت قائم ہو، خواص وعوام کے قلوب مطمئن رہیں اور سلطان عوام سے اور عوام سلطان سے محفوظ رہیں. ایک طرح کی تدبیر فیض رسانی، شفقت، عنایات، تحائف، انعامات فیاضی اور مہربانی پر مشتمل ہوتی ہے. اس تدبیر سے سلطنت کے بہت سے لوگ خوش حال ہوجاتے ہیں اور ٹھیک رہتے ہیں. شاہی نظام حکومت کی اصطلاح میں اس تدبیر کو سیاست بھی کہا جاتا ہے. سیاست کی ایک اور قسم ذلیل ورسوا کرنے، برطرف کرنے، پاس ولحاظ میں کمی برتنے اور مال وجائداد ضبط کرنے پر مشتمل ہوتی ہے. اس تدبیر سے بھی عوام کی ایک جماعت راہ راست پر رکھی جاتی ہے اور عوام کی کافی تعداد کی تنبیہ ہوجاتی ہے سیاست کی ایک اور قسم ٹھوکریں مارنے، بید مارنے، اور تنبیہیں دینے پر مشتمل ہوتی ہے. زیادہ لوگوں کو درست رکھنے کے لیے اس طرح کی سختیاں ضروری ہوتی ہیں. اس کے علاوہ دوسرے خوف زدہ ہوجاتے ہیں اور انھیں ایک سبق حاصل ہوجاتا ہے. سیاست کی ایک اور قسم جیسے ریاست کی حکمت عملی کسی خاص جماعت کے لیے ضروری کر دیتی ہے، ضمانتوں، ہتھکڑیاں ڈالنے اور قید وبند پر مشتمل ہے. اس کے ذریعہ مال گزاری نہ دینے والوں کو راہ راست پر رکھا جاتا ہے، دوسروں کو خوف زدہ کیا جاتا ہے اور یہ سلطنت کے عمدہ نظم ونسق کے لیے مفید ہے. سیاست کی ایک اور قسم جلاوطنی ہے. جلاوطنی کئی طرح کی ہوتی ہے. کچھ لوگوں کو سیاسی مصلحت کی بنا پر سلطان اپنے دارالسلطنت سے شہر بدر کر کے اپنی سلطنت ہی کے کسی حصّہ میں منتقل کر دیتا ہے اور ان کے رتبہ کی حیثیت سے انھیں دیہات اور وظائف عطا کرتا ہے. دوسروں کو وہ ان کے تخت سلطانی کے قریب حاصل رتبوں سے ہٹا کر دور یا نزدیک کے کسی مقام کے لیے جلاوطن کر دیتا ہے. بعض کو ممالک بعید کے لیے بھی جلاوطن کیا جاتا ہے۔
جلاوطنی کی یہ تینوں اقسام (افسران کے لیے) سیاسی سزائیں ہیں. لیکن جب تک شریعت ہی اجازت نہ دے. سلطانوں کو مسلمانوں کو ہر چھوٹی غلطی پر سزائے موت نہیں دینا چاہیے. اگر قید، ضمانتیں، بیڑیاں، اور جلاوطنی موثر سد راہ ہیں تو مسلمانوں کی زندگیاں نہیں لینا چاہیے اور ان کا خون نہیں بہانا چاہیے.
رسولؐ اکرم کے دین ودولت سے وابستہ عظیم المرتبت لوگوں نے کہا ہے. ہر وہ سلطان جو قرآن کی اس آیت کا مطلب بخوبی سمجھتا ہے کہ "اللہ گناہوں کو بخشنے والا، توبہ کو قبول کرنے والا اور اپنی سزاؤں میں سخت ہے"[ے]

ے قرآن، سورہ ۴۰. آیت ۳.

تو وہ بھی بخشش اور سرزنش کے مناسب مواقع میں تمیز کرلے گا۔ اس کے عہد میں موثر انتظام اور عمدہ نظم ونسق ظاہر ہوگا اور اسے اپنی حکومت کی حکمت عملی کی وجہ سے نجات حاصل ہوگی۔

علمائے دین نے بھی کہا ہے: جب بھی سلطان اپنے عوام کے ساتھ مذکورہ بالا آیت قرآن کے مطابق پیش آتا ہے تو اسے اپنی زندگی کے دوران ہی اپنی سلطنت سے مسرتیں حاصل ہوتی ہیں اور اس کی موت کے بعد اس سرزمین پر اس کا نام باقی رہتا ہے۔ قرآن نے مزید کہا ہے "اگر اللہ انسانوں کو وہی سزائیں دے جن کے وہ مستحق ہیں تو اس سرزمین پر کوئی زندہ مخلوق باقی نہیں رہے گی"[1] اللہ بخش دیتا ہے اور معاف کردیتا ہے۔ وہ سزا نہیں دیتا۔ رسولؐ اکرم نے فرمایا ہے۔ "بہترین بنی آدم وہ ہیں جو اللہ سے بخشش کی دعا کرتے ہیں خواہ انھوں نے غلطیاں کی ہیں یا نہیں"۔

عظیم سلطان جنھیں خوف خدا تھا انھوں نے کہا: بخششوں اور سزاؤں کے بغیر بادشاہت مناسب طور پر قائم نہیں ہوسکتی۔ صرف اسی سلطان کو دوررس کہا جاسکتا ہے جو بخشنے اور سرزنش کرنے کے صحیح مواقع سے بخوبی واقف ہے اور جسے اپنے احکام جاری کرنے اور ان کے نفاذ کے وقت امور سیاست کے استحکام کا مناسب لحاظ ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کو عنایات ومہربانی سے صحیح رکھا جاسکتا ہے اور وہ اس کے ساتھ سختی اور درشتی برتتے ہیں تو یہ سیاست یا درست رکھنا نہیں ہے بلکہ بدنظمی اور بداخلاقی ہے اسی طرح امور سیاست کو درست وصحیح رکھنے کے لیے اگر کسی شخص کو پابہ زنجیر کرنا یا جلاوطن کرنا ضروری ہے لیکن وہ اسے دارالسلطنت کے قریب ہی کوئی صوبہ یا کوئی عہدہ عطا کردیتے ہیں اور اس پر لطف و عنایت کی بارش کرتے ہیں تو ایسی سیاست سے وہ ریاست کی عمارت کو کھنڈر کردیں گے۔ نیز اگر سلطان امور ریاست کے مستحکم ہونے سے قبل ہی سزائیں دینے کا ارادہ رکھتے ہیں یا بڑی مہمات میں معمولی غلطیوں کو جرم کہنے پر اصرار کرتے ہیں یا ان کے تعزیری احکامات کے نفاذ کے سلسلہ میں خواص وعوام کے عادی ہونے سے قبل ہی، وہ اپنے عتیر اور معمولی دعووں کی تکمیل پڑے رہتے ہیں تو اس طرح کی سختیوں سے وہ صرف امور سیاست کو ابتری میں ڈالیں گے۔ اگر کسی وجہ سے سلطان اپنے کسی مقرب کے ساتھ بے رحمی برت چکا ہے تو مشفقانہ شاہی عنایات کے ذریعہ آزردہ شخص کے دل سے ناراضگی کو نکال دینا چاہیے۔ سلطان کو اپنی سلطنت کے مددگاروں اور حامیوں کے ساتھ اس طرح رہنا چاہیے کہ اس کے وقار میں کمی نہ آئے اور ان کی بھی بے عزتی نہ ہو۔ یہ سلطان کی مکمل ذہانت کا قطعی ثبوت ہے لیکن مشکل ترین کام ہے۔

---

[1] قرآن، سورہ ۳۵، آیت ۴۵۔

(۲ - سلطان کا اعتراف حقوق)

قدیم سلاطین نے کہا ہے : بادشاہت کا ایک ضروری وصف اعتراف حقوق ہے. اگر کوئی سلطان عوام کے حقوق تسلیم نہیں کرتا ہے تو اس کی مملکت کا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا اور اسے آخرت میں نجات حاصل نہیں ہو سکے گی. حقوق تسلیم کرنے والے سلطان کی امتیازی خصوصیات کا اکثر ذکر کیا گیا ہے. سلطان کے (انسانوں کے حقوق / اعتراف کی بنیاد خدا کے احکامات کی اطاعت ہے. یہ دوسری بات ہے کہ وہ غلطیوں، غفلتوں یا گناہوں کا مرتکب ہے لیکن اسے دینی اور دنیاوی امور میں خدا اور رسول سے غافل نہیں ہونا چاہیے.

(۱) اپنے بھائیوں، بیوی، بچوں، قدیم دوستوں اور قدیم خیر خواہوں کے سلسلے میں سلطان کے حقوق کے اعتراف کا مطلب یہ ہے کہ وہ سلطان بننے کے بعد ان کے ساتھ اپنے شاہی وقار کے قیام کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام امور زندگی میں پہلے سے ہزار گنا بہتر طریقہ سے پیش آئے. وہ ان میں سے ہر شخص کی ذمہ داریاں اپنے شاہی ذرائع کے مطابق انجام دیتا ہے لیکن حدود کے اندر تاکہ روز محشر میں وہ اپنے طریقوں کے سلسلے میں جواب دینے سے قاصر نہ رہے.

(۲) کسی سلطان کے اپنی مملکت کے مددگاروں اور حامیوں یعنی دربار کے اعلیٰ اور منتخب افسروں اور ریاست کے خیر خواہوں کے حقوق کے اعتراف کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اور سلطان کے درمیان باہمی اطمینان کے علاوہ سلطان ان کی غلطیوں پر پردہ ڈالے اور ہر معمولی وجہ پر انھیں بے عزت نہ کرے اور یہ کہ اگر دوسروں نے بھی ان کے اعلیٰ رتبوں تک پہنچنے کی خواہش کی تو یہ بھی ممکن نہیں.

(۳) سلطان کے قدیم خدمت گاروں اور غلاموں سے متعلق حقوق کے اعتراف سے مراد یہ ہے کہ وہ انھیں عزت و احترام سے رکھے. تاہم اسے انھیں صرف شخصی اوصاف کی بنیاد پر ہی اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنا چاہیے. اگر اس کے برعکس کیا گیا تو ان کی بربادی ہوگی اور مملکت کی بھی. امور ریاست کو زائد غیر معقول قسم کی عنایات سے بھی مستحکم نہیں کیا جا سکتا. صرف اس شخص کو عنایات و تحائف سے مشرف کرنا چاہیے جو اس عزت کا مستحق ہو اور پھر اس کی خدمات کے تناسب کو مد نظر رکھنا چاہیے. گزشتہ خدمات کے اعتراف میں کمی بدنامی اور عدم اعتماد کا باعث بن جاتی ہے لیکن نااہل لوگوں کے ساتھ حد سے زیادہ مہربانیاں ظلم، راہ راست سے انحراف مستحق لوگوں کے حقوق کے اعتراف میں کمی اور ریاست کی حکمت عملی میں خامیوں کی موجب ہوتی ہے.

(۴) سلطان کے سلطنت کے منتخب انسانوں کے، جو مسلمہ اوصاف سے مزین ہیں اور اس کے لیے شخصی خدمات انجام دینے کا بھی دعویٰ نہیں کرتے ہیں، حقوق کے اعتراف کا مطلب یہ ہے کہ زر دان کی خوبیوں کے

تناسب سے اپنی دہلیز اور دربار میں موجود عوام میں ان کے لیے عزت واحترام پیدا کرے اور اپنی عنایات اور ذاتی تعلقات سے انھیں اپنی ریاست کا مخلص خیر خواہ بنائے۔

(۵) سلطان کا رعیت کے حقوق کے اعتراف کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے گناہوں کو بخشے۔ ان کی پشیمانیوں کو تسلیم کرے۔ معمولی تحقیق وتفتیش اور ان کی غلطیوں کی کھوج کرنے سے گریز کرے اور ان سے صرف وہی طلب کرے جو ان کی قوت برداشت سے باہر نہ ہو۔ مزید یہ کہ اسے ان کے ساتھ شفقت سے پیش آنا چاہیے اور زیادہ تر محکومین کو اپنے حد سے زیادہ عدل وانصاف سے اپنا خیر خواہ بنانا چاہیے۔ جب سلطان عوام کے حقوق تسلیم کرنے اور اپنے وعدوں کی تعمیل کرنے کی شہرت حاصل کر لیتا ہے تو امور ریاست مستحکم ہو جاتے ہیں اور اس کے محکومین اور سپاہی اس کے حامی اور خیر خواہ بن جاتے ہیں۔

(۳۔ سرزنش کے کچھ مسائل)

(اس موضوع پر قلمی نسخہ میں عبارت خلط ملط ہو گئی ہے لیکن تسلسل صحیح کرنے کے بعد جو عبارت بنی ہے اس میں حسب ذیل عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے: (۱) سلطان کو شرعی سزاؤں میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے (۲) سیاسی جرائم کے لیے سزائے موت صرف انتہائی صورتوں میں ہی دینا چاہیے۔ (۳) قرآن وحدیث سیاسی مجرموں کی سزا کے متعلق ساکت ہیں اور عظیم فقہا اسلام نے صرف اتنا کہا ہے کہ سلاطین اور سیاسی سزائیں دینے والا شخص دونوں خدا کو جواب دہ ہیں۔ لہٰذا سلطان کو ان ''ناگزیر مواقع کو سمجھ لینا چاہیے جن میں وہ سزائے موت دینے میں حق بجانب ہے۔ برنی اس اصول کی تائید کرتا ہے کہ سزائیں اتنی ہی دی جائیں جس قدر وہ ریاست کی بہبود کے لیے ضروری ہیں (۴) دینی سزائیں جو ہندوستانی معاشرہ اور روایات سے بالکل غیر متعلق ہیں (۵) سلطان کی ہتک عزت اور توہین کے لیے سزائیں۔ (۶) بیت المال کے سلسلے کے جرائم (۷) وہ حالات جن میں سلطان کو عوام کی سفارش سن لینا چاہیے۔)

(۱) تمام سلاطین کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انھیں امت اسلام کے لیے شریعت کے مجوزہ جرمانہ، سزا و معاوضہ کو بڑھانے یا گھٹانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ دراصل تحفظ دین کے سلسلے میں سلطان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ شریعت کے نفاذ کے لیے ۔۔ ایماندار افسر مقرر کرے اور ان کی اس قدر موثر طریقہ سے مدد کرے کہ احکام شریعت کسی غلط تشریح یا فریب کے بغیر جاری کیے جا سکیں۔ ان افسروں کو اشخاص کا کوئی احترام نہ کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی کی حیثیت یا رتبہ کا پاس کرنا چاہیے، نیز انھیں علمارِ دین سے ورثہ میں ملی ہوئی روایات کے ظاہری معنی سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں منافقتوں یا مبالغہ آمیز تشریحات کی طرف رجوع نہیں ہونا چاہیے اور ایسے

معاملات کہ جن میں قوانین شریعت نافذ نہیں کیے جا سکتے انھیں سلطان کے روبرو پیش کرنا چاہیے۔

۲۔ کچھ دنوں کی عظیم الشان بادشاہت کے دوران سنت اللہ کی پیروی کرنا چاہیے[1]۔ اس دنیا میں مختلف اقسام کی مخلوق ہے اور سلطان کو ہر جماعت اور طبقہ سے نمٹتے وقت اس کی مخصوص روایات، کام، پیشہ اور عادات کو مدنظر رکھنا ہے۔ اسے باوصف اور مطیع اشخاص کے ساتھ تو شفقت سے اور منکسر انسانوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔ اسے اپنے خیرخواہوں کی غلطیوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ ان کی کمیوں سے تجاہل برتنا چاہیے اور ان کی نااہلیوں پر پردہ ڈالنا چاہیے۔ نیز اسے ان کے معمولی جرائم، لغزشوں اور اپنے ہی شخص کے خلاف ان کے گناہوں کو معاف کر دینا چاہیے۔ البتہ باغیوں، سرکشوں اور شرپسندوں اور نیز سیاسی مجرموں، مانعین، نافرمانوں، بدمعاشوں اور بےشرم لوگوں کو مناسب سزائیں دینا چاہیے۔ ہر سزا میں اس کی حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور جہاں ممکن ہو سکے سزائے موت دینے میں ضبط سے کام لینا چاہیے کیوں کہ انسان اللہ کی تعمیر ہے، معاوضوں، جرمانوں اور جلاوطن کرنے کے سلسلے میں اسے اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ شریعت کے احکامات سے تجاوز نہ ہو۔

بلاشک وشبہ سلاطین نے سزائے موت دینے میں کسی عالم دین کی نصیحتوں کے مطابق عمل نہیں کیا ہے۔ مذکورہ بالا طبقوں اور جماعتوں کے سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ اگر کم سزائیں دے کر انھیں سیاست سے (یعنی ڈر، ہیبت) رکھنے کا مقصد حاصل نہیں ہوتا ہے تو کافی پس وپیش کے بعد اور بادل نخواستہ انھیں سزائے موت دینے کی اجازت ہے۔ عام عوام کے لیے سیاست کا مطلب موت کے گھاٹ اتارنا ہے۔ سزائے موت کے بارے میں مختلف خیالات ہیں۔ تمام مذاہب میں انسانوں کو اس کی زندگی سے محروم کرنا منع ہے اور کسی مسلمان کو سزائے موت کا حکم دینا جب تک کہ شریعت ہی اجازت نہ دے انتہائی پرخطر ہے خواہ حکم سناتے وقت یہ کتنا ہی آسان معلوم ہو[2]۔ نیز تمام سزائیں دیتے وقت حالات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ سزائے موت دینے سے حتی الامکان گریز دیندار مسلم سلاطین کی سیاست کی

---

[1] سنت اللہ جیسے تصور پر حاشیہ میں مناسب گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ بہرکیف قرآن میں اس تصور کی طرف دو جگہ اشارہ کیا گیا ہے۔ (الف) سورہ ۱۶، آیت ۷۷: "ہم نے اپنے انبیاء کے ذریعے جو سنت تمہارے سامنے بھیجی ہے تم ہماری اس سنت میں کوئی تبدیلی قرار نہیں دو گے۔" (ب) سورہ ۴۸، آیت ۲۳: "تمہارے سامنے جو ہوا ہے اس سے متعلق سنت اللہ ہے اور تم سنت اللہ میں کوئی تبدیلی قرار نہیں دو گے۔"

[2] اس جگہ اور اس کے بعد کے پیراگرافوں میں قرآن کی سورہ ۵، آیت ۱۳ کے ان احکامات کی طرف اشارہ ہے: "ایک سچے مومن کو کسی سچے مومن کا قتل نہیں کرنا چاہیے لیکن اگر غلطی سے ایسا ہو جاتا ہے۔۔۔ اگر کوئی شخص کسی سچے مومن کا بالارادہ قتل کرتا ہے تو ابد تک اس کی جگہ دوزخ میں ہے۔"

اہم ترین خصوصیت رہی ہے۔

۴. لیکن کوئی "دمیند" سلطان جن حقیقی مصیبتوں اور مشکلوں سے دوچار ہوتا ہے وہ جرمانوں اور زبردست سزاؤں سے متعلق ہیں جو اس کی سیاسی حکمت عمل کے لیے ضروری ہیں۔ سیاسی سزاؤں کے مسئلہ پر ہمیں چاروں سنی مسلکوں سے کوئی واضح حکم نہیں ملا ہے سوائے اس کے کہ سلاطین جو بھی سیاسی سزائیں دیتے ہیں وہ ان کے لیے جواب دہ ہیں۔ سلاطین اسلام کے لیے دنیاوی امور میں اس سے زیادہ پریشانی کی کیا بات ہوسکتی ہے کہ انھیں احکام خدا و رسول کو پس پشت ڈالنا پڑ جائے اور شریعت کی اجازت کے بغیر ہی اپنی ذاتی ذمہ داری پر مسلمانوں کا خون بہانا پڑے جسے خدا نے منع کیا ہے کہ کچھ دن کی حکومت کے لیے وہ مسلمانوں کا قتل کر کے تخت الٰہی کے سامنے جواب دہ ہوں اور اپنی انفرادی شخصیتوں کے تحفظ، شاہی امور کی شان و شوکت اور اپنے رتبہ او رعزت کو دنیا کے عوام کے امن و بہبود کے مرادف سمجھیں۔

سزائے موت کی مذکورہ بالا پہلی قسم "قصاص شرعی" کہلاتی ہے اور دوسری "سیاست ملکی"۔ سلطان محمود کا خیال تھا کہ اس دنیا کی تمام لذتیں "قصاص شرعی" کی ذمہ داری سے زیادہ وزنی نہیں ہیں اور اللہ پر ایمان لانے والے کسی بھی شخص کے خون کا ایک قطرہ بھی جو ناجائز طور پر بہایا گیا ہے قدر و قیمت میں بادشاہت کی تمام شان و شوکت اور اقبال مندی سے زیادہ ہے۔

محمود کے فرزندوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ علماء دین نے جن سلاطین کو جن سیاسی سزاؤں کے لیے ذمہ دار قرار دیا ہے اور حدود مقرر نہیں کیے ہیں وہ سزائیں مختلف اقسام کی ہیں۔

سزا کی ایک قسم سلطان کے خلاف سازشوں سے متعلق ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

کچھ یا کافی تعداد میں لوگ سلطان کے خلاف بغاوت کرنے کی سازش مرتب کرتے ہیں لیکن وہ بغاوت شروع ہونے سے پہلے ہی، ان کی سازش کا پتہ لگا لیتا ہے اور ان کے ارادے اور منصوبے قطعی طور پر عیاں اور ثابت ہوجاتے ہیں پس امور ریاست کو مناسب طریقہ سے آراستہ کرنے اور دوسرے سازشیوں کی تنبیہ کی خاطر اور پھر اپنی اور اپنے ماتحتوں کی مستقل فلاح و بہبود کی غرض سے سلطان اس طرح کے سازشیوں کو خواہ وہ دس ہوں، بیس ہوں یا اس سے بھی زیادہ اور یہ لحاظ کیے بغیر کہ وہ مسلمان ہیں اور علانیہ بغاوت کے مرتکب نہیں ہیں (عملاً) موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سلطان کی بصیرت ایسے اشخاص کی موت کا مطالبہ کرتی ہے اور ان کی پشیمانی قبول نہیں ہوتی۔ علماء دین نے ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے محض بغاوت کی سازش کی تھی کوئی واضح فیصلہ نہیں دیا ہے۔ انھوں نے ایک سرسری سا فیصلہ دیا ہے کہ "سیاسی امور سلاطین کی ذمہ داری پر چھوڑ دیے گئے ہیں، شریعت قصاص شرعی کی اجازت صرف اس صورت میں دیتی ہے جب کہ کسی شخص نے دوسرے شخص

کو ناجائز طور پر مار ڈالا ہو یا اسلام سے منحرف ہوگیا ہو یا پھر اس نے شادی شدہ عورت سے مباشرت کی ہو لیکن محض سازش کرنے یا بغاوت میں شامل ہونے پر قصاص شرعی دینے کے بارے میں نہ تو قرآن میں کوئی آیت ہے، نہ ہی کوئی حدیث اور نہ ہی کسی مقبول عالم دین کا کوئی قول ہے۔ سلطان دوسروں کی تنبیہ اور ہدایت کے لیے اور اپنی اور اپنے حمایتیوں کی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے سازشیوں کو سزائے موت دیتا ہے۔ اس کے باوجود اس طرح کی موت کی سزائیں دینی نقطہ نظر سے انتہائی پریشان کن ہیں جب کہ سلطان اور اس کی حکومت کی فلاح و بہبود کے لیے وہ سودمند اور دوسروں کے لیے نصیحت آموز ہوسکتی ہیں کیوں کہ لوگ محض ارادوں کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارے جاتے ہیں اور ان کی پشیمانی قبول نہیں کی جاتی۔

سیاسی سزا کی ایک دوسری قسم مسلمانوں کی اس جماعت سے متعلق ہے جو شبہ کی کسی وجہ کے بغیر کسی ایسے خلیفہ یا سلطان کے خلاف بغاوت کر دیتے جو نہ تو فاتح ہے اور نہ ہی غاصب، وہ اپنی تلواریں نکال لیتے ہیں طاقت آزمانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں، لڑائیاں لڑتے ہیں اور لشکر اسلام کے خلاف جنگیں کرتے ہیں اور خواہ مخواہ رعیت کو لوٹتے ہیں تاکہ لوگ پریشان ہو جائیں اور تتر بتر ہو جائیں۔ علمائے شریعت میں ان باغیوں کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے جو لشکر اسلام کے خلاف جنگوں میں مارے جاتے ہیں۔ لیکن اس پر اختلاف رائے ہے۔ کہ اگر باغی زندہ پکڑ لیے جائیں اور وہ اپنی بغاوت کے لیے پشیمان ہوں تو ان کی پشیمانی آیا قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟

ایسے حالات میں اعام اسلطان کی بصیرت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو راہ راست پر رکھنے اور ان کی تنبیہ کی غرض سے اسیر باغیوں کی پشیمانی قبول نہ کی جائے اور انھیں سزائے موت دی جائے۔ لیکن اسیر باغیوں کی سزاؤں کے سلسلہ میں سچے دیندار سلاطین کی مختلف رائیں تھیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ تمام مقید باغیوں کو سزائے موت نہیں دینا چاہیے اور اخلاقی اعتبار سے صحت مند اور شر پسند افراد میں فرق کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے ان لوگوں کو آزاد کر دیا تھا جو دل سے امن کے خواہاں تھے اور ضرورتاً یا فریب میں آکر باغیوں کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ اس قسم میں خیمہ کے ساتھ چلنے والے، غلام، خدمت گار، بازار کے لوگ اور ایسے ہی دوسرے لوگ شامل ہوتے ہیں جو تمام بغاوتوں میں ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ شر پسندوں کو بھی دو جماعتوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ ان مجنونوں اور شر پسندوں کو انھوں نے موت کے گھاٹ اتارا جنھوں نے بار بار بدنظمی پیدا کی اور بغاوت کی اور ہمیشہ بغاوت کے لیے سازش کرتے رہے تھے۔ دوسری طرف انھوں نے ان باغیوں کو جن کی پشیمانی کو انھوں نے قابل قبول سمجھا اور جنھوں نے ماضی میں شاذ ہی بغاوت کی تھی سزائے موت نہیں دی بلکہ صرف جلاوطن کر دیا یا اپنے افسروں کی نگرانی میں مقید کر دیا۔

دیندار سلطانوں نے ان اشخاص میں بھی تمیز کی جنھوں نے بغاوت اور نافرمانی کے بعد دست بردار ہو کر گوشہ نشینی پر اکتفا کیا اور وہ اشخاص جنھوں نے خون بہایا، شہروں کو لوٹا اور اسلام کے پرچم پر دست درازی کی پہلی جماعت کی سزاؤں میں انھوں نے مختلف طریقوں سے تخفیف کی اور دوسری جماعت کے اشخاص کو ان کے مجرمانہ افعال، جرائم، لوٹ مار، ظلم وجبر کی مناسبت سے سزائیں دیں۔ اگر دوسرے طریقوں سے معاملات درست کرنا ممکن ہوا ہے تو دیندار سلاطین نے اسیر باغیوں کو سزائے موت نہیں دی ہے۔ انھوں نے ان تمام مومنین کو مارنے سے پرہیز کیا ہے اور ان کی پشیمانی قبول کی ہے جنھوں نے محض بغاوت اور نافرمانی کی غرض سے کسی کا خون نہیں بہایا نہ مسلمانوں کا مال وجائداد لوٹا، نہ بیوی بچوں کو ضرر پہنچایا اور نہ ہی پرچم اسلام پر دست درازی کی۔

محمود کے فرزندوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اقتدار سے محبت اور بادشاہت کی خواہش ایسی دنیا سے وابستہ ہیں جس میں احکام حکومت جاری کرتے وقت شریعت کو پہچاننے والی چشم کی بینائی جاتی رہتی ہے جب کہ خوف خدا، خوف محشر اور خوف آخرت ایک مختلف ہی دنیا سے متعلق باتیں ہیں۔ لیکن سلطان کیسے ہی حالات سے دوچار کیوں نہ ہو۔ دین حق کی پابندی اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ وہ اپنی غفلت میں قوانین شریعت کی طرف پشت کر لے اور مسلمانوں کے خروج اور خون کے معاملہ میں غصہ کے تحت کیسے ہی احکامات جاری کر دے۔

فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام کو معلوم ہونا چاہیے کہ سیاسی بیش دستیوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں وہ بیش دستیاں ہیں جن سے ریاست کے زوال کا خطرہ ہے دوسری وہ جو بادشاہت کے عزت و وقار کو رسوا کرتی ہیں۔ زمانۂ قدیم کے ظالم فرماں رواؤں اور فرعونوں نے، جنھوں نے خدا کی عبادت سے منہ موڑ رکھے تھے اور الوہیت کے دعوے کیے تھے۔ دونوں اقسام کے سیاسی جرائم کے لیے سنگین سزائیں دی تھیں۔ انھوں نے ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انھیں لاتعداد قتل کرنے میں کوئی پس وپیش یا خوف محسوس نہیں ہوا، لیکن سلاطین اسلام کو، جو ریاست کو دین کی شمشیر تصور کرتے ہیں، باغی ظالم فرماں رواؤں کی روایات پر نہیں چلنا چاہیے۔

قدیم مسلم سلاطین نے جو اپنے دین میں غیر مشغول تھے، مسلمانوں کو سزا دینے کے بارے میں بہت غور وخوض کیا۔ ان کی سزائیں کئی طرح کی ہوتی تھیں۔ وہ سیاسی مجرموں کے مجمع کو ایک ہی لکڑی سے نہیں ہانکتے تھے۔ انھیں پس وپیش ہوتا تھا اور وہ اس امر پر مختلف زاویوں سے غور وفکر کرتے تھے یہاں تک کہ وہ کسی مسلمان کو اس کی زندگی سے محروم کرنے کے خیال ہی سے لرز جاتے تھے جب ان پر ملزمین کی بیش دستیاں

ثابت ہو جاتی تھیں اور ان کی زندگیاں بچانے کے لیے کوئی مناسب راستہ نہیں نکل پاتا تھا) ہوتا اور یہ بھی واضح ہو چکا ہوتا کہ ان کی پیش دستیاں شر انگیز اور ہولناک دونوں ہی تھیں تو ایسی صورت میں وہ کچھ اشخاص کو عوام کی تنبیہ کی خاطر سزائے موت دے دیتے تھے۔ پھر بھی جب تک وہ زندہ رہتے تھے اپنے ہاتھوں سے دی جانے والی سزاؤں کے خیال سے لرزتے رہتے تھے۔ اگر کسی شخص کی بے گناہی اس کی سزائے موت کے بعد ثابت ہو جاتی تھی تو وہ اس کے ورثاء سے رابطہ قائم کرتے تھے اور ان کو خونبہا دیتے تھے اور نیز انہیں اپنی نگرانی میں پرورش کرتے تھے۔ وہ ہر عذر کے تحت قصاص شرعی کے نفاذ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اور اپنے معاملات میں سخت نہیں ہوتے تھے۔ وہ کسی ایک شخص کے گناہ کے لیے دس انسانوں کو قتل نہیں کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ کسی شخص کو اس کے جرائم کی پاداش میں سزائے موت دینے کے بعد اس کے معصوم رشتہ داروں کو کوئی زک نہیں پہنچاتے تھے کیوں کہ جس شخص کو مارا گیا صرف وہی مجرم تھا، اس کے رشتہ دار نہیں۔ قرآن کی اس آیت کو نظر انداز کرنا کہ "کوئی بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا ہےٗ"، اور مقتول کے (معصوم) خاندان کو کچلنا اور مٹانا یا کسی ایک شخص کے گناہوں کے لیے ایک سو یا ایک ہزار انسانوں کو، آخرت کی سزاؤں کا دھیان کیے بغیر، آفت میں ڈالنا بے دینی اور شریعت کی اہانت ہے۔

علمارِ دین نے شریعت کی اجازت کے بغیر کسی مسلمان کو سزائے موت دینے کے وحشیانہ طریقہ کے متعلق حسب ذیل باتیں کہی ہیں۔ ایک طاقت ور دیندار سلطان کے دل میں، جو دین کا محافظ، عقیدہ میں پختہ اور بصیرت میں درست ہے، خدا اور شریعت محمدی کا خوف ہونا چاہیے اور سلطنت کے باشندوں کی بہبود اس کے افکار و اعمال کا مقصد ہونا چاہیے۔ اپنی ذات اور سلطنت کی حفاظت ہی اس کی سزاؤں کا واحد مقصد نہیں ہونا چاہیے اور اس کے قلب کو مستقل خدا سے التجا کرتے رہنا چاہیے۔ اسے ان ناگزیر مواقع کو صحیح طور پر بھانپ لینا چاہیے جن میں کوئی مسلم سلطان اپنی ذمہ داری پر سزائے موت کا حکم دے سکتا ہے۔

مسلم سلاطین نے سیاسی پیش دستیوں کے لیے قصاص شرعی اور دوسری سزائیں دیتے وقت کئی اصولوں کو مدنظر رکھا ہے۔ ایک اصول جو انھوں نے پیش نظر رکھا ہے کچھ اس طرح ہے۔ وہ کچھ ہی اشخاص کو سزا دیتے ہیں تاکہ بہتوں کو تنبیہ ہو جائے اور وہ مناسب طریقہ سے پیش آئیں۔ لیکن بالفرض وہ کثیر تعداد میں ایک سو یا دو سو یا پانچ سو لوگوں کو سزائے موت دیتے ہیں تو یہ سیاسی سزا نہیں بلکہ بدنظمی اور ہنگامہ ہے۔

۸ سیاسی سزاؤں کے متعلق (جیسا کہ پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے) نہ تو قرآن ہی میں کوئی حکم ہے اور نہ کوئی حدیث

ٗ قرآن، سورہ ۴، آیت ۱۶۴

ہے اور نہ ہی (مقبول عام) فقہا نے اس کے بارے میں کوئی واضح بات لکھی ہے۔ انھوں نے تو سلطان کی اہلیت پر بھی گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے جنھیں قانونی توجیہہ واستنباط کا حق حاصل ہو سکتا ہے۔

سیاسی سزاؤں میں جو دوسرا اصول مدنظر رکھنا چاہیے وہ اس طرح ہے اگر ایک ہی جرم کی پاداش میں بہت سے اشخاص سلطان کے سامنے پیش کیے جائیں تو سلطان کی بصیرت کا یہ معیار ہو کہ وہ ہر فرد کی حیثیت اور مقام کے مطابق سزاؤں کا حکم دے۔ کچھ پر تو وہ ایک رقم بطور جرمانہ عاید کرنے پر اکتفا کرتا ہے کچھ دوسروں کو وہ عام قید کی سزا سناتا ہے اور کچھ کو بیڑیاں ڈال کر زنداں خانہ میں ڈال دیتا ہے اگر کچھ کو وہ ٹھوکریں لگواتا ہے تو دوسروں کو دور دراز کے مقامات کے لیے جلاوطن کر دیتا ہے اور بعض کو سزائے موت بھی دیتا ہے۔

۴۔ سزا کی ایک قسم وہ ہے جو سلطان اپنے دین کی کاملیت کی وجہ سے دیتے ہیں اور جس کے متعلق وہ لوگوں کی پشیمانی قبول نہیں کرتے۔ گو کہ اس موضوع پر علماء دین میں اختلاف ہے تاہم ایسی سزاؤں پر خدا سلاطین کو اجر دیتا ہے۔ نبوت کے دعویداروں کو سزائے موت دینا چاہیے اور بغیر کسی پس وپیش کے ان کو قتل کر دینا چاہیے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے لیکن رسول اکرم کے لیے نامہذب الفاظ استعمال کرنے کے لیے زبان کو جنبش دیتا ہے اور ان کا توہین اور حقارت آمیز لہجہ میں ذکر کرتا ہے تو سلاطین کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑیں اور بدترین طریقوں سے موت کے گھاٹ اتار دیں۔ اس کی توبہ اور ندامت کسی بھی شرط پر قبول نہیں ہونا چاہیے۔ اس ذمی (محفوظ غیر مسلم) کی سزا کے بارے میں اختلاف ہے جو رسول اکرم کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن صحیح رائے یہ ہے کہ اسے پٹنا چاہیے یہاں تک کہ وہ مر جائے اور اسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ دوسرے انبیاء کے لیے نامہذب الفاظ استعمال کرنے پر بھی قصاص شرعی اور موت کی سزائیں تجویز کی گئی ہیں لیکن اس میں اختلاف رائے ہے کہ آیا ملزمین کی ندامت قبول کی جائے یا نہیں۔ نیز اگر کوئی مسلمان قرآن یا حدیث کی کسی کتاب کو اپنے پیروں سے روندتا ہے یا کسی بھی طرح ان کی توہین کرتا ہے یا جامع مسجد میں کھلم کھلا شراب نوشی کرتا ہے۔ یا کھلے عام مباشرت یا اغلام بازی کا مرتکب ہے، یا رمضان میں علانیہ شراب نوشی کرتا ہے، یا کسی بچے بچی سے جنسی تعلق رکھتا ہے یا ان عورتوں کے ساتھ زنا کرتا ہے جن کے ساتھ نکاح ممنوع ہے جیسے کہ راندۂ درگاہ ملحد تو ملزمین کی ان جماعتوں کو سزائے موت دینا چاہیے تاکہ دین کا استحکام اور عوام الناس کی ہدایت ہو اور یہ بداعمالیاں عام نہ ہو سکیں۔ ماہ صیام میں (روزہ کے اوقات میں) کھانے والوں کو خواہ وہ کھلم کھلا ہی کیوں نہ کھاتے ہوں سزائے موت نہیں دینا چاہیے کیوں کہ عین ممکن ہے کہ ان کے پاس کوئی معقول جواز ہو۔ تاہم ایسے اشخاص کی سرزنش ہونا چاہیے اور انھیں سزا دینا چاہیے نہ کہ انھیں یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ جہاں تک اسلامی

روایات کی توہین کرنے والوں کی بات ہے ان کے ساتھ کسی طرح کی نرمی اور ملائمت تجویز نہیں کی گئی ہے۔

۵۔ جہاں تک سلطان کی توہین کرنے پر سزا کا معاملہ ہے اگر ہتک کرنے والا کوئی کافر مشرک یا ذمّی ہے تو اسے سزائے موت دینا چاہیے لیکن بالفرض وہ مسلمان ہو تو اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ معاملہ شریعت کے دائرہ عمل میں آتا بھی ہے یا نہیں۔ بہرصورت سزائے قتل نہیں ہے۔ لیکن غیر شرعی معاملہ میں نہ تو سزائے موت ہے اور نہ ہی کوئی دوسری سزا لیکن شریعت کی حدود میں آنے والے معاملات میں سزا ہے۔ نیز خواص کے لیے ایک قسم کی سزا ہے اور عام لوگوں کے لیے مختلف۔ کچھ اتفاقی صورتوں میں خواص کے لیے سخت سزا کا حکم ہے اور عام لوگوں کے لیے نرم۔ لیکن دوسرے اتفاقی حالات میں عام لوگوں کے لیے خواص سے زیادہ سخت ہے۔ خواص کے لیے عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ اقسام کی سزائیں ہیں۔ ہتک عزت کرنے والے کو مناسب سزا دینے کے لیے حالات کا علم ضروری ہے۔

علمائے دین نے کہا ہے: "اگر سلطان کو گالی دینے والے یا اس کے احکام کی توہین کرنے والے کو بھی سزائے موت دی جاتی ہے تو اس طرح سلاطین اور انبیاء میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور اس امتیاز کو نظر انداز کرنا سنت سے غفلت کے مترادف ہے۔ کیوں کہ رسولؐ اکرم نے فرمایا ہے کہ "انبیاء کو گالی دینے والے اور انھیں برا بھلا کہنے والوں کے لیے سزائے موت ہے لیکن رسولؐ اکرم کے صحابہ کو برا بھلا کہنے اور گالیاں دینے والے کو کوڑے لگا کر قید کرنا چاہیے" اس حدیث سے علمائے دین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جو حضرت ابوبکر کو گالی دے اسے پہلے ٹھوکریں لگائی جائیں اور پھر قید میں ڈال دیا جائے اور جو حضرت عائشہ کو گالی دے اسے سزائے موت دی جائے۔ اسی طرح جو رسول اکرم کی دوسری ازواج مطہرات کو گالی دے اسے بھی سزائے موت دی جائے کیوں کہ جب مومنین کی ماؤں پر گالیاں پڑتی ہیں تو رسول اکرم کو بھی ان گالیوں میں شامل کر لیا جاتا ہے اور درحقیقت، ان ہی کو گالی دی جاتی ہے۔

۶۔ بیت المال کے غبن اور دوسری پیش دستیوں کے لیے جس میں تمام مسلمان شریک ہیں نہ تو سزائے قتل ہے اور نہ ہی قطع ید یا دست[۱] اگر الزام ثابت ہوجاتا ہے تو رقم واپس طلب کرنا چاہیے۔ اگر رقم قبضہ میں رکھتے ہوئے بھی غبن کرنے والا عذر پیش کرتا ہے تو اس کے ساتھ سخت برتاؤ کرنا چاہیے اور سزائیں دینا چاہیے۔ لیکن ایسی

---

[۱] قرآن کی قطع دست کی سزا (سورہ ۵، آیت ۴۱) ان اشخاص کو نہیں دینا تھی جنھوں نے بیت المال سے چوری کی تھی کیونکہ وہ "غبن" کے مرتکب تھے، "چوری" کے نہیں۔ چنانچہ تاریخ فیروز شاہی کے مطابق (ص ۲۹۲) بیانہ کے قاضی مغیث الدین نے سلطان علاؤالدین خلجی سے عرض کیا "اگر عاملوں کو اپنی ضروریات زندگی کے لیے کافی نہیں ملتا ہے اور (باقی صفحہ ۱۴۳)

سزاؤں میں جیسے قید، بند شیں اور بیڑیوں میں جکڑنا، قانون قرآن پر مناسب توجہ رکھنا چاہیے۔ غبن کرنے والے کے اچھے یا برے چال چلن کی روشنی میں اس کے جرم کے بارے میں رائے قائم کرنا چاہیے۔ اگر چوروں کو بیت المال کی ملازمت میں داخل ہونے دیا جائے گا تو وہ غبن اور ناجائز تصرف کو اپنا پیشہ بنالیں گے اور اگر سلطان اس سے واقف ہونے کے باوجود قید و بند کے ذریعہ رقم واپس نہیں لیتا ہے تو بیت المال میں کافی بدعنوانیاں راہ پالیں گی نیز اگر اس طرح کی باتوں کو واقع ہونے دیا گیا تو سلطان پر سے، جو کہ بیت المال کا محافظ ہے اور جس کے شعور و بصیرت کے سپرد بیت المال کا جمع و خرچ کیا گیا ہے، عوام اعتماد اٹھ جائے گا آخر میں (مسلسل غبن کے نتیجہ میں)، عوام کے دلوں سے اعلیٰ ترین حاکم کا احترام ختم ہو جائے گا۔ نتیجتہً احکام کے نفاذ میں ڈھیلا پن پیدا ہو جائے گا، امور حکومت میں کوئی استحکام باقی نہیں رہے گا اور ملک کے انتظامیہ میں انتشار پھیل جائے گا۔

۷۔ ایک دوسرا اصول جس کا عظیم سلاطین نے اپنی سزاؤں اور سیاسی جرمانوں میں لحاظ رکھا ہے شفاعت (سفارش) کے دروازے کو کھلا رکھنا ہے کیوں کہ اس سے عوام کے قلوب میں بڑی امید پیدا ہوتی ہے، خواص و عوام میں سلطان کے لیے محبت بڑھتی ہے اور سلطان کے مخالف اور اس کی مملکت سے مفرور لوگ مایوس اور ناامید نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن سلطان کو سفارش کا دروازہ کھولتے وقت اپنے ذہن میں کچھ شرائط رکھنا چاہیے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اگر سفارش کرنے والا شخص سلطان کے بیٹوں، بھائیوں اور اعلیٰ افسروں میں سے ہے تو وہ دوسروں سے نفرت نہ کرتا ہو اور کوئی دوسرا اس سے زیادہ کا عزیز اور مقرب نہ ہو۔ دانش مند اور عالی نسب بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے اشخاص کی تعداد کتنی کم ہے جنھیں ایسا اقبال حاصل ہو۔ اگر سفارش کرنے والے شخص کا تعلق حلقۂ مشائخ سے ہے تو رتبہ میں ان کا کوئی ثانی نہ ہو اور کوئی ان سے برتر اور زیادہ قابل احترام نہ ہو۔ اگر سفارش کرنے والا شخص عالم ہے تو اسے تقوی، دیانت داری، برتاؤ اور فضیلت علم میں سبھی پر سبقت رکھنا چاہیے تاکہ اس کی سفارش رد نہ کی جا سکے اور دوسرے لوگ اپنے دلوں میں ایسا ہی اقبال حاصل کرنے کی تمنا نہ کرسکیں اور امراء و وزراء کو مداخلت کا موقع نہ مل سکے۔

سفارش (شفاعت) کا دروازہ کھولنے کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس دروازہ کو ہمیشہ کھلا نہیں رکھنا چاہیے۔ کبھی کبھی تو سلطان کو بہ خوشی سفارشیں سن لینا چاہیے لیکن اگر (سزاؤں کے متعلق) مستقل سفارشیں سنی

بقیہ حاشیہ: وہ بیت المال سے چوری کرتے ہیں جو رعیت سے وصول کیے ہوئے محصولات سے پر کیا جاتا ہے یا وہ رشوتیں لیتے ہیں یا (جمع کیے گئے) خراج اور رقم سے کم (حکومت کو دیتے ہیں) تو سلطان اپنی قوت فیصلہ کے مطابق ان پر جرمانہ، قید یا دوسری سزائیں عاید کرسکتا ہے۔ لیکن قطع دست بیت المال سے چوری کے لیے بطور سزا تجویز نہیں کیا گیا ہے۔

گئیں اور انھیں قبول کیا جاتا رہا تو انتظامی اور مال گزاری امور میں ملوث مجرم اسی راستے کو پکڑیں گے۔ نتیجۃً بدنظمیاں پیدا ہوں گی لیکن وظائف، تنخواہوں میں اضافے اور انتظامی و مال گزاری امور سے غیر متعلق جرائم کے سلسلے میں سفارش کا دروازہ زیادہ کھلا رکھنا چاہیے۔ نیز اس طرح کی سفارش کرنے کی خصوصی رعایت بہت سے اشخاص کو دینا چاہیے تاکہ ضرورت مند ملتجی اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ایسی سفارشوں کو وسیلہ بنا سکیں۔ یہ طریقہ امور حکومت اور ریاست کے لیے بہت زیادہ مفید ہوتا ہے۔

اس نصیحت کی تائید میں دو مثالیں دی گئی ہیں (۱) امام ثعلبی کی تاریخ عباسیان کی سند پر یہ کہا گیا ہے کہ خلیفہ مامون الرشید ابھی مرو ہی میں تھا کہ بغداد میں بغاوت ہوگئی۔ ہارون الرشید کے ایک بھائی ابراہیم مہدی کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا اور ربیع بن فضل، جو ہارون کا وزیر تھا، باغیوں کے ساتھ جا ملا۔ مامون نے بغداد کی طرف کوچ کیا اور بغاوت بہ آسانی دبا دی گئی۔ مامون نے تمام باغیوں کو بمعہ ابراہیم مہدی اور ربیع بن فضل معاف کر دیا[۱]
(۲) یمن کے قدیم فرمارواؤں کا لقب تبّع تھا۔ ان میں ایک ظالم تبّع نے یہ سن کر کہ ایک نابالغ تخت نشین ہوا تھا روم (بازنطین) کی طرف کوچ کر دیا۔ اسے ناگہانی بارش نے آگھیرا اور دو سال بعد وہ ناکام ہی واپس ہوگیا۔ اس دوران سلطنت کے تحفظ کی خاطر یمن کے افسروں نے اس کے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ تبّع نے ایک مرتبہ پھر اپنے کو دارالسلطنت میں مستحکم کیا، چار پانچ ہزار آدمیوں کو جنھوں نے اس کے بھائی کی حمایت کی تھی، گرفتار کروایا اور ہر روز ان میں سے پانچ سو کے قتل کا حکم دیا۔ پہلے دن کے قتل عام کے بعد قیدی اپنے قید خانوں سے نکل آئے اور ظالم تبّع کو بمعہ اس کے خاندان، رشتہ داروں اور راعی کو قتل کر ڈالا۔[۲]

---

[۱] جیسا کہ ایک سابقہ نوٹ میں واضح کیا گیا ہے جس وقت مامون مرو میں تھا بغداد میں ایک بغاوت بھڑک اٹھی۔ مامون کے چچا ابراہیم کو، جو سابق خلیفہ مہدی کی ایک حبشیہ باندی کے بطن سے پیدا ہوا تھا، جولائی ۸۱۷ء میں تخت نشین کر دیا گیا اور ہارون کے ایک سابق وزیر فضل بن ربیع نے اس کی حمایت کی۔ مامون نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور باغیوں کو سزا دینے سے پرہیز کیا۔ (موئر، کیلیفیٹ، ۵۰۱ - ۴۹۸، الفخری، ص ۲۱۹-۲۱۶/ ابن خلکان، ابراہیم مہدی پر نوٹ، ج اول، ص ۱۶)

[۲] جنوبی عرب میں واقع یمن ایک قدیم مرکز تہذیب تھا جس کا کچھ ذکر ہٹی کی تاریخ عرب (History of the Arabs) کے پانچویں باب میں مل جائے گا۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی تک عربوں میں اس قدیم تہذیب کے بارے میں کوئی زندہ و جاوید یادگار باقی نہیں رہی تھی جبکہ اس کے آثار ہر جگہ موجود تھے۔ قرآن میں دو جگہ 'تبّع قوم' کا حوالہ دیا گیا ہے۔ "وہ تبّع قوم اور ان سے قبل والوں سے کیا بہتر ہیں ہم نے انھیں نیست و نابود کر دیا کیونکہ وہ گناہ کے مرتکب تھے (باقی صفحہ پر)

نصیحت ۱۴

ضوابط کے بارے میں

سلطان محمود کہتا ہے : اے فرزند، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہت ذمہ داری کا عہدہ اور زبردست بوجھ ہے۔ اور کیسا یہ عہدہ ہے کہ عوام کے معاملات، دنیا میں عدل و انصاف کا نفاذ، اور بنی آدم کے باہمی لین دین، ان کے اختلافات، اور جھگڑے سب ایک ہی شخص کی رائے، قوت فیصلہ احکام اور اختیارات تمیزی سے منسوب کیے جاتے ہیں اور وہ اس طرح مستحکم اور مستقل قائم ہو جاتے ہیں۔ اس سب کے نتیجہ میں نظم اور عمدہ انتظامیہ وجود پذیر ہوتے ہیں، قوانین شریعت نافذ ہوتے ہیں، اسلامی روایات بلند ہوتی ہیں، مرکز میں صداقت قائم ہو جاتی ہے۔ اچھائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ ظلم و جبر کا خاتمہ ہوتا ہے، اناج اور مویشیوں میں برکت ہوتی ہے، بدنصیبیاں اور آفات سماوی کم ہوتی ہیں، نعمت الٰہی کی مسلسل بارش ہوتی ہے اور نیک کاموں کے عوض میں انعام و جزا عطا ہوتے ہیں۔ لیکن بادشاہت کا جیسا عظیم اور ذمہ داری کا عہدہ ان پائیدار قوانین کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی انسانوں کے معاملات قابو میں رکھے جا سکتے ہیں جن کے بارے میں علم و عقل متفق ہیں اور علماء اور دانش مندوں کے صلاح و مشورہ سے بھی فیضیاب ہیں۔

انتظامی اصطلاح میں ضابطہ ایک ایسا طریقہ عمل ہے جسے سلطان اپنے اوپر ایک لازمی فرض کی حیثیت سے ریاست کی بہبود کے حصول کے لیے عاید کرتا ہے اور جس سے وہ قطعاً منحرف نہیں ہوتا۔

بطور مثال اسے ملاحظہ کیجیے۔ حکومت کے تمام اقدامات کا مقصد فوری فائدہ اور قطعی بہبود دونوں ہے اور دانش مند لوگ فوری فائدہ کو اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں جب تک کہ اس سے قطعی بھلائی بھی وابستہ نہ ہو۔ اس طرح عالی نسبوں کی عزت افزائی اور کم اصلوں کی تحقیر کو علم اور عقل دونوں نے منظور کیا ہے لہٰذا سلطان حکومت کے منصب اور عہدے صرف عالی نسب اور پیدائشی آزاد اشخاص کو تفویض کرنا اپنا لازمی

بقیہ حاشیہ:

(سورہ ۴۴، آیت ۳۷) "اور جنگل کے ہم نشین اور تبع عوام، انھوں نے انبیاء کو مسترد کیا اور (ہماری) تنبیہ پوری ہوئی"
(سورہ ۵۰، آیت ۱۴) برنی کا ظالم تبع قرآن کی ان سطور کی روشنی میں وضع کیا گیا ہے۔ لیکن وہ بازنطینی سلطنت پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے زمانہ میں اس سلطنت کا کوئی وجود ہی نہ تھا اور نہ ہی اسے برسات (برشگال) گھیر سکتی تھی جو ان علاقوں میں ہوتی ہی نہیں۔ (ح)

فرض بنالیتا ہے اور کسی بھی حالت میں حکومت کے منصب رذیل، ادنیٰ اور کم اصل لوگوں کو نہیں دیتا ہے۔ خواہ اسے عالی نسبوں کے تقرر میں فوری فائدہ نظر نہ آتا ہو اور کم اصلوں کے تقرر سے فوری فائدہ حاصل ہو سکتا ہو تب بھی وہ ادنیٰ اور کم اصل انسانوں کو حکومت کے منصبوں کے نزدیک بھٹکنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس اصول کو وہ اپنے لیے اتنا لازمی تصور کرتا ہے کہ اس سے کبھی تجاوز نہیں کرتا۔ اس طرح کے اصول کو ضابطہ کہا جاتا ہے۔ اگر سلطان ایک عہدہ یا منصب بھی کسی رذیل یا کم اصل انسان کو تفویض کرتا ہے یا اپنی ریاست کے کسی اعلیٰ افسر کو ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے تو اس اقدام کے بعد یہ ضابطہ واقعی ضابطہ نہیں رہے گا اور اس کے نفاذ کا مقصد حاصل نہیں ہو پائے گا۔

حکومت اور انتظامیہ کے امور و تدابیر میں کئی ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ریاستی منصوبوں کا فوری اور نیز قطعی فائدہ کا مقصد حاصل ہو سکے۔ ایک کامل دانش مند سلطان کا یہ فرض ہے کہ اس کے اختیار میں ہو تو وہ ان شاہی ضوابط کو نافذ کرے جو اپنے کرم و انصاف کے باعث مثالی بن چکے ہیں۔ لیکن اگر وقت اور حالات میں تبدیلی کی وجہ سے وہ بزرگوں کے ضوابط نافذ کرنے سے قاصر ہے تو اسے ان کامل دانش مند انسانوں کی صلاح سے، جو سیاسی تجربہ رکھتے ہیں اور قیادت کے لیے اپنی اہلیت کی بناء پر ممتاز ہیں، اپنے زمانہ اور حالات کے مطابق ضوابط وضع اور نافذ کرنا چاہیے۔ اپنے عہد کے لیے موزوں ضوابط کی مناسب تشکیل کے لیے کہ جن کے نفاذ سے اس کے سیاسی منصوبہ کے مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں، کافی غور و خوض کی ضرورت ہے۔

لہٰذا اے محمود کے فرزندو، تمہارا یہ فرض ہے کہ جب تک تمہارے ضوابط جاری اور مستحکم نہ ہو جائیں اپنے انتظامی امور کو درہم برہم سمجھو۔ تم وہ ضوابط اختیار کر سکتے ہو جو دیندار سلاطین نے اپنے وزیروں اور دانش مندوں کے مشورہ سے وضع کیے تھے لیکن بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے اگر تم ان اصولوں کے مطابق عمل پیرا نہیں ہو سکتے ہو تو اپنی مملکت کے دانش مند خیر خواہوں کو جمع کرو اور پھر نئے ضوابط وضع کرو۔ لیکن ان نئے ضوابط کو، جو حکومت کے ہر محکمہ کے کام منضبط کریں گے، کافی غور و فکر اور بحث و مباحثہ کے بعد وضع کرنا چاہیے اور اس دوران موضوع کے ہر موجودہ اور مستقبل کے پہلو کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ لیکن تمہارے لیے، تم جو کہ محمود کے فرزند ہو، اس کے ضوابط کی پیروی ہی بہتر ہوگی کیوں کہ محمود دوسروں سے اصغر سہی لیکن کم از کم تمہارے لیے تو بزرگ ہی ہے۔ اس کے ضوابط اختیار کرنے میں تمہاری عزت افزائی اور شان ہے۔

محمود کو اپنے اقتدار کے پہلے یا دو سالوں کے دوران اپنے زمانہ اور عہد کے حالات کے لیے موزوں ضوابط وضع کرنے میں کافی پریشانی اٹھانا پڑی۔ اس سلسلہ میں غور و فکر کے دوران احمد حسن، علی خویشاوند اور ابو سہل اسفرائنی کا خون پسینہ ایک ہو گیا۔ ان ضوابط کے مطابق ریاستی امور چلاتے ہوئے ...... محمود کو

چھتیس سال[1] گزر چکے ہیں اور چونکہ یہ ضوابط صحیح تھے لہذا اس کا نظم ونسق مضبوطی سے چلتا رہا اور اس پر کوئی مصیبت یا بدقسمتی نازل نہیں ہوئی۔

اگر تم نئے ضوابط وضع کرنے کا ارادہ رکھتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے سیاسی منصوبہ کے لیے یہ ضروری ہے تو تھوڑے غور وفکر کے بعد ہی تم پر یہ واضح ہو جائے گا کہ حسب ذیل چار شرائط کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

پہلی شرط

نہ تو ضوابط احکام شریعت کی تردید کرتے ہوں، نہ احکام دین میں مداخلت اور نہ ہی مذہبی معاملات کے درجے کو پست کرتے ہوں۔

دوسری شرط

ضوابط کے نفاذ سے خواص زیادہ فرماں بردار اور عوام زیادہ پرامید ہوں اور صالح لوگ ہمنوا اور شرپسند بے اثر ہوں، ضوابط، نفرت، مشققت یا پریشانی کا باعث نہ بنیں۔

تیسری شرط

ان ضوابط کی نظیریں دینی سلاطین کے ضوابط میں ملتی ہوں اور ان کے نفاذ سے بے دین فرماں رواؤں کی رسوم اور نظیریں یا ظالم حکمرانوں کی روایات اور طریقے بحال نہ ہوں۔

---

[1] یہاں بھی برنی دوسری جگہوں کی طرح تاریخوں کے بارے میں الجھا ہوا ہے۔ طبقات ناصری کے مطابق سبکتگین ۳۸۷ھ میں اور محمود ۴۲۱ھ میں انتقال کر گئے تھے۔ اس نے یہ بھی وضاحت کردی ہے کہ "محمود اکسٹھ سال کی عمر میں چھتیس سال حکومت کرنے کے بعد مرا۔" لہذا محمود کے عہد کا چھتیسواں سال اس کی زندگی کا آخری سال ہوگا جس میں مغربی ایران کا بندوبست کرنے یا سلجوق خطرہ کو کچلنے میں قاصر رہنے اور تیزی سے بڑھتی ہوئی دق سے معذور ہونے کی وجہ سے محمود نے مغربی ایران کے انتظامات مسعود کے سپرد کر دئے اور خود غزنی واپس لوٹ گیا جیسے وہاں مٹی اسے بلا رہی تھی لیکن اسی پر بس نہیں ہے۔ اسی نصیحت کے آخر میں محمود سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ وہ اڑتیس سال سے حکومت کر رہا ہے۔ (ز ح)

چوتھی شرط

اگر ان ضوابط میں کوئی چیز سنت کے خلاف ہے اور پھر بھی عوام میں نیکی کی غیر معمولی کمی یا ایمان کی انتہائی کمزوری کی وجہ سے تمہیں ان کا نفاذ ضروری محسوس ہوتا ہو تو تمہیں انھیں درست اور صحیح تصور نہیں کرنا چاہیے. تلافی کی غرض سے تمہیں بکثرت خیرات دینا چاہیے اور جو گناہ تم کر رہے ہو اس سے خائف ہونا چاہیے. تم پر یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ ان ضوابط کا نفاذ شریعت کے حسب ذیل اصول کے تحت آتا ہے "ضرورتیں ممنوعات کو جائز کر دیتی ہیں" پس تمہیں کافی خیرات کرنا چاہیے اور اپنے گناہوں سے خوف کھانا چاہیئے. اس طرح کے ضوابط کے لیے ان ضوابط کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جو قدیم ظالم بادشاہوں کے درباروں میں کھڑے ہونے کے طریقے، زمین پر پیشانی رکھنے اور تعظیماً جھکنے سے متعلق ہیں جن کا مقصد بادشاہ کے بے مثل رتبہ، برتری اور اقتدار کو قائم کرنا تھا اور جو بعد ازاں دیندار مسلم سلاطین کے درباروں میں بھی مروج ہو گئے.

اے فرزندو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وضع ضوابط انتہائی مشکل کام ہے. زمانہ اور وقت کی ظاہری ضرورتوں کے موافق وضع کیے گئے نو تشکیل ضوابط آسانی سے نافذ نہیں ہو پاتے ہیں. نئے ضوابط وضع کرنے والے اگر مکمل دانش مندی، بصیرت، علم اور نو رنگ تجربوں سے مزین و آراستہ نہیں ہیں اور دور ماضی کے ضوابط سے واقف نہیں ہیں تو عوام نہ تو اپنے دلوں میں ان کے وضع کیے ہوئے ضوابط تسلیم کریں گے اور نہ ہی ظاہری طور پر ان کی تعمیل کریں گے.[1]

(قانون وضع کرنے والوں کے) جذبات اور غصہ ان کی عقل کے قابو میں ہونا چاہیے ان کی دین کی تمنا ان کی مادی دنیا کی آرزو پر حاوی ہونا چاہیے. ان کے رشک وحسد کے جذبات پژمردہ ہو جانا چاہئیں اور ان کے دلوں میں سلطان اور رعیت کے لیے نیک خواہش پیدا ہو جانا چاہیے اور انھوں نے اپنی زندگیوں میں نیکی اور بدی کے خلط ملط اور امور ریاست میں جائز اور ناجائز کی ایک دوسرے میں سرایت کو قطعی طور پر پہچان لیا اور انھیں وہ تدبیر شناخت کرنے اور اسے مدنظر رکھنے کا اہل ہونا چاہیے جو فوری فائدہ کی طرف مائل تدبیر کی بہ نسبت قطعی بہبودی کی طرف رہنمائی کرتی ہے. جب یہ شرائط پوری ہو جائیں گی تو ان کے بنائے ہوئے ضوابط مضبوط اور دوسروں

---

[1] تاریخ فیروز شاہی میں ہمارے مصنف نے جن فرماں رواؤں کا جائزہ لیا ہے ان میں سے صرف علاؤالدین خلجی کے ضوابط ہی ان کی حسب خواہش وضع اور نافذ کیے گئے تھے (تاریخ فیروز شاہی، علاؤالدین کے مالگزاری اور انتظامیہ سے متعلق ضابطوں کے لیے ملاحظہ کیجیے ص ۲۸۹-۲۸۲ اور قیمتوں پر کنٹرول سے متعلق ضوابط کے لیے دیکھیے ص ۳۱۹-۳۰۲

کی پیروی کے لائق ہو جائیں گے. لیکن جہاں تک ناکارہ جاہل اور نفس پرستوں کے ضوابط وضع کرنے کا مسئلہ ہے، جن کا سب سے بڑا مقصد عارضی فائدہ یا ایک مختصر مدت کی بہبود ہے، یہ دیکھا گیا ہے کہ ان کے بنائے گئے ضوابط ایک ہفتہ بلکہ ایک دن بھی مضبوطی سے قائم نہیں رہ سکتے. نتیجہ کے طور پر وہ فلاح کے بجائے ابتری زیادہ پھیلاتے ہیں....

دوسری طرف ان قدیم ظالم فرماں رواؤں نے بھی جنھوں نے اپنے چہروں کو الوہیت کے دعوؤں سے مسخ کیا اور اپنے کو زمین کا خدا کہلوایا، دنیا اور اس کے امور کو قابو میں رکھنے کے لیے ضوابط وضع کیے اور ان کے نفاذ کے وقت 'اللہ'، اس کے انبیا اور روز محشر کو قطعی اپنے پس پشت رکھا، ان کا پہلا ضابطہ یہ تھا کہ ہر شخص ان کی ہر ہر بات کی اطاعت کرے. اگر انھیں ایک لاکھ یا دو لاکھ اشخاص میں بھی نافرمانی نظر آتی تھی تو وہ ان سب کو قتل کروا دیتے تھے. ان کا دوسرا باعث شرم ضابطہ یہ تھا کہ اگر وہ کسی سے خوش ہوتے تو اسے خزانہ بخش دیتے تھے. حالاں کہ وہ دس دینار کے بھی قابل نہ ہوتا تھا. اگر وہ ایک ہزار لوگوں کو سزائے موت کا مستحق سمجھتے تھے تو انھیں اپنے مقاصد کے لیے آزاد کر دیتے تھے اور دوسری طرف اقوام و قبائل کو بغیر کسی جرم یا خطا کے قتل کر ڈالتے تھے.

اس طرح کے شرمناک ضوابط کی بدولت ہی بے دین ظالم فرماں روا حکمرانی کرنے اور حکومت کے اختیارات استعمال کرنے میں کامیاب ہو سکے. یہ ایک دور کے لیے تو ممکن تھا لیکن دیندار سلاطین اور خاص طور سے مسلم سلاطین کے لیے اس طرح حکومت کرنا انتہائی مشکل ہے کیوں کہ دین اسلام کی بنیاد اس دنیا کو ترک کرنا اور اس سے نفرت کرنا ہے. نیز مسلم شریعت نے اس سلسلے میں واضح طور پر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اگر خون مسلم کا ایک قطرہ بھی بغیر کسی معقول وجہ کے بہایا گیا تو اس کے بہانے والے کو ابد تک تکلیف دہ سزائیں بھگتنا ہوں گی. علاوہ ازیں دین کی سنتیں بھی ہیں جو تمام کی تمام شاہی حکومت کی رسوم اور طور طریق کے خلاف ہیں لہذا مسلمانوں کے لیے جو ضوابط اعلان کیے جائیں وہ نایاب ترین دانش مندوں کے وضع کیے ہوئے ہوں تاکہ جس وقت دنیاوی امور کا مناسب بندوبست ہو رہا ہو اور عوام زیر اطاعت کیے جا رہے ہوں اس وقت دین اسلام کو کوئی گزند نہ پہنچے اور آخرت کے انعامات سے محرومی نہ ہو جائے.

ہر دانش مند سلطان کو محمود کے حسب ذیل الفاظ پر کافی غور و فکر کرنا چاہیے کیوں کہ محمود کو اس معاملے میں تجربہ حاصل تھا اور نیز اسے اپنی بادشاہت کے باعث پیدا ہونے والی روحانی مصیبتوں میں اپنی شرکت پر بھی کافی غور کرنا چاہیے. اور تب اسے محمود کے حسب ذیل قول کی اہمیت کا احساس ہوگا اور تادم واپسیں وہ محمود کے لیے لب بہ دعا ہوں گے:

" سلاطین کے باب دربارگاہ کے لوگوں، وزیروں، امراء الحل کے ناظروں، بڑے بڑے عہدہ داروں

سے غلاموں اور دربانوں تک کے تمام انتظامات دورِ قدیم کے دانش مند بہت پائیداری کے ساتھ مرتب کرتے تھے تاکہ سلطان کا وقار اور یگانگی سالم و محفوظ رہے اور امورِ ریاست میں باقاعدگی قائم رہے۔ وہ اسی وقت سے زیرِ عمل رہے ہیں، تاہم سلاطین کی شان و شوکت، رسوم آداب، اور رواجوں یا طاقت و تکبّر کے وہ تمام کام جن کے توسط سے دور و نزدیک کے عوام کے قلوب میں سلطان کا خوف نقش ہو جاتا ہے اور جو اس کے احکامات کے نفاذ کا ذریعہ ہیں، ان کے بارے میں قرآن و حدیث دونوں میں ایسی کوئی عبارت نہیں ہے جس سے ان کی اجازت ملتی ہو۔ نیز شاہی درباروں کے طریق کار کے بارے میں خلفاء راشدین کی حیات سے جو مسلم سلاطین کے لیے لائق اتباع ہیں ہمیں کوئی اصول نہیں ملتا ہے، لہٰذا وضع ضوابط ایک مشکل کام ہے جن کے نفاذ سے امورِ ریاست درست و صحیح رکھے جاتے ہیں اور دنیا سلطان کے دین اور اس کے دیگر معاملات کے پامال ہوئے بغیر سرسبز ہو جاتی ہے۔

(برنی اس نصیحت کے سلسلہ میں سلطان محمود غزنوی وخطا کے فرماں روا قدر خاںؒ کی وہ ملاقات بطور مثال پیش کرتا ہے جس میں دونوں سلطانوں نے ایک دوسرے کو اپنے ضوابط سے باخبر کیا۔ چوں کہ محمود کا ۱۰۳۰ء ہی میں انتقال ہو چکا تھا اور خطا مملکت ریا قراخطا ۱۱۲۳ء تک قائم نہیں ہوئی تھی لہٰذا اس طرح کی ملاقات کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ خطا کے فرماں روا کا لقب گور خاں، یعنی عالمگیر فرماں روا، تھا نہ کہ قدر خاں۔

ہے طبقاتِ ناصری (ص ۱۱) کا مصنف محمود کے عہد کے آخری حصہ کے بارے میں لکھتا ہے: "محمود نے آمو دریا پر ایک پل تعمیر کیا اور ملک توران میں اپنی فوج لے گیا۔ قدر خاں نے اس سے ملاقات کی۔ ترک کے خان بھی اس کے پاس بغرض ملاقات آئے اور اظہارِ عقیدت کے ساتھ اطاعت قبول کی۔ ان کی درخواست پر محمود نے سلجوق کے بیٹے کو، جس کے حوصلہ کے سامنے تمام ترک خان لاچار تھے، اس کے قبیلہ کے لوگوں کے ہمراہ دریائے آمو کے پار خراسان بھیج دیا۔"

اس بیان کے بعد فتاوائے جہانداری کے قدر خاں اور طبقاتِ ناصری کے قدر خاں میں مماثلت دکھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ فتاوائے جہاں داری کے قدر کی خصوصیات کچھ اس طرح ہیں۔ (الف) وہ غیر مسلم ہے، (ب) وہ قراخطائی ہے (لہٰذا محمود کا ہمعصر نہیں ہو سکتا)، (ج) وہ خدا کو منگول نام 'تنگری' کے تحت تسلیم کرتا ہے، (د) اور وہ اثر و اقتدار میں محمود سے برتر نہیں تو برابر ضرور ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برنی کو طبقاتِ ناصری یا کسی دوسری تاریخ کی کتاب سے قدر خاں کا نام یاد رہ گیا تھا اور پھر اس نے قدر خاں میں چنگیز خاں کی کچھ خصوصیات کا اضافہ کر کے ایک فرضی شکل تیار کر دی۔ لیکن چنگیز خاں اس طرح کا واضح قوانین تھا کہ جسے برنی پسند نہیں کرتا تھا اور چنگیز خاں اور محمود کی ملاقات کو کسی بھی طرح عقل و دلائل کی بنیاد پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ ان دونوں کے درمیان دو صدیوں کا فرق تھا جس سے سب ہی واقف تھے۔ اس کے برعکس خطائی مسلم مورخین کے دھندلے دائرہ نظر پر منڈلا رہے تھے اور ان میں ایک فرضی حکمراں بنانا بہت آسان کام تھا۔

ذیل کے اقتباس میں غیر ضروری جملوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔)

جب محمود اور قدر خاں خطائی کے درمیان صلح ہوگئی تو قدر خاں نے ایک دعوت کا اہتمام کیا اور بذاتِ خود محمود کو مدعو کرنے آیا۔ محمود اس کے ساتھ . . . اس کے فوجی خیمہ میں گیا۔ محمود اور اس کے افسروں کو قدر خاں کی فوج نہایت عمدہ طریقے سے سازوسامان سے لیس، بخوبی تیار اور تعداد میں بھی زیادہ نظر آئی۔ محمود نے غور کیا کہ قدر خاں کے سپاہی اس قدر فرماں بردار تھے کہ ان میں سے ہزارہا اپنے افسروں کے محض اشاروں پر ہی اپنا فرض پورا کرنے کے لیے دوڑ پڑتے تھے اور جو حکم ملتا تھا اسے فوراً بجا لاتے تھے۔

(یہ سب دیکھ کر محمود نے قدر خاں سے ان ضوابط کے متعلق استفسار کیا جن کے مطابق اس نے اپنی حکومت منظم کی تھی، اور قدر خاں نے حسب ذیل جواب دیا۔)

"میری قوم میں 'تنگیری'[1] کی طرف سے کوئی مقدس کتاب نازل نہیں ہوئی ہے اور ہمارے درمیان کوئی نبی نہیں بھیجا گیا ہے۔ میں نے اور میرے بزرگوں نے عقل و دانش کی بنیاد پر قائم ضوابط کے ذریعہ حکومت کی ہے۔ جب میرے خاندان کے کسی قدیم فرماں روا نے خطا سلطنت پر مبنی ضوابط سے حکومت کی تو امورِ ریاست بخوبی منظم رہے اور اس کے بعد اس کے بیٹوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اگر اس نے اپنی ذاتی خواہشات اور خود ارادی کے مطابق حکومت کرنے اور ہر روز عوام میں ایک نئے قاعدہ اور نئی رسم جاری کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے اقوال و افعال پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اس نے مہم میں اپنی اور اپنے بیٹوں کی زندگیوں کی بھینٹ چڑھائی ہے اور وہ خود بدترین طریقوں سے ختم ہوا ہے۔

(اس کے بعد قدر خاں نے حسب ذیل بیس ضوابط سامنے رکھے :۔)

"(۱) سلطان کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ میرے سامنے جس شخص نے بھی جھوٹ بولا ہے اسے میں نے اپنا دشمن خیال کیا ہے اور اسے پھر اپنے دربار کے آس پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا ہے۔ میں تیس سال سے برسرِ اقتدار ہوں اور میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ کسی بھی چھوٹی یا بڑی مصیبت میں جھوٹ نہ بولنا میں نے اپنے لیے لازم تصور کر لیا ہے۔

"(۲) اگر میرا کوئی افسر غبن کا مرتکب ہوا ہے تو خورد برد کی گئی رقم واپس لے کر میں نے اسے یا اس کے بیٹوں

---

[1] تنگیری۔ یہ کہا جاتا ہے کہ منگولی میں 'تنگیری' کے معنی آسمان یا خلا کے ہیں۔ یہ خدا کے لیے منگول اصطلاح ہے اور منگول اسلام قبول کرنے کے بعد بھی تنگیری کی اصطلاح استعمال کرتے رہے۔ تنگیری اور تنگیر تعالیٰ، اللہ یا خدا کے مساوی ہیں۔ (ح)

کو کوئی عہدہ نہیں دیا ہے۔

"(۳) اگر میرے خلاف کسی اجنبی نے بغاوت کی ہے تو میں نے اسے اور اس کے افسروں کو جو شریک رہے تھے بمعہ ان کے قبیلوں اور پیروکاروں کے تلوار سے اڑا دیا ہے۔ اور اگر میری سلطنت کے شرکا کار میں سے (یعنی میرے خاندان میں سے) کسی نے علم بغاوت اٹھایا ہے تو میں نے اسے ایک مختصر رقم دے کر بیوی بچوں کے ساتھ کسی دور دراز ملک کے لیے جلاوطن کر دیا ہے البتہ ان سرغنہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے جو اسے ترغیب دیتے رہے تھے۔

"(۴) کسی کم اصل یا کمتر کو سلطان کے نزدیک کوئی رتبہ یا منصب یا عہدہ حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اس عہد میں کسی کمینہ، کم اصل یا بازاری آدمی کو کوئی منصب یا عہدہ نہیں دیا ہے۔ میں نے اس طرح کے لوگوں کو اپنی ریاست کے اعلیٰ افسروں کے قریب نہیں آنے دیا ہے یا اپنی سلطنت میں انھیں بہبود حاصل نہیں کرنے دی ہے۔

"(۵) جب بھی میں نے کسی شخص کو دوسرے پر ظلم کرتے دیکھا ہے تو ظالم کا مکان اور مال و جائداد مظلوم کو منتقل کر دیے ہیں۔

"(۶) اگر کسی شخص نے میرے دربار میں نمایاں خدمت انجام دی ہے اور اپنے ہم رتبہ امراء سے زیادہ وفاداری کا مظاہرہ کیا ہے تو میں نے اس کی خدمت کے واجبی حقوق کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ میں نے درجہ بدرجہ اہلیت کے مطابق اس کے رتبہ میں ترقی کی ہے۔ اس ضابطہ کے نفاذ سے میری سلطنت میں ظلم کم ہو گیا ہے۔

"(۷) میں نے اپنی سلطنت میں تاجروں اور دکان داروں کو اس طرح دبا رکھا ہے کہ وہ نہ تو اشیاء میں ملاوٹ کر سکتے ہیں، نہ دھوکہ بٹی کر سکتے ہیں اور نہ ہی اشیاء کی خرید و فروخت میں بے جا نفع کما سکتے ہیں۔ وہ اناج یا کسی دوسری چیز کی تجارت میں احتکار کی کوشش نہیں کرتے اور تھوڑے نفع پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اناج اور کپڑے میں ارزانی فوجی استحکام کا باعث ہوتی ہے۔

"(۸) میں اپنے دور اقتدار میں اپنے افسروں، درباریوں، قبائلیوں اور فوج کے متعلقین اور ساتھ ہی افسروں، والیوں اور عاملوں کی طرف سے اچھی طرح باخبر رہا ہوں۔

"(۹) میں نے فوج کی کمانیں ایسے اشخاص کو سپرد کی ہیں جو نیک نیت اور نیک عمل ہوں، بہبود کے خواہاں، تجربہ میں پختہ، باسلیقہ، فرماں بردار، خدا سے خائف اور منکسرالمزاج ہوں۔

"(۱۰) جب کبھی میں نے یہ سنا ہے کہ کسی شخص نے دنیا ترک کر کے اپنے کو تنگیری کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے تو میں نے اس کی بہت عزت کی ہے اور اسے احترام دیا ہے۔ میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا

ہوں اور اس سے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی ہے۔ میں نے علماء اور ہنرمندوں کو سونا اور گھوڑے انعام میں دیے ہیں۔

"(۱۱) میں نے اپنی بارگاہ میں اٹھنے بیٹھنے کے ضابطہ میں امراء تومان (دس ہزار سپاہیوں کے کمانڈر، ہزارہ (ایک ہزار سپاہیوں کے کمانڈر) بزرگ اور تجربہ کار لوگوں اور عالی نسب اشخاص کے وقار اور عزت و اقبال کے تحفظ میں اور انھیں خلعت و تحائف عطا کرنے میں غفلت نہیں برتی ہے یا ذرّہ برابر بھی گریز نہیں کیا ہے۔

"(۱۲) اپنے عہد کی ابتداء میں میں نے کچھ ایسے دانش مند اور تجربہ کار لوگوں کو جنھیں میں نے اپنی طرف مہربان اور مشفق محسوس کیا تھا، امور حکومت میں مشورہ دینے کے لیے منتخب کیا۔ انھیں مختلف طریقوں سے عطا کی، اپنی ریاست کا مشیر بنایا اور کسی بھی طرح ان کے مشورہ سے انحراف نہیں کیا۔

"(۱۳) اگر میں نے کسی فوجی سالار کو سپاہیوں کی بہبود کا خواہاں دیکھا ہے اور اس کے فوجی دستے تیار اور سازوسامان سے بخوبی لیس پائے گئے ہیں تو میں اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا ہوں اور اسے اعلیٰ ترین منصب پر فائز کیا ہے۔ لیکن اگر اس کے سپاہیوں کو مصیبت میں گرفتار اور بدنظمی کا شکار پایا ہے تو اسے اپنی عنایات سے محروم کر دیا ہے اور اس کے سپاہیوں کو کسی دوسرے کی زیرنگرانی دے دیا ہے۔ اس حکمت عملی کے سبب فوج بہت پھلی پھولی ہے۔

"(۱۴) میں نے اپنے پورے عہد میں پڑوسی ممالک کے کاروانوں اور تاجروں سے محصول یا دوسری ٹیکسوں میں ایک درہم بھی وصول نہیں کیا ہے بلکہ انہیں خلعتوں اور نقدی کی صورت میں تحائف سے سرفراز کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں میرے ملک میں اناج اور کپڑا سستا ہوا ہے۔ میں نے عوام سے خراج اور جزیہ کی وصولیابی میں اعتدال برتا ہے۔[1]

---

[1] جزیہ۔ شریعت کی اصطلاح میں 'جزیہ' وہ عام محصول ہے جو ایک مسلم فرماں روا اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتا ہے۔ لیکن یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ برنی کے زمانہ میں 'جزیہ' کا کیا مفہوم تھا؟ برنی فتاوائے جہاں داری میں محصول کو مسلسل دو قسموں یعنی 'خراج' اور 'جزیہ' میں تقسیم کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ قبل اسلام کے سلاطین نے اپنے عوام سے اور ہندو راجاؤں نے اپنے عوام سے 'جزیہ' وصول کیا (نصیحت ۱۱) امیر خسرو اور امیر حسن سجزی نے بھی اس طرح کی مثالیں دی ہیں جو یہ نشان دہی کرتی ہیں کہ جزیہ مسلمانوں سے وصول کیا جارہا تھا۔ یہ سوچنے کی معقول وجہ ہے کہ عہد سلطنت میں 'جزیہ' کا مفہوم غیر مسلموں پر کسی عام محصول سے نہیں تھا اور جب کہ 'خراج' کی اصطلاح لگان کے لیے استعمال کی جاتی تھی 'جزیہ' کی اصطلاح ان دوسرے تمام محصولوں کے لیے استعمال ہوتی تھی جو کہ زمین سے متعلق تھے اور محصول ادا کرنے والے اشخاص کے مذہب کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔

اگر کوئی رعیت اپنے اوپر واجب الادا دس دینار دینے سے بھی قاصر رہی ہے تو میں نے ان سے وصولیابی پر اصرار نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی شخص میرا وفادار رہا ہے تو میں نے اس کی وفاداری کے لحاظ سے اس کے محصول معاف کر دیے ہیں اور رعیت پر زائد مال گزاری یا محصول، لازمی محنت یا شب کا کام، وہ ہلکا پھلکا ہو یا بھاری، عاید نہیں کیا ہے۔

"(۱۶) اگر میں نے کسی سے عنایت یا ترقی کا وعدہ کیا ہے تو انعام واکرام عطا کرتے وقت وعدہ سے زیادہ ہی دیا ہے۔ اگر میں نے کسی شخص کو کسی سلسلہ میں دھمکی دی ہے تو جرم کی سیاسی نوعیت نے پر سزا کے لیے رائے قائم کرتے وقت پس وپیش نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر جرم امور مال گزاری سے متعلق رہا ہے اور اس کے پاس وصولیابی کے نشانہ سے کم رقم پائی گئی ہے تو میں نے اپنی دھمکیوں سے ہلکی سزائیں دی ہیں۔ اگر غبن کرنے والے کی عاجزی اور پریشانی واضح ہو گئی ہے تو میں نے اسے بخش دیا ہے۔

"(۱۷) میں نے کسی شخص کے ساتھ دغا نہیں کی ہے۔ لیکن اگر کسی نے میرے خلاف بغاوت کی ہے تو میں نے زمین پر اس کا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔

"(۱۸) میں نے حاسد لوگوں کی شکایت کے بارے میں حسب ذیل انتظام کیا ہے۔ اگر شکایت امور مال گزاری کے بارے میں رہی ہے تو میں نے اس شکایت کو ان افسران کے خلاف نہیں سنا ہے جنھیں بذات خود میں نے ترقی دی تھی۔ اگر یہ شکایت ایسے اشخاص کے خلاف کی گئی ہے جن سے میں واقف نہیں تھا تو میں نے اس کی تحقیق کی ذمہ داری اپنے افسروں کے سپرد کر دی ہے اور شکایت کنندہ کو اپنے تک رسائی نہیں کرنے دی ہے۔ اگر شکایت سیاسی امور سے متعلق رہی ہے اور میں نے شکایت کرنے والے کے لگائے ہوئے الزام کو صحیح پایا ہے تو میں نے اسے تحائف واعزازات سے سرفراز کیا ہے۔ اگر اس طرح لگائے ہوئے الزام کو میں نے غلط بھی پایا ہے تب بھی میں نے الزام لگانے والے سے زیادہ سختی نہیں برتی ہے تاکہ اطلاعات اور خبر رسانی کا یہ باب بالکل ہی بند نہ ہو جائے۔

"(۱۹) میں ایک عرصہ تک اپنے مصاحبوں اور اجنبیوں اور اپنی بیویوں، بچوں، رشتہ داروں، قرابت داروں اور فرماں بردار و منتخب افسروں کے ساتھ ہر طرح کے حالات میں پروقار طریقہ سے رہا ہوں۔ میں نے کسی قول وفعل سے بادشاہت کے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچائی ہے کہ جس سے لوگ میری طرف سے بے رخی برتنے لگیں یا احترام میں کمی آجائے۔

"(۲۰) حتی الامکان میں نے رازہائے سلطنت کسی پر افشا نہیں کیے ہیں اور بالفرض میں نے انھیں افشا بھی کیا ہے تو ایسے اشخاص پر جن کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انھیں کھول دیں گے اگر کسی نے میرے راز کھول دیے ہیں تو میں نے آئندہ اسے اپنے قریب کوئی رتبہ یا عہدہ نہیں دیا ہے آخری بات یہ کہ میں اپنے

ان میں ضوابط سے کسی بھی وقت ذرہ برابر بھی ٹس سے مس نہیں ہوا ہوں۔

(برنی کا خیال تھا کہ خطائین ایک ایسی ملت تھی جو عقل کی بنیاد پر ایک خدا (تنگیری) کی معترف تھی لیکن جس کا کوئی دین یا مذہب نہیں تھا۔ قدر خاں کے جو ضوابط برنی نے بیان کیے ہیں وہ رجعت پسندانہ اور استبدادی تو ہیں لیکن وہ غیر مذہبی اور متعصبانہ نہیں ہیں۔ محمود نے قدر خاں کے استفسار پر اپنے چودہ ضوابط کا ذکر کیا جو برنی کے خیال میں شریعت کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے اور جو ایسے شدید تعصب کی علامت ہیں جسے برنی بجید پسند کرتا تھا)

محمود نے قدر خاں سے کہا: "ہم دین محمدیؐ سے وابستہ ہیں۔ محمد خاتم الانبیاء تھے۔ میں اپنی سلطنت کے متعلق جو بھی ضابطہ وضع کرتا ہوں اس میں میرا حقیقی مقصد رسول اکرمؐ کی شریعت کا نفاذ ہوتا ہے۔ میرے ضوابط شریعت محمدی سے انحراف نہیں کرتے ہیں۔

"(۱) میری حکومت کا پہلا ضابطہ یہ ہے۔ مجھے سلطان ہوئے اڑتیس[1] سال گزر چکے ہیں اور تخت نشین ہونے کے وقت سے دین محمدی کے مخالفین کو تلوار سے اڑانا، مسلم شریعت کے احکامات کو زمین کی آخری حدود تک لے جانا اور تمام ممالک کو نور اسلام سے منور کرنا میرا مضبوط ارادہ اور پختہ عزم رہا ہے۔

"(۲) میں احکام شریعت کے نفاذ کا فرض متقی، دین دار اور خدا کا خوف رکھنے والے انسانوں کو تفویض کرتا ہوں، کسی جعلساز، فریبی، دنیا کے حریص طالب یا کسی باطل دین کے پیرو کو قاضی کی حیثیت سے مقرر نہیں کرتا ہوں۔ میں ملک کے سیکولر عہدے صرف عالی خاندان اور والا نسب اشخاص ہی کے سپرد کرتا ہوں کسی رذیل، کمینہ یا کم اصل کو دین یا مملکت کے عہدوں کے نزدیک نہیں آنے دیا جاتا ہے۔

"(۳) میں ایک ایسے افسر کو ہر لغزش پر معزول نہیں کرتا ہوں جسے میں نے کافی آزمائشوں کے بعد اعلیٰ رتبہ پر فائز کیا ہے اور مصاحبوں میں مقام دیا ہے۔ کسی بھی شخص کے خدمت یا وفاداری کے دعووں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ جن اشخاص کا درجہ میں نے یا میرے باپ[2] نے بڑھایا ہے۔ ان کا مرتبہ ہر معمولی جرم، غبن اور ظلم کی پاداش میں نہیں توڑتا ہوں بیں اپنے بیٹوں اور اپنی سلطنت کے مددگاروں اور خیر خواہوں کے ساتھ اس طرح رہتا ہوں

---

[1] یہ ناممکن تھا، کیوں کہ محمود نے صرف چھتیس سال تک حکومت کی۔ دیکھیے اس نصیحت کا حاشیہ ۱۔

[2] اس سے صاف مراد ہے کہ محمود کا باپ سلطان تھا لیکن نصیحت ۲۳ میں برنی یہ قطعی بھول جاتا ہے کہ وہ ہمیں اس جگہ یا دوسری جگہ کیا بتا چکا ہے اور اس طرح کے حیرت انگیز بیانات قلمبند کرتا ہے کہ (الف) غزنی اور خراسان کے ملک "محمود کو مجبوریوں سے ملے اور یہ کہ (ب) محمود کے باپ اور دادا سلطان نہیں تھے۔" (ح)

کہ میرے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے اور ان کی وفاداری میں اضافہ بھی ہو۔

"(۴) ہر سال میں سونے چاندی کے انبار لگواتا ہوں اور اپنی موجودگی میں سپاہیوں میں تقسیم کرادیتا ہوں۔ تقسیم جس قدر ہوتی اسی قدر میرا دل باغ باغ ہوتا ہے۔ میں نے اپنی فوج کے مصارف میں کبھی تخفیف کا حکم نہیں دیا ہے یا ایسا سوچا تک نہیں ہے۔ حتی الامکان میں نے سپاہیوں کو توہین کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

"(۵) علم، دانش مندی، عدل، تقوی، ہنر، نیک سیرت، صداقت اور عمدہ روش کی میں بڑی قدر کرتا ہوں۔ میں نے ان خوبیوں سے متصف اشخاص کو اعلیٰ رتبہ اور بلند درجے دیے ہیں جب کہ ان کے پاس مجھ تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا یا سفارشات بھی نہیں تھیں، جیسے قدیم خدمت اور اسی طرح کے دیگر دعوے۔ میں نے انھیں وظائف، تحائف، دیہات و باغات عطا کیے ہیں۔ لہٰذا میری سلطنت ایسی خوبیوں کے مالک اشخاص سے آراستہ ہے۔ اس حقیقت نے بھی میری نیک نامی اور شہرت میں مدد کی ہے۔

"(۶) اپنی سلطنت میں اپنے بیٹوں، رشتہ داروں، درباریوں، والیوں اور ملکوں کے فرماں رواؤں سے لے کر زمینداروں، مقدموں اور رعیت تک ہر شخص سے میں بخوبی باخبر ہوں۔ لہٰذا میں نے احکام کی تعمیل میں خوش سلیقگی اور راست روی پائی ہے۔

"(۷) میں نے امور ریاست پر توجہ دینے کے اپنے وقت کو مناسب طریقہ سے تقسیم کیا ہے تاکہ میری زندگی بیکار باتوں میں رائیگاں نہ جائے اور اصل قابلیت ناکردہ نہ رہ جائے۔

"(۸) کسی بھی مہم کا قصد کرنے اور اس کی بجاآوری سے قبل میں نے اس کی کامیابی کے بارے میں خوب اچھی طرح غور و فکر کیا ہے اور اپنے مشیروں سے مشورہ کیا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے مقصد کو مصمم کرلیا ہے۔ خدا کی عنایت سے میری مہمات عمدگی اور سہولت کے ساتھ کامیابی پر ختم ہوئی ہیں۔

"(۹) میں منکسر المزاج اور فرماں بردار رعیت کے ساتھ ہمیشہ شفقت سے پیش آیا ہوں اور پر امن اور نیک اشخاص کو میں نے اپنی عنایت کے سائے میں پرورش کیا ہے۔ خراج کی وصولیابی میں نہ تو میں اتنا سخت رہا ہوں کہ رعیت غریب اور نادار ہو جائے اور نہ ہی اتنا نرم کہ وہ زائد دولت کی وجہ سے باغی اور نافرمان ہو جائے۔ بے خوف، لاپرواہ، بہیمی اور اندھے جاں بازوں، بے دین، بدذات، فریبی، بے شرم، جابزدن اور گستاخ لوگوں سے میں سختی سے پیش آتا ہوں۔ میں نے ایسے لوگوں کے ساتھ سختی، مضبوطی، تخویف اور تسلط کے طریقے برتے ہیں۔

"(۱۰) میں کسی جھوٹے کی خوشامدانہ باتوں کے فریب میں نہیں آیا ہوں اور نہ ہی میں نے دھوکہ بازوں کی غلط بیانیوں کو صحیح سمجھا ہے۔ میں مصاحبوں اور شعراء کی خوشامد کی وجہ سے مغرور نہیں ہوا ہوں۔

"(۱۱) خدا ورسول اور روزِ محشر اور اس روز اپنے مخالفین کے دعووٴں کے خوف سے میں ایک رات بھی اپنے بستر پر چین کی نیند نہیں لے سکا ہوں۔ اس خوف نے مجھے ظلم، جبر جور اور ناانصافی سے باز رکھا ہے۔

"(۱۲) میں نے غبن کرنے والوں یا انتظام مال گزاری میں دوسرے جرائم میں ملوث لوگوں کو اس طرح نہیں کچلا ہے کہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر نہ کھڑے ہو سکیں۔ میں نے جرمانہ عاید کرنے اور جائداد ضبط کرنے کے معاملہ میں شریعت کی پابندیوں کا احترام کیا ہے۔ میرے دارالسلطنت میں یقیناً کوئی منصب یا عہدہ خالی نہیں رہا ہے

"(۱۳) میں نے کبھی منصفانہ طریقے کو ترک نہیں کیا ہے یا کسی بھی وقت یا کسی وجہ سے تکلمانہ روش اختیار نہیں کی ہے۔ یہ ضابطہ میرے دیگر ضوابط کی بنیاد ہے۔ چنانچہ قادرِ مطلق نے میری مہمات کو کامیابی عطا کی ہے۔

"(۱۴) میں نے مذکورہ بالا ضوابط کا اس قدر احترام کیا ہے کہ میرے دل میں ان سے انحراف کا کبھی کوئی خیال تک نہیں آیا ہے۔

قدر خاں نے تبصرہ کیا کہ "اس طرح کے ضوابط کی پابندی تنگیری کی مہربانی سے ممکن ہے"، وہ محمود کے ہاتھوں پر ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا۔[1]

نصیحت ۱۵

سلطان کی اولوالعزمی کے بارے میں

برنی وضاحت تو نہیں کرتا ہے لیکن اس کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس نے 'عزم درست' جس کے بغیر کوئی بھی سلطان اپنے عام فرائض انجام نہیں دے سکتا ہے یا تخت پر قائم نہیں رہ سکتا ہے اور جس پر نصیحت (۱) میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اور اولوالعزمی (عالی ہمت، بزرگ منشاء) میں فرق کیا ہے جو اس سلطان کے لیے ضروری ہے جو دنیا کے فرماں رواؤں میں اپنے کو ممتاز اور سرفراز دیکھنا چاہتا ہے۔ فارسی عبارت میں اس نصیحت کے سلسلے میں جو بحث کی گئی ہے وہ خلط مبحث ہو گئی ہے لہٰذا پیراگرافوں کی ترتیب کو بدلنا اور مکرّر جملوں کو (۱۶۹ الف سے ۱۷۰ اب تک) شامل کرنا غیر ضروری خیال کیا گیا۔ ان ضروری تبدیلیوں کے بعد ہم غور کریں گے کہ اس نصیحت میں حسب ذیل عنوانات پر بحث کی گئی ہے: (۱) اولوالعزمی ایک عظیم سلطان کی ممتاز خصوصیت ہے (۲) عالی ہمت

---

[1] لیکن نصیحت نمبر ۱۵ دیکھیے جس میں برنی نے یہ وضاحت کی ہے کہ قدر خاں صرف غیر مسلم ہی نہیں تھا بلکہ اسلام کے لیے خطرہ تھا۔

سلطان اپنی فراخدلی سے پہچانا جاتا ہے (۳) بخل اولوالعزمی کی ضد ہے (۴) دانش مندوں نے عالی ہمت سلطان کی گیارہ خصوصیات گنائی ہیں (۵) سلطان محمود کی تعریف وتحسین اور (۶) شرطیں جن کی سلطان کو غیر ممالک فتح کرتے وقت پابندی کرنا چاہیے۔

۱۔ سلطان محمود نے اپنی وصیت[۱] میں کہا: اے فرزندگان محمود اور سلاطین عالم! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سلطان کا اولین وصف اور بادشاہت کی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد 'اولوالعزمی' ہے بادشاہت اور اولوالعزمی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں کیوں کہ بادشاہت خدا کی قائم مقامی اور نیابت ہے۔

عظیم فرماں رواؤں نے کہا: جو شخص بھی علو ہمتی سے مزین نہیں ہے۔ اس کے لیے حکومت کے اختیارات استعمال کرنا، یا اپنے کو نائب خدا، اور ظلِ الٰہی، کہنا، یا عوام کو اپنی شفقت اور عنایت کے زیر سایہ لانا یا بنی آدم سے اپنے احکام کی انجام دہی کی توقع کرنا یا خواص وعوام کے قلوب سے وفاداری، خلوص اور محبت کا استخراج کرنا یا عوام کے رہنماؤں اور عظیم اور ممتاز انسانوں کو اپنی اطاعت اور خدمت کے حلقہ میں لانا یا دنیا اور اس کے باشندوں پر فوقیت حاصل کرنا،" ہمچو ما دیگرے نیست" کا اعلان عوام کے کانوں تک پہنچانا یا اپنی بارگاہ کو بہتر فرقوں کی معروضات کا مرکز بنانا، یا اپنے برابر کے لوگوں کے ساتھ اپنے ماتحتوں کی طرح برتاؤ کرنا ممکن نہیں ہے۔ قادر مطلق نے انبیاء کو علم اور دانش مندی میں مکمل اور سیرت اور روش میں بے عیب تخلیق فرمایا تاکہ ان کی تعلیمات انسانوں کے قلوب میں مضبوطی سے ثبت ہوجائیں۔ اسی طرح کسی بھی مسلم سلطان کو اپنے فرائض کی مناسب انجام دہی کے لیے، مردانگی، خطابت، فہم وادراک اور پختہ عقیدہ سے مزین ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے دین وملکت کے عظیم لوگوں نے کہا ہے "بادشاہت کفر اور بیماری کے ساتھ تو چل سکتی ہے لیکن بخل، بے انصافی، کمزور ارادہ، اور کمین خصلت سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی"۔

افلاطون، ارسطو، دیوجینس، بقراط، سقراط[۲] اور قدیم وجدید ہر دو عصر کے تمام دانش منداس سے متفق ہیں کہ بادشاہت اولوالعزمی کا مظہر ہے اور کم ہمت انسان بادشاہت حاصل نہیں کرسکتے۔ اولوالعزمی انبیاء، درویشوں

۱۔ سچ پوچھیے تو سلطان محمود نے سلاطین کے لیے عام ہدایت یا نصیحت پر مشتمل کوئی وصیت نامہ یا عہد نامہ نہیں چھوڑا لیکن برنی کے زمانہ میں وصیت نامے وضع کرنے اور انھیں دور ماضی کے سلاطین سے منسوب کرنے کی عادت عام تھی۔

۲۔ فارابی اور ابن سینا جیسے عظیم ترین مسلم علما، افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ نظام سے بخوبی واقف تھے۔ حتیٰ کہ اعلیٰ درجے کے علما دین بھی ارسطو کی فکر کے عام رجحان کے بارے میں کچھ واضح نظریات رکھتے تھے جسے وہ احترام سے "معلم اول" اور "عظیم فلسفی" کہتے تھے۔ (مثال کے طور پر دیکھیے شہرستانی کی کتاب "الملل والنحل" کا (باقی صفحہ ۔ پر)

اور حکماء کی امتیازی خصوصیت ہے جنھوں نے مادی دنیا کی بے مائیگی اور عارضی نوعیت کی وجہ سے اس کی تحریصیں ترک کردیں اور اپنی علو ہمتی کو خدا کی طرف منعطف کردیا، جس کی طرح کوئی دوسرا نہیں ہے؛ لیکن فرماں روا کو بھی جو دینی اور دنیاوی کمال کا حوصلہ رکھتا ہے اور دونوں عالم میں اعلیٰ ترین مدارج حاصل کرکے اپنے ہم رتبہ لوگوں میں ممتاز ہونے کی سعی کرتا ہے، عالی ہمت انسان ہونا چاہیے خواہ اس میں یہ دونوں خوبیاں نہ ہوں۔ کوئی بھی شخص دنیاوی امور میں فوقیت حاصل کیے بغیر سلطان نہیں ہوسکتا لیکن کسی سلطان کی اولوالعزمی کی جداگانہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی مملکت میں برتری حاصل کرنے کے بعد فرماں رواؤں میں عظیم ترین درجہ حاصل کرنے کی غرض سے روئے زمین کی بادشاہت کے لیے اپنی عالی حوصلگی کی کمند بھی پھینکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہیں ہے تو اسے کم از کم اپنے مسلمہ اوصاف بکثرت سپاہیوں اور اہل کاروں اور بے شمار خزانوں اور بیش قیمت اشیاء کے واسطے ہی سے سلاطین عالم میں اپنے کو ممتاز کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اولوالعزمی کے بغیر کسی شخص کو بادشاہت کا وہ درجہ حاصل نہیں ہوسکتا جو عظمت کی معراج ہے۔

۲۔ اگر سلطان میں اولوالعزمی، مصمم ارادہ اور عظمت کی طلب نہیں ہے تو وہ فرماں رواؤں کے فرائض مناسب طریقہ سے انجام نہیں دے پائیں گے۔ ان کے عطیات عوام تک نہیں پہنچیں گے اور اگر ان کے عطیات ملک کے تمام عوام تک پہنچتے ہیں تو خواص و عوام کے قلوب میں ان کے اقبال اور عظمت کا کوئی احترام مضبوطی سے جگہ نہیں کرسکے گا۔ شہنشاہوں کے عطیات، عطیات کے شہنشاہ ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے تحائف سے تعداد اور قیمت میں زیادہ ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ سب تک پہنچتے ہیں۔ جس طرح سلطان کو مملکت کے دوسرے تمام عوام میں قیادت کے لیے اپنی اہلیت میں ممتاز ہونا چاہیے تاکہ عوام الناس کے قلوب میں اس کے لیے اعتماد پیدا ہو اسی طرح اس کی فراخدلی یعنی نفیس، بے بہا اور لاتعداد تحائف کی بخشش کو شاہی رتبہ کی لازمی خصوصیت تصور کرنا چاہیے۔ دیگر شاہی امتیازات میں، جیسے خزانے، بیش بہا اشیاء، گھوڑے، اونٹ، خچر اور عالی شان

بقیہ حاشیہ :۔ افضل الدین صدر ترکہ اصفہانی کا ترجمہ جسے سید محمد رضا جلالی نینی نے مرتب کیا ہے، ص ۲۷۰-۱۳۲۸)
لیکن عام مسلم مورخ کا علم عظیم یونانی مفکرین کے بارے میں انتہائی مبہم تھا اس کی ایک بہت اچھی مثال میر روضۃ الصفا ص ۲۳۶
۔۲۲۴ میں ان فلسفیوں کے بارے میں میر خوند کا وہ جائزہ ہے جو ایک جدید قاری کو مسکرانے پر مجبور کرتا ہے اور اسے الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن برنی کو ارسطو کو سکندر کے وزیر اور عام طور سے سلاطین کے مشیر کی حیثیت سے پیش کرنے کی عادت تھی لہٰذا یہ بتانا ضروری ہے کہ ارسطو نے اپنی سیاست، (جلد ۳، باب ۱۶) میں بادشاہت کو حکومت کی مناسب تشکل کی حیثیت سے قطعی طور سے مسترد کردیا ہے (رح)۔ ۱۔ قرآن سورہ ۴۲، آیت ۱۱۔

محل جو بادشاہت کی عظمت و وقار کے لیے لازمی ہیں، خود غرضی اور حرص کا ایک عنصر شامل ہوتا ہے لیکن عطیات کی بخشش صرف بزرگ منشائی کا عطیہ ہے۔

۳۔ اولوالعزمی، عظمت اور عظمت کی چاہ کفایت شعاری، طمع اور بخل وجز رسی کی ضد ہیں۔ بادشاہت انسانوں پر تسلط اور اختیار جس کا لازم ہے، صرف اسی حالت میں ممکن ہے جب سلطان اپنے ہمعصروں سے وقار طاقت اور رتبہ میں برتر ہو۔ اس طرح کی برتری کمزور ارادہ، کوتاہ نظر، جز رس اور خسیس اشخاص کے بس سے باہر ہے۔ کنجوس ہمیشہ ذلیل، ناقابل اعتماد اور ہیچ سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے نفرت اور عدول حکمی نوع انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ عوام کے قلوب سے سلطان کی عدول حکمی رجواس کے بخل کے باعث پیدا ہو جاتی ہے) کے خیال کو دخل نہیں ہونے دینا چاہیے کیوں کہ اس سے احکام مملکت کے نفاذ میں بے اعتنائی پیدا ہو جائے گی۔ برعکس اس کے عوام کے دل میں سلطان کے لیے جتنا زیادہ احترام اور عزت ہوگی اتنی ہی سہولت سے اس کے احکام عمل درآمد ہوں گے۔ علاوہ ازیں سلطان کے احکام جتنے موثر طور پر نافذ ہوں گے۔ سلطان اور اس کے عوام اتنے ہی زیادہ مرفہ الحال ہوں گے۔

بادشاہت ہمیشہ تسخیر و تخویف کے دو ستونوں پر قائم رہتی ہے لیکن تسخیر اور تخویف دونوں کسی خسیس اور کمزور ارادہ شخص کی رسائی سے باہر ہیں خسیس اور کنجوس سلطان اپنی رعایا کے قبضہ میں ہر قابل قدر اور بیش قیمت چیز کو دیکھ کر یا صرف ان کے قبضہ میں ہونے کی خبر سن کر اس کا حرص کرنے لگتا ہے۔ لہٰذا اس کی یہی بس بھر کوشش رہتی ہے کہ اس کی رعایا کی قیمتی اشیاء اور مال و اسباب اس کے ہاتھوں میں آجائیں۔ اپنے سامنے بیش مہات پر تو وہ اپنا خزانہ خرچ نہیں کرتا ہے البتہ اپنے شاہی اقتدار کو رعایا پر ظلم کرنے کے لیے ضرور استعال کرتا ہے تاکہ کسی جواز کے بغیر وہ ان کا مال واسباب ضبط کر سکے۔ اس طرح کے کام سلاطین کی فطری خصلت اور ایک فرماں روا سے جن اوصاف کی توقع کی جاتی ہے ان کے برعکس ہیں (ایک مکرر پیراگراف کا یہاں ترجمہ نہیں کیا گیا ہے)

جبلی اولوالعزمی کے بغیر کوئی شخص موروثی حق یا طاقت اور فریب کے ذریعہ بادشاہت حاصل کر سکتا ہے۔ بہر صورت اس کے ہاتھ بکثرت خزانے چڑھیں گے۔ وہ ان خزانوں کو اپنی سلطنت کے تحفظ پر صرف تو کرے گا لیکن طریقہ نہایت تکلیف دہ ہوگا اور کوئی قطعی منصوبہ بھی ذہن میں نہیں ہوگا۔ وہ فراخ دل اور فیاض بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے اسے اپنے کو اندرونی طور سے تیار کرنے کے لیے بہت کوشش کرنا پڑے گی اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ اسے دین و دنیا میں ذلت ملے گی۔ نمود و ریا کے لیے بحیثیت (سیاسی تدبیر اختیار کی گئی) نمایشانہ فراخدلی تعریف و تحسین اور عظمت کے حصول کا ذریعہ نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ اولوالعزمی کے لیے

لیاقت، ایک لازمی شرط ہے اور اس دنیا میں صرف لائق آدمیوں ہی کی عزت کی جاتی ہے اور وہی آخرت میں نجات حاصل کرتے ہیں۔

۴۔ حکماء نے عالی ہمت سلطان کے ساتھ حسب ذیل (گیارہ) خصوصیات منسوب کی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کی نظروں میں دنیاوی مملکت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اس کی تمام تر کوششیں عالم بالا کے لیے وقف ہوتی ہیں لیکن اگر وہ اس دنیا کے لیے آرزومند ہوتا ہے تو اس صورت میں وہ تمام ربع مسکون کو اپنے زیر حکومت لانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو وہ دنیا کے شہنشاہوں میں اپنے مسلمہ اوصاف، دولت کی فراوانی اور وسیع علاقہ سے ممتاز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری خصوصیت وہ تمام دنیا کو اپنا احسان مند بنانا چاہتا ہے لیکن خود خدا کے سوائے کسی دوسرے کا بار احسان نہیں اٹھا سکتا۔ تیسری، اس کی یہی خواہش رہتی ہے کہ تمام دنیا کے کار خیر و نیک اسی کے ہاتھوں انجام پائیں لیکن وہ اس دنیا یا آخرت میں کسی صلہ کا متمنی نہیں ہوتا ہے۔ چوتھی، اس کی مستقل یہی خواہش رہتی ہے کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے اور ہمیشہ سب کو کچھ نہ کچھ دیتا رہے۔ پانچویں، انتظامی امور اور نیز اعلیٰ ترین روحانی خوبیوں میں وہ امتیازی خصوصیت کا تمنائی ہوتا ہے۔ اس کا ذہن تمام خامیوں سے نفرت کرتا ہے خواہ وہ مملکت کے انتظامیہ میں ہوں یا افراد کے چال چلن میں، چھٹی اس کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ تمام انس و جن اس کے دسترخوان پر کھانا تناول کریں اور تمام حیوانوں اور پرندوں کو اس کے مطبخ سے غذا تقسیم ہو اور اس دنیا کے ننگے جسم لوگ اس کے جامہ خانہ سے کپڑے پہنیں۔ ساتویں، اس کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اسی کے لبوں سے ساتوں اقلیم کے لیے احکامات جاری ہوں۔ آٹھویں، اس کی بادشاہت میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے اس کا دل اس سے مطمئن نہیں ہوتا اور وہ کچھ زیادہ ہی کی تمنا کرتا رہتا ہے۔ نویں، وہ عوام کی ضروریات کی تکمیل کا وسیلہ بننے کی آرزو رکھتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی بھی شخص اس کے در سے اپنی امیدیں حاصل کیے بغیر واپس جائے۔ دسویں، اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کی حکومت غلاموں کی آزادی، قرض داروں کی خلاصی اور بدنصیب آفت زدوں کی حفاظت کا ذریعہ بنے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتا بلکہ سن بھی نہیں سکتا کہ اس کی حکومت میں کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ گیارھویں، جب وہ کاملیت کی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو وہ ناممکنات کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ وہ محض ممکنات کے حصول ہی سے مطمئن نہیں ہو جاتا ہے۔

نامور علماء تاریخ نے کہا ہے کہ قدیم بادشاہ حسب ذیل رسم اختیار کرتے تھے۔ شاہی دسترخوان کے بچھنے پر عام دعوت کا اعلان کیا جاتا تھا اور کوئی بھی بھوکا شخص بادشاہ کی دعوت میں شریک ہو سکتا تھا۔ اپنے کھانے کے اوقات پر وہ چار یا پانچ ہزار اونٹوں پر کھانا لاد کر صحرا میں جا کر منتشر کر دیا کرتے تھے تاکہ جانور،

چوپائے اور پرندے بھی بادشاہ کی فیاضی سے اپنا حصہ پاسکیں۔ اگران کے دسترخوان پر بیس یا بائیس ہزار لوگ بیٹھیں تو ان کے لیے بھی وہی نان و حلوہ اور شربت ہوتا جو سلطان کو پیش کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا: "بادشاہ کی دعوت دعوتوں کی بادشاہ ہے۔" جاڑے یا گرمی کے موسم میں بادشاہ اپنے قبائے یکتا زیب تن نہیں کرتے تھے جب تک کہ ہزاروں اشخاص اپنی خلعتیں نہ پہن لیں ان کا کہنا تھا، "کہ اگر سلطان اتنا کرنے کا بھی حوصلہ نہیں رکھتا ہے تو اس کے لیے خدا کی مخلوق پر حکومت کرنا جائز نہیں ہے اور اسے بادشاہ کا خطاب دینا ظلم ہے۔"

(اس کے بعد سلطان محمود کی تعریف میں کئی پیراگراف ہیں جن کا ترجمہ کرنا غیر ضروری ہے کیوں کہ وہ ہمارے مصنف کی محض پرواز فکر کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان ہی میں ہمیں تاریخی اعتبار سے مندرجہ ذیل ناممکن بیان ملتا ہے: "متعدد مواقع پر محمود کے ذہن میں آیا کہ یہ بڑی افسوس ناک بات تھی کہ قدر خاں مسلمان نہیں تھا، دین حق میں عقیدہ نہیں رکھتا تھا اور یہ کہ اسلام کو اس سے خطرہ لاحق تھا[1]۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو محمود نے قدر خاں اور اس کی سلطنت کے عظیم افراد کو اپنے فوجی خیمہ میں بطور مہمان بلاکر اور انھیں غزنی، خوارزم، ماوراء النہر، خراسان، سیستان اور تمام ہندوستان کے علاقے سونپنے کے بعد خود ایک خرقۂ درویش پہن کر مکہ روانہ ہو گیا ہوتا۔")

۵۔ فتوحات کے لیے اپنی مہموں میں سلطان کے لیے کچھ شرائط کی پابندی ضروری ہے۔ اگر ان شرائط کی پابندی کی گئی تو ان کے مقاصد پورے ہو جائیں گے۔

پہلی شرط، وہ سپاہی جو شاہی رکاب کے اردگرد رہنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، ان کے ذہن ہر حال میں اپنے خاندانوں، قبیلوں، پیروکاروں، بیویوں، بچوں، جائداد اور مال و اسباب کی طرف سے مطمئن ہونا چاہیے ان کے دلوں میں کوئی پریشانی یا فکر نہیں ہونا چاہیے، خواہ مہم دس سال تک ہی کیوں نہ جاری رہے۔

دوسری، وہ تمام چیزیں جن کی مخلوق خدا کو ضرورت ہوتی ہے یا جن کے لیے ان کے دل بہت بے تاب ہوتے ہیں اور جو انھیں دارالسلطنت میں مل سکتے ہیں وہ انھیں فوجی خیمہ میں بھی دستیاب ہونا چاہئیں سلطان کو کچھ اس طرح انتظام کرنا چاہیے کہ کھانے کی تمام اقسام، کپڑے، عطر، ہر قسم کے پھل اور میوہ جات، معجون، حلوے، اچار، دوائیں، بوزہ رنگین، مختلف شرابیں اور بھنگ فوجی خیمہ میں مہیا ہو جائیں۔ نیز وہ تمام جماعتیں جن کے بغیر امور دین اور تفریحات ہی ممکن نہیں ہیں، جیسے علماء دین، مشائخ، فقہا، اطباء، نجومی، صنعت کار، دوکاندار،

۱۔ برنی یہ قطعی بھول گیا ہے کہ پچھلی نصیحت (ص ۱۴۱) میں وہ قدر خاں کو مشرف بہ اسلام کر چکا ہے۔

تاجر، کاروانی سوداگران، درباری لونڈیاں، موسیقار، رقاصائیں، بھانڈ، شراب فروش، بازی گر، افسانہ گو، پہلوان اور مسخرے، ان سب کو طویل اور دور دراز کی مہمات میں موجود رہنا چاہیے۔ سپاہی انھیں دیکھ کر یہ سوچیں گے کہ وہ دارالسلطنت میں ہیں۔ ان کے دل اپنے گھروں سے دور ہونے کی وجہ سے مضمحل نہیں ہوں گے۔ وطن سے دوری کو وہ جلاوطنی محسوس نہیں کریں گے اور دینی و دنیاوی زندگی کی ضروریات اور جسمانی و جنسی خواہشات کی تسکین کے اسباب کی فراوانی کی وجہ سے وہ اپنے فوجی خیمہ کو دارالسلطنت تصور کریں گے۔ مذکورہ بالا جماعتوں کی موجودگی اور ان کی سرگرمیاں، انھیں اپنے رشتہ داروں سے جدائی کا غم بھلانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

تیسری شرط، سلطان کو اپنی طویل اور دور دراز کی مہمات میں مال غنیمت کے پانچویں حصہ[1] کی خاطر اپنے سپاہیوں کے ساتھ تشدد نہیں برتنا چاہیے۔ اور مفصل تحقیقات کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ حسین باندیوں اور خوب صورت کم سن غلاموں سے لطف حاصل کرنے اور ساتھ ہی اپنے حاصل کردہ مال اور نادر اشیائ کی وجہ سے سپاہی اپنے خاندانوں کو بھول جاتے ہیں اور اس طرح ان کے دلوں میں اپنے اعزا کے لیے محبت کا جذبہ کم ہو جاتا ہے۔

چوتھی شرط، سلطان کو اپنے وزیروں اور دانش مندوں سے مشورہ کر کے راستہ کا ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ فریق مخالف دارالسلطنت اور خیمہ کے درمیان تیز رو پیادوں (الاغ)، پائکوں، ناقہ سواروں، اور قاصدوں کا سلسلہ منقطع نہ کر سکے۔ اس صورت میں اہل خانہ اور افواج میں موجود لوگ جلدی جلدی آپس میں خبر و خیریت کا تبادلہ کر کے ذہنی سکون حاصل کر سکیں گے۔ ان انتظامات کی وجہ سے سلطان اپنے دارالسلطنت کی طرف سے سپاہیوں کے دل اپنی بیویوں اور بچوں کی طرف سے اور خاندان والوں کے دل فوج کی طرف سے مطمئن رہیں گے۔ دونوں جانب کا یہ ذہنی سکون مہم کی کامیابی میں معاون ثابت ہوگا اور اگر فوجی مہم طویل ہوگئی تو بھی کسی پریشانی کا اندیشہ نہیں رہے گا۔

پانچویں شرط، مہموں کے دوران سلطان کے سپاہی نئے شہر اور نئے ملک دیکھیں گے۔ بنی آدم کے ذہن اور مزاج متنوع اور مختلف ہوتے ہیں۔ بہت سے نئے شہر اور ملک ان سپاہیوں کے مزاج کے مطابق ہو سکتے ہیں۔

---

[1] قرآن کے اس حکم (سورہ ۸، آیت ۴۱) کی طرف اشارہ ہے "ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر ہمیں جنگ میں کچھ مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول اور قریبی اعزہ، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔"

بہت سی چیزیں انھیں اپنی حسب پسند مل سکتی ہیں اور وہ وہاں متوطن ہونے کے خواہش مند ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں اپنے ہی دارالسلطنت میں ذاتی پریشانیاں لاحق ہوں ۔۔۔ جس کی وجہ سے وہ اس سے نفرت کرتے ہوں اور ناپسند کرتے ہوں۔ چنانچہ اگر وہ دوسرا اسجا بنا اور حسین وجمیل شہر دیکھتے ہیں تو وہاں بس جانے کی تمنا کر سکتے ہیں۔ لہذا سلطان کو اپنی مہم کے دوران بہت محتاط اور ہوشیار رہنا چاہیے تاکہ اس کے خیمہ سے ایک چیونٹی بھی دغا دے کر دوسرے ملک میں وطن پذیر نہ ہو سکے۔ بلکہ سلطان کو اپنے تمام وسائل یعنی عطیات، عنایات اور متعدد وعدوں کی ترغیب دے کر ہنرمندوں، ماہرین فن اور عالی نسب اور باوصف آدمیوں کو دنیا کے تمام اطراف سے اپنی سلطنت میں مدعو کرنا چاہیے۔

نصیحت کی وضاحت کے لیے دو مثالیں دی گئی ہیں (۱) ہرات کے سلطان السلاطین نے (جسے کسی معروف سلطان سے شناخت کرنا ممکن ہے) عراق پر حملہ کیا مگر منہ کی کھائی۔ اس کے مخالف نے اسے ایک سوداگر کے ہاتھوں بیچ دیا جس نے اسے پلٹ کر بغراخاں سمرقندی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بغراخاں سلطان السلاطین کی خدمات سے بہت خوش ہوا جو اس نے خوارزم کے فرماں روا کے حملہ کے موقع پر انجام دیں اور ان خدمات کے اعتراف میں اس نے سلطان السلاطین کو ہرات پر دوبارہ قبضہ کرنے میں مدد بہم پہنچائی۔ (۲) ارسطو نے سکندر کو دنیا کی فتح کے منصوبہ کے خلاف یہ نصیحت کی کہ "دنیا میں ایسی پائیداری نہیں ہے کہ کوئی اپنی قیمتی زندگی کو اس کے فتح کرنے میں ضائع کرے"۔ لیکن سکندر کے جوش وخروش کے پیش نظر ارسطو راہ سے ہٹ گیا۔ "وہ طریقے جن سے دنیا کی فتح ممکن ہے سکندر کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں"۔

نصیحت - ۱۶

سلطنت کے امراض کے بارے میں

سلطان محمود نے کہا ہے: اے فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ چوں کہ بادشاہت دنیاوی اقبال کی معراج ہے اس لیے یہ برے دن، کی آفتوں سے میل نہیں کھاتی۔ اگر بگڑے ہوئے حالات کی وجہ سے انتظامیہ میں انتشار پھیلتا ہے اور سلطنت میں مختلف امراض سر اٹھاتے ہیں، تو ان کے لیے علاج مہیا کرنا ضروری ہے۔ اگر مرض دوا کے باوجود بڑھتا ہے تو موت

ناگزیر ہو جائے گی۔ اگر علاج موثر ہے تو اسے زندگی کی علامت سمجھو۔ حکماء نے کہا، بادشاہت سرتاپا اقبال ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً ملک میں کوئی نہ کوئی بیماری ظاہر ہوتی ہے یا آفات اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ اگر اس بیماری کا صحیح فیصلوں اور تدبیروں سے جلد ہی تدارک نہیں ہو جاتا ہے اور سلطان اپنے وزیروں اور حکماء کے مشورہ سے ان مصیبتوں کو ختم کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں اور غفلت اور لاپرواہی برتتے ہیں تو اس صورت میں سلطنت کا زوال دور نہیں ہوگا۔ اگر ایوان سلطنت میں دس اینٹوں کی بھی کمی رہ گئی تو پلک جھپکتے ہی ایک بڑا شگاف پیدا ہو جائے گا اور زیادہ ہی رخنے پڑ جائیں گے لیکن اگر دس اینٹوں کی اس ریخت کی مرمت کر دی جاتی ہے اور اسے فوراً پُر کر دیا جاتا ہے تو آئندہ کہیں کوئی شگاف نہیں پڑے گا۔

ملکی آفات کی ایک اور قسم وبائیں اور قحط ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں سلطان اور رعیت کی کوششیں اور تدبیریں بے اثر ہوتی ہیں۔ قحط میں حسب ذیل اقدامات سے زیادہ کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ سلطان خراج اور جزیہ میں تخفیف کر کے یا اپنے خزانہ سے قرض دے کر یا غریبوں اور ضرورت مندوں کو اپنے بس بھر عطیات دے کر عوام کی مدد کر سکتا ہے۔ نیز وہ تاجروں کو نقد قرض دینے کی ہدایت کر سکتا ہے تاکہ وہ دوسرے ممالک سے اناج درآمد کر سکیں اور اسے ہر ممکن طور پر سستے داموں پر رعیت کو فروخت کر سکیں۔ اگر قحط زیادہ سخت ہے تو سلطان خراج اور جزیہ بالکل ہی معاف کر سکتا ہے اور مملکت کے دولت مندوں کے لیے ایک عام فرمان جاری کر سکتا ہے کہ وہ غریبوں اور محتاجوں کی ذمہ داری سنبھالیں تاکہ ہر خیل اور خطہ کے لوگ تباہ نہ ہوں لیکن وبائی امراض کی صورتوں میں سلطان کی تدبیریں اور کوششیں بالکل بے اثر ہوتی ہیں۔

سلطنت کے امراض کی ایک اور قسم یہ ہے، سلطان کے طریق عمل اور کردار، مثلاً سخت مطالبات اور زیادہ طلبی، بدمزاجی اور درشت اقدامات، حد سے سوا پابندیاں اور سزائیں، رحم کی کمی اور غلطیوں سے چشم پوشی کرنے سے انکار، کم تنخواہیں اور زیادہ محاصل اور آخر میں وہ احکامات جن کا نفاذ عوام کے لیے بہت زیادہ باعث تکلیف ہو سکتا ہے یا بالکل ہی ناممکن ہے، ان سب وجوہات کی بناء پر رعیت کا سلطان پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور فوج اور عوام اس سے بے حد نفرت کرنے لگتے ہیں۔ قدیم سلطانوں اور وزیروں نے اسے مملکت کا بہت ہی مہلک مرض تصور کیا ہے ...... کیوں کہ آگ گھر ہی کے چراغ سے لگتی ہے۔ رعایا کی اس سے نفرت اور بدخواہی کی وجہ سے سلطان کے دل میں بھی رعایا کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اچھے انتظامیہ کی بندشیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں اور طرفین کی باہمی

منافرت کے باعث ملک کا قیام ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہر طرف بغاوتیں اور فسادات سر اٹھاتے لگتے ہیں تمرد اور نافرمانیاں بڑھتی ہیں، انتشار اور افراتفری میں اضافہ ہوتا ہے اور احکام حکومت عمل درآمد نہیں ہوسکتے بادشاہت کے دونوں ستون یعنی خزانہ اور فوج ہل جاتے ہیں اور گرنے لگتے ہیں۔

اس مرض کا علاج تلاش کرنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ یہ خود سلطان کے کردار کا نتیجہ ہوتا ہے جب بھی سلطان اپنی رعایا کے ساتھ مذکورہ بالا طریقوں سے پیش آتا ہے اور رعایا اس کے اصل کردار اور مقاصد کو بھانپ لیتی ہے تو سلطان حکومت کو از سر نو منظم کرنے کی غرض سے اپنے طریق عمل اور کردار کو بدل بھی لے تب بھی رعایا اس پر اعتماد نہیں کرے گی۔ سلطان کے لیے ان کی نفرت کم نہیں ہوگی اور وہ اس کے کردار کی ظاہری تبدیلی کو چالبازی اور فریب سے تعبیر کریں گے۔

کچھ سلطانوں نے عوام کی نفرت سے پیدا شدہ اس مصیبت سے دوچار ہونے پر جو ملک کے ایک مہلک مرض کی علامت ہے سلطنت اپنے بیٹے یا بھائی کے سپرد کر دی ہے اور کسی خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے اور اس طرح وہ تباہی اور ذلت سے محفوظ رہے ہیں یا پھر انھوں نے زہر کھا لیا ہے۔ اور اپنی قربانی کو ترجیح دی ہے تاکہ کوئی ایسی بغاوت نہ اٹھ کھڑی ہو جس میں وہ مع اپنے خانوادوں اور پیرو کاروں کے ہلاک کر دیے جائیں۔[۱]

مملکت کی آفت کی ایک اور قسم کچھ اس طرح ہے۔ کوئی طاقتور دشمن، جو سلطان سے ہر لحاظ سے مثلاً طاقت، وقار، خزانوں اور فوجی قوت میں، برتر ہے اس کی مملکت پر حملہ آور ہو اور فی الوقت کوئی مخالفت یا مزاحمت ممکن نہ ہو۔ انھوں نے اسے ایک بہت بڑی آفت خیال کیا ہے اور بہت سی تدابیر، اگر وہ واقعی قابل عمل ہیں تجویز کی ہیں۔

پہلی تدبیر یہ ہے، حملہ آور، اس کے اعلیٰ افسروں اور فوجی سپہ سالاروں کو اس طرح عطیات: تحائف بھیجنا چاہیے کہ وہ ان تک پہنچ جائیں اور اس طرح جس خرابی کا ان کی طرف سے اندیشہ ہوسکتا

---

[۱] یہاں یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہے کہ ایسے حکمراں کا ذکر کرتے وقت برنی کے ذہن میں سلطان محمد بن تغلق ہی تھا جس نے اپنے درشت اقدامات سے رعیت کو مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ وہ تاریخ فیروز شاہی میں، ص ۵۲۲، ۵۲۱، لکھتا ہے کہ ایک گفتگو کے دوران اس نے سلطان کو سلطنت کی مہمتیں دور کرنے کی غرض سے علیحدگی یا دست برداری تجویز کی۔ لیکن دور اندیشی یا خوف کی وجہ سے اس نے محمد بن تغلق کی پریشانیوں کے آخری اور موثر حل کے لیے خودکشی تجویز نہیں کی۔

تھا اسے حکمت عملی کے ذریعہ ا فوری طور پر ا ملتوی کر دینا چاہیے. سلطان کو اب سانس لینے کی جو مہلت ملے اسے بکثرت سپاہی جمع کرنے اور دفاع کو منظم کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے. ایسی ناگہانی صورت میں اسے صرف اپنے ہی خزانے نہیں استعمال کرنا چاہیے بلکہ عوام سے بھی رقم دینے کی اپیل کرنا چاہیے اور ہر شخص جو سن شعور کو پہنچ چکا ہے اسے سپاہی بنالینا چاہیے. رسد جمع کرنے اور قلعہ مضبوط کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے. ا عمدہ ترین تدبیر پر عمل کرنا چاہیے ا حملہ آور کے راستہ میں پڑنے والی ہر چیز کو اجاڑ دینا چاہیے، مکانوں کو تو مسمار کر دینا چاہیے اور تالاب میں پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں چھوڑنا چاہیے اور چارہ جلا دینا چاہیے. اگر حملہ آور پیش کش کی ادائیگی کا وعدہ کرتا ہے، خواہ وہ پیشکش بڑی ہو یا مختصر تو اس سے سلطان کے وقار کو ٹھیس پہنچے گی. لہٰذا بہت سے سلطانوں نے دشمن کی اطاعت قبول کرنے اور خراج کی پیش کش پر جنگوں اور مقابلوں کو ترجیح دی ہے جو ان کی تباہی اور ردّی ہلاکت کا باعث ہو سکتی ہیں. ایسی ناگہانی صورت میں سلطان کا وقار یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسے اپنے مددگاروں، حامیوں، خیر خواہوں، طرف داروں اور شیر دل سورماؤں کے ساتھ دشمن کا سامنا کرنا چاہیے، انجام کی فکر کیے بغیر اپنی زندگی اور مملکت کی بازی لگا دینا چاہیے اور دشمن پر اتنا سخت وار کرنا چاہیے کہ یا تو وہ واپس چلا جائے یا پیش قدمی سے باز رہے. اس ناگہانی صورت میں خطرہ ہے اور خطرہ میں فتح ہوتی ہے یا شکست. ۱ؔ

کسی طاقت ور دشمن کو راہ سے ہٹانے کے لیے دوسری تدبیر شادی کا معاہدہ ہے. سلاطین نے اس طرح کے معاہدوں کو پسند کیا ہے بشرطیکہ وہ موثر ہوں. لیکن یہ تدبیر اس صورت میں ممکن نہیں ہے جب مذہب کا اختلاف آڑے آتا ہو کیونکہ مسلم خواتین کو کسی غیر مسلم دشمن کے نکاح میں نہیں دیا جا سکتا. ایسی ناگہانی صورت میں یہ تدبیر کارگر نہیں ہوگی.

کسی طاقت ور دشمن کو زیر کرنے کے لیے تیسری تدبیر یہ ہے کہ اس کے اعلیٰ ترین افسروں اور اس کے فوجی سپہ سالاروں کو جیت لیا جائے. اگر سلطان کے مہذب رویہ اور بیش قیمت اشیاء، عطیات و

۱ؔ غالباً تصنیف کے اس حصہ پر برنی اپنے چچا علاء الملک کی سلطان علاؤ الدین خلجی سے کلی کی جنگ کے وقت ہونی گفتگو کے بارے میں سوچ رہا ہوگا. علاء الملک نے منگول شہزادہ قطلغ خواجہ سے کسی مصالحت کی تجویز کی طرف غالباً خراج پیش کرنے کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن علاؤ الدین نے یہ واضح کر دیا کہ مصالحتوں کا وقت گزر چکا تھا اور جنگ کا فیصلہ کر لیا. تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۵۹، ۲۵۴)

تحائف بھیجنے کے باوجود دشمن پیش قدمی سے باز نہیں آتا ہے تو اس کے کچھ افسروں کو جو اعلیٰ ترین رتبوں پر فائز ہوں، بڑی بڑی رتبوں کی ترغیب دے کر رازدارانہ اور خفیہ طریقے سے اپنی طرف ملالینا چاہیے۔ اگر حملہ آور کے منتخب اور مشہور افسران رشوتوں کی وجہ سے جو وہ قبول کر چکے ہیں، اپنے تن من سے اس کی مہم میں اس کی مدد نہیں کرتے ہیں اور واقعی اس کے مخالف ہیں تو اس سے کوئی کامیاب نتیجہ برآمد ہونا ممکن نہیں ہے۔ تجربہ نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے۔

کسی طاقت ور دشمن کے خلاف چوتھی تدبیر قطعاً حوصلہ شکن اور مایوس کن اقدام ہے۔ اگر دشمن نے مملکت میں غلبہ حاصل کر لیا ہے اور اس کا عزم انتہائی حد کو پہنچ گیا ہے اور کوئی بھی طریقہ یعنی جنگ، شادی کے معاہدے یا اس کے افسروں کو جیت لینا کارگر نہیں ہے تو اس صورت میں سلطان کو اپنا دارالسلطنت کسی دوسری جگہ قائم کرنا چاہیے۔ رعایا میں سے منتخب لوگوں اور تجربہ کار سورماؤں کو ایک ایسے مقام پر لے جانا چاہیے جہاں دشمن کی رسائی مشکل ہو۔ ان سے اپنا ملک چھوڑ کر دوسری جگہ آباد ہونے کی اپیل کرنا چاہیے۔ اس تدبیر کا ذکر تو کر دیا گیا ہے لیکن شاذ ہی اس پر عمل کیا گیا ہے کیونکہ لوگوں کا ترک وطن کرنا انتہائی مشکل ہے۔

ملکی آفات کی ایک اور قسم یہ ہے۔ سلطان بمعہ اپنی فوج اور خزانوں کے اپنے دارالسلطنت میں ہے اور دو حریف جو طاقت میں اس کے برابر ہیں ایک ہی وقت میں اس کے ملک پر مختلف سمتوں سے، مثال کے طور پر مشرق اور مغرب سے یا شمال اور جنوب سے حملہ کر دیتے ہیں۔ اگر ان حالات میں سلطان اپنے دشمنوں میں سے ایک کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اس سے ٹکرانے کے لیے آگے بڑھتا ہے، تو دوسرے دشمن کو اس کا ملک فتح کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اگر وہ دونوں کا مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کی فوج اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہوگی۔ سلطان واقعی لاچار ہے ایسی صورت میں مصلحت اور حکمت عملی کا یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ جب تک مہم جاری رہے اور دونوں دشمن اپنی ضرورتوں کے تحت واپس نہ ہولیں۔ وہ تمام دستیاب ذرائع سے دارالسلطنت اور مملکت کے بڑے بڑے قلعوں کا تحفظ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ سلطنت کی اس ویرانی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو دو یکساں طاقت ور دشمنوں کے باعث ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسی مصیبت بہت کم آتی ہے۔

ملکی آفت کی ایک اور قسم یہ ہے۔ سلطان کا فوجی ساز و سامان اس کی کسی مہم کے دوران ضائع ہو جائے اور بیشتر اس کے کہ وہ اپنی فوج کو از سر نو ساز و سامان سے لیس کر سکے۔ اس کی ٹکر کا کوئی دشمن خوب لیس ہو کر اس کے خلاف کوچ کر دے۔ ایسی صورت میں بھی یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ دارالسلطنت

کی حفاظت کی جائے اور قلعوں میں پناہ لے لی جائے. سلطان کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ وہ اپنی اور خواص و عوام کی ہر ممکن طریقے سے حفاظت کرے۔ ؎

ملکی آفت کی ایک دوسری قسم یہ ہے. سلطان ایک تازہ ترین مفتوحہ مملکت میں اپنی طاقت تو قائم کرلے لیکن دشمن کے خالصہ علاقہ کے افسروں کو جیتنے یا مقبوضہ ملک کے فوجی افسروں کی عداوت اور مخالفت پر قابو پانے میں ابھی تک کامیابی نہ حاصل کر سکا ہو، اور ایسے لمحہ میں کوئی دشمن اس کی سلطنت پر حملہ کردے. ایسی ناگہانی صورت میں جنگ یا مقابلے قرین مصلحت کے خلاف ہیں. سلطان کے لیے قلعوں میں پناہ لینے، دارالسلطنت کی حفاظت کرنے اور وقتی طور پر فریب دیتے رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

ملکی آفات کی ایک اور قسم یہ ہے. کوئی طاقت میں ہم پلّہ نہیں لیکن تیار اور بخوبی مسلح دشمن سلطان کی مملکت پر حملہ آور ہو اور سلطان کے پاس اتنا خزانہ نہ ہو کہ حملہ آور کی فوج کے مقابلہ کے لیے ایک بخوبی لیس فوج مہیا کر سکے. ایسے حالات میں سلطان کو اپنی رعایا کی ملکیت مستعار لے لینا چاہیئے۔ خواہ وہ مرضی سے دیں یا بزور طاقت، اور پھر اپنی حسب ضرورت فوجی ساز و سامان تیار کرنا چاہیے اور دشمن سے ٹکرّ لینے کے لیے کوچ کر دینا چاہیے. یہ ایک بہت بڑا بنیادی اصول ہے "کہ ضرورت ممنوعات کو جائز کر دیتی ہے." آخری بات یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا دشمن ملک پر دھاوا بولتا ہے جس کا موجودہ فوج کی مدد سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور ایک نئی اور زبردست فوج تیار کرنے کے لیے رقم حاصل کرنا بھی ناممکن ہے تو پھر حسب ذیل ارشاد ربّانی کی تعمیل کرنا چاہیے "کوچ کرو، خواہ کم ساز و سامان سے لیس ہو یا بھاری ساز و سامان سے، اور اللہ کی راہ میں اپنی ملکیتوں اور جانوں کی بازی لگا دو" ؎ بہ الفاظ دیگر پوری رعیت کو ایک منظم فوج تیار کر لینا چاہیے۔

اے فرزندگان محمود! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حکمت اور سیاسی مصلحت کے نقطۂ نظر سے فیصلہ کن جنگوں (حربہائے بزرگ) میں بڑا خطرہ ہے. 'حربہائے بزرگ' ان جنگوں کو نام دیا گیا ہے جو دو ہم پلہ طاقتوں کے درمیان ہوتی ہیں. اس طرح کی جنگوں میں ملوث ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سلطنت کو

؎ یہ اشارہ اس صورت حال کی طرف ہو سکتا ہے جس کا علاؤالدین کو چتوڑ کی فتح کے بعد اپنی واپسی پر سامنا کرنا پڑا اور اسے اچانک یہ معلوم ہوا کہ منگول جنرل ترغی دہلی پہنچ چکا تھا. (تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۰۲ - ۲۹۹)

؎ قرآن، سورہ ۹، آیت ۱۴۔

کو بازی پر لگا دیا جائے۔ دور اندیش دانش مندوں اور حکماء نے کہا ہے: "اگر بچنے کا کوئی راستہ ہے تو حربہائے بزرگ سے دور رہنا چاہیے۔ اصل دانش مندی اس کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ سلطان اپنی زندگی، سلطنت، بیوی، بچوں، مال و اسباب کو بیک لمحہ خطرہ میں ڈال کر 'حربہائے بزرگ' میں ملوث ہو جائے۔ دو ہم پلہ طاقت والے طرفین میں جنگ کسی ترازو کے پلڑوں کی حرکت کے مانند ہے۔ کسی ایک پلڑے کے بھاری ہونے سے، خواہ بہت ہی معمولی فرق ہو، دوسرے پلڑے میں کوئی وزن یا اہمیت باقی نہیں رہتی ہے۔ کسی 'فیصلہ کن جنگ' میں شکست کی وجہ سے تمام ملک روند دیا جاتا ہے۔ خاندان اور خانوادے ختم کر دیے جاتے ہیں اور دوسرے بھی گرداب میں آجاتے ہیں، حکومت اور مملکت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں اور عورتیں اور بچے جن کے تحفظ کے لیے لوگ اپنی زندگیوں کو خطرہ میں ڈالنے کے لیے تیار رہتے ہیں، دوسروں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔

دو ہم پلہ سلطانوں کے درمیان جنگ جس میں شکست کی صورت میں پسپائی کا کوئی امکان نہیں ہوتا دوسری جنگوں سے مختلف ہے۔ دوسری جنگوں میں تو کسی ایک طرف کے اعلیٰ فوجی افسروں کی ہی شکست ہوتی ہے لیکن مملکت نہیں چھنتی۔ صورت حال بہتر کی جا سکتی ہے اور مصیبت اور افراتفری شکست خوردہ فوج ہی تک محدود رہتی ہے۔ لیکن "فیصلہ کن جنگ" میں سلطان کی شکست اور ہزیمت کی وجہ سے تمام سلطنت تہ و بالا ہو جاتی ہے، از سر نو تعمیر اور پسپائی کا کوئی امکان نہیں رہتا اور بحالی کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ "فیصلہ کن جنگ" میں عام افراتفری اور مصیبت کا خطرہ ہوتا ہے۔ لہٰذا عظیم وزیر کہہ گئے ہیں "حربہائے بزرگ' سے گریز کرو جن میں ایک لمحہ میں سب کچھ تہ و بالا ہو جاتا ہے۔"

حکماء نے کہا ہے: سلطان کو اپنی جنگوں میں صرف اپنی فوج کی کثیر تعداد اور دشمن کی مختصر تعداد پر ہی نظر نہیں ڈالنا چاہیے یا غرور میں آکر سبز باغ نہیں دیکھنا چاہیے۔ کیوں کہ قادرِ مطلق کا ارشاد ہے: "کتنی ہی بار ایک مختصر فوج اللہ کی مدد سے ایک زبردست فوج پر غالب آگئی ہے۔[1]" نیز سلطان کو اس بنیاد پر فتح اور کامیابی کی توقع نہیں کرنا چاہیے کہ وہ صداقت پر ہے اور دشمن غلط موقف پر ہے کیوں کہ اکثر شرپسند حق پرستوں پر فاتح رہے ہیں۔ جنگوں میں افواج کی فتوحات اور شکستیں تقدیر الٰہی کے ان مقدور احکام میں سے ہیں جن کے راز کھولنا انسانی علم یا شعور کے بس کی بات نہیں۔

---

[1] قرآن، سورہ ۲، آیت ۲۴۹۔

حکماء نے "فیصلہ کن جنگوں" کی اجازت نہیں دی ہے۔ دور اندیشی ان سے گریز کرنے میں پنہاں ہے، نہ کہ ان کی جستجو میں اور سلطانوں کے لیے حتی الامکانی دور اندیشی لازمی ہے۔ البتہ ضرورت کے اوقات پر فیصلہ کن جنگوں کی اجازت ہے۔ یہ صاف طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اس سلسلے میں تامل اور پس و پیش کی صرف ان حالات میں ہی اجازت ہے جہاں اختیار کی بات ہے، ضروری صورتوں میں نہیں۔

اے فرزندگان محمود اور سلاطین عالم! تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دانش مندانہ منصوبے، اپنے ذاتی تحفظ سے متعلق قطعی بہبود کا لحاظ، اپنی بیویوں اور بچوں کی بھلائی اور خاندانوں اور پیروکاروں کی بقاء، اپنے ملک و مملکت کی محبت، عیش و آرام کے جذبات و خواہشات کی ترغیبیں، طویل زندگی کا حرص، دنیاوی دولت اور مال و اسباب کی تمنا، حسین و جمیل عورتوں کی محبت اور اعلیٰ رتبہ کی آرزو — یہ سب باتیں شیردل سورماؤں کے دامن کو صرف اس وقت تک تھامے رہ سکتی ہیں اور ان کے ذہنوں میں ان کا گذر اسی وقت تک ہو سکتا ہے جب تک کہ جنگ کی آگ روشن ہی ہو رہی ہو اور لوگ صفوں میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوں اور ان کی آنکھیں ایک دوسرے پر شعلے برسا رہی ہوں۔ لیکن جب جنگ کی آگ کے شعلے لپکنا شروع ہو جاتے ہیں، گھوڑوں کی ہنہناہٹ کانوں میں گونجتی ہے، دونوں افواج کی اڑائی ہوئی دھول ملتی ہے، فوجیں ایک دوسرے کی چیخ و پکار اور جنگ کے نعرے سنتی ہیں، ترکش سے تیر نکل آتے ہیں اور تلواریں اپنی میانوں سے باہر آجاتی ہیں، جسم کی تین سو ساٹھ نسیں تن جاتی ہیں، آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور سر کے بال اور جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تب پھر تحفظ اور بہبود کا تمام لحاظ، عورتوں اور باندیوں کی محبت اور بھائیوں اور بیٹیوں کے لیے شفقت سینہ سے معدوم ہو جاتی ہے اور دوسری تمام مہمیں فراموش کر دی جاتی ہیں۔ اس لمحہ تلوار کھینچنے، زمین کو حد نظر تک خون سے آلودہ کرنے، دشمن پر جا پڑنے، ایک دوسرے کے جسموں سے جانیں نکالنے، دوزخ بنانے، آسمان زمین ایک کرنے اور جان قربان کرنے کو تفریح خیال کرنے کے علاوہ عقل میں کچھ نہیں آتا ہے۔ صرف جنگ سے قبل ہی حوصلہ مند لوگوں کی عقلوں میں منصوبے اور تدابیر آتی ہیں لیکن ایک مرتبہ جنگ چھڑ جائے پھر کوئی اصول اور نصیحت یا تقریر، مصلحت اندیشی اور خطرہ کا کوئی خوف ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اگر دشمن ہزار ہا ہزار ہوں تب بھی وہ انھیں کم نظر آتے ہیں۔ جنگ کے وقت شجاع لوگ کوئی حلیف تلاش نہیں کرتے یا کسی کی مدد اور تعاون کے لیے درخواست نہیں کرتے۔ اگر کسی واقعہ حوصلہ مند سورما پر ایک ہزار آدمی بھی ٹوٹ پڑیں تو اسے کسی پس و پیش کے بغیر ان پر جوابی حملہ کرنا چاہیے۔

اس طرح میں نے تمہارے لیے وہ لکھ دیا ہے جو حکماء اور وزراء نے بطور مصلحت کہا ہے اور میں نے

تم پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ کس طرح شجاع ترین لوگ جنگ کے وقت پیش آتے ہیں تاکہ تم اس کے لیے تیار رہو جو خدا نے تمہارے لیے جنگ کے دوران مقدور کر دیا ہے اور وہ کرو جو تم بہترین سمجھو. لیکن تقدیر کا لکھا ضرور ہوگا. اور سب باتیں فضول ہیں.

(خوارزم کے ایک بادشاہ کی ہوشیاری اس نصیحت کے سلسلے میں بطور مثال پیش کی گئی ہے[۱]. اس مثال کا نقل کرنا نہایت مناسب ہے کیوں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برنی تاریخ... اور جغرافیہ سے کتنا نابلد تھا.)

تاریخ خوارزم شاہی، میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ مامون کے بھائی خلیفہ معتصم کے دور میں ایک خوارزم شاہ ہوا تھا[۲]. پہلے اس کے اور خلیفہ کے درمیان کوئی تنازعہ تھا. چار سال متواتر: جو کہ زمانے کے لیے عجوبہ بن گئے، اس کی سلطنت پر مصیبتیں نازل ہوئیں. اور وبائیں پھیلتی رہیں لیکن اپنے پر تدبیر منصوبوں سے اس نے ان مصیبتوں کا تدارک کرنے کی کوشش کی اور اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے سخت جدوجہد کی اور اپنی افواج کو بارہا ساز و سامان سے لیس کیا.

اس کی مصیبتوں کی فہرست اس طرح ہے. ایک سال اس کی فوج کے گھوڑے ریڑھ کی ہڈی (طبق) کے کسی مرض میں مبتلا ہوئے اور تباہ ہو گئے. اس طرح اس کے شہسوار سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیادہ فوجیوں میں تبدیل ہو گئی. اس کے اصطبلوں کے لاکھوں گھوڑوں میں سے صرف چند ہزار زندہ بچے. اس کی مملکت کے عوام بھی اپنے گھوڑوں کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے نادار ہو گئے. اسی سال

---

۱. اگر برنی کے سوچے ہوئے چار فوجی خطروں کو کسی سلطان کو چار متواتر سالوں میں دور کرنا ہے تو اسے کوئی ایسا سلطان نہیں مل سکا جس کے ساتھ ایسا کارنامہ منسوب کیا جا سکے. برنی کو ہمارے سامنے کسی فرضی سلطان کی مثال رکھ دینا چاہیے تھی اور ہمعصر سلاطین یا معروف جغرافیائی مقامات کا حوالہ نہیں دینا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی سے اسے ایک بہت ہی لغو کتاب میں نہایت واہیات حکایت مل گئی اور اپنی لاعلمی یا یادداشت کے کمزور ہو جانے کے باعث اس نے اس مثال کے سلسلے میں تاریخی اور جغرافیائی غلطیوں کو محسوس نہیں کیا. (ح)

۲. خلیفہ معتصم کے عہد (۸۴۲ - ۸۳۳) میں خوارزم کا شہر اور علاقہ براہ راست مرکز کے زیر انتظام تھا. خلیفہ والی کو مقرر اور برطرف کرتا تھا. کثعہ کے قدیم فرماں روا کو 'خوارزم شاہ' کا لقب برقرار رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن وہ شہر یا علاقہ پر حکومت نہیں کرتا تھا. (بارتھولڈ، ترکستان، ص ۱۴۷) (ح)

ایک فوج بغداد سے خوارزم کے خلاف کوچ کرنے کے لیے مقرر کی گئی۔ جب یہ فوج چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح خوارزم کی سرزمین میں داخل ہوئی تو خوارزم کے شاہ نے خلیفہ کی فوج کے سپہ سالار کے پاس قاصد بھیجے اور خفیہ طور پر یہ وعدہ کیا کہ وہ اسے مغربی (رومی) سونے کے دو سو ہزار دینار دے گا۔ اس نے بغداد میں خلیفہ کے سپہ سالار کو یہ سونا حوالے کرنے کے لیے اپنے تاجروں کی ضمانت دی۔ اس کی ایک بیٹی تھی جسے اس نے خلیفہ کے حرم میں داخل ہونے کے لیے بھیج دیا۔ اس نے خلیفہ کو ہر سال ایک بھاری رقم ادا کرنے کی ذمہ داری بھی قبول کی اور اس مقصد کے لیے ایک دستاویزی وعدہ بھی قلمبند کیا اور اسے خلیفہ کے افسروں کو پیش کر دیا۔ اس سال ان تدابیر سے اس نے اپنی سلطنت کی مشکلات کو رفع کیا اور خلیفہ کی فوج کو واپس کر دیا۔ اس نے خلیفہ کے سپاہیوں کو خشک غذا کے لیے کافی رقم دی۔ نیز اس نے بغداد کی فوج کے نمایاں افراد اور افسروں کو مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا اور تحائف کے ذریعہ انھیں جیت لیا۔ خلیفہ کی فوج اس سے بہت خوش واپس ہوئی اور وہ خود ایک بڑے خطرہ سے بچ گیا۔

کیوں کہ خوارزم شاہ کے گھوڑوں کی تباہی کی خبر دور دراز تک پھیل چکی تھی لہٰذا اگلے سال شاہ خطا آئی سی کون (nssskida.9) نے سمرقند کے بغرا خاں کے ساتھ مل کر مخالف سمتوں سے خوارزم پر حملہ کر دیا[۱]۔ خوارزم شاہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ اگر میں ان دونوں سلطانوں سے لڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو میرے پاس اتنی طاقت نہیں کہ مقابلہ کر سکوں۔ اگر میں ان میں سے ایک کو جنگ میں ملوث رکھتا ہوں تو دوسرا میرے دارالسلطنت میں داخل ہو جائے گا اور اس پر قبضہ کر لے گا۔ چنانچہ اس نے مقابلہ کا خیال ترک کر دیا اور خوارزم کے تجربہ کار سورماؤں کو اپنے چار بڑے قلعوں میں طلب کیا۔ عورتوں اور

---

[۱] ممکن نہیں۔ خطا کی سلطنت جیسا کہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے ۱۱۲۳ء تک قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت کوئی بغرا خاں سمرقندی نہیں تھا۔ زین الاخبار کے مطابق ص ۲۰، سامانیوں کا جد سامان خدات خلیفہ مامون کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ سامان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام اسد تھا جسے مامون بہت پسند کرتا تھا۔ بعد ازاں خراسان کے والی غسان بن عباد نے مامون کی تجویز پر ماوراءالنہر کے بہت سے علاقوں کو اسد کے بیٹوں کے حوالے کر دیے۔ سمرقند اسد کے بیٹے نوح کے زیر نگرانی رکھا گیا۔ بعد ازاں طاہریوں نے سمرقند نصر بن احمد بن اسد بن سامان خدات کے سپرد کر دیا۔ لیکن یہ لوگ صرف خلیفہ بغداد کے افسر ہی تھے۔ سامانیوں کی امارت اسماعیل بن نصر کے زمانہ تک قائم نہیں ہوئی تھی۔ (مزید دیکھیے بارتھولڈ۔ ترکستان۔ ص ۲۱۰۔ آخری بات یہ خطا اور سمرقند سے خوارزم کی طرف کوچ کرنے والی فوجیں اس تک دو مخالف سمتوں سے نہیں بلکہ ایک ہی سمت سے پہنچ سکتی تھیں یعنی مشرق کی سمت سے (ر ح)

بچوں کو قلعوں میں رکھا گیا اور سورماؤں نے ان کے گرد ڈیرے ڈال دیے اور انھیں یہ ہدایت کی گئی کہ اگر کوئی ان پر حملہ آور ہو تو وہ اسے پیچھے ڈھکیل دیں۔ انھوں نے اپنے مویشیوں کو آزاد چھوڑ دیا تاکہ وہ دشمن کے سپاہیوں کا رخ موڑ دیں لیکن جن مویشیوں کے لیے چارہ مہیا کیا جا سکتا تھا انھیں قلعوں کے اندر لے لیا گیا۔ خوارزم شاہ نے قلعہ خوارزم کی طرف تو اپنی پشت کی اور اپنے دارالسلطنت کے قرب جوار میں فوجی خیمے نصب کیے اور وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ خوارزم میں بے شمار چارہ جمع کیا گیا۔ دونوں دشمن فوجیں مخالف سمتوں سے علاقہ میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے اناج کے کھیتوں میں اپنے گھوڑے چرائے اور مویشیوں کو پکڑ لیا حالانکہ ان کی بڑی خواہش تھی کہ خوارزم شاہ ان سے ٹھنی ہوئی لڑائی کے لیے نکل کر سامنے آئے لیکن وہ خوارزم سے ایک فرسنگ سے زیادہ آگے نہیں بڑھا اور تین چار ماہ تک محاصرہ میں گھرے رہنے والے جو فن جنگ اختیار کرتے ہیں اس نے بھی اسی پر عمل کیا۔ جب مہم کا موسم ختم ہو گیا تو دونوں حملہ آور سلطانوں نے اپنے اپنے ملک واپس جانے کی ضرورت محسوس کی۔ اس طرح خوارزم شاہ ایک ایسی مصیبت سے محفوظ رہا۔

تیسرے سال شاہ فرنگ نے اس کے علاقہ پر دھاوا بول دیا اور فرنگی چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی تعداد میں خوارزم میں داخل ہو گئے۔[1] خوارزم شاہ نے خوارزم کے تمام علاقہ کو ویران کرنے کا حکم دے دیا۔ گھوڑوں اور مویشیوں کے گلوں کو مختلف سمتوں میں عوام کی پیش کی ہوئی کسی بھی قیمت پر فروخت کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ خوارزم کے دولت مندوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بڑے بڑے قلعوں کے اندر آ جائیں۔ اور ملک کے مفلس اور محتاج عوام سے درخواست کی کہ وہ قرب و جوار کے علاقوں میں چلے جائیں اور کچھ ماہ وہاں گزار لیں۔ اس نے خوارزم کے سامان خوراک کو جس قدر وہ کم کر سکتا تھا کم کر دیا۔ نیز یہ حکم دیا کہ زاید غلہ کو صحرا اور جنگلوں میں اس طرح دفن کر دیا جائے کہ کوئی غیر ملکی فوج اسے حاصل نہ کر سکے۔ تمام گھاس نذر آتش کر دی گئی مویشیوں کو ذبح کر کے کھا لیا گیا یا انھیں دوسرے علاقوں میں لے جایا گیا جہاں سے ان کا سوکھا گوشت (قدید) دارالسلطنت میں لایا جاتا تھا اور بڑے قلعوں میں رکھا جاتا تھا دارالسلطنت کے گرد ایک فرسنگ کے فاصلہ سے اس نے ایک لکڑی کا دمدمہ تعمیر کروایا اس کے بعد وہ قلعہ کے اندرونی حصے میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ داخل ہو گیا اور فرنگیوں کے پاس بھی نہیں

---

[1] یہ لغو ہے۔ اس ثابت شدہ تاریخی حقیقت کے علاوہ کہ فرنگیوں یا یورپیوں نے معتصم کے عہد میں خوارزم پر حملہ نہیں کیا یہ بھی غور طلب ہے کہ وہ یا تو خلیفہ بغداد کو ختم کر کے یا پھر روس اور سائبریا کی دوسری طرف سے کوچ کر کے خوارزم پہنچ سکتے تھے اور دونوں کارنامے لہٰذا کہ نویں صدی میں یورپیوں کے قابو سے بالکل باہر تھے۔ (ح)

ٹھپکا۔ شاہ فرنگ جو اپنی لا تعداد فوج کے ساتھ خوارزم کے علاقہ میں داخل ہوا تھا، ایک ماہ تک وہیں رہا، لیکن وہ غذا کی قلت کی وجہ سے مصیبت میں پڑ گیا۔ اس کے سپاہی بھوک سے بیتاب ہو گئے اور فرنگیوں کے گھوڑے گھاس کی کمی کی وجہ سے مرنے لگے۔ مصلحتاً شاہ فرنگ خوارزم کے علاقہ سے واپس ہو گیا اور خوارزم شاہ اور اس کے عوام کو ایسی مصیبت سے نجات مل گئی۔ خوارزم شاہ کی اس غیر متزلزل حکمت عملی کو جس پر بعد کے سلطانوں نے بھی عمل کیا، صفحۂ روزگار پر درج کر لیا گیا ہے اور اس سے اس کی زبردست حکمت اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہے۔

چوتھے سال مصر اور شام کے مشہور اور معروف سلاطین میں سے کسی ایک سلطان نے خوارزم پر حملہ کیا۔[له] گزشتہ سالوں کے مصارف کے باعث خوارزم شاہ کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ چنانچہ خوارزم شاہ نے اپنی سلطنت کے ہر شخص کو جس کے پاس کچھ بھی پیسہ تھا اسے (بطور قرض) اپنے دربار کے دروازہ کے سامنے لاکر ڈھیر کرنے کا حکم دیا۔ یہ وعدہ کیا گیا کہ قرض تین سال میں بیباق کر دیا جائے گا۔ اس مقصد کے تحت اس نے اپنے ہاتھ سے ایک عام دستاویز لکھی اور اسے مسجدوں کے منبروں سے پڑھنے اور بازاروں اور مجلسوں میں دکھانے کا حکم دیا۔ کیونکہ خوارزم کے عوام کو خوارزم شاہ کے قول اور تحریر پر اعتماد تھا چنانچہ انھوں نے اپنی دولت کو دو حصوں میں بانٹا اور نصف حصہ خوارزم کے دربار کے سامنے لے آئے اور اسے وہاں ڈھیر کر دیا۔ خوارزم شاہ نے اس پیسہ سے ایک فوج ساز و سامان سے لیس کی اور دشمن کے خلاف کوچ کر دیا لیکن اس نے کسی مقابلہ کا خطرہ مول نہیں لیا۔ بالآخر سلطان شام مصیبت میں مبتلا ہو گیا، اس کے سپاہی اسے دغا دینے لگے اور وہ وطن واپس ہو گیا۔ اس طرح اس سال بھی خوارزم شاہ نے اپنی تدبیر اور حکمت عملی سے ایک بڑی مصیبت سے نجات پالی۔

له یہ بھی لغو ہے۔ اس وقت کوئی سلطان مصر یا شام نہیں تھا۔ دونوں علاقوں پر براہ راست بغداد کی حکومت تھی مصری شاہی خاندان طولون نے خلیفہ معتبز (۸۶۹ - ۸۶۶) کے عہد تک اپنا دور شروع نہیں کیا تھا۔ بغداد کے ایک نمایاں ترک افسر بیبکیاک کو والی مصر مقرر کیا گیا۔ لیکن اس نے مصر کے والی کی حیثیت سے اپنے فرائض اپنے نائب احمد بن طولون سے انجام دلوانے کو ترجیح دی۔ طولون نے بالآخر نحیف خلافت کے جوئے کو اتار پھینکا اور مصر کا خود مختار فرماں روا بن گیا (۸۸۳ - ۸۶۸) دوسرے یہ کہ، شام اور مصر کے مقبول عام سلاطین میں سے کوئی سلطان معتصم کی خلافت کو پہلے ختم کیے بغیر خوارزم نہیں پہنچ سکتا تھا (ح)

پانچویں سال اس نے خوارزم میں اتنے سپاہی جمع کر لیے اور انھیں سازوسامان سے اس طرح لیس کر دیا کہ اس کے حریفوں کے ذہنوں سے اس کی سلطنت فتح کرنے کی خواہش معدوم ہو گئی۔ وہ برسوں خوارزم کے تخت پر محفوظ رہا۔

نصیحت ۱۷

سخت مطالبات ترک کرنے کی مصلحت کے بارے میں:

سلطان محمود کہتا ہے: اے فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ رفق و مدارات اور شفقت و نرم روی انتظام عامہ کی بنیادیں ہیں۔ اگر کوئی سلطان اپنی حکومت کی اخلاقی بنیاد کو بخوبی سمجھتا ہے اور اپنے عوام کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہے تو اس کی سلطنت جلد ہی منظم ہو جائے گی اور اس کی شہرت عرصہ تک باقی رہے گی۔ اسے فطرت انسانی کا بھی صحیح علم ہونا چاہیے کیونکہ آدمی لاچار، غریب، ضرورت مند، نادار اور خوف زدہ پیدا کیا گیا ہے۔ سکھ، آسائش اور آرام طلبی سے محبت انسان کی فطرت میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ وہ مشکلوں، سختیوں، مشقتوں اور مصیبتوں سے نفرت کرتا ہے اور ان سے دور بھاگتا ہے یا انھیں دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا اگر سلطان عوام کو ایسے احکامات دیتا ہے جن کے وہ پہلے سے عادی نہیں تھے اور جن کے مطابق چلنے میں مشکلیں، سختیاں اور مصیبتیں در پیش آتی ہیں اور اگر اس کے باوجود سلطان اب بھی مطالبہ کر رہا ہے اور اپنے احکامات کے سلسلے میں سخت ہے اور عوام کو ان کے اختیار سے باہر فرائض کی انجام دہی کے لیے مصیبت میں ڈالے رکھتا ہے اور عوام اس کے احکامات پر عمل کرنے سے قاصر ہیں تو اس صورت میں ان کے لیے اپنی گردنوں سے اطاعت کا طوق اتارنا ضروری ہو جائے گا۔ ایسے حالات میں سلطان عوام کا دشمن بن جائے گا اور عوام سلطان کے دشمن بن جائیں گے۔ حاکم اعلیٰ کے امور مملکت بگڑ جائیں گے، ہر طرف بغاوت اور نافرمانی سر اٹھائے گی اور حکومت کا اقتدار جاتا رہے گا۔

اگر سلطان امور حکومت میں قادر مطلق کی سنت پر چلتا ہے تو وہ یہ محسوس کرے گا کہ ایک بندۂ محض کی بادشاہت، خواہ وہ مجازی اور عارضی ہی سہی، خدا کی نیابت اور قائم مقامی کا رتبہ رکھتی ہے اور خدا نے دینی امور میں بھی زیادتی کو ممنوع قرار دیا ہے۔ قرآن نے حکم دیا ہے: 'اپنے دین میں بے اعتدالی کی

طرف مائل نہ ہو۔[1] اور سختیوں کے دور کرنے کے سلسلے میں قرآن فرماتا ہے : " اللہ کسی نفس پر اس کے اختیارات سے باہر کوئی فرض عائد نہیں کرتا ہے۔"[2] مزید برآں خدا کے ہر اس فرمان کے سلسلے میں جو اس نے وحی کے ذریعہ نازل کیا اور ہر اس حکم کے سلسلے میں، جس کی اطاعت اس نے فرض قرار دی ہے، اور دین اسلام ان احکامات کا پابند ہے، بہت سی رخصتوں، کی اجازت دی گئی ہے. چنانچہ توحید اسلام کا بنیادی اصول ہے اور معرفت، توحید کی بنیاد ہے[3] لیکن 'معرفت' حاصل کرنا مشکل اور مشقت طلب ہے. لہٰذا مسلمانوں کی آسانی اور سہولت کے لیے تقلید کو، جو موروثی ایمان پر مبنی ہے اور معرفت سے غیر متعلق ہے، کافی خیال کیا گیا ہے اور اس طرح مقلد اسلام کو امت مسلم میں داخل کر لیا گیا ہے، اس طرح نماز کے معاملہ میں، جو تمام اطاعت اور عبادت کی روح ہے، اور جس کے فرض ہونے کی نوعیت کو بہت زیادہ اور انتہائی مضبوطی سے دل نشین کیا گیا ہے، مسافروں کے لیے جنھیں دشواریوں اور سختیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے (فرض) رکعتیں چار سے گھٹا کر دو کر دی گئی ہیں. بارش کے دنوں میں جس سے پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں دو نمازوں کو ایک ساتھ ملا کر پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے. جیسے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء. اگر کوئی شخص کسی ناقابل عبور پریشانی کی وجہ سے نماز نہیں پڑھ پاتا ہے اور اس کا وقت گزر چکا ہے تو بعد میں اس کی جگہ قضا نماز کی اجازت ہے.

اس طرح کے تمام احکامات تکلیفوں اور سختیوں کو کم کرنے اور آرام اور سہولت کے نقطۂ نظر سے جاری کئے گئے. اپنی سہولت کے لیے مسافر کو ماہ صیام میں کھانے کی اجازت دی گئی ہے اور یہی رعایت حاملہ عورتوں، دودھ پلانے والی ماؤں، بیمار اور بے حد ضعیف لوگوں کو بھی دی گئی ہیں جن کے لیے روزہ ناقابل عبور بوجھ ہوتا ہے. اسی اصول کے مطابق زکوٰۃ دینے کا فرض صرف دولت مندوں پر عاید کیا گیا جن کے قبضہ میں اپنی ذاتی ضروریات سے زیادہ کچھ ہے. حج اس صورت میں لازمی نہیں ہے جبکہ راستے محفوظ نہ ہوں،

---

[1] قرآن، سورہ ۴، آیت ۲۴۹۔

[2] قرآن، سورہ ۲، آیت ۱۷۱۔

[3] معرفت، 'مصباح الہدایۃ' میں شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور تصنیف 'عوارف المعارف' کے حوالہ سے معرفت کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے. تم میری کتاب پڑھ رہے ہو، یہ عربی میں ہے. اگر کتاب پڑھتے وقت تم ساتھ ہی ساتھ عربی قواعد کے تمام اصولوں اور ان کے ہر لفظ پر اطلاق سے واقف ہو تو تمہیں قواعد کی معرفت حاصل ہے. اب اسی طرح اگر تمہیں وجود کل کے بارے میں علم ہے تو تمہیں خدا کی معرفت حاصل ہے. (ح)

اور جب تک کہ ایک شخص لمبے سفر کے اخراجات برداشت کرنے کا اہل نہ ہو اور اپنے والدین کی اجازت حاصل نہ کرلی ہو۔ ان مستثنیات کا مقصد یہ ہے کہ ان دینی فرائض کی ادائیگی میں جو اسلام کے پانچ ستون ہیں انسان کے اختیار سے باہر کوئی دشواری پیش نہ آجائے ورنہ مسلمان ان کی ادائیگی میں اپنی نا اہلیت کی وجہ سے روحانی طور پر تباہ ہوجائیں گے۔ دین اسلام میں خدا نے جس آرام اور سہولت کی اجازت دی ہے۔ اس کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے رسولؐ اکرم نے فرمایا ہے "مجھے نرمی اور سہولت کے دین حق کے لیئے بھیجا گیا ہے"

نیز شریعت کی تجویز کی ہوئی سزاؤں کے معاملہ میں جو اتنی اذیت ناک ہیں کہ ان سے زندگی کے لیے اور انسانی جانوں کے لیے زبردست مصیبت اور بوجھ کا خطرہ لاحق ہوجائے، رسولؐ اکرم نے فرمایا ہے: شبہات کی بنیاد پر سزاؤں سے گریز کرو"۔ بہ الفاظ دیگر چونکہ قادر مطلق انتقام کے تمام عناصر سے بالاتر ہے جب کہ رحم اس کی الوہیت کا ایک ضروری وصف ہے لہٰذا اس بنیاد پر انسانوں کے ذہنوں سے حدود اللہ توڑنے پر خوف سزا کو دور کرنا چاہیے کہ ملزم کے قصور کے بارے میں شبہ ہوسکتا ہے[1] اس طرح مخلوق خدا باوجود اس کے کہ وہ قصوروار ہے شریعت کی سخت مجوزہ شدید سزاؤں کے تحت نہیں رکھی جائے گی۔ سلطان کے احکامات پر گفتگو کرتے وقت شریعت کے اصولوں کی نرمی کا حوالہ دینے کی وجہ یہ ہے۔ انتظام عامہ کی بنیاد (جیسے کہ پہلے بیان کیا گیا ہے) رفق وملائمت، مہربانی، خوش اخلاقی اور عفو ودرگزر ہیں۔ سختی اور زائد مطالبات حکومت کے صحیح اصولوں کے خلاف ہیں۔ ایسا شاہی حکم جس کی اطاعت زبردست مصیبتوں اور پریشانیوں کا باعث ہوتی ہے بالآخر ایک ایسی صورت پیدا کردے گی جو عوام کی قوت برداشت سے باہر ہوگی۔ لہٰذا اگر سلطان عوام کی غلطیوں پر سزا دینے میں نرم رو نہیں ہے اور فرمان خدا یا خود اپنے احکامات کی اطاعت کے معاملہ میں سخت ہے اور جرائم کو معاف کرنا بالکل ترک کردیتا ہے اور مہربانی، رحم، شفقت، انسانیت، عفو ودرگزر اور غلطیوں سے چشم پوشی قطعاً اٹھا رکھتا ہے اور مشکل ترین کاموں کا حکم دیتا ہے اور اپنے احکامات کی انتہائی اطاعت اور پابندی کا مطالبہ کرتا ہے اور اپنے لیے واجب رقم کی پوری وصولیابی پر اصرار کرتا ہے اور تفصیلی تفتیشات

---

[1] اس موضوع پر یہاں تفصیل سے گفتگو نہیں کی جاسکتی لیکن انسانیت کا پاس ولحاظ اس کی دراصل مصلحت، سزاؤں سے گریز کا مطالبہ کرتی تھی جو قرآن نے ایسے حالات زندگی میں پیش کیے تھے جو گزر چکے تھے چنانچہ قاضیوں نے دو طریقے اختیار کیے۔ پہلے تو انہوں نے قرآن کے واضح کیے ہوئے جرائم کی تشریحات کو سختی (باقی حاشیہ صفحہ ۔۔۔ پر)

کرتا ہے اور اپنے افسروں اور عوام دونوں کی کمیوں اور غفلتوں کو بڑے جرم سمجھتا ہے اور اپنے مطالبات میں سخت ہے اور معافیاں یا معذرتیں سننے کے لیے رضامند نہیں ہوتا ہے اور خواص و عوام دونوں کے ساتھ درشتی اور بدمزاجی سے پیش آتا ہے اور مال گزاری کے ہر معاملے کو تحقیق کے لیے افسر مالیات (مستوفی) کے سپرد کر دیتا ہے تو ان سب کے باعث انتظامیہ میں لازمی طور پر بدنظمیاں پیدا ہوں گی عوام دل شکستہ ہو جائیں گے اور ان کی امید مایوسی میں بدل جائے گی اور سلطان سے وفاداری بالکل ختم ہو جائے گی۔

خواص و عوام امید چھوڑ بیٹھیں تو حکومت مستحکم یا پائیدار نہیں بنائی جا سکتی کیوں کہ شاہی احکامات کے نفاذ میں استقلال عوام کے دلوں میں موجود امید و خوف کے عناصر پر منحصر ہوتا ہے۔ اس اصول کی بنیاد پر کہ بہترین طریقۂ عمل میانہ روی ہے وہ انتظامی امور کو کامیابی سے مستحکم کر سکتے ہیں تمام مذاہب میں انتہائی تقاضوں اور شدید مطالبوں کو غلط خیال کیا گیا ہے۔ اور انھیں ملک کے استحکام کے لیے بھی مضر قرار دیا گیا ہے۔ دانشمند سلطان اپنے عوام کے ساتھ نرمی اور شرافت سے پیش آئے ہیں۔ انھوں نے خدمت اور اطاعت، شر بندی اور دغا فریب میں اس طرح فرق کیا ہے کہ ان کے اقتدار اعلیٰ میں کوئی کمزوری یا معذوری ظاہر نہیں ہوئی ہے۔ اور ان کے شاہی وقار کو زک نہیں پہنچی ہے جب کہ دوسری طرف انسانوں کے سینوں میں ان کے لیے وفاداری میں اضافہ ہوا ہے اور خواص و عوام کے ذہنوں میں ان کا خوف و احترام بیٹھ گیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو عوام سلطان کی قوت اور رعب و دبدبہ سے اس کی اطاعت کے عادی ہو گئے ہیں تو دوسری طرف عوام کی خیرخواہی اور وفاداری کے سبب سلطان کی حکومت کو عروج اور اقبال حاصل ہو گیا ہے اور انتظامی امور مناسب ڈھنگ سے مستحکم ہو گئے ہیں۔

اس طرح کا انتظامی استحکام جو کہ سلطان کی متضاد خوبیوں کا ثمر ہے آخرت میں اس کی نجات اور برتری کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا اپنے اعلیٰ افسروں، درباریوں، سپاہیوں، رعیت اور خواص و عوام کے

بقیہ حاشیہ: سے محدود کر دیا۔ دوسرے انھوں نے شہادت کے اصولوں کو اتنا کڑا بنا دیا کہ جب تک کوئی جرم بازار یا شاہی شاہراہ پر ہی سرزد نہ ہوا اس کا ثابت کرنا عملاً ناممکن تھا۔ بالواسطہ شہادت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہر جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار شہادتیں درکار تھیں اور اگر ان کی شہادتوں میں ذرا سا بھی فرق ہوتا تو ملزم کو بری کر دیا جاتا تھا۔ نتیجہ کے طور پر ان جرائم کو ضوابط کے ذریعہ سماعت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ (ح)

ساتھ اپنے تمام مختلف تعلقات میں کامل بصیرت اور زبردست فوقیت کا مظاہرہ کرنے والے سلاطین پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اس اصول پر عمل پیرا ہوں کہ میانہ روی، بہترین راستہ ہے۔ انھیں اسلام کے مصدقہ مطالبات کے نفاذ میں غافل، لاپرواہ، بے توجہ اور ڈھیلا نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی شدید اور سخت مطالبات کی طرف مائل ہونا چاہیے جو کہ کسی سلطان کے لیے بہت بڑے نقائص ہیں۔ روم کے قیصروں کا ایک قول تھا "نہ تو بادشاہ کو شکر کی طرح ہونا چاہیے کہ لوگ سے چاٹ کر بالکل صاف ہی کر دیں اور نہ زہر کی مانند ہونا چاہیے جس کا کھانے والا ہر فرد مر جاتا ہے۔ پہلی صورت میں جب سلطان صرف عوام کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا رتبہ گر جاتا ہے، حاکم اعلیٰ کا اثر مرجھا کر بے کیف ہو جاتا ہے دوسری صورت میں جب سلطان اپنے تمام عوام کے ساتھ درشتی اور بدمزاجی سے پیش آتا ہے اور اپنے مطالبات میں تشدد پسند اور سخت ہوتا ہے تو عوام میں اس کی طرف سے نفرت بھڑک اٹھتی ہے۔ لیکن جب بھی سلطان معتدل طریقے اختیار کرتا ہے اور عوام کو خوش کرنے یا ان پر رعب و دبدبہ قائم کرنے کے لیے انتہائی سوجھ بوجھ سے کام لیتا ہے اور جہاں مرہم کی ضرورت ہوتی ہے مرہم لگاتا ہے اور جہاں زخم (داغ) کی ضرورت ہوتی ہے زخم لگاتا ہے تو ملک میں نظم و ضبط قائم ہوتا ہے۔ اطاعت پسند خیر خواہ بن جاتے ہیں، باغی فرمانبردار بن جاتے ہیں، دشمن دوست بن جاتے ہیں۔ دغا باز واپس آجاتے ہیں۔ سلطان سے متنفر لوگ اس کی طرف پھر سے مائل بہ کرم ہو جاتے ہیں۔ عوام کے دل و دماغ پر سکون ہو جاتے ہیں۔ سلطان کی عفو پروری اور رواداری سے عوام زیادہ پر امید ہو جاتے ہیں جب کہ دوسری طرف اس کی قوت اور رعب و دبدبہ سے وہ خوف زدہ بھی رہتے ہیں۔ لہٰذا جب بھی خوف اور امید کے باعث جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ انسانوں کے ذہن اچھی طرح متوازن ہوتے ہیں تو امور انتظامیہ بہترین طریقوں سے انجام پاتے ہیں اور حاکم و محکوم ان سے بجید مستفید ہوتے ہیں۔

اس نصیحت کے سلسلے میں دو مثالیں دی گئی ہیں (۱) شرح السنہ کی سند پر برنی لکھتا ہے کہ ایک عرب نے ماہ صیام میں اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کی، اس کے بعد اسے سخت ندامت ہوئی۔ اس کے قبیلہ کے لوگ اس سے دست بردار ہو گئے۔ اور اس نے رسولؐ اکرم سے درخواست کی حضور نے اس کے گناہ کے بدلے میں اسے چالیس ایام تک لگاتار روزے رکھنے کا حکم دیا۔ عرب نے کہا "یا رسولؐ اللہ! روزے کے دوران میرے جسم میں اتنی شہوت بھڑک اٹھتی ہے کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کرنے سے اپنے کو روک نہیں پاتا ہوں۔ رسولؐ اکرم نے دوسرا بدل یہ بتایا کہ یا تو ایک غلام کو آزاد کر دیا پھر ساٹھ فقراء کو کھانا کھلاؤ۔ عرب نے کہا کہ اس کے پاس کوئی غلام نہیں ہے جسے وہ آزاد کرے اور نہ ہی

وہ ساٹھ فقراء کو کھانا کھلا سکتا ہے کیوں کہ مدینہ کا وہ مفلس ترین شخص ہے۔ اسی وقت کوئی شخص کھجوروں کی کئی لادیاں رسولِ اکرم کے پاس لایا، رسولِ اکرم نے اس عرب سے فرمایا "یہ کھجوریں لو، تمہیں اور تمہارے خاندان کو تمہارے گناہ کی تلافی کے لیے انھیں کھانا چاہیے۔" برنی مزید لکھتا ہے کہ فقہا کے مطابق رسولِ اکرم کا یہ حکم صرف اس عرب کے لیے ہی تھا اور اسے نظیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

(۲) شہنشاہ یزدجرد[۱] انتہائی فضول خرچ تھا۔ وہ روزانہ پانچ بلکہ دس لاکھ دینار خرچ کرتا تھا جبکہ صرف ایک لاکھ دینار اس کے خزانہ میں ہر روز آتے تھے۔ جب اس کے وزیر نے اس کو تنبیہ کرنے کی کوشش کی تو اسے جواب میں ایک جھڑکی ملی۔ یزدجرد نے اس طرح بیس سال تک زندگی گزاری۔ اس کے بعد ایک حریف بادشاہ اس پر حملہ آور ہوا۔ یزدجرد نے، جو اس وقت ساٹھ سال کا ہو چکا تھا، کسی بھی طرح اس حریف سے چھٹکارا پالیا اور اس کے بعد اس نے قدیم خزانہ کو، جسے وہ خالی کر چکا تھا، سخت مطالبات کے ذریعہ پُر کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہر روز تمام رعیتوں کے دو سو یا تین سو انسانوں کو اپنے دربار کے سامنے موت کے گھاٹ اتارتا تھا۔ عوام اس کے مطالبات اور اس کی سزاؤں سے عاجز آکر اس کے محل پہنچے اور اس کی بوٹی بوٹی کر دی۔

نصیحت ۱۸

سلطان کی متضاد خوبیوں کے بارے میں

سلطان محمود کہتا ہے: اے فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا نے انسان کی متضاد خوبیوں سے تشکیل کی ہے۔ ہر زندہ مخلوق میں جسے حیوانوں کے حلقہ سے نکال کر انسانوں کی جماعت میں رکھا گیا ہے قبض و بسط[۲]

---

[۱] یزدجرد، ساسانی خاندان ... یزدجرد ہوئے۔ یزدجرد اول فاسق (۳۹۹-۴۲۰ء) جو بہرام چہارم کا جانشین بنا۔ یزدجرد دوم (۴۴۰-۴۵۷ء) ابن بہرام گور اور یزدجرد سوم جس کا عربوں نے خاتمہ کیا (سائکس، پرشیا، ص ۴۳۰-۴۲۹، ۴۳۶، ۴۳۵ اور ۵۰۲-۴۸۹) ان میں سے کسی بھی یزدجرد کی موت مذکورہ طریقے سے نہیں ہوئی۔

[۲] قبض و بسط، تصوف کی اصطلاحات ہیں جن کی واقعی یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ عام انسان دکھ سکھ، (باقی صفحہ پر)

حلم ورحم ، فراخ دلی وبخل ، غرور وعاجزی کی متضاد خوبیاں یقینی طور پر دیکھی جا سکتی ہیں. انسانی فطرت میں متضاد خوبیوں کی نشو ونما ایک تحیّر افزا کمال ہے. سلطان میں خاص طور سے ان متضاد خوبیوں کی کاملیت کی حد تک نشو ونما ہونی چاہیے تاکہ وہ خدا کا "نائب" اور "قائم مقام" بننے کا اہل ہوسکے کیونکہ قادر مطلق نے انسانوں کو مختلف مزاجوں اور خصوصیتوں اور طرح طرح کی خواہشات اور منشاء کے ساتھ تخلیق کیا ہے. ایک انسان کی ظاہری شکل اور ناک نقشہ دوسرے کی طرح نہیں ہوتا اور یہی بات انسانوں کی ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے. انسان کے کردار کے حقیقی تضاد بکثرت ہیں تمام انسانوں کو نیکی وبدی کی متضاد خوبیوں سے مرکب کیا گیا ہے. تاہم ہر انسان میں نیکی وبدی کا ایک مختلف مرکب ہے چنانچہ ایک انسان کی بدیاں اور نیکیاں کسی بھی دوسرے کی نیکیوں اور بدیوں سے مطلق یا مکمل طور پر نہیں ملتی ہیں. کچھ انسانوں میں نیکی بدی پر اس طرح حاوی ہوگئی ہے کہ بدی کا وجود کالعدم ہوگیا ہے اور ان میں کوئی سطحی چیز نظر نہیں آتی. دوسرے انسانوں میں بدی اس طرح نیکی پر غالب آگئی ہے کہ یا تو کوئی خوبی نظر نہیں آتی یا اگر کسی قسم کی خوبی ظاہر ہوتی ہے تو تنقیدی جائزہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ گھٹیا پن ہے جس نے ظاہر میں خوبی کا جامہ اوڑھ رکھا ہے. اس طرح کے لوگ لاتعداد اور بکثرت ہیں. کچھ انسانوں میں کبھی خوبی نظر آسکتی ہے اور کبھی گھٹیا پن. لیکن درحقیقت اکثر لوگ "حیوان غیر ناطق" پیدا کیے گئے ہیں وہ حیوانوں اور شکار کے جانوروں کے حلقہ میں شامل کردیے گئے ہیں اور ہر خوبی سے محروم ہیں اور ان کا وجود اور ان کی ہستی، ان کی حیات وموت تمام چیزیں کمینگی میں ہیں

انتظام عامہ کے دائرہ میں سلطان اپنے تمام عوام سے نمٹتا ہے اور وہ ان سب کا سپہ سالار اور فرماں روا ہوتا ہے، لہٰذا رعب، ودبدبہ اور مہربانی، شہرت اور شفقت، طاقت اور ملائمت، غرور اور عاجزی، سختی اور نرمی، غصہ اور رحم، فراخدلی اور سخت دلی جو تمام کی تمام متضاد خوبیاں ہیں سلطان کے کردار میں کاملیت کے درجہ تک نشو ونما پانا چاہیے اور مناسب موقع پر ان کا اظہار ہونا چاہیے. اپنے کردار کی اس کاملیت کی وجہ سے سلطان کے لیے ان ہزارہا انسانوں سے نمٹنا ممکن ہوسکے گا جو اخلاقی

بقیہ حاشیہ: مسرت اور افسردگی، خوف اور امید کے تجربے کرتا ہے، اعلیٰ صوفیاء میں، جن کی روحانی طبیعت نشو ونما پا چکی ہے یہ متضاد تجربے اس وقت بسط کی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں جب وہ اعلیٰ ترین ممکنہ مسرت محسوس کرتے ہیں کیونکہ انھیں قادر مطلق سے وصل حاصل ہوچکا ہے اور جب انھیں تجلی الٰہی سے تعلق ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ان کی محرومی بہت زیادہ ہوتی ہے تو یہ متضاد تجربے قبض کی صورت اختیار کر لیتے ہیں (ح)

خوبیوں، خصوصیتوں، مزاجوں اور فطرتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگر سلطان صرف رعب اور دبدبہ کا قائل ہے اور اس میں مہربانی کا کوئی عنصر نہیں ہے تو اطاعت پسند، لاچار اور متین لوگوں کا کیا ہوگا کس طرح وہ ایسے طرزِ عمل کو برداشت کر سکیں گے جو قطعی طور پر یا غالب طور پر دہشت انگیز ہے! اگر سلطان صرف مہربان ہے اور بالکل دہشت انگیز نہیں تو وہ باغیوں، سرکشوں، متمردوں اور نافرمانوں کی سرگرمیوں پر روک نہیں لگا سکے گا۔ وہ انھیں صرف مہربانی سے مطیع، مجبور اور فرماں بردار نہیں بنا سکے گا۔ سلطان کی دوسری متضاد خوبیوں کے سلسلے میں بھی کچھ یہی بات ہے۔[1]

کمالاتِ مخلوق میں ایک کمال یہ ہے کہ سلطان اپنی متضاد خوبیوں میں کامل ہو اور ان کا مناسب اور موزوں مواقع پر اظہار بھی کرتا ہو۔ پس رحم کے وقت سختیاں نہ کی جائیں اور نہ ہی سختیوں کے موقع پر رحم۔ ایسی خوبیوں سے مزیّن سلطان کے پاس اوصافِ الٰہی کا مناسب حصہ ہوتا ہے۔ صرف وہی شخص اس بادشاہت کا، جو خدا کی نیابت اور قائم مقامی ہے، مستحق ہے جس کی متضاد خوبیاں جبلّی ہیں، اور محض کاملیت تک پہنچی ہوئی نہیں ہیں بلکہ جن کا نیک اور بد لوگوں سے نمٹنے کے مناسب مواقع پر اظہار بھی ہوتا ہے۔ رحمِ خداوندی ایسے سلطان کی پیشانی پر چمکتا رہتا ہے۔ اس عالم میں ایسے سلطانوں کو قطبِ عالم کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور آخر میں انھیں عرشِ الٰہی کے زیرِ سایہ جگہ نصیب ہوگی۔ ان کی تعریف و ستائش اور نیک اعمال یاد کرنا نجات کا ذریعہ ہے، تباہی کا باعث نہیں! یہ مقولہ کہ "عدل کی ایک ساعت بھی ریاضت کے ستّر سالوں سے بہتر ہے" ایسے ہی سلاطین کے عدل کی نسبت سے کہا گیا ہے اور رسولؐ اکرم کی حدیث کہ "سلطان زمین پر ظلِّ الٰہی ہے اور تمام مظلوم اس کے یہاں پناہ

---

[1] برنی اس شدت سے اور اس مفروضہ کے ساتھ کہ یہ جداگانہ تھے سلطانوں کے کردار تک محدود ہے۔ سلطان کے ساتھ جو متضاد خوبیاں منسوب کرتا ہے ان میں کوئی پراسرار بات نہیں ہے۔ یہ متضاد خوبیاں ہر شخص میں پائی جاتی ہیں لہٰذا ہر منظم سماج یا ملک میں بلکہ بادشاہت سے زیادہ ایک آئینی حکومت میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا واحد مطلب یہ ہے کہ ملک یا حکومت میں مختلف طرح کے عوام سے پیش آنے کے لیے مختلف طرز کی تنظیمیں ہونی چاہئیں۔ خدا کے ساتھ متضاد خوبیوں کا انتساب ایک بہت ہی مختلف دینی موضوع ہے۔ اکثر مذاہب کے اعلیٰ ترین مفکرین کا یہ خیال ہے کہ خدا میں کوئی تناقص نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؓ کے ساتھ ایک قول کی روایت منسوب کی گئی ہے "تم اس وقت تک خدا کی ماہیت نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ تم اس کے اوصاف کی تنزیہہ نہ کر لو" (رح)

لیتے ہیں" ان ہی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ علماء دین نے کہا ہے "وہ سلطان جسے خدا کی خوبیوں اور اوصاف میں سے کوئی حصہ نہیں ملا ہے اپنے ناپسندیدہ افعال واقوال کی وجہ سے اپنے کو اور دوسروں کو جہنم کی آگ کے لیے سزاوار بنا لے گا"

"اس کا لحاظ نہیں کیا جائے گا کہ وہ غاصب ہے یا موروثی جانشینی کے اصول کے تحت فرماں روا بنا ہے۔"

رسول اکرم کی ان احادیث سے کہ "سلطان زمین پر ظل الٰہی ہے اور تمام مظلوم اس کے یہاں پناہ لیتے ہیں" اور " اگر کوئی سلطان نہ ہوگا تو کچھ لوگ دوسروں کو تباہ کر دیں گے" یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سلطان کی نجات اور درجات ان کی متضاد خوبیوں پر منحصر ہیں اور ان خوبیوں کا مناسب مواقع پر مظاہرہ کرکے وہ جنت میں جگہ پانے کے مستحق ہوجاتے ہیں۔ وہ تمام خوبیاں جو بادشاہت اور فتوحات کے لیے مطلوب اور ضروری ہیں اور جن کے بغیر امور ریاست درست نہیں ہوسکتے مذکورہ بالا احادیث میں شامل ہیں۔ رسول اکرم کی احادیث مختصر تو ہیں لیکن وہ بہت جامع ہیں۔ اگر عالم اپنے کو ان دو احادیث کی شرح کے لیے وقف کردیں تو کم ازکم ایک جلد تیار ہوجائے گی۔ لیکن پھر بھی کوئی شارح شرح کا حق ادا نہیں کرپائے گا۔

وہ تمام سلطان جن میں نیکی بدی پر غالب ہے اور نیکی جبلّی ہے عوام کے ساتھ اپنے انتظامی معاملات میں عدل وانصاف اور مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گو کہ سلطنت کی محبت ان کے ذہنوں پر غالب ہوتی ہے اور انھیں قابو میں رکھنے کے لیے دین کی طرف سے کسی کو مقرر نہیں کیا گیا ہے اس کے باوجود اپنی جبلی نیک فطرت کی وجہ سے وہ شر، ظلم، جبر، غیر مناسب رعب و دبدبہ، نفرت، تشدد، سختی، بے رحمانہ تخریب کی طرف مائل نہیں ہوتے اور ان کے عوام آسودگی اور مسرت سے اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ اس طرح کے سلطانوں کو اس دنیا میں نیک نامی ملتی ہے اور آخرت میں انھیں نجات حاصل ہوتی ہے یا کم ازکم ان کی سزاؤں میں تخفیف کی جاتی ہے۔

نیز سلاطین اسلام، جن کی دین کو ضرورت ہوتی ہے اور جو نیک سیرت اور ایمان کی مضبوطی سے متصف ہوتے ہیں عوام کے ساتھ اپنے معاملات میں صرف خدا اور رسول کے دین کی خاطر اپنی شفقت اور مہربانی، رعب و دبدبہ، غصہ اور ملامت، مضبوطی اور رحم، سختی اور نرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور انھیں صرف اسی مقصد کے لیے اپنے اقتدار کے قیام کی قدر محسوس ہوتی ہے اگر وہ رحم دل ہیں تو صرف خدا و رسول کے دین کی خاطر، اگر وہ رعب و دبدبہ قائم کرنے کی طرف رجوع ہوتے ہیں تب بھی ان کا مقصد

دین کی خدمت ہوتا ہے۔ ان کا شاہی اقتدار جو ان کی متضاد خصوصیات پر مبنی ہوتا ہے اسلام کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور ان کی زندگیاں کلمۂ حق کی تعزیز، دین کی روایتوں کی بلندی، احکام شریعت کے رواج، نیکی کے حکم اور بدی کی ممانعت، اسلام اور مسلمانوں کی عزت افزائی اور شرک و کفر کو ذلیل کرنے کے لیے وقف ہوتی ہے۔ انھیں لازمی طور پر اس دنیا میں نیک نامی ملتی ہے۔ ان کے نیک اعمال کی تعریفیں روز قیامت تک جاری رہیں گی اور پھر وہ حشر کے دن انبیاء کے ساتھ اٹھیں گے۔

لیکن ان سلاطین اسلام کی بدیاں جنھیں نیک پیدا نہیں کیا گیا لازمی طور پر ان کی خوبیوں پر غالب آجاتی ہیں۔ دین میں ان کا عقیدہ مستحکم نہیں ہوتا اور ان کی (ظاہری) خوبیاں کسی حکمت عملی اور منصوبوں کے تحت ہوتی ہیں، ان کی آنکھیں اور ان کے ذہن صرف اپنی ذات اور اپنے اقتدار کے تحفظ پر جمی رہتی ہیں اور وہ اپنی متضاد خوبیاں صرف ان دو مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا اس دنیا میں اصل مقصد اقبال مندی اور اقتدار ہوتا ہے اور وہ اپنے دین کو اس مقصد کا ماتحت بنا لیتے ہیں۔ مصلحت کا جو بھی تقاضا ہوتا ہے اس کے مطابق وہ صرف اپنی ذات اور اقتدار کے لیے غضبناک اور نرم ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ مشفق و مہربان ہوتے ہیں تو اس میں ان کا ذاتی مفاد ہوگا۔ اگر وہ رعب و دبدبہ کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اس کی پشت پر بھی وہی مقصد ہوگا۔ جب وہ عنایت کی نوازش کرتے ہیں یا رواداری دکھاتے ہیں یا عوام پر ظلم کرنے سے پرہیز کرتے ہیں تو ان کا مقصد اپنی ذاتوں اور سلطنتوں کا تحفّظ ہوتا ہے نہ کہ دین کا۔ ان ہی مقاصد کی خاطر وہ دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، یا تشدد اور رعب و دبدبہ کی طرف مائل ہوتے ہیں لہٰذا دونوں صورتوں میں وہ ذمّہ دار قرار دیے جائیں گے اور انھیں آخرت کی نعمتوں سے محروم رکھا جائے گا (اس موضوع سے متعلق ایک غیر اہم پیراگراف کو یہاں شامل نہیں کیا جا رہا ہے)

اے محمود کے فرزندو! اگر انھوں نے تمھیں جبلی خوبیوں سے نوازا ہے تو دین کے تحفظ کو اپنی شجاعت اور حوصلہ کی آخری منزل اور مقصد بنانے کے لیے جدوجہد کرو اور اپنی متضاد خوبیوں کو اس مقصد کے لیے بروئے کار لاؤ۔ اپنے ملک اور اقتدار کے قیام کو اس مقصد کا ماتحت سمجھو تاکہ تمھیں نجات حاصل ہو سکے لیکن دوسری طرف اگر تم میں اخلاقی خوبیاں جبلی نہیں ہیں تو رسولؐ اکرم کی اس حدیث کے مطابق عمل پیرا ہو" (اپنے اندر) اللہ کی اخلاقی خوبیاں پیدا کرو" تمھیں اپنی کاوشوں سے اپنی بدیوں کو خوبیوں میں تبدیل کرنا چاہیے کیوں کہ انسان کو اپنی اخلاقی صفات بہتر کرنے کا اہل پیدا کیا گیا ہے، دوسرے لوگ اپنی اخلاقی صفات کو بہتر کر سکتے ہیں اور نہیں بھی، لیکن سلطان،

جس کی متضاد صفات تمام دنیا پر اثر انداز ہوتی ہیں اخلاق کو بہتر کیے بغیر بادشاہت قائم نہیں رکھ سکتا، اور جہاں تک اسلام میں تمہارے عقیدہ کی بات ہے اپنے کو اس کسوٹی پر کسو۔ اگر تم یہ محسوس کرتے ہو کہ تمہاری شجاعت اور حوصلہ کا مقصد تمہارے ملک اور تمہارے اقتدار کا مقصد اور منہاج دین کا تحفظ اور عروج، کلمۂ حق کی تنویر، اسلامی روایات کی بلندی، مسلمانوں کی عزت افزائی اور کفر و شرک اور مشرکوں کا خاتمہ ہے اور یہ کہ تمہارا واحد مقصد اپنی سلطنت اور اپنی ذات کی بقا نہیں ہے تو تمہیں یہ یقین ہو جانا چاہیے کہ تم ایک سچے مسلمان ہو۔ لیکن اگر یہ صورت نہیں ہے تب تمہیں اپنے ایمان کے سلسلے میں خائف رہنا چاہیے اور خود ستائی پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے۔

تمام فرمانرواؤں کا فرمان روا اور حقیقی سلطان السلاطین قادر مطلق ہے جو اپنے غیظ و غضب اور مہربانی قہر اور رحم کے ذریعہ دنیا کو قائم رکھتا ہے۔ ان کے اثرات اچھے برے دونوں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس نے نیک اور مطیع لوگوں کے لیے جنت تخلیق فرمائی ہے اور انھیں اس میں جگہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ بد اور نافرمان لوگوں کے لیے دوزخ پیدا کی ہے اور انھیں اس سے ڈرایا ہے۔ اس نے جنت کے محافظ رضوان کو مہربان نظر پیدا کیا ہے اور داروغۂ دوزخ کو غضبناک آنکھ دے کر پیدا کیا ہے۔ سلطان مجازی کو سلطان حقیقی کی سنت پر عمل کرنا چاہیے اور سلطنت کے باشندوں سے اپنی متضاد صفات کے ساتھ، جو کہ امور ریاست کے لیے لازمی ہیں پیش آنا چاہیے جس طرح ایک سلطان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے عمدہ سلوک، خوش مزاجی، فراخ دلی، انکساری، اور رواداری میں نمایاں لوگوں کو اپنی بارگاہ میں افسر کی حیثیت سے مقرر کرے تاکہ اس کے نیک اور مطیع عوام یہ محسوس کر سکیں کہ یہ خوبیاں خود سلطان کی خوبیاں ہیں اور اس کا انتظامیہ ان عہدیداروں کی وجہ سے فیضیاب ہوگا۔ اسی طرح دوسری طرف اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ اپنے شر پسند اور باغی عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنی بارگاہ میں سخت اور بے رحم افسر تعینات کرے، یہاں جن خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور سلطان کے افسروں میں یہ دونوں متضاد خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اگر یہ صورت رہی تو عوام سلطان کا احترام کریں گے، انتظامیہ چاق و چوبند ہوگا، لوگوں کے گھوڑوں اور کھیتوں میں اضافہ ہوگا۔ نیکی بدی پر حاوی ہوگی اور سلطان کے نیک اور باوصف عوام مطمئن اور آسودہ حال رہیں گے (انگریزی زبان کی روایات کے احترام میں نے اس پیراگراف میں برنی کے استعمال کیے ہوئے ایک سو سے زائد اسمائے صفات کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔)

(برنی ایک مرتبہ پھر فطرت انسانی کے متعلق اپنی حقیر رائے کی طرف متوجہ ہوتا ہے) اس دنیا میں

شر پسندوں کی کثرت ہے۔ یہاں شیطان کی سیرت رکھنے والے بنی آدم، ابلیس صفت دیووں کے بیٹے، بھوتوں کے مزاج والے ڈاکو لٹیرے اور آدم خور انسان ہیں جو وحشی درندوں کی نسل سے معلوم ہوتے ہیں لہٰذا یہ بارگاہ سلطانی میں مطلوبہ طاقت اور غیض و غضب رکھنے والے افسر نہیں ہیں تو ان جماعتوں کو کس طرح کچلا جاسکتا ہے؟ اور جب تک ان کی سرکوبی نہیں کی جاتی ہے سلطان کے مطیع اور فرماں بردار عوام کو کس طرح غارت گری اور وحشیانہ پن سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے؟ چنانچہ یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ سلطان کی بارگاہ میں قیدخانے، قیدخانوں کے افسر، نگراں (سرہنگ) اور جلاد ہوں جو سزائیں دینے کے لیے تیار اور مستعد ہوں تاکہ قید، بیڑیوں، گزندوں، بلاؤں اور تکلیفوں کے خوف سے لوگوں کی نافرمانی اور بے ایمانی میں کمی آسکے اور احکام حکومت نافذ کیے جاسکیں۔

ان ابتدائی باتوں کا مقصد کچھ اس طرح ہے۔ سلطان کو متضاد خوبیوں کا مکمل حامل ہونا چاہیے اس میں جبلی خوبیاں ہونی چاہئیں اور دین میں اس کا انتہائی عقیدہ ہونا چاہیے تاکہ ملک کا مناسب انتظام ہوسکے۔ احکام خدا کے مطابق حکومت چلائی جاسکے۔ کلمۂ حق کی تعظیم ہو، باطل عقاید پر سچے ایمان کا غلبہ رہے۔ احکام شریعت کا نفاذ ہو اور مرکز میں صداقت قائم ہوجائے۔ تب پھر سلطان اور عوام دونوں آخرالذکر کی اطاعت سے استفادہ کرسکیں گے۔ سلطان کا آخرت میں روحانی درجہ بڑھے گا اور اس کے عوام آفات و مصائب سے محفوظ رہیں گے۔

ربرنی اس نصیحت کے سلسلے میں دو مثالیں دیتا ہے (۱) مسلمانوں کی مدد کرنے اور دوسرے عقائد کو ختم کرنے کے لیے خلیفہ دوم حضرت عمر خطاب کی تعریف کی گئی ہے (۲) سلطان سنجر سے متعلق حسب ذیل جائزہ تاریخ سے مصنف کی زبردست لاعلمی کی ایک اور مثال ہے لہٰذا اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔)

سلطان سنجر کے مطیع اور فرماں بردار لوگوں کے ساتھ انتہائی کریم النفسانہ رویہ اور سرکشوں کے ساتھ اس کی سختیوں کے بارے میں اس کے معتمد معین عاصم نے تاریخ سنجری میں حسب ذیل باتیں قلم بند کی ہیں۔

سلطان سنجر کی قوت اور اقتدار کی وجہ سے ارض مسکون کے بیشتر سلطان جن کا تعلق غیر مسلم مذاہب سے تھا اپنی عورتوں، بچوں، خاندانوں اور پیروؤں کے ساتھ نیست و نابود کردیے گیے اور باطل مذاہب کے احکامات کھرچ کر پھینک دیے گیے۔ سلطان سنجر کے غلام اس کے مخالفین کے علاقوں اور ملکوں میں سلطان بن گیے۔ اس نے احکام شریعت نافذ کیے۔ کفر و شرک کا شہروں سے حساب صاف کیا اور کفار و مشرکین کا صفایا کیا۔ اس کے دور میں بدعقیدہ اور بدمذہب لوگوں نے اپنے سر چھپا لیے۔ کسی بھی شخص کو اسلام کے مخالف کھلم کھلا کسی دوسرے مذہب کی رسوم ادا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ مسلمانوں کے شہروں

میں کسی بدمذہب اور بددین کا عزت و احترام نہیں ہو سکتا تھا اور دین کے کسی بھی دشمن کو کسی بھی لحاظ سے مسلمانوں کے اوپر برتری و فوقیت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگر کوئی بدعقیدہ انسان یا دین اسلام کا مخالف مسلمانوں میں رہنے کی غرض سے آتا تو اسے ذلیل کیا جاتا اور اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی چنانچہ کوئی بھی شخص اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ سنجر کی شان و شوکت اتنی انتہا تک پہنچ چکی تھی کہ بتیس ہزار گھوڑے، خچر اور اونٹ اس کے شاہی خیمے کے ساتھ چلتے تھے۔ ہر روز شاہی اصطبل سے کوچ شروع ہونے کے وقت سلطان کے ندیموں، شاعروں، قوالوں اور موسیقاروں کو زین و ساز سے آراستہ سات سو گھوڑے عطا ہوتے تھے۔ تاہم اتنی شان، طاقت اور دبدبہ کے باوجود سلطان سنجر اتنا رحمدل تھا کہ فرض نمازیں ادا کرنے کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ اور وعظ اور نصیحتیں سننے کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ وہ رات کو اولیاء کرام اور دوسرے تارک الدنیا اشخاص کے گھروں پر پیدل جاتا تھا اور متقی اور پاک باز لوگوں کے ساتھ گذارے ہوئے دنوں کو ایک نعمت تصور کرتا تھا۔ ہفتہ میں ایک بار وہ دو جوتے گانٹھنے والوں کے گھروں پر جاتا تھا جو صاحب کشف و کرامات ولی تھے۔ چنانچہ لوگ کہتے ہیں: ”سلطان سنجر ہفتہ میں ایک مرتبہ دو موچیوں کو سلام کرنے کے لیے جاتا تھا۔“

وہ اپنے باپ کے غلام افسروں کے ساتھ بہت احترام سے پیش آتا تھا اور ان کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھتا تھا۔ انھیں اپنے باپ بھائیوں اور بیٹوں کی طرح سمجھتا تھا۔ جشن اور شادیوں کے مواقع پر وہ اپنے رشتہ داروں اور غلاموں کے یہاں ایک مہمان کی حیثیت سے جاتا تھا اور اپنی سلطنت کی اس قدر سطوت کے باوجود وہ شاعر انوری کے مکان پر دو مرتبہ مہمان کی حیثیت سے گیا۔

اپنی انتہائی مہربانی اور رحمدلی کی وجہ سے سلطان سنجر سیاسی یا مال گزاری کے جرائم میں ملوث کسی بھی مسلمان کو سزائے موت نہیں دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا، ”کسی مسلمان کو میں اپنی سلطنت کے خلاف کسی جرم کے لیے نہیں مار سکتا کیوں کہ میں اس کی موت کے لیے خدا کو جواب نہیں دے پاؤں گا۔“ اگر سنجر کے علاقہ میں کوئی رشتہ دار یا اعلیٰ افسر بغاوت کرتا تھا اور وہ اسے مقید کر کے اس کے سامنے لاتے تھے تو سنجر اسے فوراً بری کر دیتا تھا۔ وہ قیدی کی موجودگی میں صرف اس قدر کہتا تھا، ”میں تمہیں اس وقت معاف کرتا ہوں آئندہ بغاوت نہ کرو۔ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“ اس کے نیک اعمال کے فیض سے اور اخلاقی خوبیوں کے سبب اس کے احکام تمام دنیا میں نافذ ہوئے۔ وہ بچانوے سال تک زندہ رہا اور ستر یا اسی سال تک خوش اسلوبی سے کام کرتا رہا۔

سلطان سنجر پر نوٹ :

برنی کی تاریخ سے لاعلمی اور لاعلمی سے اس کی بے خبری کے خلاف احتجاج کرنا بے سود ہے. برنی کا کوئی حامی پہلی نصیحت میں اس کی مثالی افسانے کی حیثیت رکھنے والی "خوارزم کے سلطان" کی حکایت کو صحیح ثابت کر سکتا ہے. لیکن سلطان سنجر کے عہد کے بارے میں برنی کی بے سروپا تصویر کشی کو اس طرح صحیح ثابت کرنا غالباً ممکن نہیں ہے.

تاریخ فیروز شاہی (ص ۲۱۶) میں برنی احمد چاپ کی زبان سے سلطان جلال الدین کے ساتھ اس کی گفتگو میں یہ جملہ کہلواتا ہے " جلالت مآب، آپ سلطان محمود اور سلطان سنجر کی روایات اور رسوم پر کیوں نہیں چلتے. جو دین اسلام کے ستون تھے اور جنھوں نے دنیا کو فتح کیا اور اسے قبضہ میں رکھا؟" یہاں مفروضہ یہ ہے کہ بدنصیب سنجر محمود کی طرح ایک کامیاب فاتح تھا. اس نصیحت میں برنی اپنا موقف ظاہر کرتا ہے اور سلطان سنجر کے ساتھ حسب ذیل کارنامے منسوب کرتا ہے. (الف) کہ اس نے بنیتر غیر مسلم سلاطین کا خاتمہ کیا. (ب) کہ اس نے مسلم دین کے مخالفین کو کچلا اور (ج) اس نے حکومت کو مضبوط اور عوام کو خوش حال رکھا. حال یہ ہے کہ سنجر ان سب کاموں میں بری طرح ناکامیاب رہا اور اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں.

سلطان سنجر بن ملک شاہ شام میں سنجر کے مقام پر ۱۰۸۶ء میں پیدا ہوا تھا. ۱۱۵۷ء میں سہتر (قمری) سال اور نو ماہ کی عمر میں مرو میں اس کی موت واقع ہوئی (روضتہ الصفا، ص ۱۱۴) بیس سال تک وہ اپنے بھائیوں شہنشاہ برقیارق اور محمد کی جانب سے خراسان کے والی کی حیثیت سے رہا اور شہنشاہ کی حیثیت سے اس کا دور حکومت اکیاون (قمری) سال (۱۱۵۷ - ۱۱۱۹ء) تک رہا. یہ بہت صاف طور سے اعتراف کرنا ہوگا کہ سلطان سنجر کا فارسی ادب میں ایک جداگانہ مقام ہے جس میں اس کی بدنصیبیوں کے باوجود اسے کسی اقبال مند سلطان (سلطان سعید) کہہ کر پکارنے کو ترجیح دی گئی ہے. پھر بھی یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ سلطان سنجر کو ترکستان سے لے کر اناطولیہ تک ایک زبردست سلطنت ملی تھی اور جب وہ شکستہ دل ۱۱۵۷ء میں مرو میں مرا تو عظیم سلجوق سلطنت پوری طرح مٹ چکی تھی.

روضتہ الصفا میں یہ تحریر ملتی ہے کہ سلطان سنجر نے ۱۹ جنگیں لڑیں اور ان میں سے ۱۷ میں فتحیاب رہا۔ دوسرے کارناموں میں اس نے غزنی کے بہرام شاہ، غور کے علاؤ الدین جہاں سوز اور ماوراء النہر کے والی احمد خاں کو زیر کیا. لیکن اس کے خوارزم کے والی اتسیز کے خلاف یکے بعد دیگرے کئی مہمات ناکامیاب ہوئیں. اور اتسیز ایک خود مختار شاہی خاندان کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوا جس کے مقدر میں سلجوق سلطنت کی

میراث لکھی ہوئی تھی۔

سلطان کی دو شکستیں فیصلہ کن تھیں

۱۱۴۱ء میں قراخطہ کے غور خاں نے ایک طاقت ور فوج کے ساتھ سلطان سنجر کے خلاف حملہ کیا خراسانیوں نے اپنی بد دماغی میں یہ سوچا کہ ایک سو غور خانی ان کے خلاف نہیں ڈٹ پائیں گے۔ لیکن جب فوجیں ٹکرائیں تو یہ پتہ چلا کہ دشمن کے سپاہی بے شمار تھے۔ انھوں نے ہر طرف سے سنجر کو گھیر لیا۔ لشکر اسلام کو زبردست شکست کھانی پڑی اور تیس ہزار مسلم سپاہی شہید ہو گئے۔ سنجر پریشانی میں پڑ گیا۔ بالآخر اس کے ایک افسر تاج الدین ابوالفضل نے اس سے کہا" ہمیں بچنے کی کوشش کرنا چاہیے کیوں کہ لڑنا ناممکن ہے۔ سنجر دس یا پندرہ افراد کے ساتھ بچ کر تار (اترار؟) کے قلعہ پہنچ گیا جہاں اس کے باقی ماندہ زخمی اور آفت زدہ سپاہی اس سے آملے ۔۔۔ اس جنگ میں سلطان کے تقریباً دس ہزار ممتاز سورما کام آئے اور اس کی بیوی ترکان خاتون کئی ممتاز امراء کے ساتھ دشمن کے ہاتھوں پڑ گئی، اس شکست کے باعث سلطان سنجر کا وقار اور اثر لوگوں کے ذہنوں سے مٹ گیا اور اس نے اپنے عہد میں جو کچھ دولت جمع کی تھی وہ ختم ہو گئی۔" (روضۃ الصفاء، جلد چہارم، ص ۱۱۳-۱۱۲)

اگلے دس برس میں سنجر نے اپنی شہرت قائم کرنے کی سخت کوشش کی لیکن ہوا یہ کہ اس پر ایک اور بھی زبردست مصیبت آپڑی۔ اس کے افسروں نے اپنے جارحانہ رویہ سے غز ترکوں کو، جو چالیس ہزار خاندانوں پر مشتمل ایک جماعت تھی اور بلخ اور ختلان کے گرد رہتی تھی، سخت پریشان کیا، غز ترکوں کی پیش کی ہوئی بہت ہی عاجزانہ اطاعت اور مصالحتوں کو ترک کر دیا گیا اور سنجر نے اپنے بہترین فیصلہ کے خلاف اپنے افسروں کے اصرار پر ایک فوج کے ہمراہ ان کے خلاف کوچ کیا، جب غز قبائل سلطان کے رحم سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے اپنی جانوں پر کھیلنے اور لڑنے کا تہیہ کر لیا۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں سلطان کی فوج کو شکست ہو گئی اور اس نے راہ فرار اختیار کی۔ غز ترکوں نے پیچھا کیا اور بہت سے مفرور سپاہیوں کو مار ڈالا۔ (روضۃ الصفا، ص ۱۱۴)

براؤن سنجر کو اپنے عوام کے عظیم محافظ کی حیثیت سے سمجھنے پر بہت زور دیتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ سنجر کے عہد کے اختتام پر عوام نے واقعی جو مصیبتیں اٹھائیں ان کا کچھ ذکر کیا جائے، "غز ترکوں نے سلطان کا تعاقب کیا، اسے پکڑا، اس کے سر پر تاج رکھا، اس کے قدموں کو بوسہ دیا اور اسے قید کر کے مرو لے گئے۔ شہر دولت سے ٹپاپڑا تھا کیوں کہ عوام چغر بیگ کے زمانے سے امن و سکون کی زندگی گزار رہے

تھے۔ کافر ذہن غز ترکوں نے اسے تین دن اور تین رات تک لوٹا۔ پھر انھوں نے شہریوں کو سخت ایذا پہنچائی تاکہ وہ اپنے مدفون خزانوں کا پتہ بتائیں۔ یہ سب کرنے کے بعد وہ سلطان کے ہمراہ نیشاپور کی طرف چل پڑے۔ نیشاپور کے عوام نے اپنے غز مخالفین میں سے بعض کو پہلے حملہ میں تو مار ڈالا لیکن اس کے بعد جن کے مقدر میں جانوروں کی طرح ذبح ہونا لکھا تھا، انھوں نے شکست قبول کرلی اور پناہ کے لیے جامع مسجد کی طرف بھاگ لیے کافر اور گناہ کار غز ترکوں نے مسجد کا دروازہ گرادیا۔ اور مرد، عورت، بوڑھے اور جوان، پاکباز اور گناہ کار کی تمیز کیے بغیر انھیں قتل کرڈالا اور مسجد کے صحن میں ان سب کا خون اس طرح بہا یا جس طرح آمو کی لہریں بہتی ہیں، سورج غروب کے بعد ترک ایک دوسری بڑی مسجد کی طرف چل پڑے جہاں نقش ونگار سے آراستہ جلتے ہوئے ستونوں سے اتنے اونچے شعلے اٹھ رہے تھے کہ تمام شہر روشن ہوگیا تھا، چنانچہ مسجد کے جلتے ہوئے ستونوں کی روشنی کی مدد سے غز ترک شہر کے باشندوں کو پکڑنے اور لوٹنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے (سطح زمین پر موجود ہر چیز پر قبضہ کرنے کے بعد باشندوں کی ناکوں میں دھول اوران کے منہ میں نمک ٹھونس کر غز ترکوں نے ان کی تعذیب شروع کی تاکہ وہ اپنے مدفون خزانے حوالے کردیں) خراسان کے بڑے بڑے علماء ومشائخ ان بدمعاشوں کے پنجوں میں پھنس گئے اور شہید کردیئے گئے۔ ان میں امام محمد بن یحییٰ بھی تھے جو اپنے علم اور تقویٰ کے لیے ممتاز تھے اور جنھیں آلۂ تعذیب میں کھینچ کر مار ڈالا گیا، خراسان کی ہر آباد جگہ کو غز ترکوں نے لوٹا۔" (روضتہ الصفا، جلد چہارم، ص ۱۱۴)

سلجوق سلطنت کے بہت سے دوسرے صوبے اور شہر بھی اسی طرح تاخت وتاراج کیے گئے۔ لیکن مرو اور خراسان کی خوشنما اور مرفہ الحال آبادیوں کی مثالیں یہ دکھانے کے لیے کافی ہیں کہ سنجر کے عوام کو کیا کیا مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔

تین سال کی قید کے بعد سلطان سنجر غز ترکوں سے بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہوا۔ اس نے آمو عبور کیا، دریا کے کنارے پر خیمہ زن ہوا تاکہ اس کے پیرو اس کے زیر پرچم آکر جمع ہوجائیں اور اس کے بعد اپنے دارالسلطنت کی طرف چل پڑا، لیکن مرو پہنچنے پر اسے خزانہ خالی ملا، ملک ویران تھا اور عوام تتر بتر ہوچکے تھے۔ اس کا ذہن تکلیف اور غم کے بادلوں سے گھر گیا اور وہ کسی مرض میں مبتلا ہوگیا جو اس کے لیے مرض مرگ ثابت ہوا۔ اور ۱۱۵۷ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔" (روضتہ الصفا، جلد چہارم، ص ۱۱۴)

سنجر کے عہد میں تقلید پسندی کے خلاف سب سے بڑی چنوتی الاموت کے اسماعیلی سفاکوں کی طرف سے آئی تھی لیکن برنی کے علم میں یہ بات نہیں تھی، اس تحریک کا بانی حسن بن صباح ۱۱۲۴ء تک یعنی سنجر کے دور

حکومت کے پانچویں سال تک حیات رہا۔ سلجوق سلطان جنبتی کا مقابلہ کرنے سے بالکل قاصر رہا تھا، یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ سنجر کا معین عاصم نام کا کوئی معتمد نہیں تھا، لیکن سنجر کا کوئی معتمد اتنے غلط بیان نہیں دے سکتا تھا جیسا کہ برنی دہراتا ہے۔ نیز کیوں کہ برنی فارسی کلام سے اتنی اچھی طرح واقف تھا اور واضح طور پر انوری کا حوالہ بھی دیتا ہے تو آخر اس نے انوری کے خراسان کے آنسوؤں کو کیوں اپنے ذہن میں تازہ نہیں کیا جو اس وقت لکھے گئے تھے جب سنجر ایک قیدی تھا؟ (براؤن، لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد دوم، ص ۳۸۹-۳۰۵) کوئی شخص برنی کو اس تاریخی مواد تک اس کی رسائی نہ ہونے کے لیے تو معاف کر سکتا ہے جو وزیر امیر علی شیر نے روضۃ الصفا کے مصنف کے سپرد کیا تھا لیکن طبقات ناصری میں سنجر اور اس کے ہم عصروں کے بارے میں جو معلومات مل سکتی تھیں ان سے لاعلمی کے لیے اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی تاریخ فیروز شاہی میں وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس تصنیف کے سلسلے کو آگے بڑھا رہا ہے (ح)

نصیحت - ۱۹

ریاست کے معاونین کی عالی نسبی کے بارے میں

سلطان محمود نے کہا: اے محمود کے فرزندو اور سلطانو! تمہیں قرآن کی اس آیت کو سمجھنا چاہیے جس میں خدا نے کہا ہے "اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے ارباب امر ہیں[1]۔" اور اس حدیث کو بھی سمجھو جس میں رسول اکرم نے فرمایا ہے "تم سب کو طلب کیا جائے گا اور تم سب سے تمہاری رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا" تمہیں یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ خدا نے، حالاں کہ وہ اٹھارہ ہزار عالموں کا مالک ہے اولوالامر کے احکام کو اپنے احکامات کے برابر اور رسول اکرم کے احکامات کے برابر کے احکامات ... کا درجہ دیا ہے جو انس و جن میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور ازل و ابد کے محبوب ہیں کس طرح انسان کا ایک لاچار بیٹا اس احسان کا بدلہ چکا سکتا ہے؟ نیز رسول اکرم نے فرمایا ہے کہ "ہر مسلمان اپنے گھر کا نگہبان ہے اور اس سے اس کے گھر کی رعیت کے

---

[1] تمام تاریخ اسلام میں سیاسی حاکموں کے مسلم اور غیر مسلم خوشامدیوں نے قرآن کی کسی دوسری (باقی صفحہ ۱۹۳)

بارے میں سوال کیسے جائیں گے؟ لہٰذا روزِ محشر میں جس وقت اپنے خاندان کے افراد کے بارے میں سوالات کے جواب دینا تو در کنار انسان خود اپنی ہی زندگی کے متعلق سوالوں کے جواب دینے سے قاصر رہے گا تو پھر سلطان جو کہ ایک پورے ملک کا فرماں روا اور اس کی بہبود کا ذمہ دار ہے، کسی طرح اپنے عوام کے اعمال و افعال کے بارے میں جواب دے سکے گا۔

سلطان خدا کی عنایات کے لیے پوری طرح احسان مند نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ہی وہ اپنے اعلیٰ منصب کے فرائض، یعنی شریعت کے مطابق حکومت، عالی نسب اور عالی کردار وفادار معاونین اور افسروں کے بغیر انجام نہیں دے سکتا۔ وہ ناکارہ اور بے شرم لوگوں کی مدد اور بے دین اور بد قماشوں کے تعاون سے بہتر فرقوں کے ساتھ اس طرح نہیں رہ سکتا کہ وہ خدا کے سامنے اپنے تمام عوام کی ذمہ داری لے سکے اور نجات حاصل کرنے والوں کی صف میں آ جائے۔

حکماء عالم اس سے متفق ہیں کہ سلطان انتظامیہ کے تمام فرائض بذات خود انجام نہیں دے سکتا اور وہ نامعلوم اشخاص کو فرمانروائی کے اختیارات میں شریک نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ انتظامیہ کے کام کو اپنے مددگاروں، معاونوں اور شریک کاروں کو تفویض کرے اور والی اور امیر کے عہدے ان کے سپرد کرے جو اس سے قریب ترین ترین ہیں۔ اگر وہ کسی اجنبی کو اپنی حکومت کے امور کی دیکھ بھال کے لیے ہدایت کرتا ہے تو وہ اس کی وفاشعاری کے بارے میں یقینی نہیں ہو سکتا۔ نیز کسی اجنبی کو سلطان کے کام کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔

الحاصل جب بھی کسی سلطان کے معاون، مددگار، خیر خواہ، طرف دار اور پیرو کم اصل، رذیل اور کمین خصلت ہوتے ہیں جن کے پاس مذہب کا کوئی حصہ بخرہ نہیں ہوتا تو وہ امورِ حکومت کو درہم

بقیہ حاشیہ: آیت کے اتنے زیادہ غلط معنی بیان نہیں کیے ہیں۔ ایک طرف خدا اور اس کے رسول اور دوسری طرف جو تم میں سے اولوالامر ہوں، کے درمیان کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اول الذکر کی اطاعت کا حکم مشروط نہیں ہے جب کہ امیر کی اطاعت محدود اور مشروط ہے۔ لیکن اگر ایک آیت کا پہلا حصہ ہی نقل کیا جائے اور بقیہ چھوڑ دیا جائے تو قرآن کے حکم کا مکمل غلط تاثر پیدا ہوگا۔ پوری آیت اس طرح ہے "اے مومنو، اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو، اور ان کی جو تم میں سے ارباب امر ہیں لیکن اگر تم کسی امر پر نا متفق ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کر دو۔"

(سورہ ۴، آیت ۵۹) (ح)

برہم کر دیتے ہیں اور ایسی مہمات چلاتے ہیں جو دین اور ملک پر مصیبت ہی لائیں۔ بالفرض وہ امور دنیا کو ٹھیک بھی رکھتے ہیں تو اس سے کیا، خدا کے دشمن بھی دنیاوی امور کو درست کر لیتے ہیں۔ لیکن ناکارہ، بے شرم، کم اصل، رذیل اور بے دین ایسی مہمات کو سر نہیں کر سکتے جن سے عاقبت اچھی ہوتی ہے یا جن کے نتیجہ میں سلطان کو آخرت میں عزت ملتی ہے۔

قدیم اور جدید فرقوں کے حکماء و علماء کے تجربے نے حسب ذیل اصول کو صحیح ثابت کر دیا ہے اور اس کے بارے میں کوئی اختلاف رائے ممکن نہیں ہے کہ رذیل، کم اصل اور بے دین کسی دینی یا دنیاوی کام کو پورا نہیں کر سکتے جسے علم یا عقل نے اچھا سمجھا ہو۔ جب بھی سلطان بد قماش جماعت کو رسول اکرم کے دینی یا ریاستی عہدوں پر فائز کرتا ہے اور حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے، جو اس پر اللہ کی بڑی عنایت ہے، ان لوگوں کو جنھیں روحانی دنیا مسترد اور الگ کر چکی ہے، صرف اپنا شریک کار ہی نہیں بناتا بلکہ انھیں کھلی ہوئی آزادی بھی دیتا ہے تو وہ اس کی جانب سے جو تمام باتیں کرتے ہیں ان کے لیے اسے عرش الٰہی کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ کیا یہ ایک عجیب بات نہیں ہے کہ یہ کم اصل افسر منصبی فوائد اور تفنیش کی لذتیں اٹھائیں اور سلطان کو ان کی بداعمالیوں کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے؟

لیکن اگر سلطان آزاد، عالی نسب اور خوبیوں سے متصف لوگوں کو اپنا افسر اور معاون مقرر کرتا ہے تو ان کی فطرت اور خصلت کی وجہ سے اس کے کارندوں کی حیثیت سے ان کے کام ضرور ہی قابل تعریف ہوں گے اور روز محشر میں لئے اپنے اتنے ہزار ہا عوام کے لئے جواب دہ ہونے پر حیران و پریشان نہیں ہونا پڑے گا حالانکہ انبیاء و اولیاء جو بارگاہ الٰہی کے مقربین میں سے ہیں، اس دن نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے اور زاہد، درویش، ابرار اور اخیار اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں سوالات کے جواب دینے سے قاصر ہوں گے۔

محمود کے فرزندوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ سلطانوں کی اٹھائی ہوئی دینی اور دنیاوی دونوں تکالیف کے باعث زیادہ تر ان کے برے معاون، مددگار اور حمایتی تھے۔ اپنے شاہی اقتدار کے نشے میں انھوں نے ناکارہ لوگوں کی ترقی روکنے کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔ کمین اور کم اصل لوگوں کا خلوص اور وفاداری ان کی نگاہ کو بے بصیرت بنانے میں کامیاب ہوئے اور ان کی فوری بہبود کی خواہش نے انھیں آخری نتائج پر غور کرنے سے باز رکھا ہے۔ چنانچہ اس اختیار اعلیٰ کی بدولت جو انھیں خدا کے انعام کی شکل میں ملا ہے انھوں نے نکموں کو اپنا شریک کار بنا لیا ہے اور ان لوگوں کے اعمال و افعال کی وجہ سے اپنے کو دنیا و آخرت میں ذلیل و رسوا کر لیا ہے۔

بالفرض سلطان حقیر اور ممنوعہ بدیوں کا شکار ہے لیکن اس کے مددگار اور معاون جو انتظامی منصوبوں میں اس کے شریک کار اور معتبر افسر ہیں، عالی نسب، والا نسل اور خوب سیرت ہیں تو حکومت کا کاروبار متزلزل نہیں ہوگا، افراتفری نہیں پیدا ہوگی اور انتظامیہ کی ڈوریں نہیں ڈھیلی ہوں گی اور سلطان کو ان کے کارناموں کی وجہ سے آخرت میں سزا نہیں ملے گی۔ دوسری طرف اگر سلطان بذات خود اچھی خوبیوں سے متصف ہے اور خوف خدا اس پر غالب ہے لیکن اس کے مددگار، معاون، والی اور عامل بدیوں کا شکار ہیں تو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے امور انتظامیہ درہم برہم ہو جائیں گے۔ اور سلطان کو بھی بذات خود ان کے اقوال و افعال کی وجہ سے آخرت میں ذلت اٹھانا پڑے گی۔

ازمنہ قدیم وجدید کے تمام حکما اس حقیقت پر متفق ہیں کہ سلطان کے معاونوں، مددگاروں، اعلیٰ افسروں اور طرفداروں کی خوبیاں یا برائیاں بذات خود سلطان کی خوبیوں اور برائیوں (جیسی بھی صورت ہو) کی قابل تردید دلیل ہوتی ہیں۔ ایک سلطان جو خوبیوں سے متصف ہے اپنی فطرت اور خصلت کی وجہ سے کسی بھی ایسے شخص کو داخل نہیں کرے گا جو بدیوں کا شکار ہے۔ اسی طرح کمین خصلت سلطان اپنی فطرت کی وجہ سے کسی بھی باوصف شخص کو ایک آنکھ دیکھنا یا ایسے شخص کو اپنی ریاست کا مددگار، معاون یا اعلیٰ افسر بنانا برداشت نہیں کرے گا۔ کیوں کہ ایک ہی قسم سے تعلق خواہ وہ بدی یا نیکی انسانوں کے درمیان محبت، باہمی صحبت کی تمنا، خوش خلقی اور ہم آہنگی پیدا کرتا ہے جب کہ نیکی اور بدی متضاد ہیں اور مخالف بھی۔ اور خوبیوں اور بدیوں کے لحاظ سے برتر افسر کو اس کے چال چلن کے مطابق کام سپرد کیا جا سکتا ہے نہ کہ کمتر افسر کو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک باوصف شخص کسی بدچلن آدمی کو دیکھنا پسند نہیں کرتا یا ایک بدچلن کسی باوصف کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے ہیں اور دشمن ہی رہتے ہیں۔

کسراؤں کی حکومت کیومرث (ابن آدم) سے خسرو پرویز تک کافی طویل المدت ثابت ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ کسراؤں نے کسی رذیل، کم اصل یا بدقماش کو یا بدیوں میں گرفتار کسی شخص کو اپنے قریب کوئی جگہ نہیں حاصل کرنے دی تھی۔ وہ نااہلوں اور نااہلوں کے بیٹوں کو اپنے مددگاروں اور معاونوں کی حیثیت سے داخل خدمت نہیں کرتے تھے اور کیوں کہ کیومرث کے زمانہ سے وہ عالی نسب اور شاہی نسل سے تھے اور عظمت، بادشاہت، اعلیٰ رتبہ اور قیادت کی اہلیت ان کی رگوں اور نسوں میں سرایت کر چکی تھی لہٰذا ان کی حکومت کے افسروں میں اور اختیارات اعلیٰ میں ان کے شرکاء کار میں کوئی کمین یا کم اصل داخل نہیں ہو سکا بلکہ ان کے دربار کے احاطہ میں بھی نہ پھٹک سکا اور کیوں کہ وہ عالی نسب، بلند ترین اور بہترین لوگوں کو اپنا مددگار، معاون، طرف دار، خیر خواہ اور اپنے علاقوں کا

والی اور عامل بناتے تھے اس لیے شاہی اقتدار ان کے خاندان میں کئی ہزار سال تک رہا۔ ان کی ذاتی عظمت اور ان کی سلطنت کی عظمت دنیا کے عوام کے دلوں میں نقش ہو گئی تھی اور ان کے کارناموں کی ثناء و تعریف کتابوں میں درج کی گئی۔

اے فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام! تمھیں کچھ دن کی اپنی مجازی بادشاہت کے دوران اپنے اختیارِ اعلیٰ کے شریک کاروں اور اپنے معتبر افسروں کی حیثیت سے باوصف اشخاص کی تقرری کے انتخاب میں حقیقی شہنشاہ شہنشاہاں کی سنت کی تقلید کرنا چاہیے تاکہ ان کے کاموں کی وجہ سے تمھیں دنیا و آخرت میں عزت مل سکے۔ قادر مطلق صرف باوصف اور نیک سیرت اشخاص کو اپنی بارگاہ کی قربت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ وہ انھیں نبوت اور ولایت سے ممتاز کرتا ہے اور انھیں اعلیٰ رتبوں اور عظیم روحانی مدارج پر پہنچاتا ہے۔ وہ انھیں باعث احترام بناتا ہے اقبال دیتا ہے اور ممتاز اور بلند کرتا ہے وہ کسی ایسے شخص کو عرش الٰہی کے قرب میں کوئی مقام یا امتیاز حاصل نہیں کرنے دیتا جو بدقماش اور ناپاک ہے یا بدکاریوں اور رذالت کا شکار ہے جب بھی کوئی سلطان سعادت و اقبال مندی اور عقل کامل کا حامل ہوتا ہے تو اپنی کچھ دن کی حکمرانی میں وہ قادر مطلق کی سنت پر عمل کرتا ہے۔ وہ ملک کے باوصف، ہنرمند اور ذکی و فہیم اشخاص کو اپنی حکومت کے مددگاروں اور معاونوں کی حیثیت سے مقرر کرتا ہے اور مملکت کے اعلیٰ ترین اور بہترین افراد کو اپنے دربار کے افسران بالا کی حیثیت سے رکھتا ہے اور اپنی سلطنت کے صرف ممتاز اشخاص کو ولایت، عہدے اور رتبے تفویض کرتا ہے۔

اعلیٰ ترین اور بہترین افراد کے رہنما رذیلہ سلطان کے عملہ میں شریک ہونے سے تو اتفاق رائے نہیں کریں گے[۱] پھر بھی سلطان طرح طرح کی عنایات، مہربانیوں اور شفقت، خوش خلقی اور تحائف کے ذریعہ ملک کے منتخب اور چیدہ لوگوں کو اپنی ریاست کے خیر خواہوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کے لوگوں کو اسے رتبہ یا عہدہ میں ادنیٰ اور ناقابل لوگوں کے ماتحت نہیں رکھنا چاہیے۔ دانش مند سلطانوں نے ایک عام اصول کے تحت یا مخصوص صورتوں میں رذیل اور بے دین لوگوں کی جماعتوں سے دائمی نوعیت کے عمدہ یا نیک کارناموں کی کوئی توقع نہیں رکھی تھی۔ ان ادنیٰ لوگوں سے سلطان کو دنیا و آخرت میں کوئی عزت نہیں مل سکتی خواہ ان کی کامرانیاں ایک سو ہی کیوں نہ ہوں۔

---

[۱] یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس پر پہلے ہی گفتگو ہو چکی ہے کہ بیشتر صوفیاء کو ان کے اصول حکومت کے عملہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ عجم نوشیروان عادل نے اپنے جانشینوں کے لیے اپنی وصیت میں کہا ہے کہ اپنی حکومت کو ان سے آراستہ کرو جنھیں خدا نے آراستہ کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تم اپنے منتخب کیے ہوئے لوگوں کو صرف اس دنیا کے اسباب سے سجا بنا سکتے ہو، تم انھیں حقیقی حسن کی خوبیوں سے مزین نہیں کر سکتے ۔ تمہاری سلطنت کو تمہارے منتخب کیے ہوئے لوگ کبھی ٹھیک نہیں کر سکتے لیکن جنھیں خدا نے زینت بخشی ہے وہ تمہارے انتظامیہ کو منظم کر سکتے ہیں ۔

رکوفہ کی جامع مسجد میں ایک خطبہ میں امیرالمومنین حضرت علی اپنے ناخوش فوجی سپہ سالاروں کو باغی معاویہ کے خلاف کوچ کرنے کے لیئے جوش دلانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ سپہ سالار شام کی طرف کوچ کرنے میں سستی دکھا رہے تھے اور مہمل عذر پیش کرتے تھے ۔ ایک صحابی نے دریافت کیا" کوئی بھی مسلمان آپ کی خلافت کے جائز ہونے پر شبہ نہیں کرتا ہے پھر کیوں آپ کی خلافت ابوبکر اور عمر کی خلافتوں کی طرح مستحکم نہیں ہے ؟" امیرالمومنین نے جواب دیا" ایک مملکت کا استحکام اس کے معاونین پر منحصر ہوتا ہے ۔ ابوبکر کے اور عمر کے معاونین میں تمام مہاجرین و انصار اور ابوعبیدہ جراح، عثمان بن عفان، میں خود عبدالرحمن بن عوف، سعد بن وقاص، طلحہ، زبیر، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، عبداللہ مسعود، خالد بن ولید، معاذ بن جبل جیسے اشخاص تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی خلافتوں کے دوران ایک عالم اسلام کے پرچم کے نیچے آیا اور دین کی سرحدیں دور دراز علاقوں تک پہنچ گئیں، لیکن جیسے میرے معاون ہیں ان کی مدد سے کس طرح انتظامیہ کو مستحکم کیا جاسکتا ہے یا بغاوتوں کو کچلا جا سکتا ہے یا اسلامی ممالک کو مخالفین سے پاک کیا جا سکتا ہے ؛ تم انھیں اس مجلس میں ہی دیکھو ۔ معاویہ کے خلاف جس کی بغاوت پھیل چکی ہے، اس جنگ میں وہ ہر قسم کے عذر پیش کر رہے ہیں اور ہر غلطی کے مرتکب ہیں"

دیندار سلاطین نے اپنے مددگاروں اور معاونوں کے امتحان اور انتخاب میں کچھ اصولوں پر عمل کیا ہے اور وہ ان پر قائم رہے ہیں :۔

پہلا اصول تو یہ تھا کہ منتخب شدہ شخص ایسا ہو جس میں دین کی لگن دنیاوی سامان کی خواہش پر غالب ہو خواہ یہ غلبہ سوئی کی نوک کے برابر ہی کیوں نہ ہو ۔ اگر اس کی تمام تر کوششیں اس دنیا کے مال و اسباب کی تلاش میں لگی رہتی ہیں تو اسے سلطان کے مددگاروں اور معاونوں میں نہیں رکھنا چاہیے کیوں کہ اس صورت میں وہ دنیاوی امور میں بھی فائدہ مند نہیں ہوگا ۔ اس لحاظ سے دین دار سلاطین جو سب سے بڑی غلطی کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے مددگاروں اور معاونوں کے انتخاب کے وقت وہ صرف اپنے تئیں ان کی وفاداری اور خلوص کو ہی مدنظر رکھتے ہیں ابتدا سے ہی یہ سوچے بغیر کہ ایک انسان جس کی

وفاداری ان سے حاصل ہونے والے مادی فوائد پر منحصر ہے اور جو اسی لیے اس دنیا کا غلام ہے لہٰذا اس سے کسی ایسی چیز کی توقع نہیں کی جاسکتی جس کا آخری نتیجہ قابل تعریف ہو، وہ ایسے انسان کو حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز کرتے ہیں اور صرف اس کے اقوال و افعال سے اس کے اوصاف طے کر کے اس سے نیک کام، ایفائے عہد، اور اپنے لیے وفاداری دونوں کی توقع کرتے ہیں خواہ وہ اس وقت بارگاہ میں موجود ہو یا نگاہوں سے دور ہو۔ دین کے چمن میں ایسے درخت سے کوئی پھل نہیں توڑا جاسکتا جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور اس دنیا کی طمع میں ڈوبی ہوئی ہوں، اور ایک انسان جو دینی معاملات میں قابل اعتماد نہیں ہے۔ امور ریاست میں بھی قابل اعتبار نہیں ہوسکتا۔

دوسرے، منتخب شدہ شخص کو آزاد، شریف النسل اور والا النسب ہونے میں فوقیت حاصل ہونا چاہیے خواہ یہ فوقیت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو کیوں کہ کسی بھی مذہب، عقیدہ، عام تسلیم شدہ روایت یا ضابطۂ ریاست نے رذیل، کمین، کم اصل اور نااہل انسانوں کو حکومت کے مددگار و معاون بنانے کی اجازت نہیں دی ہے اگر کوئی کمین اور کم اصل ایک سو خوبیوں سے مزین ہو تب بھی وہ ملک کو توقعات کے مطابق نظم و ضبط میں نہ رکھ سکے گا یا قیادت اور سیاسی اعتماد کا اہل ثابت نہ ہوسکے گا۔

تیسرے، جب کوئی انسان حکومت کے افسر اور معاون کی حیثیت سے منتخب ہوچکا ہے اور رازہائے ریاست میں داخل ہوچکا ہے تو اسے سیاسی جرائم اور بغاوت کے علاوہ کسی دوسری چیز کے لیے سزا نہیں دینا چاہیے نااہلی، غفلت، بھول اور نجی امور پر توجہ (جن سے فرائض عامہ میں غفلت ہوجاتی ہے) ایسی بدعنوانیاں ہیں جن سے ریاست یا انسانی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا لہٰذا ان لغزشوں کی پاداش میں سزا دینا اچھا نہیں ہے۔

چوتھے سلطان کو اپنے مددگاروں اور معاونوں کی طرف ترقیوں، عنایتوں، مہربانیوں اور فیوض کے معاملات میں اعتدال برتنا چاہیے۔ ہمیشہ انھیں اپنی حیثیت کے مدارج میں ترقی کے لیے پرامید رکھنا چاہیے اور ان میں سے کسی کو بھی دفعتاً ایسا عہدہ نہیں عطا کر دینا چاہیے جس کے بعد سلطان کے منصب کے علاوہ کوئی بالا عہدہ نہ ہو۔ لیکن بالفرض سلطان اپنے معاونین میں سے کسی کی منصبی ترقی میں انتہائی عنایت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے بعد اسے اس شخص پر اکثر و بیشتر غصہ نہیں کرنا چاہیے نہ ہی اس کے ہر مشورہ کو مسترد کرنا چاہیے اور نہ ہی اس کی ذلت اور بے عزتی ہونے دینا چاہیے۔ کیوں کہ اگر ان افراد کے عزت و وقار کو ذرہ برابر بھی ٹھیس پہنچتی ہے جو ترتیب کے لحاظ سے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچ چکے ہیں تو ان کی وفاداری پائیدار نہیں رہتی اور بلکہ کم ہونے لگتی ہے جن افسروں سے اس طرح برتاؤ کیا جاتا

ہے ان کے ذہنوں سے سلطان کے لیے وفاداری مفقود ہوجاتی ہے۔ وہ خوشامدیوں کی طرح پیش آنا شروع کردیتے ہیں اور یہ حتمی نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ نیز اپنے کچھ معاونین کے لیے سلطان کی عنایات کی وجہ سے ان کے ہمعصروں اور رفیقوں کی وفاداری میں کمی آجاتی ہے، ان کی خودداری اور جذبۂ احترام کو گزند پہنچتی ہے اور اپنے رشک وحسد کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔

(اس نصیحت کے سلسلے میں فنٹر گیرالڈ کے 'عظیم شکاری' بہرام گور کے حوالہ سے ایک مثال دی گئی ہے۔ ہمیں یہ باور کرنے کے لیے مدعو کیا گیا ہے کہ آدم کے زمانہ سے دنیا کبھی اتنی خوش حال نہیں رہی تھی جتنی کہ بہرام کے عہد کے ابتدائی دور میں "حتیٰ کہ موت کی مصیبت بھی مفقود ہوچکی تھی، اور نتیجہ کے طور پر آبادی میں اتنا اضافہ ہوا کہ ایک ایسے ملک میں جو زیادہ تر صحرائی ہے" زائد آبادی کی وجہ سے مکان اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ انسان چھتوں چھتوں ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہیں اور حتیٰ کہ خواب میں بھی کوئی غیر تعمیر شدہ رقبہ نظر نہ آتا تھا"۔ . . . لیکن بہرام نے ایک ایسا وزیر مقرر کیا جو بدقماش، ظالم، وحشی، بے رحم، تباہ کن، کم ذات اور کم اصل تھا اور جیسی کہ توقع کی جاتی تھی اس وزیر نے ظالموں، بدقماشوں، گناہ گاروں، کذابوں، تخریب کاروں، اوباشوں، رذیلوں، کمینوں اور کم اصلوں کو ریاست کے معاون و مددگار اور ملک کے والیوں اور قاضیوں کی حیثیت سے متعین کیا۔" ان افسروں کی ناانصافی نے جانوروں اور پرندوں، درختوں اور لکڑی کے شہتیروں پر بھی اثر ڈالا" سپاہیوں کو تنخواہیں نہیں ملیں اور انھوں نے اپنی راہ لی اور حریفوں نے بہرام کی مملکت کی سرحدوں پر حملے کرنا شروع کردیے۔

بہرام نے پریشانی کے عالم میں ہندوستان اور اپنے ملک کے درمیان کے عظیم بیابان کو عبور کیا اور رائے قنوج کے عملہ میں داخل ہوگیا اور راؤتوں کے ساتھ اپنی تنخواہ لینے لگا۔ رائے بہرام سے متاثر ہوا اور اسے ایک نجی ملاقات کے لیے بلایا۔ بہرام نے اسے اپنے بارے میں ہر چیز بتادی۔ رائے اپنے تخت سے اترا، آداب وتسلیمات پیش کیے اور اسے اپنے تخت کے قریب نشست دی۔ اپنی بیٹی اس نے بہرام کی زوجیت میں دی، اسے تیس ہزار شہسوار اور تیس ہزار پیادے دیے اور بیش قیمت اشیاء کا ایک خزانہ، بیس ہاتھی اور دس ہزار گھوڑے بھی بطور تحفہ عطا کیے۔ اس نے بہرام کو اپنے ملک کو دوبارہ قبضہ میں لینے، وزیر اور اس کے رفیقوں کو قتل کرنے اور اس کے بعد عجم کے حکماء کو طلب کرکے کاتبوں کو ایسی خوبیاں قلم بند کرنے کا حکم دینے کا مشورہ دیا جو وہ حکماء، سلطان کے افسروں کے لیے ضروری اور مناسب خیال کرتے ہوں، نیز بہرام کو شراب، موسیقی اور شکار کو قطعی طور پر ترک کرنا ہوگا تاوقتیکہ اس کی حکومت مستحکم نہ ہوجائے۔ بہرام نے عجم پر دوبارہ فتح حاصل کرلی اور رائے کے مشورہ پر عمل کیا۔ عجم کے حکماء سلطان

کے افسروں کے لیے جو شرائط ضروری تصور کرتے تھے وہ برنی نے درج کی ہیں۔ یہ تعداد میں تقریباً ۱۲۰ ہیں (اگر نقل نویس کی تکراروں کو بھی شامل کر لیا جائے) اور ان میں فارسی زبان کے تمام ضروری اسمائے صفات شامل ہیں۔ کسی عملی مقصد کے لیے ایسی کوئی فہرست بے کار ہے۔[ا]

نصیحت ـ ۲۰

کسی کو سلطان پر فوقیت حاصل نہیں ہونا چاہیے

(ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نصیحت کا زیادہ تر حصہ تلف ہو گیا ہے اور یہاں موجودہ تیسرا پیراگراف ظاہرہ کسی ایسے شخص کا تحریر کیا ہوا ہے جس نے برنی کے گمشدہ صفحات کو قیاساً تکمیل کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ بے تکی سطروں کے بعد خیال ترک کر دیا۔ اپنی تاریخ فیروز شاہی اور موجودہ تصنیف کی دوسری نصیحتوں دونوں میں برنی ہمیں اس بارے میں کسی شبہ میں نہیں چھوڑتا ہے کہ عام طور سے سلطان ہر دو ذرائع سے فوقیت حاصل کی جاتی ہے یعنی خدمت اور وفاداری میں کارگزاری کے ذریعہ جو پرخلوص یا پرفریب ہو سکتی ہے لیکن سحر، عمل سفلی، کیمیاگری اور جنسی طاقت بڑھانے اور کوڑھ کے علاج کے لیے دواؤں سے کبھی کسی کو ایک فرماں روا پر تفوق حاصل کرنے میں مدد نہیں ملی ہے۔ دین الٰہی کی اصطلاح جو یہاں موجود آخری پیراگراف میں ملتی ہے عام طور سے اکبر کے جاری کردہ عقیدہ کے ضمن میں استعمال کی جاتی ہے۔ مجھے تلاش وجستجو کے بعد معلوم ہوا کہ برنی نے اسے کسی دوسری جگہ استعمال نہیں کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اکبر کے دین الٰہی کے اعلان کے بعد اس پیراگراف کا اضافہ کیا گیا ہو۔ بہر حال اکبر کے دین الٰہی کا مزدک کے مسلک سے کوئی تعلق نہیں ہے)

سلطان محمود کہتا ہے: اے محمود کے فرزندو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہت اس اختیار سے عبارت ہے جو ایک انسان کسی علاقہ پر طاقت اور زور سے حاصل کرتا ہے۔ وہ (موروثی حق کے تحت) اس کا مستحق ہو سکتا ہے اور اس طرح اپنی ایک ذاتی چیز کو برقرار رکھ سکتا ہے یا ہو سکتا ہے اس نے اسے غاصبانہ

[ا] بہرام گور۔ اس موضوع پر دوسرے لکھنے والے فردوسی، طبری وغیرہ بھی بہرام گور کو ہندوستان لاتے ہیں لیکن جس طرح روضۃ الصفا اس واقعہ کو بیان کرتی ہے وہ اسے ہندوستان میں مختلف طریقوں سے لائے تھے محض کسی افسانہ کی تحقیق کرنا بے سود ہے۔

طریقے سے اور بغیر کسی حق کے حاصل کیا ہو کہ بہر صورت وہ کسی ایک علاقہ پر اختیار حاصل ہونے کی وجہ سے سلطان کہلاتا ہے۔

اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر سلطان کے بیٹوں، اعلیٰ افسروں، بیویوں اور غلاموں میں سے کوئی فرد اس پر ایسا اثر حاصل کر لیتا ہے کہ سلطان اس کا مشورہ مسترد کرنے یا اس کی مرضی کے خلاف چلنے سے قاصر رہے تو صورت حال الٹ جاتی ہے۔ حاکم محکوم بن جاتا ہے، فائق ماتحت بن جاتا ہے اور حاکم کے اوصاف محکوم کی خصوصیات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ نیز جب بھی کوئی انسان سلطان پر ایسی فوقیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو بادشاہت واقعی معدوم ہو جاتی ہے (چھوٹی ہوئی جگہ)

مندرجہ ذیل طریقوں سے ایک شخص سلطان پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ کوئی بد دین اور بد مذہب جادو کے ذریعہ عمل سفلی کے ذریعہ، سحر یا کیمیاگری کا علم دے کر یا جنسی طاقت میں اضافہ یا کوڑھ کے علاج کی ادویات داسے فراہم کرنے) کے توسط سے سلطان پر اثر قائم کر سکتا ہے اس طرح کا انسان سلطان کو فریب دیتا ہے اور اسے موہ لیتا ہے اور خود اپنے دینی مسلک کی تبلیغ کرتا ہے۔ وہ سلطان کو گمراہ کرتا ہے اور اس کے ایمان کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔ اس طرح مزدک اباحتی نے نوشیرواں کے باپ قباد کو عمل سفلی اور سحر سے پھانسا دیا اور دین الٰہی کی اشاعت کی۔

(اس نصیحت کی مثال غدر السیر کی بنیاد پر ان مصائب سے دی گئی ہے جن میں امیر المومنین حضرت عثمان اپنے رشتہ داروں کے زیر اثر آجانے کے سبب گرفتار ہو گئے تھے اور جو بالآخر ان کی شہادت کا باعث ہوئے۔ برنی نے ان واقعات کا جو جائزہ لیا ہے اس کا ترجمہ کرنا ضروری نہیں ہے جن کا لب لباب خلفائے راشدین پر لکھی گئی کسی بھی تصنیف میں مل سکتا ہے۔

نصیحت - ۲۱

شریف اور رذیل کے بارے میں

یہ کہا گیا ہے کہ تمام انسان مساوی پیدا کیے گئے ہیں۔ شکل و صورت میں وہ ایک سے ہیں اور انسانوں میں جو بھی فرق رونما ہوتا ہے وہ ان کے کردار کی تاثیر اور ان کے اعمال کے ثمر کا مرہون منت ہوتا ہے۔ (لیکن برنی اس نظریہ مساوات سے اتفاق نہیں کرتا ہے ورا پنے ذاتی خیالات پیش کرتا ہے۔)

انسانوں کی خوبیاں اور خامیاں ازل کے وقت ہی تقسیم ہو چکی ہیں اور ان کی روحوں میں ڈالی

جا چکی ہیں۔ انسانوں کے اعمال و افعال احکام الٰہی کی رو سے ہوتے ہیں۔ جب بھی قادر مطلق کسی انسان میں شرافت یا شرارت، نیکی یا بدی ڈالتا ہے تو وہ اسے اس شرافت یا شرارت، نیکی یا بدی کے اظہار کی صلاحیت سے بھی مزین کرتا ہے۔

جب پہلی پشت کے دوران آدم کی اولاد پیدا ہوئی اور اس کی تعداد میں اضافہ ہوا اور دنیا آباد ہوئی تو انسانوں کو اپنے وجود کے لیے ہر چیز کی ضرورت پیش آئی۔ لہٰذا غیر فانی موجد نے انسانوں کے ذہنوں پر تمام مطلوبہ فنون کا القا کیا۔ کچھ ذہنوں کو ادب اور تحریر کے علوم سے تو کچھ کو شہسواری سے، اور دوسروں کو کپڑے بننے، دھات اور بڑھئی کے کام سے واقف کرایا۔ لہٰذا تحریر اور شہسواری سے لے کر بال کاٹنے اور چمڑے کے کام تک کے تمام لطیفہ اور عامیانہ فنون۔ ان خوبیوں اور خامیوں کے مطابق جو ان کی بنیادی فطرت کے تناسب سے ان کی روحوں کو دی گئیں۔ انسانوں کے ذہنوں اور سینوں میں منتقل کر دیے گئے۔ جنھیں خوبیاں دی گئیں ان کے ذہنوں کو ان کی لائق توصیف فطرت کی وجہ سے، لطیف صلاحیتوں سے فیضیاب کیا گیا جب کہ ادنیٰ چیزوں میں گرفتار ذہنوں کو، ان کی حقیر فطرتوں کی وجہ سے، صرف ادنیٰ ترین فنون سے باخبر کیا گیا۔ اس طرح فرشتوں نے انسانوں کے ذہنوں میں مختلف فنون کی استعداد پیدا کی اور انسانوں نے مختلف پیشے اختیار کیے اور ان پر عمل کیا۔ انسانوں کو جن فنون، صنعتوں اور پیشوں کے لیے روحانی طور پر سکھایا یا پڑھایا گیا وہ انھیں عمدگی سے کرتے ہیں اور وہ صرف اپنے مخصوص فنون ہی کو مناسب طریقے سے کرنے کے اہل ہیں۔

فنون لطیفہ اور عامیانہ ہنر کے لیے یہ استعداد موروثی ہوتی ہے۔ اسے جانشینوں نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں لیا اور ہر اگلی پشت میں جانشینوں نے اپنی تیز ذکاوت اور فراست سے اپنے بزرگوں کے پیشوں میں کچھ بہتر اور پسندیدہ چیزوں کا اضافہ کیا۔ اس طرح ہر فن، صنعت اور پیشے میں، جن کے ماحصل پر بنی نوع انسان منحصر ہے، کاملیت حاصل ہو گئی ہے۔

اور چوں کہ نفیس ترین پیشے اختیار کرنے والوں کو فضیلت ملی ہے، اس لیے صرف وہی ان اوصاف کے لائق ہیں جیسے مہربانی، فراخدلی، شجاعت، نیک اعمال، اچھے کام، صداقت، ایفائے وعدہ، دوسرے طبقات کی حفاظت، وفاداری، صحیح بصیرت، عدل و انصاف، اعتراف حقوق، اور جو عنایات حاصل ہوئی ہیں ان کے لیے ممنون ہونا اور خوف خدا۔ لہٰذا انھیں اشراف، آزاد، باوصف، دین دار، عالی نصب اور نجیب الطرفین کہا گیا ہے۔ صرف یہی جماعتیں اس سلطان کی حکومت میں عہدوں اور رتبوں کے قابل ہیں جو اپنے اعلیٰ منصب اور حاکم اعلیٰ ہونے کی وجہ سے انسانوں کا قائد اور سربراہ ہونے کی حیثیت

سے ممتاز ہے۔ ان کے کاموں کے سبب سلطان کی حکومت مضبوط اور آراستہ ہوتی ہے۔

دوسری طرف وہ کم اصل، جنھیں ادنیٰ ترین فنون اور حقیر ترین پیشوں کے لیے داخل فہرست کیا گیا ہے، صرف بدیوں ہی کے لائق ہیں جیسے گستاخی، دروغ بیانی، بخل، غبن، حرام کاری، جھوٹ، بدی برائی کرنا، احسان فراموشی، گندگی، ناانصافی، جبر، حقوق کا انکار، بے حیائی، بے غیرتی، خون بہانا، بدقماشی، عیاری اور بے دینی۔ پس انھیں کم اصل، بازاری، رذیل، کمین، نالائق، نیچ ذات، بے شرم اور ناپاک کہا جاتا ہے۔ ہر وہ کام جو حقارت سے آلودہ اور ذلت پر مبنی ہوتا ہے یہ لوگ بڑے ٹھاٹھ سے کرتے ہیں۔

اگر سلطان حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے دربار اور حکومت میں ان لوگوں کو رتبے دیتا ہے جن کی خلق میں ذلت اور شر پسندی صرف منقش ہی نہیں بلکہ جن میں آنے والی نسلوں میں مزید اضافہ ہوا ہے تب ایسی صورت میں ان کے کاموں کی وجہ سے سلطان کے دربار اور اعلیٰ منصب کی رسوائی ہوگی، خدا کی مخلوق پریشان اور منتشر ہو جائے گی، حکومت کے مقاصد حاصل نہیں ہوں گے اور بالآخر سلطان کو روز محشر میں سزا ملے گی۔ رذیلوں اور کم اصلوں کی ترقی سے اس دنیا میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ خالق کی حکمت کے خلاف کام کرنا گستاخی کے مترادف ہے۔ تمھیں خالق کی حکمت سے منحرف یا امور حکومت میں گستاخ نہیں ہونا چاہیے تمھیں اپنی ریاست کے عہدوں کو ان اشخاص سے آراستہ کرنا چاہیے جن پر خدا نے عنایت کی نظر کی ہے، جن کی روحوں کو اس نے خوبیوں سے متصف کیا ہے اور جنھیں خدا نے اس دنیا میں عمدہ رویے اور نیک کاموں کے لیے بھیجا ہے۔ عوام کے ساتھ ان کے عادلانہ اور منصفانہ طریقے اور نیک رویّے کے سبب تم اس دنیا میں نیک نامی اور آخرت میں نجات کی امید کر سکتے ہو۔

(اس جگہ ایک اور پیراگراف آتا ہے جس میں برنی نے بکثرت اسمائے صفات استعمال کرتے ہوئے فرماں رواکو، دونوں عالم میں اس کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف اشراف کو ہی حکومت کے عہدوں پر مقرر کرنے اور رذیلوں کو ان کے مقام پر رکھنے کی تاکید کی ہے "رذیلوں اور کم اصلوں کے اقوال و افعال کی وجہ سے اس دنیا میں اپنے لیے بدنامی یا آخرت میں پریشانی مول نہ لو۔ خدا کے بندوں کو ان کے حکم، امارت، حکومت، اور اختیار کا تابع نہ بناؤ۔ انھیں اپنے دینی اور انتظامی عہدوں کے نزدیک نہ پھٹکنے دو۔ کم اصلوں اور کمینوں کی مکاری اور چستی سے مسحور نہ ہو کیوں کہ ان کی خوبیاں نقلی ہیں اصلی نہیں'

اشراف اور رذیلوں کے بارے میں رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ "رگ دھوکہ میں ڈالنے والی ہے، یعنی اچھی رگ اور بری رگ نیکی اور بدی کی طرف کھینچتی ہیں۔ اس استعارہ کے معنی یہ ہیں کہ عالی نسب اور شریف النسل میں صرف نیکی اور وفاداری رونما ہوتی ہیں جب کہ کم اصل اور رذیل انسان سے صرف

شرارت اور تخریب ہی جنم لیتی ہیں۔

جہاں تک قرآن کے فرمان کی بات ہے کہ یقیناً تم میں سے جو متقی ہیں انھیں اللہ کے یہاں عزت ملی ہے، یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ نجس اور نجس ذات اور کمین اور کم اصل میں تقویٰ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک رذیل بازاری انسان میں تقویٰ دکھائی دے تو سمجھو یقیناً اس کے بزرگوں کا خون شریف خون سے مخلوط ہو گیا ہو گا۔[1]

اے محمود کے فرزندو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قدیم اور جدید حکماء اور دانش مندوں کی اکثریت نے مشاہدہ اور تجربہ کی بنیاد پر واضح طور پر یہ اعلان کیا ہے کہ کم اصلوں اور رذیلوں نے انتظامیہ کے عظیم فرائض بخوبی انجام نہیں دیے ہیں اگر کوئی کم ذات فرماں روا بن گیا ہے تو اس نے ہر ممکن طور پر کم اصلوں اور رذیلوں کو چڑھانے اور عالی نسبوں کو گرانے کی کوشش کی ہے۔ کم اصلوں کا آخری کام کبھی کسی اچھائی پر ختم نہیں ہوا ہے۔ اور وہ کسی بھی مشکل صورت حال میں وفادار ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ گو کہ کچھ سلطان کمین اور کم اصل انسانوں کی خوشامد پسندی، ظاہرہ ذہانت اور عیاری سے مسحور ہو گئے ہیں اور ان لوگوں کو اپنی سلطنت کا رفیق کار اور معتبر افسر بنا لیا ہے۔ پھر بھی اس دنیا میں، اپنی زندگی کے دوران اور اپنی موت کے بعد دونوں صورتوں میں[2] انھیں ان سے اتنی ذلتیں اور گزندیں پہنچی ہیں کہ ابد تک ان کے ذہنوں سے ان کے تقرر پر پشیمانی کم نہیں ہوگی۔

نیز اگر کمین حقیر، رذیل اور خسیس بہ بازاری لوگوں اور بزدلوں کے اعلیٰ عہدوں کی مسندوں پر فائز ہوئے اور اپنے مقصد میں کامیاب رہے تو اس اصول کے پیش نظر کہ ہر جماعت کا میلان اپنی ہی طرف ہوتا ہے، وہ اپنی ہی قسم کے لوگوں کو اپنے مشورات اور اپنے حکم و ہدایت کے کام میں اپنا مددگار، معاون، رفیق، اور دستگیر بنائیں گے۔ وہ کم ترین اور رذیل ترین لوگوں کو اپنا شریک اور بے تکلف دوست بنائیں گے اور اپنے

---

[1] قرآن، سورہ ۴۹، آیت ۱۳۔ یہ قرآن کی بنیادی آیات میں سے ایک ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ متقی مسلمان دوسرے تمام ملحوظات کو بالائے طاق رکھ کر، خدا کے قریب ترین ہیں۔ برنی کا یہ دعویٰ کہ صرف اشراف مسلمان اس کی طرح کے متقی ہو سکتے ہیں ان لاتعداد مثالوں میں سے ایک ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکمراں طبقوں اور مصنوعی اسلامی نظریہ کے مفاد میں جو حکمراں طبقہ کی تائید میں گڑھا گیا تھا، کس طرح اسلام کے بنیادی اصولوں کا بے شرمی سے غلط مطلب نکالا جا رہا تھا (ح)

[2] مطلب یہ ہے کہ ان کی موت کے بعد ان کے خاندانوں کو حوادث کا شکار ہونا پڑا، جس طرح کہ علاؤالدین خلجی اور مبارک خلجی کے سلسلہ میں دیکھا گیا۔

انتظامی اختیارات کا حصہ بجزہ ان ہی کو تفویض کریں گے۔ وہ اپنی فطرت اور خصلت کی وجہ سے اشراف وآزاد اور باوصف انسانوں کو اپنی حکومت کے امور کے قریب بھی نہیں آنے دیں گے۔ نیز انھیں اپنا دشمن تصور کریں گے اور دشمن بنائے بھی رکھیں گے۔ وہ اشراف سے سخت نفرت کرتے ہیں اور ان کی تذلیل و معزولی کے لیے جان و دل سے کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک رذیل اور کم اصل انسان کی ترقی کے باعث بہت سے رذیل اور کم اصل انسان عہدے حاصل کرلیں گے اور اس لحاظ سے عزت و احترام سے دیکھے جائیں گے۔ ان کم اصل انسانوں کے اقوال وافعال کے نتیجہ میں انتظامیہ کے کاروبار میں بہت سے رخنے پیدا ہوں گے۔ لاتعداد لائق احترام اور قابل توصیف اشخاص کی بے عزتی ہوگی اور ان کی کوئی قدر و منزلت نہ ہوگی۔ اشراف و آزاد کے رتبے گرائے جائیں گے اور ان پر ظلم کیے جائیں گے۔ کمینہ پن کا مظاہرہ کیا جائے گا، خوبیوں کو کچلا جائے گا اور انھیں کہیں روپوش ہونے پر مجبور کیا جائے گا۔

(یہاں مصنف ایک مرتبہ پھر ایک قدرے طویل پیراگراف میں صفاری برادران یعقوب بن لیث اور عمر بن لیث کا ذکر کرتا ہے لیکن اس مرتبہ وہ تاریخ خراسان کو بطور سند پیش کرتا ہے۔ دونوں بھائیوں پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے صرف کم اصلوں ہی کو اپنی خدمت میں داخل کیا۔ ان کے دور اقتدار میں اشراف وآزاد نے خراسان چھوڑنا اور مختلف سمتوں میں نقل وطن کرجانا ضروری سمجھا۔ لیکن پھر بھی ان کی مصیبت کی گھڑی میں وہ کم اصل انسان جنھیں صفاری برادران نے ترقی عطا کی تھی، اپنے مربیوں کے وفادار ثابت نہیں ہوئے۔ وہ کم اصل انسان اور بازاری لوگ، جو دونوں بڑھئی بچوں کے مددگار، معاون، افسر اور دستگیر رہ چکے تھے، سامانیوں کی جانب سے ان کے خاندانوں، پیروکاروں، بیویوں اور بچوں کا خاتمہ کرنے کے لیے سرگروہ بن گئے)

(اس نصیحت کے سلسلے میں محمود غزنوی سے منسوب ایک جعلی حکایت کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ سلطان نے غزنی کے گردو نواح میں داخل ہوتے وقت تقریباً پچاس یا ساٹھ عورتوں کو دیکھا وہ چیتھڑے پہنے ہوئے تھیں انھوں نے اپنی زلفیں ہاتھوں میں پکڑ کر داد و فریاد کی" انصاف کرو! انصاف کرو!" ان کی شکایت وزیر اسفرائینی کے خلاف تھی[1] "اس نے چھ ماہ تک دیوان وزارت کے قید خانہ میں ہمارے بیٹوں، بھائیوں اور شوہروں کو بند رکھا ہے، وہ کسی جواز کے بغیر ان سے سختی سے پیش آتا ہے، اس نے ان سے وہ تمام چیزیں چھین لی ہیں جو ان کے پاس تھیں اور ٹھوکروں اور کوڑوں کے زور سے اور بھی زیادہ

---

[1] اسفرائینی کے دور عمل کے لیے اس نصیحت کے اختتام پر نوٹ دیکھیے۔

کا مطالبہ کر رہا ہے")

(محمود نے حکم دیا کہ عورتوں کو خالی مکان میں رکھا جائے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا جائے۔ تمام رات محمود سانپ کی طرح بل کھاتا رہا۔ اس نے سوچا اگر غزنی کی یہ حالت ہے جہاں میں خود رہائش پذیر ہوں تو دور افتادہ مقامات کا کیا حال ہوگا"؟ اس نے الزام ثابت ہونے پر اسفرائینی کے خلاف سخت اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا۔

(اگلی صبح محمود نے ایک مجلس یا محضر طلب کیا۔ عورتوں نے اپنی شکایتوں کا اعادہ کیا۔ محمود نے اسفرائینی کو حکم دیا کہ وہ عورتوں کے مقابل کھڑا ہو اور ان کے الزامات کے جواب دے۔ اسفرائینی نے مسکراتے ہوئے اور بغیر پریشان ہوئے جواب دیا۔"اگر ان عورتوں نے سلطان سے کی ہوئی میرے خلاف شکایتوں کا ایک سوواں حصہ بھی ثابت کر دیا تو میں اپنے لیے سزائے موت کو جائز سمجھوں گا"۔ لیکن اس نے یہ دعویٰ کیا کہ محض عورتوں کی شکایت کافی نہیں ہے، اصل شکایت کرنے والوں کو۔ ان کے مرد رشتے داروں کو سامنے لانا چاہیے۔ مجلس کے ممتاز اشخاص وزیر سے متفق تھے لہٰذا محمود نے قیدیوں کو طلب کیا۔

(لیکن جب قیدی سلطان کے سامنے پیش کیے گئے تو ان کے سر شرم سے جھکے ہوئے تھے اور کافی وقت گزر جانے کے بعد وہ صرف یہ جواب دے سکے کہ وزیر نے ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔۔۔ ہمارے اوپر دیوان وزارت کی رقم واجب الادا تھی اس لیے ہم بیڑیاں پہنے ہوئے ہیں۔ محمود نے ان سے سوال کیا آیا اسفرائینی ان سے اس رقم کا مطالبہ کر رہا تھا جو انھوں نے محصول گزاروں سے وصول کی تھی یا ان سے اپنی تنخواہوں میں سے دینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے قصور کا اعتراف کیا، ہم نے اپنے تمام مطالبات بھتے اور تنخواہیں وصول کر لی ہیں۔ یہ رقم ہم پر اصل مال سے واجب الادا ہے)

سینیر قیدیوں نے اقبال جرم کرتے ہوئے کہا کہ ان میں سے ہر ایک پر پچاس ہزار، ساٹھ ہزار اور ستر ہزار کی رقمیں واجب الادا ہیں) اور یہ کہ انھوں نے یہ رقمیں اپنے قرض خواہوں کو دینے، اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی شادیوں، گناہ اور بے اتفاقی، اور اپنی نمود میں خرچ کی ہیں تاکہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادیاں مفلس اشراف کے ساتھ کر سکیں)

(وزیر کی درخواست پر ان لوگوں کی نسل کے بارے میں تحقیقات کی گئیں اور یہ دریافت کر لیا گیا کہ وہ مے فروشوں، قصائیوں اور جلاہوں کی اولاد تھے۔ اسفرائینی نے اپنے کیے ہوئے تقررات کے لیے معافی چاہی۔"انھوں نے برسوں میری خدمت کی اور اپنے کو اہل ثابت کیا۔ انھوں نے میری آنکھوں کے سامنے میرے ہر حکم کی بڑی چستی سے تعمیل کی۔ میں ان کی مکاری کے فریب میں آ گیا اور ان کی اصل اور نسل

کے بارے میں احتیاط نہیں برتی۔ میں اس غلطی کے لیے ایک جرمانہ قبول کرتا ہوں اور وہی کروں گا جس کا حکم ہوگا۔ محمود نے قیدیوں کو بری کر دیا لیکن اس نے ان سے ایک اقرار نامہ لکھوالیا کہ وہ مستقبل میں دیوان وزارت کے نزدیک نہیں آئیں گے، نیز وہ اپنے سروں سے ان فضول فنون کو اتار پھینکیں گے جو انھوں نے سیکھ رکھے ہیں اور اپنے کو کاشت کے لیے وقف کر دیں گے اور باقی زندگیاں دیہاتیوں کی طرح ہی گزاریں گے۔

سلطان محمود کے پہلے وزیر عبد العباس اسفرائینی پر ایک نوٹ:۔

برنی کے ساتھ دقت یہ ہے کہ وہ سلطان محمود کے کچھ افسروں کے صرف ناموں سے واقف ہے اور وہ بھی پورے ناموں سے نہیں۔ اس کے علاوہ وہ ان کے کام یا دور عمل کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ برنی کی یہ مثال بے معنی ہوگی جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ اسفرائینی نے محمود کی کافی عرصہ تک خدمت کی تھی۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ عامل چھ ماہ تک قید میں رہے اور اسفرائینی یہ اعتراف کرتا ہے کہ وہ ان کے تقرر کے لیے ذمہ دار تھا اور یہ کہ انھوں نے برسوں وفاداری سے اس کی خدمت کی تھی۔ لیکن اسفرائینی محمود کے عہد کے پہلے دو سالوں کے دوران ہی اس کا وزیر تھا اور جس طرح اس کو معزول اور پھر قتل کیا گیا (کیونکہ اسے کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا) وہ محمود کو زیب نہیں دیتا۔

سلطان محمود کے وزیروں کے بارے میں اپنے پر احتیاط ذکر میں حبیب السیر کا مصنف (فارسی، جلد ۲، ص ۱۴۰) لکھتا ہے "تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ ابو العباس فضل احمد اسفرائینی سلطان محمود کا پہلا وزیر تھا اپنے پہلے دور عمل میں ابو العباس .... ایک سامانی امیر فائق کا معتمد اور نائب تھا۔ لیکن جب فائق کے اقبال کا آفتاب غروب ہونا شروع ہوا تو ابو العباس امیر سبکتگین کی ملازمت میں داخل ہو گیا اور اس کا وزیر بن گیا۔ سلطان محمود نے اپنے باپ کا جانشین بننے کے بعد اسے اس کے عہدہ پر برقرار رکھا۔ ابو العباس فضیلت یا علم میں ممتاز نہیں تھا لیکن اس نے امور حکومت کا انتظام کرنے اور فوج اور رعیت کی نگہداشت میں بڑی خوبی کا مظاہرہ کیا لیکن دو سال کے بعد اس کا ستارہ روبہ زوال ہوا۔ اور محمود نے اسے برطرف کر دیا۔ کچھ مورخین نے اس کی معزولی کا سبب اس طرح بیان کیا ہے۔ سلطان محمود خوب صورت غلاموں کا بڑا شائق تھا اور فضل بن احمد اس معاملہ میں اس اصول پر عمل پیرا تھا کہ 'انسان اپنے سلطانوں کے مذہب کی تقلید کرتے ہیں'۔ فضل نے ترکستان میں کسی مقام پر ایک غیر معمولی خوب صورت لڑکے کے بارے میں سنا۔ اس نے اپنے کارندہ کو وہاں بھیجا اور کارندہ نے لڑکے کو خرید لیا اور اسے ایک لڑکی کے لباس میں غزنی لے آیا۔ محمود نے کسی فتنہ پرداز سے یہ خبر سنی اور ترکستانی لڑکے کو مانگنے کے لیے وزیر کے پاس ایک آدمی بھیجا۔ فضل نے حقیقت سے انکار کر دیا۔ محمود کو اسفرائینی کے مکان پر جانے کا ایک اور موقعہ مل گیا اور اسفرائینی نے احترام اور خاکساری

سے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اسی وقت محمود کی آنکھیں ترکستان لڑکے پڑ گئیں اور اس طرح اس کو اسفرائینی کا مال و اثاثہ لوٹنے اور ضبط کرنے کا عذر مل گیا۔ اس کے فوراً بعد محمود ہندوستان کی طرف ایک مہم پر چل پڑا اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے سنگ دل افسروں نے ابوالعباس سے اس کا تمام مال و اسباب چھیننے کی کوشش میں اسے اتنی ایذائیں پہنچائیں کہ اس کی موت واقع ہوگئی۔ جامع التواریخ جلالی کے مطابق ابوالعباس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام حجاج تھا جو اپنے ہم عصروں میں اپنے علم کے لیے ممتاز تھا اور رواں غزلیں کہتا تھا اور ایک بیٹی بھی جس سے انھوں نے روایتیں نقل کی ہیں۔" (ح)

نصیحت۔ ۲۲

سلطان کے پرانے خاندانوں کے تحفظ کے فوائد کے بارے میں

یہ نصیحت درحقیقت دو مسائل سے متعلق ہے، شاہی خاندان کی غیر استقلالی اور حکمراں طبقہ کی غیر استقلالی۔ برنی جس کا یہ خیال تھا کہ ہر شخص کو اپنے بزرگوں کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے مجبور کیا جائے، پہلی خرابی دور کرنے کے لیے کوئی تجویز پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ترائن کی دوسری جنگ کے بعد سے شمالی ہندوستان پر چھ شاہی خاندان حکومت کر چکے ہیں، غوری، قطبی، شمسی، بلبن، خلجی اور تغلق۔ پہلے خاندان کے علاوہ ان میں سے کوئی بھی خاندان کسی معزز شاہی نسل سے وابستگی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن عام طور سے ایک شاہی خاندان کی تبدیلی کا مطلب سابق شاہی خاندان کے حکمراں طبقہ کا خاتمہ اور ایک نئے حکمراں طبقہ کی تشکیل ہوتا تھا جس پر نیا شاہی خاندان اعتماد کر سکے۔ برنی اس اتفاقی صورت کو سمجھنے میں ناکام رہا ہے جب کہ سلطان نے حکمراں طبقہ پیدا نہیں کیا تھا بلکہ حکمراں طبقہ نے سلطان منتخب کیا تھا جس طرح دکن کے افسروں نے جنھوں نے محمد بن تغلق کے خلاف بغاوت کی تھی یکے بعد دیگرے دو سلطان منتخب کیے۔ برنی نے اس پوری تصنیف میں سلطان کے ساتھ ایک ایسا اختیار منسوب کیا ہے جسے سلطان شاذ ہی استعمال کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ یہ کہتا ہے کہ حکمراں طبقہ خالصتاً سلطان کی تخلیق تھا۔ برنی اس سے شاید ہی انکار کر سکتا تھا کہ اسلامی ممالک کی تاریخ جیسی اور جتنی بھی وہ جانتا تھا اس کے اس نظریہ کی تائید نہیں کرتی تھی کہ خدا نے دو درجوں کے نفوس پیدا کیے ہیں۔ یعنی ایک وہ جو حکم کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو حکم بجا لاتے ہیں لیکن یہاں جو نصیحت کی گئی ہے وہ صرف اس سوال کے متعلق ہے کہ معزول کیے ہوئے حکمراں طبقے کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔ برنی اپنی پہلی مثال میں اس کا جواب تلاش کر لیتا ہے۔ سابق حکمراں طبقہ کو اس کے سیاسی اختیارات سے محروم کیا جائے لیکن اس کی مادی مرفہ الحالی سے نہیں۔ لیکن برنی کے خود اپنے پرزور بیان کی روشنی میں کہ جنھیں طاقت و اختیار

سے محروم کردیا گیا ہے وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جانشینوں کا خاتمہ نہیں کردیتے یا ان کے ہاتھوں پوری طرح فنا نہیں ہوجاتے ہیں۔ یہ بات مشتبہ ہوجاتی ہے کہ آیا اس کی تجویز اس کے زمانہ میں قابل عمل ہوسکتی تھی۔ اسے کبھی آزمایا نہیں گیا)

یہ کہا گیا ہے کہ قدیم ایام اور قدیم زمانہ میں بادشاہت عجم، روم، یمن، ہند، شام اور مصر کے شاہی خاندانوں تک محدود تھی اور کسی دوسری جماعت کے اراکین کے دل میں تخت غصب کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔ [1] چنانچہ عجم میں عوام کسی ایسے فرماں روا کی اطاعت نہیں کرتے تھے جو کسراؤں کے شاہی خاندان سے متعلق نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح روم میں اگر کوئی فرماں روا قیصروں کے خاندان سے نہیں ہوتا تو رومی نہ تو اس کے آگے اپنا سر جھکاتے اور نہ ہی اس کی اطاعت کرتے۔ جب بھی عوام میں یہ اصول کئی نسلوں اور عصروں کے بعد مقبول اور مروج ہوجاتا ہے تو غصب کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ کسی بھی دوسری جماعت کا کوئی فرد شور و ہنگامہ نہیں کھڑا کرسکتا اور طاقت کے ذریعہ ملک پر قبضہ نہیں کرسکتا نیز کیوں کہ قدیم دور میں بادشاہت موروثی ہوا کرتی تھی۔ اور جب ایک سلطان مرجاتا تھا تو اس کے بیٹوں میں سے کوئی ایک حق وراثت اور اپنے باپ کے ذریعہ کی ہوئی نامزدگی کی رو سے اس کا جانشین ہوجاتا تھا۔ نیا سلطان لازمی طور پر ریاست کے تمام سابق مددگاروں اور معاونوں کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھتا تھا اور نہ تو کسی رہنما کو اور نہ ہی کسی قبائلی یا خیلی سردار کو کوئی تکلیف پہنچاتا تھا۔

---

[1] یہی خیال برنی تاریخ فیروز شاہی (ص ۱۷) میں پیش کرتا ہے۔ "کیمرث سے لے کر خسرو پرویز تک عجم کے کسراؤں کے دیوانوں میں بادشاہت نسل بہ نسل بادشاہوں کو جاتی تھی، وزارت وزیروں کی نسل میں رہتی تھی۔ ملک کا عہدہ نسل در نسل ملکوں کو جاتا تھا اور امارت بھی نسلاً امیروں کو جاتی تھی۔" لیکن شاہ نامہ اور تاریخ طبری جیسی تواریخ عالم کی بنیاد پر بھی جو برنی کی دسترس کے اندر تھیں اس طرح کی تشریح لغو تھی۔ چنانچہ صرف عجم ہی میں (معمولی انقلابوں کو نظر انداز کرتے ہوئے) ایسا کہا جاتا ہے کہ ضحاک نے پیش دادیوں کو معزول کیا، ضحاک کو فریدوں نے، فریدوں کے کیانی خاندان کو سکندر نے، سکندر کے جانشینوں کو پارتھیوں (اشکانیوں) نے اور پارتھیوں کو اردشیر بابکان نے لیکن برنی پر یہ خیال اتنا مسلط ہے کہ ہر دور میں تمام عہدے نسل کی بنیاد پر تفویض ہونا چاہئیں کہ وہ یہ فراموش کردیتا ہے کہ اس نے خود اپنے نظریہ سے متضاد حقائق بیان کیے ہیں۔ مثلاً بہرام گور کولے کر بیان کی ہوئی مثال ہی لے لیجیے۔ (ح)

یہ طریقہ اور رواج انتہائی پسندیدہ تھا لیکن ان شہنشاہوں کے دورِ حکومت کے خاتمہ کے بعد جن کے خاندانوں میں بادشاہت مستحکم ہو چکی تھی۔ بادشاہت غضب اور طاقت کے زور سے قائم ہوئی اور سلطانوں کی اصل اور نسل پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کوئی بھی شخص جو کسی بھی طرح ضروری اثر، طاقت اور پیرو حاصل کر سکتا تھا وہ ملک پر اپنا اقتدار قائم کر سکتا تھا، اس کے سابقہ حکمراں کا خاتمہ کر سکتا تھا اور شاہی اختیار پر قبضہ کر کے اپنے کو سلطان کہلوا سکتا تھا۔

الحاصل جب بھی کوئی غاصب بادشاہت حاصل کرتا ہے تو لازمی طور پر اس کے طرف دار، دستگیر، خیرخواہ اور مصاحب اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے جو پہلے ہی اس کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں اور بھی زیادہ قبیلے اور خاندان اس کی حمایت میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ تقریباً کم و بیش پچاس ہزار افراد مرد اور عورتیں، بوڑھے اور جوان، غلام اور نوجوان اس کی شاہی عنایات کے باعث ایک دل اور ایک زبان ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کی حکومت کے ستون بن جاتے ہیں اور ان کے تعاون سے اس کے لیے حکومت کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

غرضیکہ بادشاہت اس خراب طریقہ سے از سر نو شروع ہوئی اور یزیدیوں اور مروانیوں کے زمانہ سے عالم اسلام کے سلاطین میں مروج ہو گئی۔ اگر کوئی سلطان قدرتی موت سے تخت سے ہٹ جاتا یا قتل کر دیا جاتا اور کوئی دوسرا سلطان موروثی حق کے ساتھ یا اس کے بغیر ہی تخت پر بیٹھتا تھا تو اس کے لیے اس وقت تک اطمینان سے حکومت کرنا ممکن نہیں ہوتا تھا جب تک کہ وہ سابق سلطان کے مددگاروں، معاونوں، قبیلوں اور خاندانوں کو ختم نہیں کر دیتا، ان کے بال و پر کاٹ نہیں دیتا اور ان کی جگہ اپنے ذاتی طرف داروں کو مستحکم نہیں کر لیتا۔

دوسری طرف اگر وہ پہلے سلطان کے طرف داروں اور معاونوں کو برقرار رکھتے اور ریاست میں انھیں ان کے عہدوں اور رتبوں پر بدستور قائم رکھتے تو وہ اس کی حکومت کے دست گیر نہیں بنتے تھے بلکہ درحقیقت اس کی تباہی اور بربادی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ انھیں نئے سلطان پر کوئی اعتماد نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی نیا سلطان ان پر بھروسہ کرتا تھا اہل دانش مشاہدہ اور تجربہ کی بدولت مذکورہ بالا مصیبت سے واقف ہو چکے ہیں۔

مسلمانوں میں یہ مصیبت اموی سلطانوں کے ذریعہ آئی جو یزیدی اور مروانی کہے جاتے ہیں۔ صحابۂ کرام کے دور میں اسلامی ممالک کی حکومت پر اپنے بیش روؤں کے ذریعے کیے گئے تقرر اور عوام کے اتفاق رائے کی رو سے خلفائے راشدین کا حق تھا۔ امیر المومنین حضرت علیؓ سے خلافت امیر المومنین حسنؓ ابن علیؓ کو ملی۔ علیؓ اور حسنؓ

بنی ہاشم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے. معاویہ، یزید اور مروانی صرف اسی سال حکومت کر سکے کیوں کہ انھوں نے اپنے اختیار میں موجود ہر ممکن طریقے سے بنی ہاشم اور ان کے دستگیروں اور خیر خواہوں کو زیر کیا اور انھیں کچلا اور پس دنیا اور آخرت میں روسیاہ ہوئے۔ اسی طرح بغداد میں خلافت عباسیہ اس وقت تک مضبوطی سے قائم نہیں ہوئی جب تک کہ ابومسلم مروزی نے اموی سلطانوں سے اہل بیت کرام کا بدلہ نہیں لے لیا اور معاویہ، یذید اور مروانیوں کے معاونوں کو مکمل طور پر برباد اور نیست و نابود نہیں کر دیا۔

محمود کہتا ہے: اے فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام! اگر تم دین محمد سے وابستگی کا دعویٰ کرتے ہو اور اپنے کو مومن اور مسلمان تصور کرتے ہو تو تم بادشاہت کے اس رواج کو ایک مہلک آفت اور مصیبت سمجھو. کھلے دماغ سے اس پر غور و فکر کرو کہ کس طرح یہ خراب طریقہ اور نقصان دہ رواج عالم اسلام کے سلاطین میں رائج ہو گیا۔ پہلے وہ بغیر کسی خارجی یا داخلی حق کے کسی علاقہ پر قبضہ کرتے ہیں. اس کے بعد اپنی سیاسی یا مذہبی مصلحت کے سبب سے دار الخلافہ سے اس غضب اور فتح کے لیے سند حاصل کرتے ہیں. اس کے علاوہ محض اپنی زندگیوں کی بقا اور تحفظ کے لیے جنھیں ہر حال میں فنا ہونا ہے، اپنے بس بھر طریقوں سے وہ سابق سلطان کے خاندانوں خیلوں اور قبیلوں کو مفلسی اور مصیبت میں ڈال دیتے ہیں، کچھ کی وہ جان بخش دیتے ہیں تو باقی دوسروں کو قتل کر دیتے ہیں. بعض کو وہ قید کرتے ہیں. بعض کو جلاوطن اور بعض کچھ کو ان کے مال و اسباب سے محروم کر دیتے ہیں۔ اپنے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے وہ اسلام یا مسلمانوں کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتے اور ان کے ذہنوں میں اس جواب کا گزر نہیں ہونے پاتا جو انھیں روز محشر میں دینا ہوگا. اس طرح کے 'خاتمہ' کو وہ سیاسی مصلحت کا نام دیتے ہیں۔

بادشاہت کی چاہ اور تمنا انھیں اتنا اندھا کر دیتی ہے کہ وہ کبھی تھوڑی دیر کے لیے بھی اس پر غور نہیں کرتے کہ اگر وہ کسی سیاسی یا شرعی جرم کے بغیر دوسرے کے بیویوں، بچوں، قبیلوں، پیروؤں، دوستوں اور خیر خواہوں کو ختم کرتے ہیں اور اس طرح کے (غلط) رواج کی پیروی کرتے ہیں، تو جو شخص ان کی جگہ لے گا وہ بھی پلٹ کر وہی کرے گا جو وہ کر چکے ہیں. لہٰذا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ بے دینوں کے طریقوں اور رواجوں کو روا رکھ کر دراصل انھوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے خاندانوں، پیروکاروں اور حمایتوں کو ختم کر دیا ہے. معصوموں کو ختم کر کے وہ کیسے برے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، نہ وہ، نہ ان کی طاقت اور نہ ہی ان کے معاون اس منصوبہ کے سبب، جسے وہ 'سیاسی مصلحت' کا نام دیتے ہیں، ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید رہیں گے. لیکن انھوں نے جن کو تباہ کیا ہے اس کا گناہ روز محشر میں ان کی گردنوں پر رہے گا.

پرانے خاندانوں کا خاتمہ کرتے وقت جو سلطان انھیں ختم کرتا ہے اپنی زبان حال سے گویا یہ کہتا ہوا!

محسوس ہوتا ہے کہ جو سلطان میرا جانشین بنے اسے میرے معاونوں اور پیرو کاروں کو اسی طرح ختم کرنا چاہیے جس طرح کہ میں نے اپنے سے پہلے کے معاونوں اور پیرو کاروں کو ختم کیا ہے. اگر وہ اس طرح نہیں کرتا ہے تو میرے پیرو کار اسے ایک دن بھی حکومت نہیں کرنے دیں گے. اسے 'سیاسی مصلحت' کا اتنا ہی پاس رکھنا چاہیئے جتنا کہ میں نے رکھا ہے. (چھوٹی ہوئی جگہ)

سلطان کو محض شبہ کی بناء پر اتنے زیادہ خاندانوں کو ختم نہیں کرنا چاہیے. اسے چند دن کی بہبود کی خاطر اپنی زندگی اور مال کے دشمنوں کو روز محشر میں اپنے خلاف شکایت کرنے کے لیے تیار نہیں کرنا چاہیے. اسے دنیا کی پرستش کرنے والے علماء کے فریب میں نہیں آنا چاہیے جو خدا اور رسول کے احکامات کے خلاف ایسا فتوٰی دیتے ہیں جو ریاست کی مصلحت کی خاطر سلطان کو مسلمانوں کو قتل کرنے اور قید میں ڈالنے کا مجاز بنا دیتا ہے. وہ صاحب بصیرت ہے تو اسے کم از کم یہ تو محسوس ہوگا کہ دوسرے بھی پلٹ کر اس کے بیٹوں، بیویوں، دستگیروں اور معاونوں کے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جس طرح اس نے دوسرے خاندان اور پیرو کاروں کے ساتھ اختیار کیا ہے اور یہ کہ وہ وہی کھیل کھیلیں گے جو اس نے کھیلا ہے (چھوٹی ہوئی جگہ)

جس وقت کوئی نیا سلطان اپنے چند بہت زیادہ خیر خواہوں کو مجلس خلوت میں اپنے روبرو جگہ دیتا ہے تو دل کو کتنا اچھا اور خوش گوار محسوس ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک اپنے ہاتھوں میں سیاہی، قلم اور کاغذ سنبھالتا ہے، تاکہ ان کی فہرست تیار ہو جنھیں ختم کرنا ہے. دوسرا شخص کہتا ہے کہ" اس آدمی کو معہ اس کے خاندان اور پیرو کاروں کو ختم کرنا چاہیے کیوں کہ واقعی کبھی ہمارے نہیں ہو سکتے، اسے قتل کر دینا چاہیے اور اس کی بیوی اور بیٹوں کو دوسرے کے حوالہ کر دینا چاہیے. اس کے قبیلہ اور پیرو کاروں کو تتر بتر کر دینا چاہیے. اس کی جائداد اور مال و اسباب ایسے قابل اعتماد شخص کے حوالہ کر دینا چاہیے جو موجودہ حکومت کے خیر خواہوں میں سے ہو تاکہ اس کا اقتدار اور اقبال بلند ہو کیوں کہ یہ سلطان کی مزید قوت اور عظمت کا باعث ہوگا. سیاسی تدبیر کا یہ تقاضہ ہے کہ یہ ہونا ہی چاہیے" ایک اور شخص پہلے سلطان کے ایک دوسرے محرم راز افسر کی یاددہانی کراتا ہے اور اس کا نام بھی ان لوگوں کی فہرست میں درج کرداتا ہے جن کا خاتمہ ہونا ہے اور ایسا کرنے کے لیے ریاست کی مصلحت پر مبنی دلائل پیش کرتا ہے. اپنے روبرو بیٹھے ہوئے لوگوں کی گفتگو سن کر سلطان کو ان کی وفاداری کا یقین ہو جاتا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وہی اس کے منتخب معاون ہیں، اور وہ لوگ مہربانی اور عنایات کی بدولت مضبوط ہوتے ہیں اور دوسروں کو ختم کر کے اپنی وفاداری کا سکہ جاتے ہیں.

اس نشست کو وہ مجلس رائے ملکی کا نام دیتے ہیں بہت سے لوگوں کو اس مجلس محرم سے علیحدہ رکھا جاتا ہے. اور محض نظارہ کرنے والے اس کے رازدارانہ مباحثوں سے واقفیت حاصل کرنے کی تمنا کے باعث بری طرح

ملول ہوجاتے ہیں. لیکن وہ نہیں جانتے اور اپنی آنکھوں کی روشنی کے معدوم ہوجانے کی وجہ سے وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ جنت کے دروازے (ایسی نشست کے اراکین پر) بند ہوجاتے ہیں جس کے مباحثوں کی وجہ سے آخر میں خدا ورسول کے احکامات کے برخلاف مسلمانوں کی ایک جماعت کے خاتمہ کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے. ان فاسقوں کے چہرے روز محشر میں سیاہ ہوجائیں گے جو رسول اکرم کی شریعت اور سنت کے خلاف منصوبہ بناتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں.

رذیل کے پیراگراف میں سے بہت سی دوہرائی گئی باتوں کو علیحدہ کرنا ضروری ہوگیا تھا. اس کے باوجود اس کا لب لباب کافی اہمیت رکھتا ہے.)

اور زمانہ ان پر ہنستا ہے اور بہ زبان تجربہ کہتا ہے : "اے احمقو، جاہلو، مغرورو اور اندھے پیروکارو، تم جو طاقت کے نشہ میں ڈوبے ہوئے ہو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کچھ عرصہ بعد دوسرے تم پر اور تمہارے متعلقین پر وہی مصیبتیں نازل کریں گے جو آج تم دوسروں پر نازل کر رہے ہو) جلد ہی وہ تمہارے اور تمہاری بیویوں، بچوں، قبیلوں اور پیروکاروں کے خلاف ٹھیک اسی طرح سے تدبیریں اور منصوبے بنائیں گے اور وہ ایک دم وہی کریں گے جو تم کر رہے ہو. تب پھر تم کیوں سوچتے ہو کہ تمہاری بہبود مسلمانوں کے خاتمہ اور تمہارے پیش روؤں کی مکمل طور پر تباہی میں پنہاں ہے. تم آخر کیوں اپنی ہی تباہی کے لیے اپنی دودھاری چلاتے ہو؟ لازمی طور پر دوسرے بھی تمہارے متعلقین ورعایا کی تباہی کے لیے فتاوی حاصل کرنے اور ان کے مطابق تعمیل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے. تب پھر، اے احمقو، تم ایسی تدبیر کیوں نہیں سوچتے ہو جس سے مسلمان زندہ رہ سکیں اور ان کے خاندان اور پیروکار اپنی زندگیوں اور مال و اسباب سے محروم، تتر بتر اور تباہ نہ ہوسکیں. اس سے حاصل یہ ہوگا کہ تمہارے خاندان بھی اس تباہی سے بچ جائیں گے. (آخرت میں تم کو جو سزائیں ملیں گی وہ ایک مختلف مسئلہ ہے. لیکن اس دنیا میں بہت مختصر مدت میں تمہارا اور تمہاری جماعت کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور اسی قسم کی مصیبتیں تم پر ڈالی جائیں گی جو اس وقت تم دوسروں پر نازل کر رہے ہو یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ یہاں تجویز کی گئی تدبیر عام قبولیت حاصل نہیں کر لیتی ہے.)

مذہب و مملکت کی عظیم ہستیوں نے کہا ہے : کسی سلطان کی طاقت کا زوال اس وقت قریب سمجھ لینا چاہیے جب وہ اپنی سلطنت کے کسی شریک کار، مخالف یا اس سے الجھنے والے کے باقی نہ رہنے کی وجہ سے مضبوط محسوس کر رہا ہو، اور ان تمام لوگوں کو راستہ سے ہٹا چکا ہو جن سے مزاحمت کا کوئی خوف یا خطرہ تھا. جب سلطان اس درجہ محفوظ ہوجاتا ہے تو اس کا خدا پر سے اعتقاد کم ہوجاتا ہے اور وہ مدد الہی کی

کی کچھ زیادہ ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ملک کو دشمنوں سے پاک رکھنے کے اس کے تمام اندازے اس کے اپنے معاونوں کی طاقت پر مبنی ہوتے ہیں (جگہ چھوٹی ہوئی ہے)

تم پر اس سے زیادہ بڑی آفت نہیں آسکتی کہ تم محمود کے مددگاروں، معاونوں، قبیلوں اور پیروکاروں کا خاتمہ کر بیٹھو کیوں کہ وہ سب تمہارے دست گیر اور معاون بن سکتے ہیں۔ محمود کو تم سے اس سے زیادہ کوئی خوف نہیں ہے کہ تمہارے اپنے بزرگ پیرو تمہارے سامنے سر جھکائیں گے اور مسعودی اور محمودی افسروں کی طرح ہونے کا دعوی کریں گے۔ وہ محمود کے افسروں کو، جن میں سے ہر ایک دین اور وفاداری کا پہاڑ ہے،.. محمودی کا لقب دیں گے۔ وہ تمہارے دماغ میں یہ خیال بٹھائیں گے کہ محمود کے لاتعداد بیٹے اور پوتے ہیں اور یہ کہ اگر کوئی محمودی شہزادہ ملک کے کسی حصّہ پر قبضہ کرتا ہے تو محمودی افسر اسے تخت نشین کریں گے۔ وہ تمہیں مشورہ دیں گے کہ تم اپنے ذاتی مددگار اور معاون منظم کرو اور اس خطرہ کی وجہ سے محمود کے دست گیروں اور معاونوں کو ان کے انجام تک پہنچاؤ، لیکن تمہیں کبھی بھی اتنے وفادار مددگار اور معاون نہیں مل سکیں گے۔ جتنے وفادار میرے دست گیر ہیں۔

محمود کی یہ نصیحت اس بادشاہ کے لیے ہے جس کے باپ دادا بادشاہ نہیں تھے اور جو غاصبانہ طریقہ سے یا عوام کے اتفاق رائے سے بادشاہت حاصل کر کے اپنے سطحی فیصلہ کی وجہ سے پرانے عہد کے مددگاروں اور معاونوں کو پوری طرح ختم کر کے اور اپنی حکومت کو مضبوط و مستحکم بنانے کی غرض سے اپنے ہی آدمیوں کو عہدوں پر رکھنے کا آرزومند ہے۔ محمود کی یہ نصیحت اس سلطان کے لیے بھی ہے، جس کی سلطنت قدیم اور موروثی تو ہے لیکن جس کے دماغ میں شیطان نے یہ خیال بٹھا دیا ہے کہ اپنے خاندان کے تسلسل کو پکا بنانے اور بادشاہت کو دوسرے خاندان میں منتقل ہونے سے روکنے کی غرض سے اسے معاملات اس طرح طے کرنا چاہیے کہ حکومت

لہ اس پیراگراف میں محمود واضح طور پر اس شخص سے مخاطب ہے جو اس کے خاندان اور اس کے افسروں کو معزول کرے گا اور وہ یہ بھی فرض کر لیتا ہے کہ مسعود اس کا جانشین ہوگا۔ کیا برنی واقعی اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ محمود نے مسعود کے دعوؤں کو نظرانداز کر دیا تھا اور محمد کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور یہ کہ محمود کا خاندان غزنی میں عرصہ تک برسر اقتدار رہا؟ اگر برنی نے کبھی طبقات ناصری کا مطالعہ کیا تھا تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسے پوری طرح بھول چکا تھا۔

کے تمام افسر اس کے غلام ہوں اور اس طرح ایک ہی خاندان سے وابستہ ہوں۔ [1]

اس نصیحت کے سلسلہ میں دو مثالیں دی گئی ہیں:۔ (۱) محمود کا سجوریوں یعنی اس شاہی خاندان کے ساتھ سلوک جس سے غزنی کی مملکت محمود کے پاس آئی۔ (۲) سکندر کا عجم کے شہزادوں کے ساتھ سلوک۔ محمود اور سجوریوں سے متعلق ذکر پورے ترجمہ کا مستحق ہے۔ کیوں کہ اس سے برنی کی اصل تاریخی محمود سے خطرناک حد تک لاعلمی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور نیز اس لیے بھی کیوں کہ برنی نے اس مثال میں ازمنۂ وسطیٰ کے اس پرخطر مسئلہ کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ ایک نئی اور کامیاب حکمراں جماعت کو اپنے زیر کیے ہوئے حکمراں طبقہ کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے۔)

اے محمود کے فرزندو! بتہیں معلوم ہونا چاہیے کہ غزنی اور خراسان کے مالک محمود کو سجوریوں سے ملے ہیں۔ محمود کے باپ دادا سلطان نہیں تھے۔ خدا نے محمود کو سجوریوں پر فتح دی اور دار الخلافہ بغداد سے محمود کے نام بادشاہت کا منشور آیا۔ چنانچہ محمود غزنی کے تخت پر متمکن ہو گیا۔ [2] اس سے قبل سجوری خراسان اور غزنی پر برسوں تک بادشاہت کرتے رہے تھے۔ ان سجوریوں کی تباہ کاری کے خلاف کوئی اختلاف رائے نہیں تھا جنھوں نے خلیفہ بغداد کے خلاف بغاوت کی تھی اور جنگوں اور جھڑپوں میں مارے گئے تھے لیکن سجوریوں کے ان مددگاروں اور معاونوں کے ساتھ برتاؤ میں جو اپنے قبیلوں، پیروکاروں، شہسواروں اور پیادوں کے ساتھ زندہ بچ گئے تھے۔ محمود کو تامل تھا۔ کمزور ایمان والے سلاطین کی یہ روایت ہے کہ وہ مذہب کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ اپنی سلطنت اور اس کے تحفظ کے لیے ہزاروں معصوموں کا خون بہاتے ہیں۔ اپنے خزانے کے لیے مسلمانوں کی جائداد اور مال و اسباب کو ضبط کرتے ہیں اور سابق حکومت کے دستگیروں کی جائدادوں، عورتوں، بچوں، غلاموں اور باندیوں کو اپنے ذاتی معاونوں کو دے دیتے ہیں تاکہ اس دولت سے آخر الذکر طاقت ور اور بااثر ہو جائیں۔ وہ اپنے قبیلوں، پیروکاروں اور پیش رَوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں اور اسے اپنی طاقت کی بقا اور اپنی حکومت کے استحکام کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

غرض کہ اگر محمود نے بے دین سلطانوں کے مطابق سجوریوں سے برتاؤ کیا ہوتا تو دین محمدی اور فرائض اسلام میں اس کے سچے عقیدے نے اس کا دامن پکڑ لیا ہوتا اور اس کی داڑھی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہوتا۔ لیکن اگر

---

[1] ظاہر ہے تمام اعلیٰ عہدوں پر اپنے غلام افسر مقرر کر کے تاریخ فیروز شاہی (ص ۲۷) میں برنی درہم خریدہ غلام، پر ملامت کرتا ہے جنھوں نے شمس الدین التمش کے آزاد افسروں کو کچل کر شمالی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی۔

[2] محمود اور سجوریوں کے بارے میں برنی کی غلطیوں اور متضاد باتوں کے لیے اس نصیحت کے اختتام پر نوٹ دیکھیے۔

وہ سمجوریوں کو خوش حال چھوڑ دیتا اور ان کو ضرر نہ پہنچاتا تو وہ خائف رہتا کیوں کہ اس نے سلطنت نئی نئی حاصل کی تھی، اس کی حکومت کی کوئی بھی تدبیر پختہ نہیں ہوئی تھی اور اس کے معاونوں کے بال و پر ابھی تک نہیں بڑھے تھے۔ سمجوری بھاری تعداد میں باقی تھے۔ عین ممکن ہے کہ وہ شور و ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ ان کے ممتاز قبیلے اور خاندان بکثرت اور خوش حال تھے۔ انتظامیہ کو الٹ دیتے اور محمود کا تختہ پلٹ دیتے۔ کیوں کہ وہ ایک یا دو پشتوں تک ملک پر قابض رہ چکے تھے اور عوام ان کے وفادار اور مداح تھے۔ ایسی ہی صورت ہے تو ان کے فتنہ کی چنگاری جلد ہی روشن ہو سکتی تھی اور شعلوں میں بدل سکتی تھی۔

محمود نے کئی دن غور و فکر میں گزار دیے۔ احمد حسن، ارسلان جاذب، التونتاش، علی خشیاوند اور محمود کے دوسرے محرم راز افسروں نے اس موضوع پر ہر روز اس سے گفتگو کی۔ ان کی دیانت داری میں اپنی عمیق نگاہ کے باعث محمود نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ بھی اتنے زیادہ نامور گھرانوں اور خاندانوں کی بربادی کے خیال سے خوش نہیں تھے اور یہ کہ صرف سیاسی مصلحت کے پیش نظر انھوں نے یہ کہا تھا کہ سمجوریوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ محمود نے انھیں جماعتوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا اور ہر جماعت کے لیے ایک مختلف حکم سنایا گیا۔ چنانچہ مثال کے طور پر ان کے رہنماؤں اور ممتاز لوگوں میں سے دو سو اشخاص اور ان کے درباریوں، افسروں اور منتخب لوگوں میں سے تین یا چار سو افراد کو قتل کرانے کے لیے چھانٹ لیا گیا۔ تین یا چار ہزار افراد جن میں مرد اور عورتیں، جوان اور بوڑھے شامل تھے دور افتادہ ممالک میں جلاوطن کرنے کے لیے علیحدہ کیے گئے۔ سمجوریوں کے عاملوں، عہدیداروں، گماشتوں اور معمولی افسروں (پیوستگان) میں سے تقریباً چھ یا سات سو افراد کو بیڑیاں پہنانے، قید کرنے اور جرمانہ کرنے کی غرض سے گرفتار کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ ان کی بیویوں، بچوں، غلاموں، باندیوں، رشتہ داروں اور قرابت داروں میں سے سات یا آٹھ ہزار افراد کے نام اس فہرست میں درج کر لیے گئے جنھیں مختلف خیلوں سے منتخب کیا گیا تھا۔ سمجوری سلطانوں کے احرموں، ان کے بیٹوں، بیٹیوں، پوتیوں، پیروکاروں، رشتہ داروں اور قرابت داروں کی علیحدہ فہرست بنائی گئی اور ان سے نمٹنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔ ان کی جائدادیں جو اندازے کے مطابق ایک یا دو ہزار دیہاتوں اور باغوں اور ایک سو یا اس سے زائد حویلیوں پر مشتمل تھیں سلطان کو ضبط کرنا تھیں۔ ان کی منقولہ ملکیت جیسے سونے کے ظروف، گرم کپڑے اور دوسری نادر اشیاء کو جمع کر لیا گیا۔

سمجوریوں اور ان کے پیروکاروں کو تباہ، تتر بتر، قتل اور جلاوطن کرنے کا یہ منصوبہ محمود کو انتہائی سخت نظر آیا۔ صرف شکوک و شبہات کی بنیاد پر سزائیں دینے کے لیے اس کا دل آمادہ نہیں تھا اور اسلامی عجز و انکسار کی وجہ سے بادشاہت اسے اپنے منہ میں تلخ محسوس ہونے لگی۔ بالآخر جمعہ کی ایک شب وہ حسب عادت بستر

سے اٹھا اور تہجد ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے عاجزی سے زمین پر اپنی پیشانی رگڑی اور سجدہ میں جا کر رو گیا اور گڑگڑایا۔ اسی وقت اس کے اوپر دائیں جانب قبلہ کی سمت سے یہ آواز بلند ہوئی: "اے محمود، آج کے بعد کل آتا ہے اور ہر اچھے اور برے کام کی تلافی ہوتی ہے۔" محمود نے محسوس کیا کہ یہ آسمانی آواز ہے اور قادر مطلق بے چارے محمود کا بھلا چاہتا ہے اور اسی لیے اسے ایک ایسے موقع پر نصیحت کی گئی ہے جب کہ وہ اتنے زیادہ لوگوں کو ختم کرنے جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ پو پھٹنے تک نہیں سویا۔

جب دن نکلا تو محمود نے غزنی کے علما و مشائخ اور ممتاز اشخاص کو طلب کر کے ایک محضر منعقد کیا۔ ان سب کی موجودگی میں اس نے اپنے ہاتھوں میں قرآن اٹھا کر اور خدا اور رسول اور تمام انبیاء، فرشتوں اور اولیاء کے نام پر یہ حلف لیا کہ وہ جب تک زندہ ہے گا محض اپنی سلطنت کی بقا کے لیے کسی مسلمان اور موحد کا خون نہیں بہائے گا اور یہ کہ وہ مسلمانوں کی بیویوں، بیٹیوں اور بچوں کے ساتھ گستاخی سے پیش نہیں آئے گا اس کے بعد اس نے بے دین اور غیر اسلامی منصوبوں کی اس روداد کو عظیم المرتبہ لوگوں کی مجلس کے سامنے رکھا۔

پھر محمود نے اپنے معتدل احکامات سنانا شروع کیے) اس نے سزائے موت کے لیے منتخب کیے ہوئے افراد کو ان کی بیوی بچے واپس کیے اور انھیں سفر خرچ دے کر چالیس اور پچاس کی جماعتوں کے حساب سے دور افتادہ اور اجنبی مقامات کے لیے جلا وطن کر دیا۔ لیکن اس نے ان سے یہ اقرار کرا لیا کہ اگر انھوں نے ملک نہیں چھوڑا یا واپس آنے کی کوشش کی تو وہ سزا کے مستحق ہوں گے۔ اس کے بعد اس نے اپنے وسیع صوبوں کے متعدد وفادار صوبہ داروں کو ان افراد میں سے دو سو یا تین سو کی جماعتیں دیں جنھیں جلا وطن کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا (یہ طے پایا کہ) انھیں مناسب اشیاء خوراک، کپڑے اور دوسری ضروریات زندگی مہیا کی جائیں اور انھیں دور کے شہروں کی حدود کے اندر رکھا جائے۔

جہاں تک ان افسروں کا معاملہ تھا جنھیں مال گزاری کے مطالبات کی وجہ سے ہتھکڑیوں، بیڑیوں اور قید کے لیے علاحدہ کیا گیا تھا۔ محمود نے یہ حکم سنایا کہ وہ حسب معمول اپنا اپنا فرد حساب دیوانی میں پیش کر دیں۔ لیکن اگر بھاری محاصل میں سے ان پر کچھ واجب الادا ہو تو انھیں وہ ادا کرنا ہو گا لیکن تین یا چار سال تک یعنی جب تک حکومت کے نئے افسر اپنے اپنے عہدوں پر جم نہ لیں وہ کسی عمل حکومت کے لیے تمنا نہیں کریں گے اور اپنی اپنی جگہوں پر اطمینان سے بیٹھیں گے (تقریباً سات یا آٹھ ہزار افراد کے ان کے اپنے خیلوں سے منتقلی کے منصوبہ کو بھی بدل دیا گیا) محمود نے اپنے خیلوں کے سرداروں اور مددگاروں اور معاونوں سے مجبوری قبائلی خاندانوں کے ساتھ شریعت کے مطابق شادی بیاہ کے رشتے قائم کرنے اور اس طرح انھیں خاندانی عزیزداریوں، مہربانیوں، اور عنایتوں سے اپنا لینے کا حکم دیا۔ اس نے سابق سلطانوں

گے حرموں یعنی ان کی بیٹیوں، نواسیوں اور ان سے متعلقہ خواتین کو دارالسلطنت کے نزدیک قلعوں میں رکھنے کا حکم دیا۔ ان نازک اندام خواتین کے لیے کھانے پہننے سے متعلق تمام ضروری چیزیں مہیا کی جاتی تھیں لیکن غلاموں اور باندیوں کی ایک محدود تعداد کے علاوہ کسی بھی فرد کو ان کے پاس جانے یا ان کے یہاں سے آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ سابق سلطانوں کے بیٹوں اور دامادوں کو بمعہ ان کے بھانجوں اور بھتیجوں کے ہندوستان کی سرحدوں کی طرف بھیج دیا گیا۔ محمود نے ہندوستان کے صوبہ داروں کو لکھا کہ انھیں مختلف شہروں اور قصبوں میں رکھا جائے اور ان کی ضروریات زندگی کے لیے ایک یا دو دیہات عطا کر دیے جائیں۔ ان کے لیے شہسواری، سواری اور شکار کی ممانعت کر دی گئی لیکن دوسرے فنون کی اجازت تھی۔ آخر میں محمود نے اپنے سرداروں کو یہ حکم دیا کہ وہ سمجوریوں کی جائدادوں، سونے، عمارتوں بیش قیمت اشیاء اور مکانوں کے امین بن جائیں۔ لیکن کچھ سال بعد اور ان کے ذہنوں سے عظمت اور قیادت کے خیالات ختم ہونے کے بعد اور جب عوام محمود کی حکومت قبول کر لیں اور سلطنت مستحکم ہو جائے تو سمجوریوں کا مال و اسباب ان کے مالکوں کو واپس کرنا ہوگا۔

مجلس کی موجودگی میں سمجوریوں سے متعلق مذکورہ بالا منصوبے طے کرنے کے بعد محمود نے یہ سوچ کر سجدۂ شکر ادا کیا کہ ایسی غیر معمولی صورت میں بھی کسی مسلمان کا خون نہیں بہایا گیا۔ کسی غیر شرعی جبر و تشدد کا ارتکاب نہیں ہوا اور نہ ہی خدا کی مخلوق کو ان کی زندگیوں سے محروم کرنے کے لیے کسی قسم کی کوشش کی گئی۔ اس نے اپنی نگاہ معرفت سے رسول اکرم کی حسب ذیل حدیث دیکھی: "انسان اللہ کی عمارت ہے۔ جو انسان کو تباہ کرتا ہے وہ اللہ کی عمارت کو تباہ کرتا ہے"؛ اور خدا نے محمود پر اپنے عہد کے آغاز میں مسلمانوں کا خون نہ بہانے کے صلہ میں تمام زندگی برکتیں نازل کیں کیوں کہ مستقبل میں کبھی بھی اسے ایسا اتفاق پیش نہیں آیا جس میں اسے محض سلطنت کی بقا کے لیے غیر شرعی طور پر اپنے ہاتھوں کو خون آلودہ کرنے کی ضرورت پڑی ہو۔

دارا کو شکست دینے اور پورے عراق اور عجم پر فتح حاصل کرنے کے بعد سکندر عراق کے شہزادوں کو قتل کرنے اور پانچ سو سے ایک ہزار سال تک کے پرانے خاندانوں کی بیخ کنی کرنے اور ان کی جگہ پر اپنے آدمی رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا اور سکندر مزید فتوحات کے لیے اسی منصوبہ کے ساتھ آگے بڑھا لیکن ارسطو نے اس طرح پرانے خاندانوں کی بیخ کنی کرنے اور ناآزمودہ لوگوں پر تکیہ کرنے کے خلاف احتجاج کیا اور سکندر نے ارسطو کا خط پڑھ کر اپنا منصوبہ ترک کر دیا۔ سکندر نے ملک عراق کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے انھیں شہزادوں کو تفویض کر دیا اور اپنی جانب سے انھیں بادشاہت کرنے کا حق دے دیا۔ اس نے کسی نامور خاندان یا خیل کو ختم نہیں کیا۔ سکندر نے جن سلطانوں اور ان کے جن بیٹوں کو مقرر کیا وہ تاریخ میں ملک الطوائف

کے نام سے یاد کیے گیے ہیں. سکندر نے شہزادوں کے ساتھ جس طرح کا سلوک روا رکھا اس کے باعث عوام ان کا اس کا نام باقی رہا.

سلطان محمود اور سمجوریوں پر نوٹ

اس نصیحت کے سلسلہ میں. برنی نے جو مثال دی ہے اس کے بارے میں وہ حسب ذیل باتیں کہتا ہے.
(۱) سمجوری وہ سلطان تھے اور اس شاہی خاندان سے والبتہ تھے جنھوں نے دو یا تین پشتوں تک خراسان اور غزنی پر حکومت کی. برنی کسی سمجوری سلطان کا نام نہیں لیتا. اس کی سیدھی سادھی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ان میں سے کسی کو اس کے نام سے جانتا ہی نہیں تھا. (۲) سمجوریوں کے بکثرت پیرو تھے۔ ۲۰۰ یا ۳۰۰ رہنما، ۴۰۰ درباری، تقریباً ۶۰۰ یا ۷۰۰ عامل اور دوسرے افسر اور تقریباً ۳۰۰۰ یا ۴۰۰۰ وہ پیرو تھے جو جلاوطنی کے مستحق تھے اور غالباً ۷۰۰۰ یا ۸۰۰۰ ممتاز قبائلی لوگ تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک مفروضہ ہے کہ سمجوری شاہی خاندان خاصا بڑا تھا (۳) محمود کے باپ اور دادا سلطان نہیں تھے (۴) محمود نے خلیفہ بغداد کے حکم کے بموجب سمجوریوں کو معزول کیا اور سمجوری حکومت کی جگہ ایک نیا انتظامیہ قائم کیا. مقابلے ہوئے جن میں سمجوری مارے گئے اور ابتدا میں محمود کی حکومت کمزور تھی.

یہ سچ ہے کہ محمود کا دادا واقعی سلطان نہیں تھا کیوں کہ محمود کے باپ سبکتگین نے اپنی زندگی کا آغاز ایک غلام کی حیثیت سے کیا. لیکن سبکتگین ایک خود مختار سلطان بنا اور برنی یہ بھول رہا ہے کہ وہ پہلے ہی اس کا اس لقب کے ساتھ ذکر کر چکا ہے.

غزنی میں کسی زمانہ میں بھی سمجوری نہیں تھے

غزنوی سلطنت کی ابتدا سے سب ہی بخوبی واقف ہیں اور برنی کو طبقات ناصری سے حقائق مل سکتے تھے. الپتگین جو سامانی سلطانوں کی طرف سے خراسان کا صوبے دار تھا، جانشینی کے سوال پر مخالف فریق کی طرف تھا اور اپنے نئے سامانی فرماں روا امیر منصور بن نوح کے خلاف بغاوت نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے غزنی کی طرف کوچ کیا اور یہاں کے حکمراں امیر انوک (یا لاوک) کو کھدیڑ کر ایک مملکت قائم کی جو عملاً تو نہیں البتہ نظری طور پر جب تک سامانی سلطنت باقی رہی اس کی مطیع و ماتحت رہی. الپتگین آٹھ سال حکومت کر کے مر گیا اور اس کا بیٹا اسحاق صرف ایک سال تک ایک پرخطر عہد سنبھال سکا. اس کے بعد دو ترک

افسروں نے اس مملکت پر حکومت کی۔ پہلا ترک بلکتگین ایک اچھا انسان تھا اور دو سال تک حکومت کرتا رہا لیکن اس کا جانشین پیرے بہت ظالم حکمراں تھا۔ عوام نے ۹۷۷ء میں پیرے کو معزول کر کے سبکتگین کو سرخ چھتری کے زیر سایہ بٹھایا۔ سبکتگین نے بیس سال تک حکومت کی اور اپنی سلطنت کی توسیع کی۔ اس کی موت کے بعد اس کے دو بیٹوں محمود اور اسماعیل میں جانشینی کی جنگ ہوئی۔ محمود کامیاب ہوا اور تخت نشین ہوا۔ جہاں تک غزنی کا سوال ہے، سمجوری کہیں بھی تصویر پر نہیں ابھرتے ہیں۔

سمجوری سامانی افسروں کا ایک نہایت ہی پریشان کن خاندان تھا جس کا خاص دائرۂ عمل خراسان تھا۔ لیکن وہ کسی بھی وقت بادشاہت کے رتبہ کو نہیں پہنچے۔ اس کے علاوہ سبکتگین اپنی موت سے پہلے انھیں پوری طرح کچلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور سلطان محمود غزنی کے تخت پر متمکن ہونے سے پہلے ہی ان کا پوری طرح خاتمہ ہو چکا تھا۔

ابوسعید گردیزی زین الاخبار میں سمجوریوں کی چار نسلیں تحریر کرنے سے اتفاق رائے رکھتا ہے (۱) سامانی فرمانروا ابونصر احمد بن اسماعیل (۹۱۴-۹۰۷ء) نے ابو عمران سمجوری کو سیستان کے صوبہ دار کی حیثیت سے مقرر کیا جو پہلے داوت دار تھا (ص ۲۴)، (۲) ابو عمران کے بیٹے ابراہیم کو سامانی فرمانروا نوح بن نصر نے ۹۴۲-۳ء میں نیشاپور کا صوبہ دار مقرر کیا (۳) لیکن جس شخص نے خاندان کو اصل شہرت دی وہ ابراہیم کا بیٹا ابوالحسن سمجوری تھا جو گردیزی کے بیان کے مطابق، عیار اور مکار تھا۔ ۹۵۹ء میں نیشاپور کا صوبہ دار مقرر ہونے کے بعد ابوالحسن نے اتنا برا رویہ اختیار کیا کہ سامانی سلطان عبدالملک بن نوح نے اسے اس عہدہ سے ایک سال بعد ہی برطرف کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن ۹۶۱ء میں اپنے پرانے عہدہ پر دوبارہ مقرر ہونے کے بعد ابوالحسن نے نہایت خوش اسلوبی کا مظاہرہ کیا اور ہر شخص اس سے خوش ہو گیا۔ لیکن بعد میں اس پر اپنی فوجی مہمات میں سستی دکھانے کا الزام عاید کیا گیا (ص ۴۶-۴۴) اس کے باوجود سامانی سلطان نوح بن منصور نے اسے تین اعزاز عطا کیے۔ ابوالحسن کو ناصر الدولہ کا خطاب دیا۔ اس سے اپنی بیٹی کی شادی کی پیش کی اور اسے نیشاپور، ہرات اور قاہستان کا سپہ سالار اور صوبہ دار بنایا۔ لیکن ابوالحسن نے امیر نوح کے وزیر ابوالحسن عتبی سے جھگڑا کر لیا اور اسے برطرفی کا حکم بھیجا گیا: "اپنا جبہ پہن کر اپنے گھر بیٹھو۔" ابوالحسن نے پہلے تو مقابلہ کیا لیکن فوراً ہی سر جھکا دیا اور فوج کی کمان اپنے بیٹے ابوعلی سمجوری کو سونپ دی۔ امیر نوح تخت نشینی کے وقت نابالغ تھا۔ شاہی اقتدار کمزور ہو چکا تھا اور سلطنت کی حقیقی حکومت ابوعلی سمجوری اور ایک اور سامانی افسر فائق کے ہاتھوں میں آگئی۔ یہ طے پایا کہ تاش حاجب کو نیشاپور ملے گا۔ خائق کو بلخ، ابوعلی سمجوری کو ہرات، اور بدعنس بمعہ قاہستان اور دوسرے علاقوں کے ابوالحسن

سیمجوری کے حوالہ کیا جائے گا۔ نیز ابوالحسن کو خراسان کی فوجی کمان بھی سپرد کی جائے گی۔ ابوالحسن سیمجوری ۹۸۸ء میں ایک باغ میں اپنی ایک محبوب باندی کے ساتھ سوتا ہوا مر گیا اور سیمجوری خاندان کی قسمت اب اس کے دو بیٹوں ابوالقاسم اور ابوعلی سیمجوری کے اختیار میں آگئی (ص ۵۲)۔ (۴۸) ابوعلی اس وقت ہرات میں تھا۔ لہٰذا ابوالقاسم ابوالحسن کے خزانوں اور غلاموں کو اپنے بھائی کے پاس لے گیا۔" امیر نوح نے ابوعلی کو اس کے باپ کی کمان بمعہ خلعت اور عمادالملک کے خطاب کے عطا کی۔" بعد میں ترکستان کے ایلک خاں کے بیٹے ابوموسیٰ ہارون نے بخارا پر حملہ کر دیا لیکن اسے بواسیر کے باعث اپنی صحت خراب ہونے کی وجہ سے واپس ہونا پڑا۔ اس کے حملہ سے واحد نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امیر نوح کی طاقت اور بھی زیادہ کمزور ہوگئی اور ابوعلی سیمجوری طاقت ور ہوگیا۔" ابوعلی کے خزانہ اور فوج میں اضافہ ہوا۔ اس نے خراسان کو قابو میں کیا اور ماوراءالنہر پر قبضہ جما لیا اور سامانی سلطنت کے محاصل، اخراجات اور تمام امور پر اپنا پورا تسلط قائم کر لیا۔ اس نے امیرالامراء المؤید باللہ کا لقب اختیار کیا اور امیر نوح کی ہر ممکن طریقے سے توہین کی۔ صرف خطبہ میں نوح کا نام رہ گیا تھا (ص ۵۳)
خلاصہ یہ کہ امیر نوح نے سبکتگین سے مدد کی درخواست کی اور سبکتگین اور محمود نے ابوعلی کو ہرات میں دنداں شکن شکست دے دی۔ ابوعلی نے نیشاپور کے لیے راہ فرار لی اور وہاں سے گرگان بھاگ گیا۔ اس نے اپنی گزشتہ رویہ کے لیے معذرت چاہی لیکن فاتحوں نے اس کی معذرتوں کو نظر انداز کیا۔ نوح نے ۹۹۷ء میں سبکتگین کو ناصرالدین والدولہ کا خطاب عطا کیا اور محمود کو خراسان کا صوبہ دار مقرر کیا۔

اس سب کے بعد نوح بخارا واپس ہوا اور سبکتگین نے ہرات کی راہ لی جب کہ محمود نیشاپور میں ہی وہاں کے امور طے کرنے کے لیے رک گیا۔ ابھی وہ اسی طرح مصروف تھا کہ فائق اور ابوعلی سیمجوری نے ایک بڑی فوج کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ محمود اپنے باپ کے پاس واپس ہرات چلا گیا اور ہر طرف سے مدد طلب کی۔ طوس کے مقام پر دوسری جنگ میں ابوعلی کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا (ص ۵۶)

سیمجوریوں کے اصل خاتمہ کا ذکر ابھی باقی رہ گیا ہے۔ اپنی مایوس کن حالت کے باوجود ابوعلی سیمجوری ایک عورت کی خاطر نیشاپور آیا اور اسے سلطان محمود نے ٹھیک وقت پر قید کر لیا۔ لیکن وہ بچ کر خوارزم پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں سے اسے بخارا آنے کی ترغیب دی گئی۔" جیسے ہی ابوعلی سیمجوری امیر نوح کے محل میں داخل ہوا اسے اس کے اٹھارہ بھائیوں اور افسروں (سرہنگوں) کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں سب کو باندھ کر ۹۹۸ء میں قندوز لایا گیا۔ جب امیر سبکتگین کو ابوعلی سیمجوری کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو اس نے اسے امیر نوح سے مانگا۔ امیر نوح نے ابوعلی سیمجوری کو بمعہ اس کے غلام ایلمان امیرک طوری اور ابوالحسین بن ابوعلی سیمجوری کو سبکتگین کے پاس روانہ کر دیا۔ امیر سبکتگین نے ان چاروں افراد کو گردیز کے قلعہ بھیج دیا اور

وہاں قید میں ڈال دیا ۹۹۸ء میں یہ سب قتل کردیے گئے۔ (ص ۵۹-۵۸)"

نصیحت ۲۳

تنگ خیالیاں جو بادشاہت سے میل نہیں کھاتیں

(برنی کے مطابق ایسی پانچ ادنیٰ قسم کی خصلتیں ہیں جو اس عالی ظرفی کے متضاد ہیں جس کی کسی سلطان کو اپنے فرائض کی مناسب انجام دہی کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ (۱) کذب، (۲) تلون مزاجی (انقلاب)، (۳) فریب یا مکر (عذر و مکر)، (۴) قہر و غصہ کا غلبہ (غضوب) اور (۵) غیر انصاف پسند کو بڑھاوا دینا۔ لیکن اس واضح حقیقت کو غیر ضروری اور بے لطف طریقہ سے بار بار دہرایا گیا ہے۔ میں نے ان جملوں اور پیراگراف کا ترجمہ نہیں کیا ہے جن میں وہی بات دہرائی گئی ہے جو برنی دوسری جگہ بھی کہہ چکا ہے۔ نیز عوام کی اخلاقی حالت پر سلطان کی شخصیت کے اثر سے متعلق تمام پیراگرافوں کو میں نے شروع میں رکھ دیا ہے۔)

کیوں کہ بادشاہت خدا کی عنایت ہے۔ لہٰذا یہ عنایت الٰہی تنگ خیالیوں سے میل نہیں کھائے گی۔ اور اگر کسی فرمانروا میں ان کی آمیزش نظر آتی ہے تو وہ سلطان نہیں غاصب ہے۔۔۔۔۔

اگر قادر مطلق کسی قوم کو غیظ و غضب سے دیکھتا ہے اور انھیں صعوبتوں، پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ ان پر ایک ایسے سلطان کو مسلط کر دیتا ہے جو جبلی خلقی تنگ خیالیوں کا غلام ہے تاکہ اس کی سیاہ کاریوں کی وجہ سے وہ بے کس اور تتر بتر ہو جائیں۔ نیز سلطان کی رذالت کے باعث عوام کی ذمائتیں بڑھ جاتی ہیں۔۔۔۔ یہاں تک کہ رذالت اتنی عام ہو جاتی ہے کہ لوگ اسے خامی خیال کرنا بند کر دیتے ہیں اور حتیٰ کہ باوصف لوگ بھی اخلاقی طور پر گر جاتے ہیں۔ حسب ذیل دو مقولے ایک عرصہ پہلے کہے گئے تھے۔ "لوگ اپنے حکمرانوں کے دین پر چلتے ہیں" اور "لوگ اپنے ہی جیسے رجحان اور کردار والوں کی طرف مائل ہوتے ہیں" ایک تنگ ظرف سلطان ہم جنسوں کی طرف میلان کے اصول کے مطابق بد چلن لوگوں کی طرف کھنچتا ہے (سلطان کے مقرر کیے ہوئے افسروں کی بدکاریاں عوام کو متاثر کرتی ہیں) اکثر عوام میں وقتاً فوقتاً برائیاں اور شر پسندیاں بڑھتی ہیں۔ راست روی پر بداخلاقی، نیکی پر بدی، اطاعت پر گناہ گاری اور عدل پر ظلم کا قابو ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ بدی نیکی پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتی ہے اور بد تمانی اور بداخلاقی کے غلبہ کی وجہ سے نیکی اور راست بازی تقریباً ناپید ہو جاتی ہیں۔ آخر میں بدی اور

بدقماشی کے منحوس اثرات کے باعث جن سے دنیا پر کردی گئی ہے، بار بار مصائب اور آفات آسمان سے نازل ہوتی ہیں۔ عوام اپنے وجود سے تنگ آجاتے ہیں۔ زندگی اور موت انھیں ایک ہی سی نظر آنے لگتی ہیں۔ دراصل چوں کہ ان کی زندگیاں تمام مسرتوں اور آسائشوں سے محروم کردی گئی ہیں اس لیے وہ موت کے تمنائی ہوجاتے ہیں۔ . . .

اور دورِ ماضی کے حکما اور ان کے جانشینوں نے لکھا ہے؛ عوام سلطان کی ہر خوبی اور خامی کو اختیار کرتے ہیں۔ عوام میں سے منتخب لوگ سلطان کی ہر اچھی بات کو اپنانے کی کوشش کریں گے خواہ وہ انھیں ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے یا نہیں تاکہ ہم جنسوں کی طرف میلان کے اصول (حکم جنسیت) کے مطابق سلطان انھیں قبولیت عطا کرے اور ان سے محبت سے پیش آئے۔ سلطان کی برائیوں کا بھی ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر سلطان مذہبی عبادت و ریاضت میں مصروف رہتا ہے تو ملک کے تمام ممتاز لوگ زہد اور تقوی کے لیے سعی کریں گے۔ اگر سلطان ایک عمدہ خوشنویس ہے تو سلطنت کے منتخب لوگ خطاطی میں اپنے جوہر دکھانے کی کوشش کریں گے۔ اگر سلطان نے شاعرانہ طبیعت پائی ہے اور وہ اشعار کہتا ہے تو تمام لوگ شاعری کی طرف رجوع کریں گے اور اشعار کہیں گے۔ اگر سلطان ایک عالم ہے تو تمام لوگ تعلیم یافتہ ہونے کی کوشش کریں گے خواہ انھیں اپنی تعلیم کے لیے نان و نفقہ اور وظائف ملیں یا نہ ملیں۔ اور یہی صورت سلطان کی برائیوں کے ساتھ ہے۔ اگر سلطان جھوٹا ہے تو وہ لازمی طور پر جھوٹے لپاڑیوں کو ترجیح دے گا اور ملک کے اکثر لوگ دروغ گوئی اپنا لیں گے۔ اگر سلطان انتہائی شرابی ہے تو جنھوں نے شراب سے پرہیز کر رکھا ہے، وہ سب شراب نوشی شروع کردیں گے۔

چوں کہ سلطان کی شخصیت اور اس کے اعمال و افعال عوام پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے خلفائے راشدین کہہ گئے ہیں حکمرانوں (امراء) کے نیک اعمال ان کے اقوال کے مقابلہ میں عوام کو ناجائز چیزوں سے کہیں زیادہ خبردار کرتے ہیں، "مثال کے طور پر اگر حکمراں شراب پیتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، وعدہ خلافی کرتا ہے اور ناانصافیاں کرتا ہے لیکن عوام کو شراب پینے، جھوٹ بولنے، وعدہ خلافی کرنے اور ناانصافیاں کرنے کی ممانعت کرتا ہے۔ تو کوئی بھی اس کی نصیحت پر کان نہیں دھرے گا اور نہ خبردار ہوگا۔ لیکن اگر وہ شراب نہیں پیتا ہے یا جھوٹ نہیں بولتا ہے یا وعدہ خلافی نہیں کرتا ہے یا غیر منصفانہ رویہ نہیں اختیار کرتا ہے تو اس کے نیک اعمال اکثر لوگوں کو برائیوں سے دور رکھیں گے خواہ وہ ایسا کرنے کے لیے حکم نہ بھی دے۔ اس اصول میں کہ صحیح امام معصوم ہونا چاہیے، ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس کے احکامات کی اطاعت ہوگی۔ انبیاء معصوم پیدا کیے گئے لہٰذا وہ پیروی کے مستحق ہیں۔ اگر سلطان جو شریعت کے مطابق نائب امام ہے، معصوم نہیں ہے ؎ تو اسے (حاشیہ صفحہ پر)

کم از کم برائیوں سے تو محفوظ ہونا ہی چاہیے تاکہ عوام اس کے اقوال و افعال کی پیروی کر سکیں اگر یہ ممکن بھی نہیں ہے تو بادشاہت کے فرض منصبی کا کم سے کم تقاضہ یہ ہے کہ وہ برائیوں کا غلام نہ ہو۔ کیوں کہ بادشاہت حقیقتاً خدا کی نیابت اور قائم مقامی ہے اور ایسا اعلیٰ منصب ان حقیر عادتوں سے میل نہیں کھاتا جو اس منصب کی منفی ہیں۔

۱۔ پہلی ادنیٰ عادت جو کسی بھی حالت میں بادشاہ کی عظمت اور اعلیٰ منصب سے میل نہیں کھاتی اور بالفرض اس میں شامل بھی ہے تو مصیبت پیدا کرتی ہے تو وہ 'کذب' ہے۔ تمام مذاہب میں کذب قابل ملامت قرار دیا گیا ہے اور یہ بہت بڑی برائیوں میں سے ایک ہے ... اور دانش مندوں اور حکما نے کہا ہے: "ایک شخص اپنی خصلت کے کمینہ پن کے باعث یا ضرورت، تنگی یا مایوسی کے تحت جھوٹ بولتا ہے؛ لیکن کسی سلطان کو، جسے اقتدار عطا ہوا ہے اور جو کامیابی سے سرفراز ہوا ہے، جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا جھوٹ بولنا ایسی کمترین حرکت ہے جو عادت بن چکی ہے .... رسول اکرم نے فرمایا ہے: "سچا مومن زنا اور چوری کرتا ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بولتا"۔ ... علاوہ ازیں سلطان کے قول و قلم میں عوام کا اعتماد حکومت کے کاروبار کی بنیاد اور ریاست کی سیاسی حکمت عملی کا ستون ہے۔ جب یہ بنیاد ہل جاتی ہے تو سلطنت کے تمام امور بگاڑ کھاتے میں پڑ جاتے ہیں ... بادشاہت سے سلطان اور عوام دونوں کے لیے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ سلطان کے سامنے کیا ہوا ہر کام ایمانداری سے ہوتا ہے اور اس کے اقتدار کے خوف کے باعث اس کے سامنے کوئی جھوٹ نہیں چل پاتا ہے۔ لیکن اگر خود بادشاہ ہی جھوٹا ہو تو یہ فائدہ اس کے اور اس کے عوام دونوں کے لیے بدنصیبی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اصل مدعا الٹ جاتا ہے۔

۲۔ دوسری خساست جو بادشاہت کی اعلیٰ خصوصیت سے میل نہیں کھاتی تلون مزاجی (انقلاب) ہے۔ تلون مزاجی (انقلاب) کا مطلب اپنے اقوال و افعال سے پھر جانا ہے۔ قدیم اور جدید علماء و حکماء کے مطابق ثبات بادشاہت کی ایک لازمی شرط اور سلطانوں کی زینت ہے جب کہ تلون مزاجی (انقلاب) ثابت قدمی کے برعکس ہے۔ انھوں نے مخالف چیزوں کے اتحاد کو ناممکن تصور کیا ہے اور چوں کہ ثابت قدمی بادشاہت کی ضروری خصوصیات میں سے ایک ہے، اس لیے ان کا خیال ہے کہ تلون مزاج شخص سلطان کے منصب کے لائق نہیں ہے اور اگر وہ بغیر کسی حق کے سلطنت کی مسند پر بیٹھ جاتا ہے تو ملک کے خواص و عوام اور رعیت اس کے اقوال و افعال پر کوئی بھروسہ نہیں کریں گے۔ بادشاہت مجسم اعتماد ہے۔ اگر یہ اعتماد اٹھتا

بقیہ حاشیہ: ۵۔ نظریۂ امام کے لیے نصیحت کے اختتام پر نوٹ دیکھیے۔

ہے تو بادشاہت بے حقیقت اور بے اثر ہو جاتی ہے۔ غلط [illegible] کہہ گئے ہیں: "بادشاہت کی علامتیں سلطان کے اقوال وعیال سے عیاں ہوتی ہیں۔ اگر سلطان اپنے اقوال وافعال میں ثابت قدم نہیں ہے، اگر اس کے الفاظ پتھر پر کندہ عبارتوں کی طرح نہیں ہیں اور اس کا عزم پہاڑ کی طرح مصمم نہیں ہے۔ تو نہ تو عوام سلطان سے اور نہ ہی سلطان عوام سے مسرت یا سرور حاصل کر سکیں گے۔" (برنی اس جگہ اس واقعہ کا حوالہ دیتا ہے جب خلیفہ حضرت عمر نے ایک صحابی کو فرمانروائے مصر کے پاس بھیجا تھا[۱]۔ لیکن صحابی امیر مصر کو خلیفہ کا خط دیے بغیر ہی واپس آ گئے تھے کیوں کہ انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ حکمراں بہت زیادہ تلون پذیر تھا) قدیم دور کے سلطان اپنی غلطیوں پر اصرار کرتے تھے اور ان کے نتائج کا سامنا کرتے تھے تاکہ ان کے ملک کی رعیت انھیں ثابت قدم سمجھے اور ان پر تغیر پذیری کا الزام نہ لگائے۔ لیکن رسول اکرمؐ کے دین و دولت کے عظیم الرتبہ لوگ کہہ گئے ہیں "غلطی پر اصرار اور ثابت قدمی بذات خود ایک غلطی ہے اور غلطی سے پلٹنا سراسر دیانت داری ہے"۔ چنانچہ کامل حکمت والا سلطان اپنے تمام اقوال وافعال میں ثابت قدم ہوتا ہے اور اچھے اور صحیح راستہ کی طرف پشت کر کے نہیں کھڑا ہوتا۔ پھر بھی اگر اسے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے تو وہ اس سے رخ پھیرنے میں تامل نہیں کرتا۔ وہ دین کے احکامات کی حکم عدولی کر کے سزایاب نہیں ہونا چاہتا اور باغی سلطانوں کی روایات پر مذہب کے اصولوں کو ترجیح دیتا ہے۔

۳۔ تیسری برائی جو بادشاہت کی اعلیٰ خصوصیت سے میل نہیں کھاتی ہے وہ فریب یا مکر (عذر ومکر) "فریب" "مکر" (عذر ومکر) کے معنی ایک ہیں۔ فریب (عذر) کا سبب بے دینی اور تکبر ہے جب کہ "مکر" کی بنیاد ریاکاری اور کذب ہے۔۔۔ عظیم سلطانوں نے جنگوں اور لڑائیوں کے دوران ضرورت کے تحت، فریب، منافقت، گھاتوں اور شب خون سے کام لیا ہے لیکن انھوں نے اس طرح کے کاموں کو "فتح اور کامیابی" کے درجہ

---

[۱] یہ لغو ہے۔ خلیفہ عمر کے زمانہ میں مصر کا اپنا کوئی حکمراں نہیں تھا۔ یہ بازنطینی سلطنت کا صوبہ تھا۔ یہ بات بلاذری کی بہت مقبول تصنیف "فتوح البلدان" سے صاف ہو جاتی ہے جس کا یہ کہنا ہے کہ عمرو بن العاص نے مصر میں جس اعلیٰ ترین حکمراں کے خلاف جنگ کی، وہ یونانیوں کا سلطان (بازنطینی شہنشاہ) تھا۔ بلاذری نے مصر کے والی کا نام المقوقس بتایا ہے جو بازنطینی شہنشاہ کی طرف سے حکومت کر رہا تھا۔ یورپی علما اس کا تعین ہرکولس کے ماتحت اسکندریہ کے وائسرائے اور بڑے اسقف سائرس سے کرتے ہیں (ملاحظہ کیجیے ہٹی کا بلاذری کی فتوح البلدان کا انگریزی ترجمہ Origins of the Islamic State، جلد اول، ص ۳۴۵-۳۳۵، نیز دیکھیے میور کی Caliphate، ص ۱۶۷-۱۵۸۔

میں نہیں رکھا ہے اور ان پر فخر نہیں کیا ہے. انھوں نے ادنیٰ طریقوں سے کسی مقصد کے حصول کو سونا کامیوں سے بدتر تصور کیا ہے۔ . . (سلطان کے کاموں میں استواری ہونا چاہیے) اگر سلطان کسی پر نگاہ کرم کرتا ہے یا اسے خلعت عطا کرتا ہے یا اس کی تعریف کرتا ہے، یا کسی بھی وجہ سے اس کے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آتا ہے، یا اس سے انکساری سے گفتگو کرتا ہے تو اس طرح کے کاموں سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا ہے، اس کی زندگی، جائداد اور مال و اسباب محفوظ ہیں. اگر اس سے سو طرح سے گناہ سرزد ہوئے ہیں اور اسے سیاسی یا مال گزاری جرائم میں ماخوذ مجرموں کی فہرست میں رکھا گیا ہے تو جیسے ہی سلطان اس کی طرف لطف و کرم سے رخ کرتا ہے اسی لمحہ اس کے تمام جرائم میں معاف کیا ہوا سمجھ لینا چاہیے. سلطان کی طرف سے ایسے رویہ کی حقیقی ماہیت سے وہ حکمراں بخوبی واقف ہے جس کے خون اور رگوں میں بادشاہت ورانتاً چلی آ رہی ہے. اگر سلطان کسی بھی سبب یا وجہ سے ایک شخص پر عنایت کرتا ہے اور اس کے بعد اسے گرفتار کر لیتا ہے، یا اسے بیڑیاں پہنا دیتا ہے یا اسے خفیہ طور سے زہر دلوا دیتا ہے تو سمجھو کہ اس سلطان نے بادشاہت کی عظمت کو نہیں پہچانا. وہ ایک بے قیمت اور بے غیرت غاصب ہے جس کا اس زمین پر کوئی نام و نشان باقی رہے گا. فریب و مکر (غدر و مکر) دورخی، کذب، عیاریوں اور مکاریوں کا خوگر بادشاہت کا اہل نہیں ہے۔

۴. چوتھی ذمات جو بادشاہ کے زبردست اوصاف سے میل نہیں کھاتی اور جو سلطان میں ایک بہت بڑا عیب ہوتی ہے قہر و غصہ کا غلبہ (مغضوب) ہے. قہر و غصہ کا غلبہ (مغضوب) اور غصہ کرنا (غضب) دو مختلف چیزیں ہیں۔ کسی انسان میں غصہ اور زود رنجی کا ہونا فطری بات ہے اور مناسب موقع پر غصہ کا اظہار ایک خوبی ہے۔ لیکن جس وقت غصہ کسی انسان کی تمام خوبیوں پر مسلط ہوتا ہے تو آدمی مجسم قہر و غصہ (مغضوب) بن جاتا ہے۔ اور یہ ایک برائی ہے کیوں کہ غصہ کرنا (غضب) ایک درمیانہ خوبی ہے جب کہ غصہ کا غلبہ (مغضوب) اس کی انتہائی حد ہے. جب انسان کی کوئی خصوصیت درمیانی درجہ میں ہوتی ہے تو اس کا ایک خوبی کی حیثیت سے شمار ہوتا ہے. چنانچہ فراخدلی ایک انتہائی حد فضول خرچی ہے اور دوسری انتہا جزرسی اور بخل، فراخ دلی بذات خود درمیانہ درجہ میں آتی ہے. اگر انسان میں غصہ (غضب) نہ ہوتا تو وہ اپنے خطرناک دشمنوں سے نجات نہ پاسکتا اور ممنوعہ چیزوں پر نظر پڑنے پر اس کے اندر مزاحمت کا کوئی جذبہ نہ پیدا ہوتا. . . (یہاں کچھ جگہ چھوٹی ہوئی ہے اور اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ برنی اس شخص کا ذکر کرتا ہے جو اپنے ہی غصہ کا شکار ہے۔) جس انسان پر قہر و غصہ کا غلبہ ہوتا ہے اس کے قلب سے اس کے بے قابو غضب کے سبب دین کا خوف معدوم ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں جب وہ غصہ سے بے قابو ہوتا ہے اور محض اپنے غصہ کی تسکین چاہتا ہے تو وہ خدا اور رسول اور شریعت کے احکامات کو یکسر بھول جاتا ہے اور اسے روز محشر کا کوئی خوف نہیں رہتا۔

جب تک وہ اپنے غصہ کی تسکین نہیں کر لیتا اور اپنے غصہ کے نشانہ سے انتقام نہیں لے لیتا خواہ وہ صحیح راستہ پر ہو یا غلط، اسے اپنے اندر سکون نہیں محسوس ہوتا اور اس کا غصہ وقتاً فوقتاً اس کے دل میں امنڈتا رہتا ہے، چاہے وہ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کرتا ہو لیکن اس کا غصہ اپنا سر اٹھاتا ہے اور تسکین طلب کرتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے انتہائی غصہ کے سبب جبر اور غصہ سے بھرا ہوا انسان بدلہ لیتے وقت کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر وہ ہنس کر، کھا کر اور لطف اٹھا کر اپنے غصہ کو ہلکا نہیں کر سکتا۔ اگر اس کے پاس اپنے غصہ کے شکار پر اپنے غصہ سے تباہی لانے کی طاقت نہیں ہے تو وہ بیمار پڑ جاتا ہے یا پھر اس کے دماغ میں خلل آ جاتا ہے... یا وہ رنج، افسردگی اور پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ عوام سے اس طرح بدلہ لینے کی خواہش سے بادشاہت مستحکم نہیں رہ سکتی۔ کیوں کہ بادشاہت کا بیشتر حصہ شفقت، رحم، مہربانی اور معافی پر مشتمل ہوتا ہے اور قہر و غصہ کی انتہائی یعنی صفت، غضوب، ان اوصاف کے ساتھ میل نہیں کھا سکتی۔

۵۔ پانچویں رذالت جو بادشاہت کے بنیادی اوصاف سے میل نہیں کھاتی اور اگر ان میں شامل بھی ہے تو پریشانی، مصیبت، اور ذلت کا باعث ہے وہ غیر منصفوں کو ترقی دینا اور ظالموں کی پرورش ہے۔ (اس جگہ برنی کے جملے بیشتر مکرر ہیں)... بے انصافی اور انصاف میں ایک اختلاف ہے اگر انصاف کا وصف واقعی موجود ہے تو بے انصافی کی پرورش اور حوصلہ افزائی محال ہے۔... جب بھی کسی غیر منصف انسان پر عنایت ہوتی ہے تو اس نتیجہ میں بے انصافی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور بے انصافی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ عدل اس زمین سے اپنا بستر گول کر جاتا ہے۔... ایک عرصہ سے لوگ کہتے آئے ہیں کہ "ریاست کفر کے ساتھ تو رہ سکتی ہے لیکن بے انصافی کے ساتھ اس کا وجود نہیں رہ سکتا"۔ سلطان کی ناانصافی کی اس سے زیادہ کوئی واضح علامت نہیں ہے کہ وہ غیر منصف کو ترقی دے۔ (اس جگہ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے حجاج کو ترقی دینے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، حجاج بن یوسف نے اہل بیت کرام کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس نے مقدس کعبہ کو جلایا اور اسے منجنیق سے تباہ کیا۔)

(برنی اس نصیحت کے سلسلے میں ایک واقعہ بطور مثال پیش کرتا ہے، جو اس کے بیان کے مطابق تاریخ نوشیرواں میں درج ہے۔ قیصر روم یعنی بازنطینی شہنشاہ) نے دو ملکوں کے درمیان معاہدہ امن کو توڑ کر عجم کی سرحدوں کو لوٹا کھسوٹا۔ نوشیرواں قیصر کے خلاف کوچ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے وزیر بزرجمہر نے اسے مشورہ دیا کہ چوں کہ عجم کے علاقہ کو ابھی مستحکم نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے پہلے ایک سفیر بھیجنا زیادہ دانشمندانہ بات ہوگی، ایک موزوں سفیر روانہ کیا گیا اور قیصر نے اس کا خیر مقدم کیا۔ قیصر نے وہ قیدی تو رہا کر دیے جو وہ لے گیا تھا لیکن مال غنیمت کے سلسلے میں معذرت چاہی۔ اس نے اس کی وضاحت بھی کی

کہ اگر یہ میرے پاس ہوتا تو اسے واپس کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی لیکن اسے تو سپاہی آپس میں تقسیم کر چکے۔ علاوہ ازیں نوشیرواں کے سفیر کے مجوزہ خاکے کے مطابق ایک معاہدہ تیار کیا گیا جس پر قیصر نے اپنے دستخط کیے۔ تاہم سفیر نے نوشیرواں کے پاس معاہدہ پہنچانے والے ہرکارہ کے ہاتھ اس کے لیے ایک خفیہ خبر بھیجی: میرے خاندان سے میرے بیٹوں کی شادی کی تیاریاں کرنے کے لیے کہیئے کیوں کہ واپسی پر میں ان کی شادی کے لیے خراسان جاؤں گا؛ نوشیرواں نے اندازہ کر لیا کہ سفیر کا مقصد ناکامیاب ہو گیا ہے اور اس نے فوج کی کوچ کے لیے تیاریوں کا حکم دے دیا۔ نوشیرواں کے پاس واپس آ کر اس کے سفیر نے یہ کہا کہ "قیصر کاذب، تلون مزاج، اپنے قہر و غصہ کا غلام (مغضوب) اور غیر منصفوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے وہ غدار اور مکار بھی ہے۔")

نظریۂ امام پر نوٹ

(برنی کے تصور میں اس طرح کے اسماعیلی نظریہ کا آہستگی سے داخل ہو جانا حیرت انگیز ہے۔ سنیوں اور اثنا عشری شیعوں کے خیال کے مطابق سلطان اپنے علاوہ کسی کی نمائندگی نہیں کرتا ہے۔ اس موضوع پر دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ مثال کے طور پر یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا ہے کہ شاہ اسماعیل صفوی یا محمود غزنوی کسی غیر معروف لیکن معصوم امام کی طرف سے حکومت کرتے تھے۔ سنیوں کی شریعت کی کتابوں میں جہاں کہیں بھی امام کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا مطلب حقیقی، معتبر فرمانروا ہے اور اس سے مراد کوئی معصوم نہیں ہے۔ لیکن اسماعیلی فرقوں کا اعتقاد یہ ہے کہ جب امام مخفی ہوتا تھا تو اس کی طرف سے کوئی داعی کام کرتا تھا۔ لیکن داعی حکمراں یا سلطان کے بجائے امام کے مبلغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کوئی داعی جو کسی غیر معروف امام کے لیے تحریک چلا کر اور تبلیغ کر کے حکمراں بن جاتا تھا۔ وہ الموت کے علی ذکرہ السلام کی طرح اپنے کو سلطان اور امام دونوں اعلان کرنے کی طرف مائل ہوتا تھا۔ "معصوم امام" کا یہ نظریہ جس کی نمائندگی سلطان کرتا ہے برنی کے مجموعی طرز فکر سے اس حد تک جداگانہ ہے کہ میرے خیال میں اس جملہ کو بعد کے اضافہ کی حیثیت سے مسترد کر دینا چاہیئے۔ (ح)

نصیحت - ۲۴

تمام نصیحت کی اساس ـــ سلطان کی نجات نیاز مندی پر منحصر ہوتی ہے جس سے اس کا قلب معمور ہوتا ہے

(اس نصیحت کو سمجھنے کے لیے وہ سب باتیں ذہن نشین رکھنا چاہیئے جو برنی بادشاہت کے بارے میں

پہلے ہی کہہ چکا ہے۔ پہلے تو یہ کہ اسلام نے جن نیکیوں کی تعلیم دی ہے وہ براہ راست ان خوبیوں کی ضد ہیں جو ایک سلطان میں، اگر اسے اپنے منصبی فرائض مناسب طریقے سے انجام دینا ہیں، ہونا ہی چاہیئے۔ سلطان کی حیثیت سے وہ صاف طور پر اوصاف الٰہی کا دعویٰ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بادشاہت کے تمام دستور رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کی سنت کے برخلاف ہیں، پھر بھی برنی کو یہ امید ہے کہ سلطان نجات حاصل کرلے گا بشرطیکہ وہ اس کی تجویز کی ہوئی حکمت عملی پر چلے۔ لیکن خارجی کام کافی نہیں سلطان کو اپنے گناہوں کا احساس ہونا چاہیے اور ان کے لیے اسے پوری طرح نادم رہنا چاہیئے)

سلطان محمود نے کہا: اے فرزندگان محمود اور سلاطین اسلام! تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آدم اور بنی آدم کو خدا کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کیوں کہ قرآن پاک کہتا ہے: "ہم نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ ہماری عبادت کریں"[۵۲]

مختصراً نیاز مندی خشوع وخضوع، احتیاج اور عاجزی بندگی کے لازمی اوصاف ہیں۔ لیکن بادشاہت کی خصوصیات ان اوصاف کی مخالف اور بالکل برعکس ہیں۔ رعب ودبدبہ، عظمت، تکبر، شان وشوکت، تسلط اور برتری بھی، جو صرف خدا کی ذات کے لیے موزوں ہیں، بادشاہت کی لازمی خصوصیات میں شامل ہیں کسی انسان کے لیے اس سے زیادہ بڑی دشواری نہیں ہوسکتی کہ وہ امور حکومت کے انصرام کی غرض سے مخلوق کی تمام خوبیوں کو ایک طرف ڈال کر اٹھارہ ہزار عالموں کے پروردگار کے اوصاف میں شریک ہوجائے۔ لیکن اگر اس صورت حال میں جب کہ سلطان خدا کے اوصاف اپنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے سبب اپنے کو تمام انسانی خوبیوں سے محروم پاتا ہے۔ اگر وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا قلب انتہائی نیاز مندی اور عاجزی سے لبریز ہے جو انسان اور اس کی بندگی کے مخصوص اوصاف ہیں اور بادشاہت کی خوبیوں کے مخالف ہیں اور متضاد خوبیوں پر عمل کرنے کے باوجود وہ اپنے کو عرش الٰہی کے سامنے نہایت ادنیٰ اور نیاز مند محسوس کرتا ہے تو یہ آخرت میں اس کی نجات اور اعلیٰ درجات کی علامت ہے۔ اسلامی روایات (غیر معقولات) کے مطابق کرامات اولیاء اسی عجز اور نیاز مندی کے سبب ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

(اس نصیحت کے سلسلہ میں تین مثالیں دی گئی ہیں۔ (۱) تاریخ امم الاولین کو حسب ذیل بیان کے لیے بطور سند نقل کیا گیا ہے۔ آدم کے دو بیٹے تھے شیث اور کیمرث، جو جڑواں بھائی تھے۔ آدم کو خدا کی طرف سے یہ ہدایت ملی کہ شیث اور ان کی اولاد کو نبوت ملے گی اور وہ لوگوں کو راہ راست کی طرف رہنمائی

---

[۵۲] قرآن، سورہ ۵۱، آیت ۵۶

کریں گے جب کہ کیمرث اور اس کے بیٹے سلطان ہوں گے اور دنیا کو نظم و ضبط میں رکھیں گے۔ کیمرث نے محسوس کیا کہ اس کا اخلاق اس کی بادشاہت کے باعث گر رہا ہے۔ اس لیے اپنے بھائی کے سامنے اس نے بڑی آہ و زاری کی۔ لیکن شیث نے اس کی ڈھارس بندھائی: "تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ تم بھی خدا کی عنایت کی نظر سے پیدا کیے گئے ہو۔ تمہارے رعب و دبدبہ، عظمت، تسلط اور وقار کے سبب دنیا میں فلاح و بہبود ہے اور عوام ٹھیک طرح سے نظم و ضبط کے مطابق رہ رہے ہیں۔ شریعت کے احکامات جو مجھے وحی کے ذریعہ ملتے ہیں اس وقت تک نافذ کیے نہیں جاسکتے جب تک کہ سماج ڈھنگ سے منظم نہ ہو۔ اگر لوگ انتشار و تشتت کے شکار ہیں، اور مفلوک الحال اور مصیبت زدہ ہیں تو انھیں دین کے راستے پر چلنے کے لیے دعوت دینا ممکن نہ ہوگا۔" کیمرث کے اگلے سوال کے بارے میں کہ کس علامت سے وہ اپنی نجات کے بارے میں یقین کرسکتا ہے۔ حضرت شیث نے جواب میں فرمایا: "اگر تمہارا قلب دنیاوی معاملات سے ہٹا ہوا ہے اور خدا اور عالم بالا کی طرف راغب ہے اور تمہیں یہ یقین ہے کہ آخرت میں خدا کی معرفت اور اعلیٰ درجات کا حصول دنیاوی زندگی کی کامیابیوں سے مطابقت نہیں رکھتا ہے اور تمہارا قلب خدا سے التجا کرنے لگتا ہے اور یہ نیازمندی مسلسل تمہارے قلب کو لبریز رکھتی ہے تو تمہیں اس نیازمندی کو برکت اور نجات کی ایک علامت سمجھنا چاہیئے۔"

(سلطان محمود نے بیس سال تک کوشش کرنے کے بعد یہ روحانی درجہ حاصل کیا ہے۔ نیازمندی اور عاجزی محمود پر اس قدر حاوی ہے کہ وہ ایک لمحہ بھی اپنے قلب کو اس سے محروم نہیں محسوس کرتا۔ اس وجہ سے مناجات کے وقت اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے چلتے ہیں۔)

(حسب ذیل بیان تاریخ سکندری کی بنیاد پر دیا گیا ہے) سکندر نے ارض معکون کو فتح کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ یہ دنیا کسی بھی طرح پائیدار نہیں ہے اس کا دل حکومت کے کاروبار اور فتوحات سے ہٹ گیا۔ امور ریاست کی انجام دہی سے وہ کبیدہ خاطر اور متنفر ہوگیا۔ عظیم فاتح پر خدا اور اعلیٰ روحانی درجہ کی تمنا کا غلبہ رہنے لگا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بات تھی کہ حکومت کے کاروبار سے علیحدگی اس کے لیے ممکن نہ تھی چنانچہ اس نے اپنے نمایاں مذہبی پیشواؤں اور حکماء کو طلب کیا اور ان سے دریافت کیا کہ "مجھے اس دنیا کی کاملیتوں کو آخرت کی کاملیتوں کے ساتھ شامل کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟" انھوں نے اپنی معمول کی نصیحتوں کے مطابق جواب میں کہا کہ "دینی زندگی اور دنیاوی زندگی کے کمالات میں ایک تضاد ہے اور متضاد باتوں کا اتحاد عقل انسانی کے لیے ناقابل ادراک ہے۔" آخر میں سکندر کو یمن کے دو درویشوں سے ملنے کا مشورہ دیا گیا جنھوں نے بہت مختصر گفتگو کرنے کے بعد اس سے یہ کہا "مبارک ہو، سکندر کہ تم اپنی شاہی عظمت کے باوجود اپنے کو ایک ایسی روحانی حالت میں محسوس کرتے ہو کہ تمہارا سینہ نیازمندی سے لبریز رہتا ہے۔ ہم نے خدائے تعالیٰ

بھی ہوئی کتابوں میں پڑھا ہے کہ دنیا نیازمندی بادشاہ کے ساتھ شامل نہیں ہوسکتی پھر بھی اگر عنایت الٰہی کے ذریعہ خدا کی تمنا سلطان کے قلب کو اس طرح بے قابو کردیتی ہے اور نیازمندی اس کے سینہ کو اس طرح لبریز کردیتی ہے کہ یہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس نیازمندی سے خالی نہیں ہوتا تب یہ آخرت میں اعلیٰ درجات پر اس کی ترقی کی ایک علامت ہے۔"

(ضیاء الدین برنی کا اختتامیہ)

خدا کے رحم سے امید رکھتے ہوئے میں اس تصنیف کو، جسے میں نے فتاوائے جہاں داری عنوان دیا ہے، انتہائی عاجزی کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ میں اٹھارہ ہزار عالموں کے پروردگار سے دست بدعا ہوں کہ وہ میرے بے سہارا ہاتھوں کو میرے گناہوں کے گرداب سے باہر کھینچ لے اور اپنی رحمت عام کے وسیلے سے مجھے نجات کے ساحل سے ہمکنار کردے۔ اور جس طرح اس نے اپنے آفاقی رحم و کرم سے میرے سینہ کو جو کہ غموں کا خانہ تھا، نیازمندی، عاجزی اور بے کسی سے لبریز کیا ہے اسی طرح میرا خاتمہ اور تمام مسلمانوں کا خاتمہ ایمان پر ہو۔

"لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"

کلمۂ شہادت کی قسم میں انتہائی پریشان، دل شکستہ، لاچار اور حاجت مند ہوں۔ لیکن اپنی مفلسی کے باوجود میں دین و دولت اور علم و دانش کے ماہرین سے یہی درخواست کروں گا۔ سابق مصنفین نے فن حکمرانی اور احکام ریاست پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انھوں نے علم و فصاحت کی روایات کے ساتھ انصاف برتا ہے انھوں نے انشاء اور ادبی اختراعات اور فصاحت میں حیرت انگیز کمالات کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنی تصانیف کو نثر و نظم کے حوالوں سے آراستہ کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اصول حکومت کو، جو سلطانوں، وزیروں، ملکوں اور امیروں کے اقوال و افعال پر منحصر ہوتے ہیں اور یہی اقتدار اعلیٰ کی روح رواں ہے، دوسری جماعتوں کے احکامات سے خلط مبحث کردیا ہے۔

اور حکماء کو کتابوں میں ایسی کوئی تصنیف نہیں ملے گی جس کی ترتیب، وضع اور خاکہ فتاوائے جہانداری کے مطابق ہو۔ میں نے اس میں شروع سے آخر تک حکومت کے احکامات اور امور ریاست پر اصولوں اور مثالوں کے حوالوں کے ساتھ بحث و گفتگو کی ہے۔

خسرو جیسا شاعر ہر شہر میں نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو وہ اتنا ہر دلعزیز نہیں ہوسکتا۔

میں نے اس کتاب کی تصنیف میں بہت تکلیف اٹھائی ہے اور مختلف طریقوں سے غور و فکر کیے۔

آب حیات حاصل کرنے سے پیشتر مجھے اپنے جسم و جاں کو رسی بنانا پڑا ہے۔

انشاءاللہ ملک وسلطنت کے وزراء، امراء، اہل نظر مدبر، اور قابل مشیر۔ وہ جو آج زندہ موجود ہیں اور وہ جو عالم ارواح سے یکے بعد دیگرے روز قیامت تک آئیں گے۔ فتاوائے جہاں داری کو مطالعہ کی عزت بخشنے اور ان اصولوں، مثالی تصویروں اور مثالوں کو سمجھنے کے بعد جن کے متعلق جتنا بھی ممکنہ طور پر وضاحت سے یا اشاروں کنایوں میں کہہ دیا گیا ہے وہ اپنے منصفانہ اور ستائشی الفاظ کا اظہار ضرور ہی کریں گے۔

میں ایک گدا کی طرح اپنے تمام قارئین سے یہ استدعا کرتا ہوں کہ وہ میری زندگی میں اور پھر میری موت کے بعد میری مغفرت کے لیے خدا سے دعا کریں۔ انھیں میرے ساتھ وہ شفقت برتنا چاہیے جو عظیم لوگوں کا شیوہ ہے اور جس کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔ خدا کے بندو، میری مدد کرو اور خدا تمہاری بھی مدد کرے کیوں کہ میں بالکل لاچار معذور، تباہ اور گناہ گار ہوں۔ میں اپنی حالت کے بارے میں عوام کے سامنے کیا کہوں؟ میں ایک گناہ گار ہوں، میں ایک گناہ گار ہوں، میں ایک گناہ گار ہوں۔ میرے لیے اللہ کے رحم وکرم کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں ہے مجھے خدا کے پردے کے علاوہ، جو سب گناہ گاروں کا پردہ دار ہے، کہیں پناہ نہیں ہے۔

ضیاء الدین برنی کی حیات اور افکار

باب اول

مقدمہ

ایک مشہور عربی مقولہ ہے کہ "مردہ کو اچھائی سے یاد کرو" اور اس مقبول عام اصول کے نقش قدم پر چلتے ہوئے برنی کے ایک ہمعصر سید مبارک کرمانی نے، جو عام طور سے امیر خسرو کے نام سے مشہور ہیں، اپنی کتاب سیر الاولیاء کے پانچویں باب میں جو کہ ہندوستان میں چشتی صوفی سلسلے کی تاریخ کی ایک مستند کتاب ہے، ایک سوانحی نوٹ قلمبند کیا ہے۔[1] امیر خسرو جو برنی سے تقریباً بیس سال چھوٹے تھے اسے ذاتی طور پر جانتے تھے لیکن ان کے راستے جدا تھے۔ عام طور سے خصوصاً حکومت اور اس کے افسروں کے ساتھ کسی بھی قسم کے روابط قائم کرنے کے خلاف تھے اور شیخ فرید اور نظام الدین اولیا خاص طور سے اس اصول کے سخت پابند تھے۔ شیخ نظام الدین اولیا جیسا کہ سیر الاولیاء کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اسی اصول کی بنیاد پر محی الدین کاشانی سے اپنا خلافت نامہ واپس لے لیا کہ سلطان علاؤالدین نے (محی الدین کے فاقوں کی خبر سن کر) آراضی وجہ معاش کے ساتھ اودھ کی قضا کے لیے جو کہ ان کا موروثی عہدہ تھا، ان کے نام ایک خط

---

[1] سیر الاولیاء کے چوتھے باب میں امیر خسرو شیخ نظام الدین اولیاء کے دس خلفاء کا ذکر کرتے ہیں جنھیں صرف حضرت شیخ نے مرید کرنے کا اختیار دیا تھا۔ پانچویں باب میں وہ حضرت شیخ کے بیس مریدوں کی مختصر سوانح دیتے ہیں اور اس کے علاوہ انیس دوسرے مریدوں کی فہرست بھی درج کرتے ہیں جن کے بارے میں صرف ایک یا دو جملے ہی اختصار سے لکھ دیتا ہیں۔ ہمارے مصنف کو ایک صفحہ دیا گیا ہے (ص ۳۱۳-۳۱۲) سیر الاولیاء کے فارسی نسخے کو ۱۸۶۱ء میں دہلی کے ایک جلین چرنجی لال نے بھورے کاغذ پر چھاپا تھا۔ اس نسخہ کا دستیاب (باقی صفحہ پر)

بھیجا تھا؎ چشتی صوفیاء نے اپنے بلند مرتبت مریدوں کو ذریعہ معاش کے لیے صرف زمین احیا یا فتوح کی اجازت دی ہے۔ لیکن شیخ نظام الدین (حضرت شیخ) کے وصال کے بعد سلطان محمد بن تغلق نے تمام صوفیا کو اپنے قبضہ میں کرنے کا فیصلہ کیا اور سلطان کی دھمکیاں اور ترغیبیں حضرت شیخ کے حلقہ کو توڑنے میں کامیاب ہوگئیں۔ ان کے معتدر خلفاء نے جیسے شیخ نصیر الدین چراغ، شیخ شمس الدین یحیٰی، شیخ قطب الدین اور مولانا فخر الدین زرادی، حضرت شیخ کے اخلاقی اصولوں سے منحرف ہونے سے انکار کر دیا۔ انھیں حکومت سے، جسے وہ ایک گناہوں سے آلود تنظیم تصور کرتے تھے، کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ سلطان کی عنایات کے خواہاں نہیں تھے اور اس کے غیض و غضب سے نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن سلطان کی ترغیبیں ادنیٰ لوگوں کو جیتنے میں کامیاب ہوئیں۔ ان میں سے ایک امیر خسرو تھے جنھیں دکن میں عہدہ دیا گیا لیکن جب سلطان محمود کی حکومت دکن میں ختم ہوگئی تو امیر خسرو کے پاس دہلی واپس آنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ وہ ایک بڑے گناہ کے احساس کا معترف ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ وہ گناہ کیا تھا۔ یہ احساس گناہ اس وقت معدوم ہوگیا جب اس نے حضرت شیخ کو ایک خواب میں، جماعت خانہ کی چھت پر ٹھیک اسی مقام پر بیٹھے دیکھا جہاں وہ ہمیشہ بیٹھا کرتے تھے؎۔ اس کے بعد وہ شیخ نصیر الدین چراغ کی خدمت میں حاضر ہوا، جو بدلے ہوئے حالات میں حضرت شیخ کی روایات کو جاری رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اس طرح اس نے دوبارہ سلوک و تصوف کی راہ اختیار کر لی؎

خواجہ ضیاء الدین برنی کو سلطان محمد تغلق نے اپنے عہد کے دسویں سال میں ندیم مقرر کیا تھا اور سلطان محمد کی موت کے بعد جس طرح کے حالات میں وہ اپنے بلند رتبے سے گرا ان کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ لیکن برنی کے لیے

بقیہ حاشیہ: کرنا مشکل ہے۔ لاہور میں غلام احمد بریان کا اردو ترجمہ چھپا تھا۔ میں خلیق احمد نظامی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے چرنجی لال کا فارسی نسخہ مجھے مستعار دیا۔

؎ شیخ نظام الدین اولیاء کو جن کا انتقال ۲۵ ھ (۱۳۲۵ء) میں ہوا، دہلوی کہا جاتا ہے، یا دہلی کے نواحی علاقے کی نسبت سے جہاں ان کا قیام تھا غیاث پوری کہا جاتا ہے یا مقام پیدائش کی مناسبت سے بدایونی بھی پکارا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں وہ عام طور سے شیخ نظام الدین اولیاء کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ لقب صحیح نہیں ہے کیوں کہ اولیاء کے معنی صوفیاء ہیں نہ کہ صوفی۔ صوفی وقائع لکھنے والے ان عظیم ترین ہندوستانی صوفیاء کو القاب دینا بہت پسند کرتے تھے۔ امیر خسرو انھیں سلطان المشائخ کا خطاب دیتے ہیں۔ میں نے اپنے علی گڑھ کے رفقاء کے دستور ادب کے انھیں حضرت شیخ کے نام سے یاد کیا ہے۔

امیر خسرو کے دادا، جو کہ ایک تاجر تھے، شیخ فرید سے مرید ہوگئے تھے شیخ فرید کی رحلت کے بعد۔ (باقی صفحہ پر)

نعلسی اور روحانی آزادی کے اصولوں سے وابستہ صوفی حلقہ میں وابسی ممکن نہیں تھی اور حالاں کہ اسے دربار سے مکمل علیحدہ رکھا گیا پھر بھی وہ آخر تک وظیفہ یا عہدہ کا طالب رہا اور سلطان فیروز اور ملک کے دوسرے اعلیٰ افسروں سے درخواست کرتا رہا جنھوں نے اس کی غم ناک اور حسرت انگیز التجائیں سنی ان سنی کردیں۔ فیروز شاہ کے انتخاب کے لیے ذمہ دار نمایاں لوگوں میں برنی شیخ نصیرالدین کا نام بھی لیتا ہے لیکن شیخ سے ان کے دہلی واپس آنے کے بعد اس کی ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ ماضی کے سالوں میں شناسا رہے ہوں گے لیکن اب ان کی دنیائیں الگ تھیں۔ شیخ اپنی آزادی برقرار رکھنے پر مصر تھے اور موجودہ انتظامیہ پر لعنت ملامت کرتے تھے حالاں کہ صوفی روایت کے مطابق وہ سلطان وقت کا نام نہیں لیتے تھے ۔ دوسری طرف برنی سلطان

بقیہ حاشیہ: کرمانی خاندان دہلی آکر ان کے خلیفہ اکبر شیخ نظام الدین سے وابستہ ہوگیا۔ امیر خسرو خود کہتے ہیں کہ وہ اتنی کم عمری میں حضرت شیخ کے مرید ہوگئے تھے کہ وہ صوفی قواعد نہیں سمجھتے تھے۔ پھر بھی سیرالاولیاء میں خاص طور سے شیخ فرید اور شیخ نظام الدین کا ذکر ہے جن کے بارے میں وہ اپنے خاندان کے بزرگوں اور دونوں مشائخ کے حیات مریدوں سے بہت کچھ معلومات حاصل کرچکے تھے اس کے علاوہ مشہور شاعر امیر حسن سنجری نے حضرت شیخ کے ملفوظات کی پانچ مختصر جلدوں میں تلخیص کی۔ اور فوائدالفواد کے نام سے اس کو شائع کیا۔ یہ تصنیف مستند ہے۔ اس میں کرامات کا کوئی ذکر نہیں ہے اور حضرت شیخ نے بذات خود اشاعت سے پہلے اس پر نظر ثانی کی تھی۔

شیخ نصیرالدین چراغ اودھی کو عام طور سے حضرت شیخ کا خلیفہ اکبر سمجھا جاتا ہے۔ حمید قلندر نے خیرالمجالس میں شیخ نصیرالدین چراغ کے ایک سو ملفوظات درج کیے ہیں۔

۱۔ جماعت خانہ سے مراد صوفیاء کا مرکز ہے۔ اگر یہ ایک وسیع عمارت ہے اور جس میں ہر صوفی کے لیے ایک علیحدہ کمرہ ہے تو اسے خانقاہ کہیں گے۔ ۲۔ سیرالاولیاء، باب ۴، نمبر ۲ (شیخ نصیرالدین چراغ)

فوائدالفواد کو نول کشور اور دوسرے مطابع نے چھاپا ہے اور اس کا مولوی غلام احمد بریان نے اردو میں ترجمہ کیا ہے خیرالمجالس کے فارسی نسخہ کا ایک بہترین ایڈیشن خلیق احمد نظامی نے تیار کیا جو علی گڑھ شعبہ تاریخ سے شائع ہوا ہے۔

پانچویں باب میں سوانحی نوٹ کے علاوہ بھی سیرالاولیاء میں دو دوسری جگہوں پر ضیاءالدین برنی کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک جگہ تو برنی کے مفقود حسرت نامہ کے حوالہ سے برنی اور حضرت شیخ کے درمیان ہوئی ایک گفتگو نقل کی گئی ہے اور اس کا بھی ذکر ہے کہ سلطان محمد بن تغلق نے برنی کو فیروز شاہ کے ساتھ مع نقد انعام کے شیخ قطب الدین ہانسوی کے پاس بھیجا تھا لیکن وجہ کوئی بھی ہو فوائدالفواد یا خیرالمجالس میں برنی کا نام نظر نہیں آتا۔

۱۔ فوائدالفواد تمام ملفوظات کی تاریخیں دیتی ہے۔ ۳ شعبان ۷۰۰ھ (۲۹ جنوری ۱۳۰۷ء) سے ۱۱ رجب ۲۲ھ (باقی صفحہ پر)

توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے ایک کے بعد ایک کتاب لکھ رہا تھا۔

ان حالات کی روشنی میں امیر خسرو کے برنی سے متعلق (مندرجہ ذیل) سوانحی نوٹ کا جائزہ لینا چاہیے۔

"اور (شیخ نظام الدین کے مریدوں اور دوستوں) میں سے خواجہ ضیاء الدین برنی تھا جو خوش اسلوبی میں لاثانی اور روحانی طبیعت رکھنے والوں کے لیے پرلطف تھا۔ خواص و عوام اس کی ستائش کرتے تھے۔ اس کے پاس بلا کی ظرافت اور مزاح تھا۔ جن سماجی اجتماعات میں وہ موجود ہوتا ہر شخص کے کان اس کے روح کے لیے تازگی بخش الفاظ پر لگے رہتے۔ وہ مزاحیہ فقروں اور داستانوں کا قاموس تھا۔ علماء و مشائخ اور شعراء سے وابستگی کے سلسلے میں وہ بڑا اقبال مند تھا اور اولوالعزمی کے وصف سے متصف تھا۔ ان تمام (خوبیوں) کا سبب یہ تھا کہ اپنے باپ کی شفقت کی وجہ سے جو ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا اسے شیخ نظام الدین کے مرید ہونے کا فیض حاصل ہوا اور اس نے شیخ کی مثل بہشت دہلیز پر عقیدت کا سر رکھ دیا۔ اس نے غیاث پور میں سکونت اختیار کر لی اور جیسا کہ خود اس نے حسرت نامہ میں لکھا ہے کہ اسے حضرت شیخ کے حضور میں قربت اور عزت حاصل ہو گئی[۱] بعد ازاں اس کی اپنی خوش طبعی اور بے مثل فن مصاحبت کی وجہ سے دربار میں اس کا کوئی ثانی نہیں رہا سلطان محمد بن تغلق کے دربار میں (نور اللہ برہان) اور اس کے دوران عہد برنی کو اس مکار، بے وفا، اور فریبی دنیا کا بھرپور حصہ ملا۔ ستر سال کی عمر میں اس کے برے دن آئے تو اس نے اپنے التماس کے بعد فیروز شاہ کی لازوال حکومت سے (خدا اس کی حکومت اور سلطنت کو دوام بخشے) ضروریات زندگی حاصل کرنے کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ثنائے محمدی، صلوٰۃ کبیر، عنایت نامہ الٰہی، ماثر سادات، تاریخ فیروز شاہی اور اپنی دوسری لاجواب تصانیف میں الگ کر ان کی تکمیل کی۔

" یہ بزرگ اکثر سلطان الشعراء امیر خسرو اور سلطان العلماء امیر حسن کی صحبت میں رہتا اور ان کی صحبت

بقیہ حاشیہ: (۲۷ جولائی ۱۳۲۲ء) تک۔ لیکن موجود لوگوں میں سے کوئی بھی براہ راست یا بالواسطہ سلطان وقت علاؤ الدین خلجی کا ذکر نہیں کرتا ہے۔ البتہ حضرت شیخ نے بغیر کسی پس و پیش کے بلبن اور دور ماضی کے دوسرے سلطانوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح خیر المجالس میں جو ملفوظات درج کیے گئے ہیں ان میں نہ تو شیخ نصیر الدین اور نہ ہی موجود اشخاص میں سے کوئی دوسرا فرد فیروز شاہ کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن شیخ نصیر الدین زمانہ کے حالات کے متعلق تنقید میں قطعی آزاد ہیں اور علاؤ الدین اور اس کی اصطلاحات کی تعریف کرتے ہیں۔

[۱] ہمارا مصنف خود کو ہمیشہ ضیاء برنی کہتا ہے۔ لیکن اس کا پورا نام، جیسا کہ امیر خسرو جانتے تھے ضیاء الدین برنی تھا۔

سے بہت استفادہ کرتا تھا۔ ان خوبیوں کے علاوہ اس کے دل میں سادات کی محبت بہت مضبوط تھی۔ بالآخر کچھ دنوں کی علالت کے بعد ایک عاشق کے حوصلہ کے ساتھ اس نے اس دنیا سے عالم بالا کو کوچ کیا۔ مرتے وقت اس کے پاس اپنا کوئی ڈنگ یا درہم نہیں[1] تھا حتیٰ کہ وہ اپنے کپڑے بھی خیرات کر چکا تھا۔ اس کی لاش پر صرف ایک چادر تھی اور اس کے نیچے ایک بوریہ اور بس۔ بالآخر حضرت شیخ (یعنی نظام الدین اولیاءؒ) کی محبت کا اثر سلطانوں کی صحبت پر غالب ہوا اور اس کا خاتمہ اچھا ہوا۔ جیسا کہ انسان کو چاہیے وہ اس دنیا سے مفلس و نادار اٹھا۔ اسے حضرت شیخ کے روضہ میں اپنے شریف النفس باپ کے پائینتی دفن کیا گیا (خدا اس پر رحم فرمائے)۔"

یہ فیروز شاہ کی حکومت کا کوئی لائق تعریف کام نہیں تھا کہ اس نے ایک زبردست عالم کو قصداً اتنی مصیبت میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا لیکن امیر خسرو نے اپنے قلم کو بہکنے نہیں دیا ہے اور تمام معاملہ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ یہ دونوں بیان غلط ہیں کہ برنی خود ہی اپنی درخواست پر کنارہ کش ہوا اور یہ کہ اسے فیروز شاہ کی حکومت سے وظیفہ ملا۔ اس کے زوال کے اسباب پر تو بعد میں گفتگو ہوگی لیکن تاریخ فیروز شاہی میں کئی پیراگراف صاف طور پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ فیروز شاہ کے عہد میں اس نے انتہائی مفلسی میں زندگی گذاری اور غالباً لوگ اس سے گریز کرتے تھے، کیوں کہ حکومت، جس کی وہ مستقل تعریف کرتا رہا، اسے ناپسندیدگی سے دیکھتی تھی، وہ بار بار اپنی لاچاری اور غربت کے موضوع کو چھیڑتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کے حسب ذیل اقتباسات ان حالات کی کچھ تصویر پیش کریں گے جو محمد بن تغلق کی موت کے بعد اس کے ساتھ پیش آئے۔

۱۔ "اگر میں اس کی تفصیل میں جاؤں کہ کس طرح فلک ناکردگار اور ناساعد زمانہ نے مصنف کے ساتھ کھیل کھیلے ہیں تو مجھے شکایتوں کی دو جلدیں تیار کرنا ہوں گی اور آسمان کے نام بیوفائی کے کئی دفتر لکھنا ہوں گے۔" (ت۔ ف، ص ۶۹)

۲۔ "فلک نے میرے ساتھ ایسا برتاؤ کیا ہے جس کی کسی دارالحرب میں اجازت نہیں ہے" (ت۔ ف، ص ۱۱۴)

۳۔ "اور ان پشیمانیوں کے علاوہ جو میں نے ان سطروں میں بیان کی ہیں ایک اس سے بھی زیادہ بڑی پشیمانی میری منتظر ہے۔ میرے وقت اور زمانہ کا سلطان ۔۔ خدا کرے وہ ایک ہزار سال جیئے۔ تاریخ میں بہت دلچسپی رکھتا ہے اور اسے علم تاریخ میں کمال و جوہر کی سعادت حاصل ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟ میرے

---

[1] یعنی کوئی تانبے کا سکہ نہیں تھا۔

دشمنوں نے مجھے اس کے دربار اور حضور سے دور پھینک دیا ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس تاریخ (تاریخ فیروز شاہی) کو اس کی جلیل القدر آنکھوں کے سامنے پیش کر دوں۔ اگر یہ تاریخ، جسے میں نے صرف اس کے عظیم المرتبت نام سے ہی عزت نہیں دی ہے جس میں میں نے اس کے کارنامے، اس کے رفاہ عام کے کاموں اور (اس کے عہد کی) نیکیاں اور واقعات بھی درج کیے ہیں، اس کے روبرو پیش ہو اور وہ اس کا مطالعہ کرے تو میں اپنی تمام پشیمانیوں سے آزاد ہو جاؤں گا اور میرے دل میں اقبال سعادت کی کمی وجہ سے جس تمنّا کا بھی گذر ہوتا ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ خدا کی قسم جو غفور ورحیم اور قادر مطلق ہے، میں انتہائی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اور اس مصیبت میں قادر مطلق سے یہ دعا کرتا ہوں کہ اے مالک! میرے مصیبت زدہ ذہن اور میری بے چارگی اور غربت کا لحاظ کر کے مجھے ایک ایسا وسیلہ عطا فرما جس کے توسط سے یہ تاریخ جلالت مآب، سلطان عالم فیروز شاہ سلطان (خدا کرے اس کی حکومت اور سلطنت ہمیشہ باقی رہے) کی نظروں کے سامنے پیش کی جا سکے تاکہ میری یہ تمام محنت رائیگاں نہ جائے۔ اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔ وہ دعاؤں کو قبولیت بخشنے کی کامل قدرت رکھتا ہے" (ت، ف، ص ۱۲۵)

۴۔ فیروز شاہ کے عہد میں ملک کی عام بہبود کے مبالغہ آمیز بیان کے بعد ہمارا مصنف مزید اضافہ کرتا ہے۔ "فیروز شاہ کے عالی شان عہد میں میں خوشحال یا دولت مند، کفیل یا خوش نہیں ہوں کیوں کہ اس لحاظ سے میں ملک کے تمام دوسرے باشندوں سے یکتا و مختلف ہوں۔ حسب ذیل بات میرے علاوہ کسی دوسرے شخص پر صادق نہیں آتی۔ پرندے اور مچھلیاں بھی اپنے گھروں میں خوش ہیں لیکن نہیں ہوں تو میں!"

۵۔ تقدیر کے خلاف برنی کی شکایت کا خلاصہ حسب ذیل دو جملوں میں ملتا ہے، "نہ تو مجھے دینی امور میں امتیاز حاصل ہوا اور نہ ہی مجھے اپنی دنیاوی زندگی میں وہ خوش حالی نصیب ہوئی جو کہ ایک نفیس اور مہذب ذہن کی تسکین کر سکتی اور اب میں بوڑھا، اندھا، لاچار اور غریب ایک گوشہ میں محدود ہوں اور پشیمانیوں کے علاوہ میرے پاس کوئی سرمایہ نہیں اور اپنے ساتھ دوسری دنیا میں لے جانے کے لیے نامراد حسرتوں کے علاوہ کچھ نہیں۔"

یہ سطور فیروز شاہ کے عہد کے چھٹے سال میں قلم بند کی گئی تھیں جس وقت برنی کی عمر چوہتر (قمری) سال تھی۔ اگر وہ محمد تغلق سے پہلے مر گیا ہوتا تو اسے قسمت نے جو دیا تھا وہ اس سے مطمئن ہوتا۔ اس وقت اس کی زندگی پر مسرت اور امیرانہ تھی۔

باب ۲

تصانیف

انہتر سال کی عمر میں برنی ایک بہت بڑی بدنصیبی کا شکار ہوگیا اور جس بدنصیبی نے اسے زندگی کے تمام مادّی اسباب سے محروم کر دیا اسی کے سبب وہ بہت شکستہ دل، نامور اور موثر مصنف بن سکا گو کہ فکری سطح پر وہ کسی قدر گمراہ کن مفکر تھا۔

برنی کے ۱۳۵۱ء میں زوال کی تفصیلات کے سلسلے میں بعد میں گفتگو کی جائے گی۔ اہم واقعات وحقائق اس طرح ہیں۔ محمد بن تغلق سندھ کے ساحل پر مر گیا اور تین روز بعد فیروز شاہ تغلق کو سلطان منتخب کر لیا گیا۔ اس دوران دہلی میں وزیر خواجہ جہاں احمد ایاز نے کسی غلط اطلاع پر یقین کر کے ایک لڑکے کو سلطان کا بیٹا بتا کر اسے تخت نشین کر دیا۔ جب فیروز شاہ دہلی پہنچا تو نام نہاد بغاوت فرو ہوگئی اور خواجہ جہاں نے خودکشی کر لی۔ برنی یا تو قلعہ بھٹنیر کی طرف بھاگا یا وہیں دھر لیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے مقدمہ میں حکومت کے فیصلہ کے انتظار میں پانچ ماہ تشویش میں گزارے۔

اس مصیبت کے عالم میں برنی نے ایک اچھے مسلمان کی طرح اپنے گزشتہ گناہوں کے بارے میں سوچا اور س نتیجہ پر پہنچا کہ نجات حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ رسول اللہ کی سیرت مرتب کرے۔ چنانچہ اس نے ہایت عجلت میں ثنائے محمدی یا نعت محمدی لکھی۔ اس تصنیف کی اشاعت نہیں ہوئی۔ جہاں تک رسول اللہ کی ی سیرت کے متعلق صحیح معلومات کا سوال ہے اس سے زیادہ توقع نہیں وابستہ کرنا چاہیے۔ البتہ اس سے خود برنی ی زندگی پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ برنی مکمل طور پر اپنی یادداشت پر منحصر تھا۔ اس کی دسترس میں کسی قسم کی مستند تالیفات نہیں تھیں اور اس طرح کی صورت حال میں کوئی عالمانہ کام ممکن نہیں تھا۔ تاہم ثنائے محمدی کی تصنیف نا کوشش برنی کو، جو کہ اب تک فنون لطیفہ کا شائق اور ٹھلوا شخص تھا۔ ایک پختہ کار مصنف بنا دیا۔ اپنے

ضعف اور غربت کے باوجود اس نے اگلے چھ یا سات سالوں میں یکے بعد دیگرے کئی کتابیں لکھیں۔ انہتر (قمری) سال کی عمر میں جاکر وہ ایک اہم شغل اور مقصد حیات سے آگاہ ہو سکا۔ تاریخ عالم میں کچھ ہی لوگوں نے اپنی تصانیف کا سلسلہ اتنی تاخیر سے شروع کیا ہے۔

برنی کی اپنے انہتر سال کے بعد لکھی ہوئی نو کتابوں میں سے فتاوائے جہاں داری کے علاوہ دو کتابیں چھپی ہیں یعنی تاریخ برامکہ اور تاریخ فیروز شاہی۔[1] برنی نے جن حالات میں تصنیف کا کام کیا ہے۔ ان کے سلسلے میں پہلے ہی کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس کے پاس کوئی کتب خانہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی دوسرے ذرائع تھے۔ وہ اپنے قبضہ میں موجود یا مستعار لی ہوئی کتاب کا ترجمہ کر سکتا تھا۔ دوسرے کی کتاب پر مبنی ایک اپنی کتاب بھی لکھ سکتا تھا، اپنی یادداشت پر زور دے کر جو کچھ بھی ملتا اسے وہ لازمی طور پر کچھ اپنے تخلیق کیے ہوئے بے تاب تخیل کی آمیزش کے ساتھ اپنے قاری کو دے سکتا تھا۔ اور پھر آخر میں ایسے اصول قائم کر سکتا تھا جنھیں وہ انسانی فکر کا آخری کارنامہ سمجھتا تھا۔ لیکن کسی قسم کی تخلیق اس کے بس سے باہر کی بات تھی۔ حتیٰ کہ اسلامی تاریخ اور تاریخ ہند پر لکھی گئی مشہور و معروف تصانیف بھی اس کی دسترس میں نہیں تھیں۔ اس کے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا کہ کسی تاریخ یا واقعہ کے بارے میں یقینی ہو سکے۔ ایک متعلقہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا کہ برنی نے کس کے لیے لکھا؟ یہ واضح ہے کہ اس کی کچھ تصانیف فیروز شاہ کے لیے تھیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ ہمیں اس سلسلے میں شبہ میں نہیں چھوڑتا کہ اس نے بقائے دوام کے لیے لکھا حالاں کہ اس کی تصانیف صرف اشراف اور اعلیٰ نسب لوگوں کے لیے تھیں۔ لیکن کیا برنی نے کتب فروشوں کے لیے بھی لکھا؟ ثبوت ایجاب کی طرف مائل ہے۔ اسے اس خیال سے مسرت ہوتی ہے کہ جن لوگوں کو وہ ناپسند کرتا ہے ان کی کتابوں کی کوئی فروخت نہیں ہے۔

---

[1] جہاں تک ہم معلوم کر سکتے ہیں برنی نے حسب ذیل کتابیں لکھیں۔

(۱) ثنائے محمدی (۲) صلوٰۃ کبیر (۳) عنایت نامہ الہی (۴) مآثر سادات (۵) تاریخ فیروز شاہی (۶) لب التاریخ (۷) تاریخ برامکہ (۸) حسرت نامہ اور (۹) فتاوائے جہاں داری۔ امیر خسرو فتاوائے جہانداری سے، جو غالباً برنی کی آخری تصنیف ہے، ناواقف تھے۔ تاریخ برامکہ بمبئی میں لیتھو پر چھپ چکی ہے ۱۸۶۲ء میں بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے سرسید احمد خاں نے تاریخ فیروز شاہی مرتب کی۔ دونوں کتابیں اب چھپی ہوئی نہیں ملتیں۔ تاریخ فیروز شاہی کے فارسی نسخہ کو میرے محترم رفیق پروفیسر شیخ عبدالرشید مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے لیے مرتب کر رہے ہیں اور جلد اول (مقدمہ اور بلبن اور معزالدین کیقباد کے عہد پر مشتمل) دستیاب ہے۔

"قابل اعتماد لوگوں نے اپنی تاریخوں میں جو لکھا ہے اسے دوسروں نے قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ لیکن خود ساختہ اور کم اصل لوگوں نے جو لکھا ہے اس پر عقل مند بھروسہ نہیں کرتے ہیں۔ بے سرو پا لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں کتابوں کی دوکانوں پر پرانی ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں کاغذ کے تاجروں کو واپس کر دیا جاتا ہے اور کاغذ کو دھو کر صاف کر لیا جاتا ہے" [1] نیز اس کی کچھ تصانیف جیسے تاریخ برامکہ کتاب کے بازار کے نقطۂ نظر کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی تھیں۔

خلیفہ ہارون رشید نے جس طرح برامکہ کا خاتمہ کیا وہ خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ معزول خاندان سے وابستہ لوگ کئی سال تک مستقل خائف رہے اور برامکہ کی تعریف کرنا پرخطر خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن تیس سال گزر جانے کے بعد کسی ابوالقاسم طائفی نے قلم اٹھانے کا خطرہ مول لیا اور عظیم وزراء کے معزول خاندان کا ایک جائزہ قلم بند کیا۔ برنی کہتا ہے کہ مصنف کے باپ نے جعفر برمکی کے کسی آزاد غلام سے بات کی ہوگی لیکن جعفر کی موت کے تیس سالوں کے اندر لکھنے والے مصنف کے پاس معلومات کے دوسرے ذرائع بھی ہو سکتے تھے[2] طائفی کی عربی کتاب کو جو ظاہرہ موضوع پر پہلی کتاب ہے، بعد میں کسی ابو محمد عبید اللہ اثری نے بڑھا کر لکھا ہے[3]۔ اثری کی توسیع شدہ تصنیف کا سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں ابو محمد بن عبداللہ بن محمد نے فارسی میں ترجمہ کیا اور اسے سلطان کے سامنے پیش کیا گیا ہوگا۔" اصل عربی کتاب کا مصنف ابو محمد عبید اللہ بن محمد الاثری ہے اور خادم ضیاء برنی نے اس کا عربی سے پرلطف فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔" ظاہر ابو محمد کا ترجمہ دہلی کے بازار میں دستیاب تھا لیکن اس کا طرز بیان متروک ہو چکا تھا لہٰذا برنی اثری کی کتاب کا از سر نو ترجمہ کرنے میں حق بجانب تھا۔ ہمارا مصنف لکھتا ہے، خادم ضیاء برنی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۴۱

[2] ایک جگہ برنی طائفی سے اس کے باپ کے بتائے ہوئے کسی واقعہ کو نقل کرواتا ہے جس نے اسے یعقوب بن اسحاق ابراہیم بن صالح بن مہران) سے سنا تھا جو ہارون رشید کا ایک اعلیٰ افسر تھا (ص ۴۳) ایک دوسری جگہ طائفی کی حسب ذیل رائے نقل کی ہے" میں نے انھیں (برامکہ کو) نہیں دیکھا کیوں کہ ان فراخدل لوگوں کو اس جوانمرد کے ہاتھوں، جو اپنے کو خلیفہ کہتا ہے، ختم ہوئے ایک قرن (تیس سال) گزر چکا ہے۔

[3] یہ سوچنے کے لیے جواز ہے کہ عصری اثری نے برامکہ کے زوال کے ڈیڑھ سو سال بعد طائفی کی کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے توسیع دی کیوں کہ برنی کی تاریخ برامکہ میں حسب ذیل جملہ شامل ہے "آج اس واقعہ کو پیش آئے ہوئے ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں۔ عباسیوں کی حکومت میں کوئی استحکام باقی نہیں رہا ہے۔ ہر علاقہ کسی نہ کسی کے ہتھے لگ چکا ہے اور صرف عراق اور مصر اپنے دین دار فرمانرواؤں کی وجہ سے خلفاء کے ماتحت رہ گئے ہیں۔ حکمرانی اور براہ راست (باقی صفحہ پر)

نے برامکہ کا تذکرہ بیان کرنے میں بہت فائدہ محسوس کیا ہے اور اس لیے اس کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا ہے اگرچہ اس سے پہلے ایک فارسی ترجمہ ہو چکا ہے لیکن مصنف نقادوں کو دونوں تراجم کا موازنہ کرنے دعوت دیتا ہے۔

برنی کی تاریخ برامکہ برمکی خاندان کا محض خاکہ دیتی ہے اور صرف ایک خصوصیت پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ وہ ہے برامکہ کی تمام لوگوں اور ہر ایک شخص کے ساتھ فیاضی۔ یہ خاصا جانا پہچانا اور عام موضوع ہے۔ برمکی سخاوت کی کہانیاں یکے بعد دیگرے سلسلہ وار بیان کی گئی ہیں۔ وہ مال گزاری کے اعداد و شمار اور معمولی سمجھ کے لیے چیلنج اور ناقابل یقین باتیں ہیں۔ برنی لغو حکایتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جو برامکہ کے زوال کے ڈیڑھ سو سال بعد جمع ہو گئی تھیں، سلطان محمود کو بطور سند پیش کرتا ہے یہ دنیا سے چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ دین دار فرمانروا اور مجاہد سلطان محمود صداقت پسند اور اس معاملہ میں بہت حساس تھا۔ اس کی وسیع سلطنت میں کوئی بھی شخص ان سخی افراد کی فیاضی کے بارے میں مہمل حکایتوں کا ترجمہ کرنے اور انھیں اس کے سامنے پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ کسی حکایت کی صحت کے بارے میں اتفاق نہیں ہو جاتا تھا اس کا ترجمہ نہیں کیا جاتا تھا۔[1] پھر بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عباسیوں کے مجموعی ذرائع ان کے سلطنت کسانوں اور کاریگروں کی محنت کی پیداوار تک محدود تھے۔ اور برنی برمکہ سے جو تحائف منسوب کرتا ہے وہ اس رقم سے کہیں زیادہ ہیں۔ عباسی دور خلافت فلسفہ اور تہذیب اور اسلامی اور دینی علوم کی ترقی میں اپنی خدمات کے باعث دہلی سلطنت سے کہیں بدتر تاریخی مقام رکھتا ہے۔ تاہم خلافت عباسیہ کا زیادہ تر حصہ ایک ویران صحرا ہے جہاں سال میں تقریباً ۴ انچ طوفانی بارش ہوتی تھی۔ البتہ کچھ علاقوں پر عنایت تھی جیسے نیل کے ساحل اور جنوبی کیسپین علاقہ لیکن دوسرے مقامات پر لوگ مکمل طور پر مصنوعی آب پاشی پر منحصر تھے۔ ہارون رشید کے بغداد کے گرد ایک ایسا رومانی ہالہ کھنچا ہوا تھا جس کا قرون وسطیٰ کی دہلی مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کر سکتی۔ لیکن جہاں تک زندگی کی عام چیزوں مثلاً اناج، زر نقد، اشیاء اور مویشیوں کا سوال ہے علاؤ الدین کی سلطنت میں قابل کاشت زمین کا کافی بڑا رقبہ شامل تھا اور یہ خلافت عباسیہ کی زمین سے زیادہ غلہ پیدا کرتی تھی اور محمد بن تغلق نے بے مقصد تحائف میں جو پیسہ بہایا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو کبھی برامکہ کے پاس رہا ہوگا۔ لیکن برنی اپنے

بقیہ حاشیہ:- انتظامیہ کے تمام حقوق پوری طرح معدوم ہو گئے ہیں۔

[1] تاریخ برامکہ، ص ۱۱۲۔

پنے زوال کے بعد عظیم لوگوں کی سخاوت لکھنے کے لیے بے چین تھا اور رازی کی عربی کتاب میں اسے اپنے حسب مقصد مناسب موضوع مل گیا۔[1]

تاریخ برامکہ کے مقدمہ میں برنی اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ قفال کی تاریخ محمودی کا مطالعہ کر رہا تھا وہ تاریخ فیروز شاہی میں (قفال کا نام لیے بغیر) تاریخ محمودی کو ان کتابوں میں رکھتا ہے جن سے سلطان محمد بن تغلق بخوبی واقف تھا۔[2] اس کتاب کا کوئی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے لیکن اس واقعہ کی روشنی میں کہ محمود پر تصنیف کی ہوئی یہی ایک کتاب ایسی معلوم ہوتی ہے جس تک برنی کی دسترس تھی اور یہ کہ اس نے محمود کے دور کے بارے میں بہت ناکافی واقعات اور بکثرت غلط معلومات فراہم کیں اور برنی کی یہ رائے زنی کہ محمود چوں کہ شافعی تھا لہٰذا ذمیوں کو حنفی شریعت کے دیے گئے حقوق کا احترام کرنے کے لیے مجبور نہیں تھا، یہ موضوع ایک تفصیلی جائزہ کا متحق ہو جاتا ہے۔

ابن خلکان (۱۲۸۲ - ۱۲۱۱ء) اپنی وفیات میں قفال کے بارے میں حسب ذیل معلومات دیتا ہے۔[3] "ابوبکر عبداللہ احمد بن عبداللہ القفال المروزی (مرو کا باشندہ) جو کہ شافعی مسلک کا عالم تھا، اپنے زمانہ میں علم فقہ، علوم دین اور نفس کشی میں کامل نمونہ تھا۔ کافی تعداد میں لوگوں نے اس کے درس سے استفادہ کیا اور ان لوگوں میں ابوعلی السنجی، قاضی حسین اور امام الحرمین کے والد ابو محمد الجوینی شامل تھے۔ یہ سب لوگ بڑے ممتاز امام ہوئے۔ انھوں نے کافی سبق آموز کتابیں تصنیف کیں۔ اسلامی سلطنت کے مختلف ممالک میں شافعی نظریات کی اشاعت کی اور دوسروں کو ان کی تعلیم دی۔ نتیجہ میں یہ بھی امام کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ القفال نے جس وقت فقہ کا مطالعہ شروع کیا اس کی عمر کافی زیادہ ہو چکی تھی۔ اپنی جوانی اس نے قفل بنانے میں گزار دی۔ اس فن میں اسے بہت مہارت حاصل تھی اور اسی وجہ سے اسے القفال کے خاندانی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب اس نے فقہ کا مطالعہ شروع کیا اس وقت اس کی عمر تیس سال تھی۔ اس نے ابن الحدّاد المصری کے فقہ کے ثانوی اصولوں سے متعلق رسالہ پر جس پر ابوعلی السنجی اور ابوطیب الطبری نے بھی شرحیں لکھی ہیں، ایک شرح لکھی۔۔۔۔ القفال کا ۴۱۷ھ (۲۷-۱۰۲۶ء) میں نوے سال کی عمر میں انتقال ہوا اور اسے سجستان میں دفن کیا گیا جہاں اس کا مقبرہ آج بھی بہت مشہور ہے اور اسے مقدس مقام کی حیثیت حاصل ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔" ابن خلکان محمود پر لکھی گئی کسی کتاب کو مولانا قفال

---

[1] تاریخ برامکہ ص ۱۱۲

[2] یہ جملہ افسر بیگم کے ترجمہ میں افسوس ناک چوک کی وجہ سے چھوٹ گیا ہے۔

[3] وفیات کا B. M. G. De Slane نے عربی سے ترجمہ کیا اور Bernard Quaritch نے ۱۵ پکیڈلی، لندن سے ۱۸۶۸ء میں شائع کیا۔ ج ۲، ص ۲۶۔

کے نام سے منسوب نہیں کرتا. اگر ایسی کسی کتاب کا وجود رہا ہوتا تو ابن خلکان اس سے ناواقف نہیں ہوتا.

ابن خلکان نے امام الحرمین جن کے باپ قفال کے شاگرد تھے ان کی منیث الخلق فی اختیار الحق (جلد دوم ص ۲۶) کی سند پر اس ناشائستہ چال کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعہ سلطان محمود کو شافعی مسلک میں تبدیل کر لیا گیا تھا. سلطان محمود نے یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ دونوں مسلکوں میں سے کونسا صحیح تھا حنفی اور شافعی علماء کی ایک نشست منعقد کی. ابن خلکان لکھتا ہے کہ "یہ علماء اس پر متفق تھے کہ سلطان کے سامنے دونوں مسلکوں کے مطابق) دو رکعت نماز پڑھی جائے تاکہ وہ اس کا جائزہ لے اور غور و فکر کے بعد وہی مسلک اختیار کرے جو بہتر ہو. القفّال المروزی نے یہ نمازیں ادا کیں [۱] قفال نے شافعی قواعد کے مطابق دو رکعت نماز بہت انہماک اور شائستگی سے پڑھی. اس کے بعد اس نے ابو حنیفہ کے ہدایت کیے ہوئے طریقہ کے مطابق دو رکعت نماز کی ابتدا کی اور کتے کی چکنی چمڑی کھال زیب تن کر کے اور اپنے جسم کے ایک چوتھائی حصہ پر کیچڑ کی لیپ لگا کر کھجور کی شراب سے وضو کیا (ملک میں اس وقت آب و تاب کی گرمی پڑ رہی تھی اس لیے بہت جلدی اس پر مکھی مچھر بھنکنے لگے.

وضو میں ترتیب الٹی رکھی [۲] اور قبلہ رخ ہو کر بغیر نیت کیے ہوئے نماز شروع کر دی. اس کے بعد اس نے فارسی میں تکبیر پڑھی. اور پھر اس نے قرآن کی اس آیت کو فارسی میں پڑھا دو برگ سبز، اور قیام کیا اور دو مرتبہ رکوع میں گیا جس طرح مرغ دانا چگتا ہے اور ان ارکان کی ادائیگی میں کوئی وقفہ نہیں دیا. اس کے بعد اس نے دو مرتبہ تشہد پڑھا اور سلام پڑھے بغیر گردن جھٹکی اور ریاح خارج کر کے نماز ختم کر دی [۳] اور تب اس نے سلطان سے مخاطب ہو کر کہا کہ

---

۱ ابن خلکان کی وفیات De Slane ، جلد ۲، ص ۳۳۴

۲ یعنی الٹی ترتیب سے. ہاتھ دھونے کے بجائے پاؤں دھونے سے شروع کیا.

۳ ابن خلکان. ج ۲. ص ۳۳۶. دی سلین نے (ج ۲، ص ۳۲۶) قفال کی حنفی طریقہ نماز کی مضحکہ خیز نقل کی اہم خصوصیات کی حسب ذیل وضاحت کی ہے، حنفی نظریہ کے مطابق سور کے علاوہ ہر جانور کی پکی ہوئی کھال پاک ہے. نبیذ کے علاوہ ہر درخت اور پھل سے کھینچا ہوا عرق ناپاک ہے" (قفال نے ہاتھ، منہ، پاؤں وغیرہ دھونے کے عام طریقہ کو اس بنیاد پر الٹ دیا کہ حنفی فقہ میں دھونے کی ترتیب میں تبدیلی سے وضو بے ضابطہ نہیں قرار پاتا. حنفی فقہ کے مطابق نماز کی نیت الفاظ سے ادا کرنا بہتر ہے اور اپنی مادری زبان میں نیت کرنے کو ترجیح دی ہے لیکن الفاظ سے ادا کیے بغیر بھی نیت کافی ہے - دو برگ سبز، الفاظ مدھامتان (قرآن، الرحمن سورۃ ۵۵ آیت ۶۴) کا فارسی ترجمہ ہے. امام ابو حنیفہ ایک رکعت کے لیے کم سے کم تین آیات قرآن کا تعین کرتے ہیں لیکن قفال نے انھیں تین الفاظ سے مراد لیا ہے. حنفیوں نے اپنی مادری زبان میں نماز کی اجازت دی ہے تاکہ عام حد سے ایسا نہیں ہوتا ہے شافعی نماز میں آیات قرآن کے ترجمہ کی اجازت

"اے سلطان یہی ابو حنیفہ کی نماز کا طریقہ ہے۔" سلطان نے جواب میں کہا، اگر ایسا نہیں ہوا تو میں تمہیں مار ڈالوں گا کیوں کہ کوئی بھی دین دار انسان ایسی نماز کی اجازت نہیں دے گا۔ حنفی علماء نے اس طریقہ نماز کو اپنے امام کا طریقہ ماننے سے انکار کیا جس کے بعد قفال نے ابو حنیفہ کی کتابیں طلب کیں اور سلطان نے ایک عیسائی کاتب سے ہر ایک امام کے طریقے کو بآواز بلند پڑھنے کا حکم دیا۔ معلوم یہ ہوا کہ قفال نے جس طریقہ نماز کو پیش کیا تھا واقعی اس کی ابو حنیفہ نے اجازت دی تھی اور سلطان نے حنفی طریقہ عمل کو شافعی طرز عمل کے مقابلہ میں ترک کر دیا۔"[1]

یہ واقعہ اگر صحیح بیان کیا گیا ہے تو اس سے کسی بھی طرح سلطان محمود یا مولانا قفال کی عزت افزائی نہیں ہوتی۔ لیکن سلطان محمود کے گرد جو روایات نمودار ہوئیں ان میں اس کی شافعی مسلک میں تبدیلی کو مولانا قفال سے منسوب کیا گیا تھا اور کسی شخص کو مولانا قفال کے نام سے سلطان محمود پر ایک کتاب لکھنے کا شاندار خیال آگیا۔ اس عہد کی دوسری جعلی تاریخوں کی طرح یہ بھی کچھ عرصہ کے لیے مشہور ہوئی اور غالباً اس سے برنی کو فتاوائے جہانداری کو موجودہ شکل میں لکھنے کی تحریک ہوئی۔ لیکن اسے عالم طبقہ نے قبول نہیں کیا اور یہ بازار سے غائب ہوگئی۔ متاخرین جیسے نظام الدین احمد بخشی اور فرشتہ تاریخ محمودی کا حوالہ نہیں دیتے ہیں

گزشتہ چھ صدیوں سے ضیاء الدین برنی کی ایک مورخ کی حیثیت سے شہرت پوری طرح اس کی تاریخ فیروز شاہی پر منحصر رہی ہے جو دہلی سلطنت کی بلبن کی تخت نشینی سے لے کر فیروز شاہ کے عہد کے چھٹے سال تک نوّے سال کے عرصہ کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں بڑی کوتاہیاں ہیں۔ کچھ بہت اہم موضوعات پر اس نے بعد کے ہر مورخ کو گمراہ کیا ہے لیکن پھر بھی قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی کسی فارسی تاریخ کو اس کے برابر جگہ دینا مشکل ہے۔ اس کی وجہ سیدھی اور صاف ہے۔ برنی کے لیے تاریخ کوئی روداد یا واقعہ نگاری یا کوئی کہانی نہیں تھی۔ یہ یقیناً ایک علم تھا یعنی سماجی نظام کا علم اور اس کی بنیاد دین یا روایت نہیں بلکہ مشاہدہ اور تجربہ تھا۔ کسی پہلے کے مسلم مورخ کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ بعد کے بہت تھوڑے مورخین برنی کے معیار پر آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برنی کے بنیادی اصولوں یا اس کے نتائج کو تسلیم کرنے کے لیے ہم پر کوئی پابندی عاید کی گئی ہے لیکن ہمیں برنی کی تعریف کرنا چاہیے کہ اس نے سماجی نظام کو باقاعدہ سمجھنے کے لیے مخلصانہ کوشش کی۔ اس کی ذاتی پریشانیوں نے اسے حیرت انگیز بصارت عطا کر دی تھی۔

بقیہ حاشیہ: نہیں دیتے ہیں۔ حنفی فقہ میں ریاح خارج ہونے سے نماز نہیں ہوتی۔ قفال نے اس معاملہ میں حنفیوں کے متعلق غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

[1] ابن خلکان۔ ج ۳، ص ص ۳۳۵، ۳۳۴

تاریخ فیروز شاہی کو بہترین طور پر سمجھنے کے لئے اس کے دو نقائص کے جائزہ سے آغاز کرنا چاہیے (۱) برنی کہتا ہے کہ اس نے ۷۵۸ھ (۷-۱۳۵۶ء) میں، اپنے زوال کے چھ سال بعد جس وقت وہ مفلسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی کا اختتام کیا۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا اس نے کسی بھی طرح کی دستاویزات جمع کی تھیں، روزنامچہ رکھا تھا یا اپنی مجوزہ تاریخ لکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً کوئی یادداشت تیار کی تھی؟ جواب نفی میں ہی ملتا ہے۔ برنی کا اپنے زوال کے بعد تاریخ لکھنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ تاریخ فیروز شاہی کے مقدمہ میں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس کا اصل ارادہ تو یہ تھا کہ آدم کے وقت سے لے کر اپنے زمانہ تک پھیلی ہوئی ایک تاریخ عالم لکھے اور اسے فیروز شاہ سے منسوب کرے، لیکن ایسا سوچتے وقت مجھے یاد آیا کہ دہلی میں صدر جہاں منہاج الدین جرجانی بے مثل عمدگی کے ساتھ طبقات ناصری لکھ چکا ہے[1]۔ طبقات ناصری ۲۳ طبقات پر مشتمل ہے اور یہ آدم کے وقت سے لے کر سلطان ناصر الدین کے زمانہ تک کی تاریخ نوع انسان کا احاطہ کرتی ہے برنی بہت صحیح سمجھ پر پہنچا کہ اگر اس نے محض طبقات ناصری کے واقعات کو اپنی زبان میں دہرا دیا تو اس کی محنت ضائع ہو جائے گی اور اگر اس نے کچھ مختلف چیز لکھی تو عوام اسے بدتمیز اور گستاخ سمجھیں گے اور قاری کے ذہن میں طبقات ناصری کی صحت کے بارے میں شبہات بھی پیدا ہو جائیں گے۔" اس رائے زنی کا پورا مفہوم سمجھنے کے لیے ہمیں یہ ذہن نشین کرنا چاہیے کہ برنی نے اس وقت مروجہ جعلی تاریخوں سے جو حقائق جمع کیے وہ طبقات ناصری کی براہ راست تردید کرتے تھے۔ چنانچہ برنی نے عقلمندی سے اس جگہ سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا جہاں طبقات ناصری ختم ہوتی تھی۔ برنی اکثر بیشتر طویل گفتگوئیں اور نصیحتیں قلم بند کرتا ہے لیکن وہ اس کے پاس موجود کسی دستاویز پر مبنی نہیں تھیں۔ وہ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "تاریخ کے حقائق سند پر مبنی نہیں ہیں[2]۔" اس اصول کو عام اصول کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن برنی جیسے غیر سرکاری مورخ کے پاس، جو عصری واقعات قلم بند کرتا ہے اور جس کی حکومت کے دفتر خانوں تک رسائی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ مقبول عام حقائق کو قلم بند کرے یا ان افراد سے، جن کے نام وہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ جو کچھ سن رکھا ہے اسے درج کرے۔

(۲) برنی بار بار عظیم مسلم مورخین مثلاً طبری، بیہقی، عتبی وغیرہ کا حوالہ دیتا ہے۔ بہت افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ یا تو اس نے ان کی کتابوں کو پڑھا ہی نہیں یا انھیں یکسر بھلا دیا۔ اس موضوع پر پہلے ہی گفتگو کی جا چکی ہے۔ دہلی سلطنت کی تاریخ کے سلسلے برنی ذیل کے چار مصنفین کو مستند مانتا ہے یعنی خواجہ صدر نظامی مصنف

---

[1] فیروز شاہی، ص ص ۲۱-۲۰

[2] تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۳

تاج المعاصر، مولانا صدرالدین عوفی مصنف جامع الحکایات، منہاج الدین جرجانی مصنف طبقات ناصری اور کبیرالدین عراقی بن تاج الدین عراقی جس نے سلطان علاؤالدین کی حیات میں اپنے اعجاز رقم قلم سے اس کے فتح نامے لکھے [۸۰] ان میں سے صرف آخری تصنیف ہی تاریخ فیروز شاہی کے زمانہ سے متعلق ہے لیکن دوسری تصانیف بھی تھیں جیسے امیر خسرو کی تاریخی مثنویات اور ان ہی کی دو نثریہ تصانیف خزائن الفتوح اور اعجاز خسروی (۵ جلدیں) امیر حسن کا دیوان اور امیر خسرو کے پانچ دیوان بمعہ مقدمات بہ انداز نثر اس کے لیے مددگار ہوئے۔ کیا برنی نے کسی تاریخ کے بارے میں یقین کرنے کے لیے یا کسی واقعہ کی تحقیق کے لیے ان کتابوں میں سے کسی کے اوراق پر کبھی نگاہ ڈالی۔ ایک مرتبہ پھر جواب نفی ہیں ملتا ہے اگر برنی نے تصنیف کے وقت خزائن الفتوح کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ ملک کافور کے جنوبی حملوں کے بارے ہمیں زیادہ صحیح معلومات دیتا۔ اسی کتاب اور اس کے علاوہ خسرو کی دیول رانی خضر خانی کے شروع کے حصہ کی مدد سے برنی نے علاؤالدین خلجی کے منگولوں کے ساتھ تنازعات کا ذکر بھی زیادہ مبہم نہیں کیا ہوتا [۸۱]۔ تاریخ فیروز شاہی میں کسی بھی دستیاب مواد سے استفادہ نہیں کیا گیا خواہ یہ کتابیں ہوں یا

---

[۸۰] فیروز شاہی، ص ۳۶۱

[۸۱] کبیرالدین عراقی کے فتح ناموں کی جلدوں کی تعریف کرنے کے بعد ضیاءالدین برنی حسب ذیل خامیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے (الف) کبیرالدین صرف علاؤالدین کی فتوحات ہی بیان کرتا ہے اور اس کی شکستوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا (ب) اس نے تعریف اور خوشامد کا سہارا لیا ہے اور مورخین کی روایت کی تقلید نہیں کی ہے جو انسانوں کے اچھے برے دونوں کاموں کو قلمبند کرتے ہیں (ج) کیوں کہ اس تصنیف کی ہر جلد علاؤالدین کے عہد میں لکھی گئی تھی اور اسی فرمانروا کے سامنے پیش کی گئی تھی، لہذا اس کے پاس خوشامد کے علاوہ دوسرا راستہ نہیں تھا۔ (د) برنی کبیرالدین کی فارسی اور عربی نثر کی تعریف کرتا ہے لیکن اس سے اس کی یہ مراد ہے کہ یہ طرز بیان تاریخی تصانیف کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ اب یہ ملاحظہ ہو کہ امیر خسرو کی خزائن الفتوح (جس کا میں نے Campigns of Alauddin Khilji کے عنوان کے تحت بہ زبان انگریزی ترجمہ کیا ہے) کا شروع کا حصہ کبیرالدین کی تصنیف کا خلاصہ ہے لیکن اس کے بعد کے حصہ میں ملک کافور کی دکن مہمات کا مفصل ذکر کیا گیا ہے بہت ممکن ہے کہ کبیرالدین مرچکا تھا اور امیر خسرو نے یا تو اپنی ہی اختراع سے یا علاؤالدین کے حکم کے بموجب اس کی تصنیف کو جاری رکھا۔ یہ یقیناً اس نقطہ نظر سے لکھا گیا تھا جیسے کہ اسے سلطان کے سامنے پیش کیا جانا تھا۔ خسرو کی خزائن الفتوح میں کبیرالدین کی تصنیف کے تمام نقص موجود ہیں۔ برنی کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی لیکن اسے خسرو کی تصنیف کی کافی خامیاں ظاہرہ یاد رہ گئی تھیں۔ اس لیے ان کی تلافی کی غرض سے اس نے قتلغ خواجہ اور طرغی کے حملوں کا مفصل ذکر کیا ہے (باقی صفحہ پر)

دستاویزات جیسے فتح نامے جن کی بہت اشاعت کی گئی تھی اور جو اس کے زمانے سے متعلق تھے۔ مصنف کے پاس اپنے قلم، سیاہی اور کاغذ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

تاہم تاریخ فیروز شاہی ایک عظیم تصنیف ہے اور اس کے مثبت پہلوؤں پر نظر ڈالنا بے سود نہیں ہوگا۔

(۱) تاریخ فیروز شاہی انسانی یادداشت کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ مصنف ہر اس چیز کو جس کا اس نے بذات خود مشاہدہ کیا تھا اور ہر وہ چیز جو اس نے پچھلی نسل سے سنی تھی قلم بند کرتا ہے۔ خامیاں تو واقعی ہیں۔ کہیں اس کی یادداشت اسے مغالطہ میں ڈال دیتی ہے جیسا کہ اس کے کلی کی جنگ کے ذکر کے ساتھ ہوا ہے[1]۔ اسی طرح اس کی یہ داستان کہ سلطان علاؤالدین ایک نیا دین قائم کرنا چاہتا تھا یا تو اس کے بڑھاپے کے بے چین تخیل کا وہم ہے یا اس کی جوانی میں فراہم شدہ غلط اطلاعات پر مبنی ہے۔ ہمارے پاس خود برنی کی سند موجود ہے کہ علاؤالدین عبادات کے طریقہ ادائیگی سے واقف تھا، پھر بھی اس نے کبھی روزہ نہیں رکھا اور جمعہ کی نماز میں بھی حاضر نہیں ہوا جو کہ ایسا فرض تھا جسے بہت ہی کم مسلم سلاطین نے چھوڑنے کی جرأت کی۔ برنی اور خسرو دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں علاءالدین اسماعیلی اباحتیوں کا بہت شدید مخالف تھا اور جب بھی کوئی اسماعیلی کھوج لیا جاتا تھا تو سلطان کے احکام کے بموجب آری سے اس کے جسم کے دو حصے کر دیے جاتے۔ علاءالدین روزہ نماز میں غفلت برت سکتا تھا جیسا کہ برنی افسوس کے ساتھ لکھتا ہے لیکن اس کا ایمان صحیح سالم تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ علاؤالدین جاہلوں کی طرح روایتی اسلام میں پختہ اعتماد رکھتا تھا۔ نہ تو وہ بدعقیدہ یا بددین انسانوں کے عقائد جانتا تھا، نہ ان کے بارے میں اس نے کچھ سنا تھا اور نہ ہی انھیں برتتا تھا۔ ظاہر ہے روایتی اسلام پر اتنی صداقت سے گامزن

بقیہ حاشیہ: خسرو نے خزائن الفتوح اور دیول رانی دونوں میں ان حملوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

[1] عصامی فتوح السلاطین میں یہ واضح کر دیتا ہے کہ ظفر خاں نے جو لشکر دہلی کے دائیں پہلو کی کمان سنبھالے ہوئے تھا، اپنے ہی فیصلہ پر اور علاءالدین کے اس سخت حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قتلغ خواجہ پر حملہ کر دیا تھا کہ نہایت نازک فوجی صورت حال کے پیش نظر دشمن پر اس کی اجازت کے بغیر حملہ نہیں کرنا چاہیے جب کہ صرف شکست ہی نہیں بلکہ برابر پر جنگ کے خاتمہ کا مطلب بھی مکمل تباہی ہو سکتا ہے۔ علاءالدین نے یہ حکم صادر کیا تھا کہ "اگر فرمانروا کے حکم کے بغیر کوئی بھی افسر پیش قدمی کرے گا تو اس کا سر اس کے جسم سے جدا کر دیا جائے گا"۔ علاءالدین یا الغ خاں پر اس وقت ظفر خاں کی تقلید نہ کرنے پر کوئی الزام نہیں لگانا چاہیے جب وہ منگول قطاروں کے ایک حصہ کو چھانٹتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا کیوں کہ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ دہلی کے غیر قلعہ بند شہر کی حفاظت کی جائے لہٰذا وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ظفر خاں نے اپنے افسروں سے مخاطب ہو کر کہا، "اگر میں دشمن کی قطاریں (باقی صفحہ ۲۵۰ پر)

کوئی شخص خواب میں بھی مذہب کے ختم کرنے کے بارے میں نہیں سوچے گا۔ تاریخ فیروز شاہی کا تنقیدی مطالعہ کرنے والے کو پوری کتاب میں اسی قسم کی غلطیاں ملیں گی۔ برنی کی تاریخیں صحیح نہیں ہیں۔ اور اکثر وہ تاریخیں دیتا ہی نہیں ہے۔ اس خامی کی تلافی دوسری تصانیف کی مدد سے ہوسکتی ہے۔ ہم ان واقعات کو تاریخ وار مرتب کرسکتے ہیں جنھیں اس نے غلط ترتیب سے بیان کیا ہے۔ ہمارے سامنے اصل دقت اس وقت درپیش آتی ہے جب ہم ان واقعات کی طرف آتے ہیں جو برنی کے ذہن میں سبب اور نتیجہ کے زاویہ سے جم گئے ہیں اور جن کے سلسلے میں ترتیب یا تاریخ وار سلسلہ کا خیال نہیں کیا گیا ہے۔ یہ دقت خاص طور سے محمد بن تغلق کے عہد کے سلسلہ میں پریشان کن ہوجاتی ہے جس کے متعلق برنی نے یہ لکھا ہے کہ "میں نے اس کا خیال نہیں کیا ہے کہ کونسی فتح، بغاوت یا واقعہ سے پہلے پیش آیا اور کونسا بعد میں اور میں نے واقعات کی تاریخ وار ترتیب کی پابندی نہیں کی ہے تاکہ دانش مند امور ریاست کا ان کا مجموعی ہیئت میں مشاہدہ کرکے عبرت اور بصیرت حاصل کرسکیں[۷]۔" ملک میں ایک بھیانک قحط پڑا جو ہمارے ملک کے بدترین قحطوں میں سے ایک تھا۔ ٹھیک اسی وقت محمد بن تغلق نے انوکھے منصوبوں (اسلوبوں) کا ایک سلسلہ شروع کیا اور اسے بہت سی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ برنی قحط کا تو ذکر کرتا ہے۔ لیکن اسے دوسرے واقعات سے نہیں جوڑتا ہے اور اس کی یہی خواہش ہے کہ ہم اس عہد کے بارے میں یہی تسلیم کریں کہ محمد بن تغلق کے اختراعات اور اصلاحات (اسلوب)، سنگدلی، جسے برنی اس کے عقلی فلسفہ میں عقیدہ سے منسوب کرتا ہے، اور اس کی ناعاقبت اندیشانہ سخاوت تھی جو تمام مصیبتوں کا سبب بنیں۔ جدید مورخ محمد بن تغلق کے عہد کی جنگوں اور بغاوتوں کو تاریخ وار ترتیب دینے میں تو کامیاب ہوگئے ہیں لیکن اس کے اسلوب یا اصلاحات کو ترتیب نہیں دے سکے ہیں۔ جہاں تک دوسرے موضوعات کا تعلق ہے جیسے خراسان کی مہم، علامتی سکے، دولون زراعت وغیرہ، برنی ہمیں پوری داستان بتانا بھول گیا ہے اور اس کی وجہ سے کافی غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں۔

تاریخ فیروز شاہی کی خامیاں اور نقائص بیان کرنا ضروری ہے جن کا ماخذ برنی کی یادداشت کی لغزشیں اور اس کے جھانسے ہیں۔ کیوں کہ قرون وسطیٰ یا دور جدید کے کسی بھی مورخ کو اس سلسلے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ دراصل جہاں داری کے مطالعہ ہی سے یہ بھانڈا پھوٹتا ہے کہ برنی کی غیر معمولی یادداشت اب جواب دے رہی ہے

بقیہ حاشیہ: توڑ کر واپسی کا راستہ بنا بھی لوں تو ہم اپنے آقا کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں گے؟" چنانچہ انھوں نے لڑتے ہوئے مرجانے کا فیصلہ کیا۔ (عصامی کی فتوح السلاطین، مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسن، ص ص ۲۶۱ - ۲۴۹)

[۷] فیروز شاہی، ص ص ۸۹ - ۳۸۸

[۸] فیروز شاہی، ص ۴۶۷

اور اگر ہم اس شبہ کو ذہن میں رکھ کر فیروز شاہی کا مطالعہ کریں تو شبہ کی تصدیق ہو جاتی ہے کچھ واقعات تو بالکل فراموش کر دیے گئے ہیں جب کہ دوسروں کو صحیح طور سے بیان نہیں کیا گیا ہے۔ کچھ معاملات میں برنی کی حتمی آراء اس کی یادداشت کے لیے زبردست تباہی کا باعث بنی ہیں۔ اس جگہ تاریخ فیروز شاہی میں مذکورہ بالا نوعیت کی تمام غلطیوں کی طرف اشارہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس پر تو ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔[۱] لیکن ایک ہی مسئلہ یعنی محمد بن تغلق کے علامتی سکوں کے اجراء کے جائزہ سے مطلب واضح ہو جائے گا۔ برنی کے نامکمل تذکرہ اور غلط یادداشت کی وجہ سے اب تک تمام مورخین محمد بن تغلق کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں جیسے وہ نرا پاگل ہو اور ہر معاملہ میں بالکل فاترالعقل لوگوں کی مثل پیش آتا رہا ہو۔

غلط فہمی دور کرنے کے لیے برنی کے بیان کا صحیح ترجمہ ضروری ہے۔" سلطان محمود کا تیسرا منصوبہ، جو ملک کی بربادی، ہندوستان کے باغیوں کی قوت اور حوصلہ اور خرید و فروخت کے معاملہ میں تمام ہندوؤں کی عظمت اور فلاح میں ممد ثابت ہوا، کانسے کے سکے (سکۂ مس) کا اجراء تھا۔ کیوں کہ اس کے اعلیٰ حوصلوں نے اسے تمام دنیا فتح کرنے اور اسے اپنے زیر اثر لانے کے لیے ابھارا کیوں کہ اس محال مہم کے لیے لاتعداد فوج کی ضرورت تھی اور لامحدود خزانہ کے بغیر ایسی فوج ممکن نہیں ہے اور شاہی خزانہ پہلے ہی خالی ہو چکا تھا چنانچہ سلطان محمد نے کانسے کا سکہ جاری کیا اس نے حکم دیا کہ خرید و فروخت میں طلائی اور نقرئی سکوں کی جگہ کانسے کے سکے مروج کیے جائیں۔[۲] اس ضابطے کے نتیجہ میں ہر ہندو کا مکان ٹکسال بن گیا اور سلطنت کے ہندوؤں نے لاکھوں اور کروڑوں کانسے کے سکے ڈھال لیے۔ انھوں نے انھیں اپنے اخراجات کے لیے استعمال کیا ان سے مکان، ہتھیار اور تمام قسم کی اشیاء خریدیں اور سکۂ مس کے ذریعہ ہو گانوں، مقدموں اور خوطوں کو طاقت اور وقار حاصل ہو گیا۔ ملک پر ایک زبردست مصیبت آ پڑی۔ عرصہ پہلے دور دراز صوبوں میں لوگ سکۂ مس کا اس کے کانسے کی قیمت کے مطابق تبادلہ کیا کرتے تھے لیکن جن علاقوں میں وہ سلطان کے احکام سے خائف تھے نقرئی سکہ کا ایک سو کانسے کے ٹکوں سے تبادلہ کیا گیا۔ ہر زرگر اپنے مکانوں میں سکے ڈھالتا تھا اور اس طرح شاہی خزانہ کانسے کے سکوں سے بھر گیا۔ کانسے کے سکے ایسے گرے اور حقیر ثابت ہوئے کہ وہ ٹھیکروں اور کنکروں کی طرح بے قیمت ہو گئے۔ پرانے سکے اپنی قیمت خرید کی وجہ سے ان کی قیمت سے چار اور پانچ گنا زیادہ بڑھ گئے۔ جب ہر طرف خرید و فروخت کا کام

---

[۱] مجھے امید ہے کہ میرے رفیق پروفیسر شیخ عبدالرشید اپنی مرتب کردہ تاریخ فیروز شاہی کے مقدمہ میں اس تصنیف پر تبصرہ کریں گے۔

[۲] اس سیاق میں لفظ طلائی، بالکل فضول ہے۔ سکۂ مس کو صرف نقرئی ٹنکہ کی جگہ لینا تھی۔

ختم ہونے لگا اور کانسی کے سکے مٹی کے ڈھیلوں کی طرح بے کار ہو گئے تو سلطان محمد نے سکۂ مس سے متعلق اپنے حکم کو منسوخ کر دیا اور دل ہی دل میں باغضب رہتے ہوئے یہ حکم دیا کہ جس کسی کے پاس ایک بھی سکہ مس ہے وہ اسے خزانہ میں لائے اور اس کے بدلے میں قدیم طلائی سکے لے جائے۔ مختلف جماعتوں کے کئی ہزار لوگ جن کے پاس اپنے مکانوں میں ایسے کانسے کے سکے تھے اور جنھیں انھوں نے بیکار سمجھ کر چھوڑ رکھا تھا یا کانسے کے برتن بنانے کے لیے چھوڑا تھا۔ اب انھیں خزانہ میں لائے اور ان کے بدلے میں نقرئی و طلائی یا ششگنی اور دوگنی لے کر اپنے گھروں کو لوٹے۔ اتنی کثرت سے کانسی کے سکے شاہی خزانہ میں لائے گئے کہ تغلق آباد میں ان کے ڈھیر ٹیلوں کی مانند بلند ہو گئے۔ ان کانسے کے سکوں کے بدلے میں کافی تعداد میں نقرئی سکے خزانہ سے باہر چلے گئے۔ خزانہ پر جو مصیبتیں آئیں ان میں سے ایک ان کانسے کے سکوں کا اجرا تھا۔[له]

آج تمام دنیا علامتی سکے استعمال کر رہی ہے اور ان پر منحصر ہے لیکن بہت سے ممالک میں کسی نہ کسی وقت علامتی سکوں کے باعث مصیبت پیدا ہوئی ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ہندوستان کے پہلے علامتی سکے کے بارے میں ہمارے پاس جو تحریری مواد ہے وہ اتنا غلط ہے۔ لفظ 'مس' کا فارسی میں مطلب تانبا یا کانسا ہے۔ مس کا تانبے سے غلط ترجمہ کرنے کے لیے برنی ذمہ دار نہیں ہے۔ تانبا ایک دھات ہے اور کانسا ایک مرکب ہے۔

برنی کے بیان میں دو تناقض اور غلطیاں ظاہر ہیں (۱) ہندوؤں کا حوالہ دینا پوری طرح فضول ہے اور یہ ہندوؤں سے متعلق برنی کے ذہن میں خلل" کی وجہ سے ہے۔ صرف زرگر ہی، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، کانسے کے جعلی سکے ڈھال سکتے تھے۔ عین ممکن ہے کہ زرگروں کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہو۔ لیکن تمام ہندو اپنے مکانوں میں کانسے کے سکے نہیں ڈھال سکتے تھے کیوں کہ وہ یہ فن نہیں جانتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندو اور مسلمان دونوں زرگروں کو جعلی کانسے کے سکے بنانے کی ہدایت کر سکتے تھے۔ موجودہ دور میں بڑھتی ہوئی قیمتوں کے انوکھے واقعہ کا بغور مطالعہ ہوا ہے۔ قرض خواہ نقصان میں رہتا ہے اور قرض دار کو فائدہ ہوتا ہے۔ پیدا کرنے والوں کو بھی خرچ کرنے والوں کے نقصان سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس معاملے میں کسی کے مذہب یا ملت کا کوئی دخل نہیں (۲) دوسرے اگر تجربہ شروع کرتے وقت خزانے میں کافی پیسہ نہیں تھا تو کس طرح محمد بن تغلق جعلی کانسی کے سکوں کو پھر سے حاصل کر سکا اور اتنے وسیع پیمانہ پر اتنی کی قیمت واپس کر سکا؟ یہ واقعہ کہ سلطان شاید تمام جعلی سکوں کی تلافی نہیں کر سکا اور یہ کہ یہ سکے آج بھی بکثرت موجود ہیں برنی کی پوری داستان کو مشتبہ کر دیتا ہے۔ موجودہ حکومتیں گھٹے ہوئے سکوں کو ان کی بازاری قیمت پر واپس لے لیتی ہیں۔ سلطان نے اس

له تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۷۶-۷۵

تدبیر پر عمل کیوں نہیں کیا؟ گھٹے ہوئے سکے رکھنے والوں کو جنھوں نے انھیں گھٹی ہوئی قیمت پر خریدا تھا، پوری قیمت ادا کرنے کے کیا معنی تھے؟

اگر برنی نے ذیل کی باتیں شامل کردی ہوتیں تو اس کی داستان پوری ہوگئی ہوتی۔

(۱) ٹکسال میں سکوں کے لیے ایک خاص طرح کا کانسے کا مرکب تھا جو بہت آسانی سے کسوٹی پر پہچانا جاسکتا تھا لیکن زرگر کانسے کے سکوں میں دھاتوں کے تناسب کے راز کا پتہ نہیں لگا سکتے تھے۔

(۲) اس زمانہ میں جب لوگ طلائی اور نقرئی سکے لیتے تھے تو وہ ان کا وزن کرلیا کرتے تھے (تاکہ گھسنے کی صورت میں منہائی کی جاسکے) اور نیز دھات کی اصلیت کو کسوٹی پر پرکھا جاتا تھا۔ سلطان کو عوام سے توقع تھی کہ وہ علامتی سکہ میں بھی اسی طریقہ پر عمل کریں گے۔ لیکن اس سلسلے میں عوام نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ لہٰذا بہت سے جعلی سکے سرکاری سکوں میں شامل ہوگئے اور کیوں کہ جعلی سکے مروج ہوگئے اور حکومت اسے نہیں روک سکی تو زیادہ سے زیادہ جعلی سکے ڈھالے جانے لگے۔

(۳) ایک کانسے کا سکہ کم از کم اس کے کانسے کے وزن کے برابر تو ہوگا یعنی تقریباً ۵۰ کانسے کے سکے معمول طور پر ایک نقرئی ٹنکہ کے برابر ہوں گے۔ لیکن کانسے کے جعلی سکے بنانا ایک جرم تھا۔ چنانچہ ایک جعلی سکہ کا کچھ بھی حشر ہوسکتا تھا کیوں کہ اس کی قیمت طے کرنے کے سلسلہ میں ایک نیا جز خوف سزا بھی داخل ہوگیا تھا۔ دور دراز صوبوں میں یہ نقرئی ٹنکہ کی قیمت کے حساب سے اپنی دھات کی حسب معمول قیمت کے نصف میں چلا۔ دارالسلطنت میں لوگ کانسے کے جعلی سکے اپنے قبضہ میں رکھنے سے خائف ہوں گے۔ یا تو وہ انھیں پھینک دیں گے یا پھر بعد میں کانسے کے برتن بنانے کی غرض سے انھیں اٹھا رکھیں گے۔

(۴) تمام عمل حکومت کے قابو سے باہر نکل گیا۔ بہت زیادہ جعلی سکے چل پڑے اور تجربے کی ناکامی کے سبب بازار میں اتھل پتھل مچ گئی۔ جن کے پاس واقعی جعلی سکے تھے انھیں سزا دینا ممکن نہیں تھا کیوں وہ معصوم تھے۔ یہ کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے گو کہ یہ حقیقت ہے کہ کسی کو سزا نہیں دی گئی۔

(۵) شروع سے ہی یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ خزانہ ہر کانسے کے سکے کو واپس لے گا۔ سلطان نے اب یہی حکم دیا۔ لوگوں کے پاس جو کانسے کے سکے تھے وہ خزانہ کے سامنے لے آئے۔ خزانہ نے ضمیر خزانہ کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے جاری کردہ کانسے کے سکوں کی تلافی کردی۔ اس نے جعلی سکوں کو ٹھکرادیا لیکن ان کے مالکوں کو سزا نہیں دی کیوں کہ وہ جائز طور پر قابض تھے۔ ان ٹھکرائے ہوئے سکوں کے ڈھیر جو غالباً بعد میں ڈھالے گئے تھے تغلق آباد میں دیکھے جاسکتے تھے۔ لیکن کانسی کے جعلی سکے جو خزانہ میں نہیں لائے گئے تھے اپنی دھات کی قیمت پر چلتے رہے اور ہمارے زمانہ تک باقی رہے۔

ان اضافوں سے برنی کی داستان صحیح اور مکمل ہوگئی ہوتی. چینی اور نیز منگول شہنشاہ صرف حکومت کے مقاصد کے لیے کاغذی کرنسی استعمال کرتے تھے. ایران کے ایل خانوں کو عام استعمال کے لیے کاغذی کرنسی جاری کرنے کی ترغیب ہوئی لیکن ان کے مشیروں نے اس تجربہ کے خلاف فیصلہ کیا. محمد بن تغلق کی حکومت کسی خاص قسم کا کاغذ نہیں بنا سکتی تھی چنانچہ اس نے ایک مخصوص کانسے کا مرکب استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ فرشتہ کا خیال ہے کہ چین کی کاغذی کرنسی نے (جسے سکہ چو کہتا ہے) محمد بن تغلق کو اس تجربہ کا خیال آیا. ان خیالات کو ثابت کرنا آسان ہے کیوں کہ ہمارے عجائب خانوں میں کافی تعداد میں جعلی سکے موجود ہیں. اس زمانہ کے نقرئی سکے کو ٹنکہ اور تانبے کے سکے کو جیتل کہتے تھے. جعلی سکے جو اس تجربہ کی بناء پر وجود میں آئے تھے کانسے کے بنے ہوئے ہیں اور انھیں ان کی مخصوص کندہ عبارت وغیرہ سے الگ پہچانا جاسکتا ہے۔ ایک طرف فارسی میں یہ عبارت کندہ ہے کہ "یہ ٹنکہ خادم (عنایات الٰہی کے لیے) پر امید محمد بن تغلق شاہ کے زمانہ میں رائج ہوا ہے." عہد سلطنت کے دوسرے تمام سکوں کی زبان عربی تھی لیکن یہاں ایک تانبے کے سکے (جیتل) کا ذکر ہے جو بہ زبان فارسی یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کی رائج الوقت قیمت ایک نقرئی سکہ (ٹنکہ) کی ہے. بہر حال دوسری طرف عربی میں بہ عربی میں یہ عبارت کندہ ہے "جو سلطان کی اطاعت کرتا ہے رحمٰن کی اطاعت کرتا ہے."

یہ بہ آسانی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یہ تمام سکے جعلی ہیں. ان میں سے پانچ یا چھ لیجئے اور انھیں کسی پتھر پر گھسئے اور سکوں کے گھسے ہوئے حصوں کو روشنی میں دیکھیے. ان میں مختلف رنگ نظر آئیں گے جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک میں دھاتوں کا تناسب مختلف ہے. لہٰذا ان میں سے کوئی بھی محمد بن تغلق کی ٹکسال کا نکلا ہوا نہیں ہوسکتا.

سلطان محمد بن تغلق کے علامتی سکوں پر گفتگو کرنا ضروری تھا تاکہ تاریخ فیروز شاہی کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں کو یہ باور کرایا جاسکے کہ برنی کی فکر کی غیر تغیر پذیری اور منجمد خیالات کے غلبہ کے ساتھ جو اکثر بڑھاپے کی متلازم ہوتی ہیں، اس کی یادداشت کی لغزشوں کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے.

(ب) تاریخ فیروز شاہی کے مقدمہ میں برنی مورخ کی رہنمائی کے لیے حسب ذیل معیار قائم کرتا ہے.

"تاریخ لکھنے کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے. ایک ایماندار مورخ کا یہ لازمی فرض ہے کہ وہ سلطانوں اور عظیم انسانوں کی خوبیوں، ہمدردیوں، عدل اور مہربانیوں کو درج کرے لیکن (دوسری طرف) اسے ان کی بدقماشیوں اور رذالتوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے. اسے تاریخ لکھنے میں خوشامد سے کام نہیں لینا چاہیے اگر وہ مناسب خیال کرتا ہے تو اسے کھل کر ورنہ اشاروں، کنایوں اور بالواسطہ باتوں کے ذریعہ صاحب

عقل اور صاحب بصیرت کو صحیح اطلاعات بہم پہنچانا چاہیے۔ اگر مورخ اپنے طاقت ور ہم عصروں کی دہشت اور خوف کے باعث اس طرح لکھنے سے (یعنی کتابوں سے صحیح مطلب بیان کرنے سے) قاصر ہے تو اس صورت میں وہ قابل معافی ہے، لیکن دور ماضی کے فرمانرواؤں کے بارے میں اسے دیانت داری اور صداقت سے لکھنا چاہیے۔"[1] نیز اگر مصنف کو سلطان یا کسی طاقت ور افسر سے نقصان یا فائدہ پہنچا ہے تو اسے اس حقیقت کو اپنی تصنیف پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ فیروز شاہ کے عہد کے چھ سال کا احاطہ کرنے والے خوشامدانہ ابواب کا جائزہ لیتے وقت برنی کی اس ہدایت کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ وہ قابل معافی ہے۔

(ج) گزشتہ چھ صدیوں میں تاریخ فیروز شاہی کے تمام قارئین اس کے غیر معمولی فارسی نثریہ طرز بیان سے، جو سلیس، شستہ اور موثر ہے، مسحور رہے ہیں۔ برنی کے وقت سے پہلے فارسی کی تاریخیں یا تو بہت زیادہ مرصع طرز عبارت میں لکھی گئی تھیں اور تلمیحات و تمثیلات وغیرہ سے پر تھیں، جیسے کہ نظامی کی تاج المآثر، اور زیادہ سے الفاظ میں کم سے کم واقعات پروئے ہوئے تھے یا پھر وہ واقعات کے سیدھے سادے اندراج کے طرز پر لکھی گئی تھیں، جیسے طبقات ناصری، اور ان میں محض واقعات کا ذکر تھا۔ برنی کے ہاتھوں میں تاریخ ہمارے ادب کے موجودہ مفہوم میں ادب پارہ بن گئی۔ تاریخ فیروز شاہی پڑھتے وقت افسانہ پڑھنے کا احساس ہوتا ہے۔ پوری تصنیف میں غیر معمولی عمدہ اقتباسات منتشر ہیں، کوئی بھی مستند فارسی تاریخ، شخصیات کے تجزیہ اور مناظر کی تصویر کشی میں تاریخ فیروز شاہی کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ برنی کسی بھی جگہ علم کا کوئی غیر ضروری مظاہرہ نہیں کرتا ہے۔ وہ اس طرح لکھتا ہے کہ قاری کو سمجھنے میں کم سے کم کوشش کرنا پڑے۔ جب کہ مروج طریقہ (اگر

---

[1] فیروز شاہی، ص ص ۱۶، ۱۵

قرون وسطیٰ کی تاریخ کا یہ عام مقبول اصول تھا کہ ہمعصر طاقت ور فرمانرواؤں اور ان کے افسروں کی تنقید بالواسطہ ہونی چاہیئے۔ چنانچہ میر خوند (بابر کا ہمعصر) اپنی مشہور کتاب روضتہ الصفا کے مقدمہ میں لکھتا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مورخ کو ہر معاملہ کے تمام پہلوؤں کو بیان کرنا چاہیئے۔ بہ الفاظ دیگر جس طرح وہ عظیم انسانوں کی خوبیاں، ہمدردیاں، عدل اور رحم گنا تا ہے اسی طرح اسے ان کی بدقماشیاں اور رذیل حرکتوں کو بھی بیان کرنا چاہیئے، انھیں چھپانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اسے مصلحت خیال کرتا ہے تو اسے موخرالذکر کو (بدقماشی کے کاموں، کو صاف طور سے بیان کرنا چاہیے۔ اگر نہیں تو اسے اشاروں کنایوں اور بالواسطہ جملوں سے کام لینا چاہیے۔ عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہے۔" (روضتہ الصفا، طبع نول کشور، ج اول، ص ۶)

کوئی امیر خسرو کی تصانیف سے اندازہ کر سکتا ہے۔ شاعری میں سادگی اور نثر میں مرصع عبارت کا تھا۔ دوسری طرف برنی کے ناشائستہ الفاظ اور فقروں سے والہانہ شوق پر اظہار افسوس کرنا پڑتا ہے۔[۱] جہاں تک ان اشخاص کا تعلق ہے جن پر فیروز شاہی نے لعنت ملامت کی ہے وہ برنی کے ناشائستہ الفاظ اور غلط بیانیوں کا جواب دینے کے لیے اپنی قبروں سے اٹھ کر باہر نہیں آسکتے۔ لیکن اس کے اپنے اعتراف سے ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ ہمیں بعد میں معلوم ہوگا کہ فیروز شاہ کے سامنے اس کے خلاف جو الزامات پیش کیے گئے تھے ان میں سے ایک الزام 'زہر آلود الفاظ' کے مسلسل استعمال کا تھا۔

(د) برنی اعلیٰ افسروں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور وہ خود بھی سلطان کا، سترہ سال تک ندیم رہا تھا۔ اس کی تصنیف کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک ضوابط اور حکومت کے فرامین داسلوب کا بہت محتاط جائزہ ہے۔ بعد کے مورخین نے اس سلسلے میں برنی کی تصنیف میں کافی اصلاح کی ہے۔ لیکن برنی کی کامیابیوں کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر چنگیز خاں ایک عظیم ہستی تھا اور ایرانی مورخین عطا ملک جوینی، رشید الدین، وصاف، میر خوند، خواند میر اور دوسروں نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی بھی مصنف نے چنگیز خاں کے یاساؤں یا ضوابط کا اتنی وضاحت سے بیان نہیں کیا ہے جتنا کہ برنی نے علاؤالدین خلجی کے اقتصادی ضوابط کا کیا ہے۔

(ہ) برنی کا اپنی تصنیف کے بارے میں بہت اونچا خیال تھا اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ 'وہ ایرانی مورخین سے امتیازی طور پر گوئے سبقت لے گیا ہے'۔ میں نے اس تصنیف کے سلسلے میں بہت تکلیف اٹھائی ہے اور میں انصاف پسند اشخاص سے تعریف کی توقع کرتا ہوں، اس کتاب کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ اگر تم اسے تاریخ تصور کرتے ہو تو تمہیں اس میں سلطانوں اور ملکوں کا ذکر ملے گا۔ اگر تم اس میں ضوابط، اسلوب حکومت اور امور انتظامیہ تلاش کرو تو تمہیں یہ ان سے خالی نہیں ملے گی۔ اگر تم سلطانوں اور فرمانرواؤں کے لیے اقوال اور نصیحتیں چاہتے ہو، تو یہ تمہیں دوسری کتاب کے مقابلے میں اس کتاب میں زیادہ تعداد میں اور بہتر ملیں گے اور چوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ اور صحیح ہے اس لیے یہ تاریخ قابل اعتبار ہے۔ نیز میں نے بہت مختصر الفاظ میں کافی معنیٰ رکھ دیے ہیں چنانچہ میری یہ مثال قابل تقلید ہے۔ اگر میں اپنی تاریخ کے متعلق حسب ذیل قطعہ پڑھوں تو یہ صحیح ہوگا۔ اگر میں کہوں کہ دنیا میں میری تاریخ کی مثال نہیں ہے تو وہ شخص جو اس علم سے لابلد ہے کس طرح میرے بیان سے اتفاق کرے گا۔[۲] اور دوسری جگہ وہ کہتا ہے۔" میں جانتا ہوں اور

---

[۱] ان میں سے بہت سے بیہودہ الفاظ اور فقرے کو اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب ان کا زبانی مدنظر ہو

تاریخ کے وہ ناقد بھی، جو اس زمانہ میں کیمیاگروں یا فرضی چڑیا سیمرغ کی طرح نایاب ہیں۔ جانتے ہیں کہ تاریخ فیروز شاہی کے معیار کی تاریخ، جس میں انتظامیہ کے اصولوں کے بارے میں معلومات بھی شامل ہیں. گزشتہ ایک ہزار سالوں میں کوئی بھی مورخ نہیں لکھ پایا ہے. میں نے واقعی اعجاز دکھائے ہیں۔

برنی کا اپنے متعلق زبردست دعوی یہ ہے کہ وہ امور ریاست پر سب سے بڑا دانش ور مفکر ہے۔ شیر شاہ کے زمانہ تک جس نے بھی فیروز شاہی کا مطالعہ کیا وہ برنی کی بصیرت کا معترف تھا اس کے بعد ملک کے حالات اور تعلیم یافتہ لوگوں کے افکار میں تبدیلی واقع ہوئی. برنی کی بحیثیت مورخ کے تو قدر کی گئی لیکن اسے سیاسی معلم کی حیثیت سے نظرانداز کردیا گیا. آج برنی کی کسی نصیحت کی کوئی عملی اہمیت نہیں ہے. مگر عظیم ترین سیاسی مفکرین، افلاتون، ارسطو، میکیاویلی، کارل مارکس صرف اپنے زمانے کے لیے معتبر ہیں، کوئی بھی شخص ہر دور کے لیے دانش ور نہیں ہوسکتا. برنی کی سیاست دہلی سلطنت کے عہد تک محدود ہے۔

بقیہ حاشیہ:۔ ہندی یا ہندوستانی میں ترجمہ کردیا جائے۔

۵۶ فیروز شاہی، ص ۲۰.

۵۷ فیروز شاہی، ص ۱۲۵

باب - ۳

ضیاء الدین برنی : خاندان اور ابتدائی زندگی

برنی لکھتا ہے "اس کمزور شخص کا باپ ایک بارتبہ شخص تھا[۱] میں ایک سخی انسان کا بیٹا اور سخی بزرگوں کا جانشین ہوں"[۲] برنی کے عالی نسب ہونے کے دعوے سے انکار نہیں کیا جاسکتا حالاں کہ یہ بدقسمتی ہے کہ اس بات پر اس کے غرور نے اس کی زندگی پر انتہائی گہرا اثر ڈالا اور حتیٰ کہ اس کے مذہبی نظریہ کو بھی فاسد کردیا۔ اس کا نانا سپہ سالار حسام الدین سلطان بلبن کے حاجب ملک باربک بکتیرس سلطانی کا وکیل در تھا۔ اور برنی حسام الدین کے اس اعلان کو نقل کرتا ہے کہ ملک بکتیرس بلبن کے افسروں میں اعلیٰ ترین، قریب ترین اور سب سے زیادہ معتبر تھا۔ تاہم بلبن کے افسروں میں رتبہ کے لحاظ سے کوتوال دہلی ملک الامراء فخر الدین کو سب سے زیادہ بزرگی حاصل تھی جب بلبن نے بنگال کے باغی صوبے دار طغرل کے خلاف کوچ شروع کیا تو اس نے ملک بکتیرس کو اپنے ساتھ لیا اور فخر الدین کو دہلی ہی میں اپنے نائب کی حیثیت سے چھوڑ دیا اور یہ اختیار دیا کہ وہ دور افتادہ سلطان کا حوالہ دیے بغیر اپنی قوت فیصلہ کے مطابق تمام معاملات طے کرے۔ جب بلبن نے لکھنوتی سے طغرل کے خلاف کوچ کیا تو اس وقت اس نے سپہ سالار حسام الدین کو لکھنوتی کا شحنہ ر کوتوال، بنایا اور یہ ہدایت کی کہ وہ ہفتہ میں تین یا چار مرتبہ دہلی سے آنے والی اطلاعات بمعہ دہلی کے ملکوں اور امیروں کی عرض داشتوں کے اسے روانہ کرے۔ ملک بکتیرس کو سات یا آٹھ ہزار حوصلہ مند شہسواروں پر مشتمل ایک پیش دستہ کے ساتھ طغرل کے خلاف بھیجا اور اس کے

۱۔ فیروز شاہی، ص ۳۵۰

۲۔ فیروز شاہی، ص ۲۰۴

سپاہی اسے پکڑنے میں اور مارنے میں کامیاب ہوئے ۔ برنی یہ واضح کرتا ہے کہ سپہ سالار حسام الدین زیرک سمجھ دار اور باشعور انسان تھا اور سلطان بلبن کے سامنے اسے بہت اعلیٰ مرتبہ اور حیثیت حاصل تھی[1]

علاء الدین خلجی کے عہد کے سیدوں کے ذکر میں برنی عام طور سے سیدوں کی تعریف کرتا ہے، کیوں کہ دنیا کا وجود ان ہی کے دم سے ہے اور بالخصوص کیتھل کے سیدوں کی تعریف کرتا ہے۔ میری دادی سید جلال الدین کی بیٹی تھیں جو کیتھل کے ذی حیثیت اور نمایاں سیدوں میں سے تھے۔ وہ ایک متقی سید خاتون تھیں اور کرامات دکھا سکتی تھیں جنھیں باعصمت عورتیں دیکھ سکتی تھیں۔[2]"

برنی کا باپ، جس کا مؤید الملک خطاب تھا، سلطان جلال الدین خلجی کے دوسرے فرزند ارکلی خاں کا نائب تھا۔ جلال الدین خلجی نے اپنے افسروں کو کیلوگڑھی میں اپنے مکان تعمیر کرنے کے لیے مدعو کیا اور مؤید الملک نے (جیسا کہ برنی ہمیں بتاتا ہے) وہاں ایک عظیم الشان مکان تعمیر کیا۔[3] برنی ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ اس کا باپ بلبن اور کیقباد کے عہد میں، کسی عہدہ پر فائز تھا۔ حالانکہ اس زمانہ کی سند کے طور پر وہ اپنے باپ اور ان کے اساتذہ کے قول نقل کرتا ہے، جو وقت کے عظیم علمائے تھے۔[4] جب ارکلی خاں ملتان کا صوبیدار بنایا گیا تو مؤید الملک اس کے ہمراہ نہیں گیا اور نہ ہی وہ ان وفادار افسروں میں شامل تھا جو ملکۂ جہاں (سلطان جلال الدین کی بیوہ) کے ساتھ دہلی سے ملتان کے لیے فرار ہوئے تھے، اس کی وجہ بہت صاف تھی مؤید الملک کا بھائی علاء الملک علاء الدین خلجی کے بڑے افسروں میں شمار ہوتا تھا۔ لہٰذا علاء الدین نے مؤید الملک کو برن (صوبہ اترپردیش میں موجودہ بلند شہر) میں نائب اور خواجہ (صوبہ دار) مقرر کر دیا۔ ہمارے مصنف نے 'برنی' کا خاندان برن کی نسبت سے لیا لیکن وہ اس جگہ کے بارے میں نہ تو کسی واقفیت کا اظہار کرتا ہے اور نہ ہی کسی تعلق خاطر کا۔ ہم یہ فرض کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ وہ تمام عمر دہلی میں رہا اور اس کے باپ نے نمائندوں کے ذریعہ اپنے فرائض انجام دیے۔

برنی سلطان جلال الدین کے قتل میں اپنے چچا علاء الملک کی شرکت پر ان کی مذمت کرتا ہے۔ لیکن

---

[1] کسی افسر کے نام کے بعد سلطانی کی اصطلاح کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ سلطان کا غلام تھا۔ لیکن کچھ لوگ انتہائی وفاداری کے سبب یہ لقب اختیار کر لیتے تھے۔

[2] فیروز شاہی، ص ۳۲

[3] فیروز شاہی، ص ۳۲۰

[4] فیروز شاہی، ص ۱۲۷

علاء الملک کے اعلیٰ رتبہ، حکمت عملی میں ہوشیاری اور قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب علاء الدین نے (اپنے چچا اور سسر) سلطان جلال الدین کی اجازت کے بغیر دیوگیر کی طرف کوچ کیا تو اس نے کڑا (الہ آباد) اور اودھ میں اپنی صوبے داری علاء الملک کے سپرد کی۔ بعد ازاں جب سلطان جلال الدین کے قتل کے بعد علاؤ الدین نے دہلی کی طرف کوچ کیا تو ایک مرتبہ پھر علاء الملک کو یہ دونوں صوبے سپرد کیے گئے۔ علاؤ الدین کے عہد کے دوسرے سال میں علاء الملک کو کڑا سے طلب کر لیا گیا اور دہلی کا کوتوال بنا دیا گیا۔ یہ بہت بڑا ذمہ داری کا عہدہ تھا۔ سلطانوں کے زوال و عروج اور شاہی خاندانوں کی تبدیلیوں کے باوجود اسی سال سے زیادہ عرصہ سے دہلی کی کوتوالی ملک الامراء فخر الدین اور اس کے باپ کے سپرد رہی تھی۔ باپ اور بیٹے نے سیاست اور سازش میں دخل نہ دے کر اور اپنے کو انتظامیہ تک ہی محدود رکھ کر اپنے عہدہ کو محفوظ رکھا تھا۔ جلال الدین خلجی اور اتیار کچھن اور اتیار سرخا کی سرکردگی میں پرانے ترک امیروں کے درمیان ہونے والی کشمکش میں فخر الدین کوتوال کے بیٹوں نے خلجیوں کی طرف داری کی تھی (١٢٩٠ء) اس کے بعد فخر الدین کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کا انتظامیہ اس کے مقرر کیے ہوئے افسروں کے ہاتھوں میں رہا۔ اب وہ سب بمعہ شہر، حرم اور شاہی خزانوں کے علاء الملک کے حوالے کر دیے گئے۔[1] سلطان نے کہا کہ علاء الملک اس کا وزیر بننے کا مستحق تھا لیکن اپنے غیر معمولی مٹاپے کی وجہ سے اس عہدے پر نہیں مقرر کیا جا سکتا۔ قتلغ خواجہ کے خلاف کیلی کی طرف کوچ کرتے وقت علاء الدین نے شہر اور ہر چیز علاء الملک کے سپرد کر دی اور یہ ہدایت کی کہ جو بھی فاتح ہو اس کے سامنے شہر کے داخلی دروازوں اور خزانہ کی چابیوں کو بوسہ دے کر رکھ دے اور اس کے بعد سے اس کا وفادار رہے۔ برنی کہتا ہے کہ جلال الدین کے قتل میں جن لوگوں نے بھی حصہ لیا تھا ان میں سے خود سلطان علاء الدین کے علاوہ کوئی بھی شخص تین یا چار سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاء الملک کیلی کی جنگ کے فوراً بعد مر گیا۔

دو یا تین جگہ برنی اپنے دادا کا ایک ایسے شخص کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے جس سے اس نے دورِ ماضی کے متعلق معلومات حاصل کی ہوں۔ اس کے دادا کو بھی ایک اعلیٰ افسر ہونا چاہیے کیوں کہ علاء الدین نے کیلی کی جنگ سے قبل منعقد ہونے والی ایک مجلس میں یہ کہا تھا "تم سب جانتے ہو کہ علاء الملک وزیر اور وزیر زادہ ہے۔" دونوں اصطلاحات بطور استعارہ استعمال کی گئی ہیں لیکن ان سے مراد یہ ہے کہ برنی کا دادا ایک ممتاز افسر تھا۔

---

[1] فیروز شاہی، ص ۲۴۸ اور ۲۵۵

تاریخ فیروز شاہی میں برنی اپنے خاندان کے بارے میں بس یہی بتاتا ہے، ہمیں ابھی تک کچھ نہیں معلوم آیا اس کے بھائی، بہن، بیویاں اور بچے تھے. تاریخ فیروز شاہی ایک نہایت تنہا پسند انسان کی تصنیف ہے. لیکن شاید اس کی خود نوشت سوانح حیات یا حسرت نامہ مل جانے پر ہم اس کے خاندان کے بارے میں زیادہ جان جائیں.

برنی قبل از وقت نشوونما یافتہ بچہ تھا. وہ فیروز شاہی میں یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ اس نے بلبن اور کیقباد کے بارے میں جو لکھا ہے وہ اس نے اپنے خاندان کے بزرگوں، اساتذہ اور دوسرے لوگوں سے سنا تھا، لیکن وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ سلطان جلال الدین کی تخت نشینی کے وقت سے، اور جس وقت اس کی عمر صرف تقریباً چھ سال تھی اس نے تمام باتیں اپنے مشاہدوں اور خود اپنے جمع کیے ہوئے حقائق کی بنیاد پر لکھی ہیں نیز وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ جلال الدین کے عہد کے دوران اس نے قرآن ختم کر لیا تھا اور عربی مفردات سیکھ رہا تھا اور تصنیف میں اپنے جوہر دکھانے کی کوشش کر رہا تھا. جس طرح سولہ سال بعد وہ جلال الدین کے دربار کی رقاصاؤں کے متعلق لکھتا ہے اس سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اندر جنسی محرکات قبل از وقت پیدا ہو چکے تھے.

برنی وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ اس کو ممتاز اساتذہ سے تلمذ کا شرف حاصل تھا. اس کے دور کے بہترین اساتذہ اپنے نجی مکانوں یا مسجدوں یا دوسرے عام مقامات پر درس دیا کرتے تھے. وہ شرفا کے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ان کے مکانوں کے چکر نہیں لگاتے تھے، پھر بھی مویدالملک کو اس کے لیے خاصے قابل اساتذہ مل گئے. انھوں نے اسے اچھی عربی اور روایتی منطق پڑھائی لیکن فلسفہ اور علوم عقلیہ سے اس کی مکمل لاعلمی اور ان کے خلاف اس کا تعصب ثابت یہ کرتا ہے کہ اسے ان میں سے کسی ایک مضمون پر بھی کسی کتاب کا درس نہیں دیا گیا تھا. اسلامی تاریخ، جیسا کہ بخوبی معلوم ہے، قرون وسطیٰ کے نصاب تعلیم کا کوئی حصہ نہیں تھی بلکہ اس کا صرف وہ حصہ تھی جو دینیات اور دینی تنازعات سے متعلق ہے یعنی رسول اکرم اور خلفاء راشدین کا عہد. برنی اپنے بڑھاپے میں قدیم اسلامی تاریخ کے واقعات کو جس طرح یہ تقلید پسند مسلمانوں کے بیٹوں کو پڑھائی جاتی تھی، بخوبی یاد رکھ سکتا تھا لیکن وہ حضرت علی کے بعد کے عہد کے سلسلے میں سراپا تحیر تھا. وہ لکھتا ہے کہ "میری زندگی کتابوں کے مطالعہ میں گزری ہے میں نے علم کی ہر شاخ کے بارے میں قدماء اور متاخرین کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور علوم تفسیر، حدیث، فقہ، اور طریقت مشائخ (تصوف) کے بعد میں نے علم تاریخ

لہ فیروز شاہی، ص ۱۲۷

سے زیادہ مفید کوئی دوسرا علم نہیں پایا ہے"۔ لہ

اس جگہ مندرج مضامین میں سے برنی پہلے تین مضامین سے تو واقف تھا لیکن ان میں وہ محض روایت کا پروردہ تھا۔ اس نے اپنے آپ غور و فکر کرنے سے انکار کیا اور فرسودہ باتیں دہرائیں۔ اسلامی تاریخ سے برنی کی لاعلمی کو فتاوائے جہاں داری کے نوٹس میں پہلے ہی ثابت کیا جا چکا ہے۔ تصوف کے بارے میں اس کی لاعلمی اور بھی زیادہ تھی۔ وہ کچھ اقوال نقل کرتا ہے جو اس نے حضرت شیخ کی خانقاہ میں سنے تھے یا معمولی کتابوں میں پڑھے تھے۔ مثال کے طور پر لیجیے کہ علمائے دین دو طرح کے ہیں علماء دنیا اور دین اور یہ کہ آخرالذکر عہدوں یا وظیفوں کے لیے سلطانوں اور ان کے افسروں کی چاپلوسی نہیں کرتے ہیں۔ یہ اقوال وہ بار بار اپنے نمونہ افراد کی زبان سے کہلواتا ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ وہ تصوف کی ابجد ہی نہیں سمجھتا ہے۔ . . . تصوف میں اولین مقصدِ حیات معرفتِ خدا کے لیے سعی کرنا ہے۔ تصوف مادی دنیا کی ان بندشوں کو رد کرتا ہے جو اس راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں، یہ جنت کے آرام و آسائش اور جہنم کی تکالیف کے مجازی قصوں کو خارج کرتا ہے جو برنی کے لیے امید اور خوف کی چیزیں تھیں۔ اس کا یہ فیصلہ تھا کہ قرونِ وسطیٰ کی طبقاتی ریاست سے علیحدہ رہا جائے کیوں کہ یہ استحصال اور مصیبت کی تنظیم تھی۔ تمام مذاہب کے ساتھ رواداری اس کا مسلک تھا۔ جبلی و فطری امن پسندی اور عفو پروری اس کی خصوصیت تھی اور سماجی زندگی کے حلقہ میں بے غرض خدمت اس کا اصول تھا جیسا کہ برنی کی تصانیف سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے خدا کے دو رخ ہیں پہلے تو وہ مسلمانوں کا قبائلی خدا ہے اور دوسرے مسلمانوں میں وہ عالی نسب مسلمانوں کا قبائلی خدا ہے۔ خدا کا اس سے زیادہ تصوف کے مخالف کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ آخر زندگی تک برنی نے تصوف کا مطلب مستقل روزے رکھنا اور زیادہ سے زیادہ عبادتوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا اور عبادات کے سلسلے میں اس کا تصور خالص میکانکی تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ کے اثر کا بیان کرتے وقت لہ وہ صرف دین کے میکانکی اجزاء کی طرف ہی اشارہ کرتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں آتا کہ شیخ کے مقصدِ حیات میں رسمی عبادات شامل تو تھیں لیکن حقیقتاً یہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے تھا۔ برنی یہ تسلیم کرتا ہے کہ سلطان علاء الدین اور اس کا خاندان شیخ نظام الدین کا عقیدت مند تھا۔ یہ صحیح ہے لیکن اس کا یہ اضافہ کرنا حیرت انگیز ہے کہ :۔ "علاء الدین کا دل کیسا تھا اور وہ کتنا غافل اور لاپرواہ تھا۔ لوگ دو ہزار اور تین سو فرسنگ سے شیخ نظام الدین کا دیدار کرنے

لہ فیروز شاہی، ص ۹

لہ تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۳۴۱ - ۳۴۷

آتے تھے اور شہر کے نوجوان اور ضعیف، تعلیم یافتہ اور جاہل ہر ممکن طریقے سے اپنے کو شیخ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن سلطان علاء الدین کی عقل میں کبھی نہ آیا کہ وہ سلطان کی زیارت کے لیے جائے یا شیخ کو ملاقات کے لیے مدعو کرے [1]۔ سابق ندیم برنی، جو سلطان کے حلقہ میں دوبارہ داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ اگر حضرت شیخ کو علاء الدین کی دعوت موصول ہوئی ہوتی تو وہ دوڑتے ہوئے قصر ہزار ستون پہنچتے۔ لیکن علاء الدین زیادہ بہتر طور پر جانتا تھا۔ طاقت کے علاوہ کوئی دوسری چیز حضرت شیخ کو قصر سلطانی میں نہیں لا سکتی تھی اور طاقت کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے سلطان علاء الدین شیخ کی خانقاہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ برنی کی زندگی کے روحانی عناصر قابل غور نہیں ہیں۔

کوئی بھی شخص دین کے اصولوں کے لیے برنی کے پاس نہیں جائے گا۔ ہمارے لیے برنی کی اہمیت اس لیے ہے کہ وہ تجربہ کی بنیاد پر تین سیاسی مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے (الف) ضوابط (ب) حکمراں طبقہ اور (ج) بادشاہت۔ وضاحت کے لیے مناسب ہے کہ پہلے ہم اس کے ضوابط اور حکمراں طبقہ کے نظریات پر گفتگو کریں، پھر اس کا دور عمل بیان کرنے کے بعد اس کے نظریۂ بادشاہت کا جائزہ لیں۔

---

[1] فیروز شاہی، ص ۳۶۶

باب - ۴

ضوابط

مسلمان عادتاً کہتے رہے ہیں کہ امت اسلام اپنے تمام امور شریعت کے مطابق، جو قرآن، حدیث اور قیاس پر مبنی مانی جاتی ہے، چلاتے تھے یا چلا سکتے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی دعویٰ کیا جاتا تھا کہ عباسی دور کے بعد (۸۶۱-۷۵۴) اجتہاد (یا نئے شرعی قوانین وضع کرنے کا) دروازہ بند ہو گیا تھا۔ دونوں دعوے غلط ہیں۔ ابتدائی مسلم سماج تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ خلفاء راشدین نے نئے قوانین کی ضرورت محسوس کی اور انھیں وضع کرنے میں کوئی پس وپیش نہیں کیا۔ تقلید پسندوں نے خلفائے راشدین کے قوانین کو شریعت کا کل حصّہ تسلیم کیا لہٰذا کوئی پریشانی کی بات پیدا نہیں ہوتی۔ ایک بہت اچھی مثال خلیفہ عمرؓ کی متعہ کی ممانعت ہے۔

اموی عہد فرقہ بند تنازعات اور سیاسی سازشوں کا دور تھا جنھیں نہایت بے دردی سے کچل دیا گیا اور مسلمانوں کو نہایت سخت سیاسی طاقت نے، خواہ وہ اسے پسند کرتے رہے ہوں یا نہیں، متحد رکھا، عظیم عباسیوں کے عہد کے ختم ہونے تک صحیح احادیث جمع کی جا چکی تھیں اور سنی شریعت کے چار مسلک مستحکم ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی خلیفہ کی مرکزی طاقت معدوم ہو گئی۔ اسلام کو اجنبی ملکوں میں پہنچ کر نئے سماجی حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کے بارے میں شریعت نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور جن میں تباہ کن نتائج کے بغیر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا چوں کہ خاص ضرورت فلاح و عام کے لیے مرکزی طاقت کی تھی۔ اس لیے اسی دوران ایرانیوں اور ترکوں کے ملکوں میں بادشاہت قائم ہوئی جس کے لیے قبول عام، یا رسول اکرم کی جانشینی، کا کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان نئے تخت نشین سلطانوں کو اپنے مذہبی رویے کی وضاحت کرنا تھی اور ان ضوابط کا اعلان کرنا تھا جو وہ نافذ کرنے جا رہے تھے۔

پہلے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے آسان ترین راستہ یہ تھا کہ وہ عوام کے مذہبی فرقہ، رسوم و روایات کو تسلیم کر دیں اور ریاست کے دینی اور نیم دینی کاموں کے لیے اچھی تنخواہوں اور مناسب عزت و احترام کے ساتھ علماء دین کی ایک جماعت کو خدمت پر مامور کریں جنھیں وہ حسب مرضی برطرف بھی کر سکیں۔ ان اطاعت پذیر اور ریاست کی مٹھی میں بند ملاؤں کو علماء ظاہر کہا گیا ہے[1]۔ ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ تعلیم یافتہ انسانوں کے لیے تقریباً یہی ایسا پیشہ تھا، جو بلا تفریق نسل کھلا ہوا تھا اور تنخواہ بھی اچھی ملتی تھی۔ دوسرا مسئلہ ایک پیچیدہ تناقض کا باعث بنا۔ شرعی قانون کی بنیاد شرعی سند تھی۔ عوام کی بہبود کا مناسب لحاظ نہیں تھا۔ اگر زنا کاروں کے کوڑے لگنا ہیں تو لوگوں اور روایتوں کا لحاظ کیے بغیر ہر جگہ ان کی مرمت ہونا چاہیے۔ اگر عورتوں کو حق وراثت حاصل ہے تو یہ لحاظ کیے بغیر کہ مقامی حالات اور روایات کے مدنظر، جیسے پردہ کا رواج، ان کے لیے اپنی جائدادوں کا انتظام کرنا ممکن نہیں ہے۔ انھیں ہر جگہ یہ حق دینا چاہیے۔ لیکن بادشاہت کی بنیاد فلاح عام تھا۔ اس کی کوئی اور بنیاد نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ مسلمان سلطانوں کی بڑی تعداد کو افسوس ناک انجام دیکھنا پڑا کیوں کہ عوام کے تعاون کی کمی نے ان کے مخالفوں کو موقع دیا۔ ایسے حالات میں ہوشیار سلطانوں نے مصالحت اور اعتدال کی تدبیر اختیار کی۔ وہ شریعت کا زبانی احترام کرتے تھے اور اگر وہ اس کی دفعات میں سے کسی دفعہ کو نافذ کرنے سے قاصر ہوتے تو اپنی گناہ گاری کا اعتراف کرتے تھے۔ وہ ریاست کے پابند ملاؤں کو نظم و ضبط میں اور مطمئن رکھتے تھے۔ انتظامیہ کے تمام حلقہ میں جہاں شریعت ساکت یا تقریباً ساکت ہوتی وہ اپنے قانون وضع کرتے تھے۔ اگر عوام کی روایتی رسوم شریعت کے خلاف ہوتیں تو وہ انھیں عرف کا نام دیکر شریعت سے تجاوز کی اجازت دیتے تھے۔ چنانچہ بادشاہت کی سرپرستی میں ضوابط نشوونما پانے لگے۔ اگر یہ ضوابط خلاف شریعت ہوتے تھے تو انھیں جائز ثابت کرنے کے لیے استحسان کا اصول پیش کیا جاتا تھا، اور شریعت کی کمر ٹوٹ گئی جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شریعت نے اپنی ترقی کے لیے کوئی وسیلہ فراہم نہیں کیا تھا مصالحت کے حق میں امام غزالی کی سند کو صحیح یا دوسرے طریقے سے پیش کیا جاتا تھا۔ بادشاہت کا ادارہ غیر قانونی کہا جا سکتا تھا، عہدوں پر فائزوں افسر برے انسان ہو سکتے تھے لیکن امت اسلام کے امور کو تو چلانا ہی تھا۔ یہ واقعہ کہ کسی برے سلطان نے میری مسجد میں امام مقرر کیا ہے اس کے پیچھے ادا کی ہوئی میری نمازوں کو باطل نہیں قرار دیتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ملک پر ایک برا سلطان حکومت کر رہا ہے میں اپنے مقدمہ کو قاضی کے پاس لے جا سکتا ہوں۔ یہ برنی کا ایک کارنامہ ہے کہ اس نے اس مسئلہ کا حل نکال لیا۔ بدقسمتی سے اس کے افکار تو صاف ہیں لیکن اس کے الفاظ میں تصادم ہے۔ پھر بھی وہ پہلا سیاسی مفکر ہے جس نے مسلمانوں کے درمیان دنیاوی ضوابط کو صحیح قرار دیا ہے اور اس کارنامے کے لیے وہ پوری تعریف کا مستحق ہے۔

[1] مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں "علماء سوء" یا "بدمعاش ملا"، کہا ہے۔

سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ایک بہت بڑے مذہبی عالم سیّد نورالدین مبارک غزنوی ہوئے ہیں جو عام طور سے میر دہلی کہلاتے تھے [۱] شیخ عبدالحق اپنی سیرالابرار میں انھیں صوفیا کی فہرست میں رکھتے ہیں لیکن وہ علماء ظاہری میں سے تھے اور ان ہی کے ضمیر کی، جیسا کہ یہ کبھی ہوتا تھا، نمائندگی کرتے تھے۔ برنی تک ان کے کچھ بنیادی اصول پہنچے اور ان سے اس کے نوجوان ذہن پر گہرا اثر مرتب ہوا۔

برنی لکھتا ہے: میں نے اپنے نانا سپہ سالار حسام الدین سے سنا جو سلطان بلبن کے (حاجب) باربک کے وکیل در تھے [۲] کہ بلبن نے بارہا اپنے بیٹوں اور معتبر افسروں کو بتایا کہ اس نے دو مرتبہ سید نورالدین مبارک غزنوی کو سلطان شمس الدین التمش کے سامنے اپنے خطبات میں حسب ذیل باتیں کہتے سنا تھا۔

"بادشاہت کے ضروری امور سے متعلق سلطان جو کچھ بھی کرتے ہیں جس طرح وہ کھاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور اپنے شاہی لباس زیب تن کرتے ہیں، جس طرح وہ بیٹھتے ہیں، کھڑے ہوتے ہیں اور گھوڑے پر بیٹھ کر نکلتے ہیں، جس طرح وہ اپنی مسندوں پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور لوگوں کو اپنے مقابل بیٹھنے اور سجدہ کرنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ وہ ان کسراؤں (ایرانی شہنشاہوں) کی رسوم کی تقلید ہے جو خدا سے باغی تھے۔ خدا کی مخلوق کے ساتھ اپنے تمام معاملات میں وہ انسانوں سے بالا فرد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ بھی رسول اکرم کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ یہ خدا کے اوصاف میں شرکت کے دعوے کے مترادف ہے اور آخرت میں جہنم کیے جانے کا باعث بنے گی۔

"مذکورہ بالا کام کرنے کی وجہ سے، جو خدا کی مرضی اور رسول اکرم کی روایات کے خلاف ہیں، سلطانوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ دین کے تحفظ کے لیے حسب ذیل چار تدابیر کی تعمیل کریں۔

"پہلے تو سلطانوں کو مخلصانہ عقیدہ کے ساتھ دین اسلام کا تحفظ کرنا چاہیے، انھیں اپنی بادشاہت کی، جو (خدا کی) مخلوق کی (اخلاقی) خصوصیت کے خلاف ہے، قوت، وقار اور رتبہ کو قرآن کی برتری قائم کرنے، اسلامی رسوم کو بلند کرنے، شریعت کے احکام نافذ کرنے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم اور بدی کی ممانعت) کو عظمت دینے کے لیے استعمال کرنا چاہیے اور سلطان اس وقت تک دین کے تحفظ کے فرض کو انجام نہیں دے پائیں گے جب تک کہ وہ خدا اور رسول کے عقیدہ کی خاطر کفر اور کافری شرک اور بت پرستی کو ختم اور نیست و نابود نہیں کر دیتے۔ لیکن اگر کفر کی مضبوط جڑوں اور کافروں اور مشرکوں

---

[۱] فیروز شاہی، ص ص ۴۴-۴۱

[۲] یعنی ملک بکیترس

کی زبردست تعداد کی وجہ سے بت پرستی کو پوری طرح ملیامیٹ کرنا ممکن نہیں ہے تو سلطان کو کم از کم شرک اور بت پرست ہندوؤں کو، جو خدا اور رسول کے بدترین' دشمن ہیں ذلیل و رسوا، بے عزت اور بدنام کرنے کے لیے ضرور کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ سلطانوں کے دین کے محافظ ہونے کی علامت یہ ہے۔ جب کسی ہندو پر ان کی نظر پڑتی ہے تو ان کی آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور انھیں اسے زندہ جلانے کی خواہش ہونے لگتی ہے۔ وہ برہمنوں کی پوری طرح بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں، جو کفر اور شرک کے قائد ہیں اور جن کی وجہ سے کفر اور شرک پھیلتے ہیں اور کفر کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ اسلام کی عزت اور دین حق کے اثر کو برقرار رکھنے کے لیے وہ کسی کافر یا مشرک کو عزت نفس کے ساتھ زندہ یا مسلمانوں کے درمیان عزت اور آزادی حاصل کرنے یا کسی قوم، گروہ، ولایت، یا اقطاع کا حکمراں بننے کی اجازت نہیں دیتے۔ نیز عالم اسلام کے سلاطین کے خوف اور دہشت کی وجہ سے خدا اور رسول کا ایک دشمن بھی میٹھا پانی نہیں پی سکتا یا اپنے بستر پر ٹانگیں پھیلا کر چین سے نہیں سو سکتا۔

"مسلم سلاطین کی نجات کے لیے دوسری ضروری تدبیر یہ ہے۔ سلطان بادشاہت کے رعب و دبدبہ اور طاقت کے ذریعہ مسلم عوام اور اسلامی شہروں، ولایتوں اور قصبوں میں، گناہوں اور شرمناک افعال کی کھلم کھلا نمائش اور ممنوعہ چیزوں کی اشاعت کو روکیں۔ شدید سزاؤں اور تنبیہوں کے ذریعہ گناہ آلود اور شرمناک افعال کو گناہ گاروں کے لیے زہر سے بھی زیادہ تلخ بنادیں۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود جو لوگ نجس اور شرمناک گناہوں کو اپنا ذریعہ معاش اور پیشہ بناتے ہیں اور تمام زندگی انھیں اپناتے رہتے ہیں ان پر سلطان کو اتنی مصیبت توڑنا چاہیے کہ انھیں دنیا انگوٹھی کے حلقہ سے بھی زیادہ تنگ نظر آنے لگے اور وہ اپنے پیشے چھوڑنے اور دوسرے ذریعہ معاش تلاش کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر طوائفیں اپنے گناہ آلود راستوں کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو انھیں چھپ کر یہ پیشہ کرنا چاہیے، نہ کہ کھل کر اور فخریہ۔ لیکن اگر طوائفیں اپنے ذلیل کوچوں میں ہی اپنا پیشہ کرتی ہیں اور باہر عوام میں نہیں آتی ہیں تو انھیں پیشہ کرنے کی ممانعت نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اگر طوائفیں نہ ہوئیں تو بہت سے بدقماش اپنی جنسی ہوس سے مجبور ہو کر (مسلم) نوامیس پر دھاوے بولیں گے۔

"دین کے تحفظ کا تیسرا اصول، جو سلطانوں کی نجات کا باعث ہوتا ہے، اس طرح ہے، شریعت رسول کے قواعد کے نفاذ کی ذمہ داری، متقیوں، خدا کا خوف کرنے والوں اور دین دار انسانوں کے سپرد کرنا چاہیے۔ بے ایمان اور بے دین لوگوں کو جنھیں دوسروں کے حقوق کا کوئی احترام نہیں اور ساتھ ہی فریبیوں، دغابازوں اور مطلب پرستوں، اور درحقیقت ان تمام انسانوں کو جنھیں اس دنیا کی چاہ ہے، مسند کے مقابل بیٹھ کر

شریعت کے نفاذ یا طریقت سے متعلق امور میں قیادت کا موقعہ نہیں دینا چاہیے یا فتاویٰ دینے یا علوم دین کی تعلیم کی ذمہ داری تفویض نہیں کرنا چاہیے. فلسفیوں اور علوم عقلیہ میں اعتقاد رکھنے والوں کو ملک میں نہیں رہنا دینا چاہیے. کسی بھی حالت میں فلسفیانہ علوم کی تعلیم کی اجازت نہیں دینا چاہیے، سلطانوں کو گمراہ فرقوں، بدعقیدوں اور تقلید پسند سنی عقیدہ کے مخالفوں کو ذلیل اور رسوا کرتے رہنا چاہیے اور ان میں سے کسی کو بھی حکومت کا کوئی عہدہ نہیں دینا چاہیے۔

"چوتھا اصول، جو سچے دین کے تحفظ اور سلطانوں کی نجات کے لیے ضروری ہے، عدل کا نظام اور نفاذ ہے. اس سلسلے میں سلطان اس وقت تک اپنی ذمہ داری انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ عدل کے نفاذ کے لیے اپنی انتہائی کوشش نہ صرف کریں اور ہر معاملہ میں انصاف نہ برتیں. سلاطین کے اثر و اقتدار کے خوف سے ان کی سلطنتوں سے ظلم و جبر خارج ہو جاتا ہے اور تمام ظالموں کا خاتمہ ہو جاتا ہے،

"جب بھی (مسلم) سلاطین مضبوط حوصلہ اور سچے عقیدہ کے ساتھ ان (مندرجہ بالا) چار تدابیر کی تعمیل کرتے ہیں اور اپنے شاہی اقتدار کے رعب و دبدبہ اور اثر کے ذریعہ مرکز میں صداقت قائم کرتے ہیں تو خواہ ان کے جسم گناہ آمیز خواہشات سے آلودہ کیوں نہ ہوں اور بادشاہت کے ضروری کاموں میں انھوں نے شریعت کے خلاف ہی عمل کیوں نہ کیا ہو پھر بھی انھیں دین دار لوگوں کا رتبہ ملے گا . . . .
———————— اور دین کی سرپرستی کی وجہ سے روز محشر میں انھیں انبیاء و اولیاء کے درمیان مقام ملے گا. اس کے برعکس اگر کوئی سلطان ہر روز ایک ہزار رکعت نماز پڑھتا ہے تمام زندگی روزے رکھتا ہے، ممنوعہ چیزوں کے قریب نہیں جاتا اور اپنا تمام خزانہ خیرات میں خرچ کرتا ہے لیکن اپنی شاہی طاقت اور اقتدار کو خدا اور رسول کے دشمنوں کے خاتمہ اور بیخ کنی کے لیے استعمال کر کے دین کی حفاظت نہیں کرتا ہے اور نہ اپنے اقطاعات اور ولایتوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بڑھاوا دیتا ہے اور نہ ہی ہر ممکن حد تک عدل نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لیے جہنم کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے۔"

الفاظ اور بیان تو برنی ہی کے ہیں لیکن خیالات نورالدین مبارک کے بھی ہو سکتے ہیں جنھوں نے برنی کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا اور بعد میں فتاوائے جہانداری میں ظاہر ہوئے. برنی نے ان اصولوں میں جس واحد عنصر کا اضافہ کیا وہ حکومت کرنے کے لیے اشراف کے حق سے متعلق تھا۔

عظیم عالم (نورالدین مبارک غزنوی) کے افکار کے بنیادی اصولوں کا بغور جائزہ کرنا چاہیے: (الف) تمام غیر مسلمین کو خدا کی پرستش و بندگی میں شریک نہیں کیا گیا بلکہ اس کے دشمنوں کی حیثیت سے علیحدہ جماعت

کہا گیا ہے چنانچہ اللہ، جسے قرآن (رب العالمین) پکارتا ہے اور جس کی ذات میں رحمت نقش ہے۔[1] مسلمانوں کا قبائلی خدا بن جاتا ہے (ب) اس تصور کو ایک اور نظریہ سے مزید تقویت ملی ہے کہ اسلام غارت گری کا دین ہے جس کی توسیع و اشاعت طاقت کے ذریعہ ہوتا تھی۔ غیر مسلموں سے گفتگو کرنے کا یا انھیں کسی بھی طرح اپنی طرف مائل کرنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ شاہی اقتدار کے ذریعہ جنگ اور طاقت کا استعمال ہی واحد تدبیر ہے۔ (ج) تاہم اس زمانے کے سب سے زیادہ بھیانک کافر منگول تھے جنھوں نے ایک مسلم شہر کے بعد دوسرے شہر میں قتل عام کیا اور جو ہندوستان کی سرحد پر منڈلا رہے تھے۔ یہ سوال بے سود ہے کہ آیا نورالدین مبارک نے اپنا گراں قدر وعظ چنگیز کے عہد میں دیا تھا یا اگتائی کے عہد میں۔ التمش منگولوں کو للکارنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور علاؤالدین جن سخت منگولوں کے حملوں کے باوجود محفوظ رہ سکا اس طرح کے حملے التمش کو پوری طرح کچل دیتے۔ نہ تو اس کے پاس علاءالدین کی جیسی انتظامی صلاحیت اور قوت عمل تھی اور نہ ہی اس کی جیسی فوجی قابلیت۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ اس کے جلال الدین منکبرنی کو پناہ دینے سے انکار کا مقصد چنگیز خاں سے کسی مڈبھیڑ سے گریز تھا۔ لہٰذا نورالدین مبارک نے ہندوؤں کو زیادہ آسان نشانہ کے لیے منتخب کیا۔ یہ ایک بزدلانہ انتخاب تھا۔ لیکن کیا دہلی سلطنت وہ ہندو مخالف تدبیر اختیار کر کے جس کا وہ مطالبہ کر رہا تھا سلامت رہ سکے گی ؟ برنی یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس سلسلے میں ذمہ دار سلاطین کا جواب نفی میں تھا۔ (د) سلطان کے عہدہ کو، حالاں کہ یہ عہدہ خلاف شریعت تھا، تسلیم کیا گیا اور اسے سنت کے خلاف عمل پیرا ہونے کی اجازت دی گئی۔ پھر بھی اگر وہ غیر مسلموں سے اس طرح لڑتا ہے جس سے کہ (دین اسلام کے اعلیٰ ترین محققین کے مطابق) رسول عربی بھی ہیبت زدہ ہو جاتے تو وہ قبر سے انبیاء اولیاء کے ساتھ اٹھے گا۔ شریعت کی عظمت کی تصدیق کی گئی ہے اور ضوابط کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے پھر بھی سلطان کے شریعت کی نافرمانی کے اختیار کا اعتراف کیا گیا ہے۔ (ہ) گناہ آلود پیشوں کے لیے شریعت کی تجویز کی ہوئی سزاؤں کو بالکل نظر انداز کیا گیا۔ ان پیشوں کو جاری رکھنے اور بہر صورت طوائفوں کا پیشہ جاری رکھنے پر زور دیا گیا جنھیں کسبی (مستاجرہ) کہا گیا۔ ان کے پیشے کو رسوا کرنا ہوگا اور ریاست کی نگرانی میں جاری رکھنا ہوگا۔

فتاوائے جہاں داری کی نصیحت ۱۱ میں نورالدین مبارک کے اصولوں کی وضاحت کے بعد برنی یہ شکایت کرتا ہے کہ مسلم سلاطین کا اس کی ہدایات پر چلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ یقیناً بلبن کے متعلق صحیح ہے۔

---

[1] کتب علی نفسہ الرحمۃ

وہ منگولوں کے خوف کی وجہ سے بداہتہً اس حالت میں نہیں تھا کہ ہندو رایوں کے خلاف کوچ کرے اور اس نے یہ بات اپنے اعلیٰ افسروں پر ظاہر کردی تھی[۱] اور علاؤالدین جو منگولوں اور رایوں دونوں سے جنگ کر سکتا تھا۔ اس نے ہندو رعایا کی رائے عامہ کو اپنے حق میں برقرار رکھا۔

برنی بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے "بلبن نے سلطان شمس الدین کے لیے سید نورالدین مبارک غزنوی کے تجویز کیے ہوئے ان اصولوں کو جنھیں اس نے خود سنا تھا بار بار اپنے بیٹوں، بھتیجوں اور افسروں کے سامنے دہرایا اور بری طرح رویا۔ اس نے ان سے کہا کہ" میں دین کے تحفظ کے فرائض کو پورا نہیں کر سکتا اور آخر کس طرح میں ایسا عزم کر سکتا ہوں جب کہ خود میرے آقا[۲] بھی دین کا تحفظ نہیں کر سکے! لیکن میں کم از کم مظلوموں کی حفاظت کے لیے آسکتا ہوں۔ عدل کے نفاذ میں کسی بھی انسان کا لحاظ نہیں کروں گا۔ میرے بیٹو اور عزیزو، تم اپنے قدامات کا خیال رکھو، اگر مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کسی کمزور پر ظلم کیا ہے تو میں تمہیں سزا دوں گا۔ بنیتر صورتوں میں میں معصوم انسانوں کے قاتلوں کو سزائے موت دوں گا[۳]۔ تمہاری مجھ سے قریبی رشتہ داری اور تمہاری خدمت کے دعوے مجھے غیر جانب دارانہ عدل کرنے سے نہیں روک سکیں گے۔"

جہاں تک تاریخ فیروز شاہی کا تعلق ہے مسئلہ ضوابط کے سلسلے میں سلطان علاؤالدین اور قاضی مغیث الدین بیانوی کے درمیان گفتگو بطور مثال پیش کی گئی ہے۔ لیکن برنی کی علاؤالدین کی بارگاہ تک کوئی رسائی نہیں تھی اور وہ یہ سوچنے میں غلطی پر ہے کہ علاؤالدین کی اقتصادی اصلاحات کی اولین وجہ یہ تھی کہ وہ اشیاء کی قیمتوں کو سپاہیوں کی تنخواہوں کے احاطہ میں لانے کا آرزومند تھا۔ اصل وجہ جس سے علاؤالدین کو تحریک ہوئی شیخ نصیرالدین چراغ نے اپنی خیرالمجالس میں قاضی حمید ملتانی کی سند پر بیان کی ہے[۴]۔ ایک دن کا واقعہ ہے قاضی حمید نے سلطان کی خلوت گاہ میں داخل ہونے کے بعد دیکھا کہ سلطان تخت زرنگار پر بیٹھا ہوا پاؤں زمین پر ٹیک رہا ہے اور ننگے سر ننگے پاؤں کسی فکر میں غرق ہے۔ قاضی سلطان کے سامنے گیا لیکن سلطان نے اسے نہیں پہچانا وہ واپس ہوا اور اس نے ملک قرابیگ کو مطلع کیا۔ اس کے بعد دونوں خلوت گاہ میں داخل ہوئے اور قرابیگ سلطان سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ بعد میں قاضی حمید نے سلطان سے دریافت کیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ سلطان علاؤالدین

---

[۱] فیروز شاہی، ص ص ۵۱-۵۰

[۲] اس جگہ آقاؤں سے مراد شہاب الدین غوری اور التتمش ہوں گے

[۳] یعنی وہ کسی قاتل کو مقتول کے ورثاء کو زرِ خوں بہا دے کر جان نہیں بچانے دیگا۔ فیروز شاہی، ص ۴۴

[۴] خیرالمجالس، مرتب خلیق احمد نظامی، ص ۲-۲۴۱

نے جواب میں کہا، سنو، کچھ عرصہ سے ایک خیال میرے ذہن میں آرہا ہے۔ اس دنیا میں خدا کے اتنے بہت سے بندے ہیں لیکن اس نے مجھے ان پر حکومت کرنے کے لیے چنا ہے۔ چنانچہ مجھ کو کچھ ایسا کام کرنا چاہیے جس سے تمام نوع انسان میرے کام سے مستفید ہو سکے۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟ اگر میں اپنا تمام موجودہ خزانہ تقسیم کر دوں اور اس سے سو گنا زیادہ بھی بانٹ دوں تو وہ سب کے لیے پورا نہیں ہوگا۔ اگر میں خزانوں کی تقسیم میں تمام (شاہی) دیہاتوں اور اقطاعات کا بھی اضافہ کر دوں تو یہ بھی کافی نہیں ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر کیا کروں جس سے سب کو فائدہ پہنچ سکے۔ ابھی میرے ذہن یہ خیال آیا ہے جس کی میں وضاحت کروں گا۔ اگر میں اناج کی قیمت کم کر دوں تو اس سے سب کو فائدہ ہوگا لیکن اناج کی قیمت کس طرح کم کی جا سکتی ہے؟ میں صوبوں (اطراف) کے نائکوں کو طلب کرنے کا حکم دوں گا تاکہ وہ صوبوں (اطراف) سے غلہ لے کر دہلی آئیں۔ کچھ دس ہزار مویشیوں پر غلہ لاد کر لائیں گے تو دوسرے بیس ہزار پر، میں انھیں خلعت فاخرہ اور چاندی دوں گا اور ان کے خاندانوں کو اخراجات دوں گا تاکہ وہ اناج لائیں اور میری مقرر کی ہوئی قیمت پر فروخت کریں۔

خیر المجالس اسی جگہ موقوف ہو جاتی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علاؤ الدین اپنے خاص مقاصد کے حصول کے لیے یعنی قحط دور کرنے اور پیداوار میں لاگت کے اصول پر اقتصادی تحفظ اور استحکام کے قیام کے لیے ضروری ضابطوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ کرامات دکھانا تو ممکن نہیں تھا، لیکن وہ شاہراہوں کی حفاظت کی ضمانت دے سکتا تھا، اشیاء کی مناسب آمد و رفت کی نگرانی کر سکتا تھا، اجارہ داریوں کو کچل سکتا تھا۔ احتکار کو روک سکتا تھا اور اس کا یقین دلا سکتا تھا کہ پیداوار کی لاگت کے اصول کے مطابق اس کی مقرر کی ہوئی قیمتوں کی سختی سے پابندی کی جائے گی چوں کہ زیادہ تر تجارت اور صنعت مخصوص ہندو طبقوں کے ہاتھوں میں تھی اس لیے اسے ان کے توسط سے کام کرنا ہوگا اور انھیں قابو میں رکھنا ہوگا۔ یہ ایک انوکھا خواب تھا جو اس سے پہلے یا بعد میں کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن علاؤ الدین ایک عملی انسان تھا اور اس نے جو اقتصادی نظام قائم کیا وہ اس کی زندگی کے بقیہ دس سالوں تک باقی رہا۔

قوانین شریعت علاؤ الدین کے مقاصد کے لیے ناموزوں تھے اس لیے اس نے ان کی طرف توجہ نہیں دی اس نے ریاست کی خدمت میں حاضر ملاؤں اور ان کے نظریوں کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی اور قاضی حمید ملتانی کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ ریاست کی طرف سے انھیں سنبھالے لیکن آخر علاؤ الدین کو تمام عوام کی خدمت کرنے کا یہ انوکھا خیال کہاں سے ملا؟ قرآن کی براہ راست مطالعہ اور غالباً شیخ نظام الدین اولیاء کی تعلیمات سے۔[۱]

[۱] کیوں کہ قرآن خواہ اصل پڑھیے یا ترجمہ البتہ مفسرین کی غلط بیانی کو ایک طرف رکھیے (حاشیہ صفحہ ۔ پر)

ہر شخص کو یقین دلاتا ہے کہ اسے انسان کی مصیبتوں کے تدارک کا کتنا گہرا احساس ہے۔ رسول اکرم نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے ملک کے اخراجات اور قرآن کے مخصوص کیے ہوئے مصیبت زدہ گروہوں، یعنی یتیموں، مساکین، فقراء اور ان افراد کی امداد کے لیے جو تنگ دستی کے باوجود دست طلب نہیں بڑھاتے ہیں محصول یا یوں کہیئے کہ صدقات کا مطالبہ کیا ہے۔ رسول اکرم کے لیے حکومت کے مطلوبہ محصولات یا صدقات کے جائز و صحیح ہونے کا جواز یہ تھا۔ اور ان کے خیال میں محصولات اور صدقات میں فرق کرنا بے سود تھا، کہ حکومت انھیں مصیبت سے نجات دلانے کے کام میں خرچ کرے گی۔ یمن کے والی کو انھوں نے یہ ہدایت کی تھی کہ امیروں سے وصول کر کے غرباء کو دو، ان کا اپنا گھر میں رہنے، پہننے اور کھانے کا معیار تقریباً آج کل کے اوسط درجہ کے ہندوستانی کسان کے برابر تھا اور ان کی زندگی کا ایک اہم رخ اپنے اردگرد کی مادی پریشانی سے جدوجہد کرنا تھا، ہمارا فلاحی ریاست کا موجودہ تصور پیداوار کے ذرائع میں بہتری پیدا کر کے عوام کے مادی اور تمدنی حالات میں بہتری لانے کی امید پر منحصر ہے۔ ساتویں صدی میں اس طرح کا کوئی تصور ناممکن تھا۔ رسول اکرم جو کچھ بھی سوچ سکتے تھے وہ یہ کہ حکومت کو راحت اور بحالی کی مشین ہونا چاہیے۔ محصولات تو کم تھے مگر مقصد حاصل کیا جا سکتا تھا اور عرب معیار زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جائے گا کہ یہ کافی حد تک حاصل کر لیا گیا تھا۔

مجتہدین اسلام نے، جو بہت زیادہ قابل احترام ہیں اور جنھیں اس معاملہ میں مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے، قرآن کی تعلیم اور رسول اکرم کی ریاست کے اس پہلو کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا ہے۔ انھوں نے محض یہ اصول مقرر کر دیا کہ اچھی آمدنی والے انسان کو اپنی آمدنی کا ۲½ فی صد فوری پریشانی ختم کرنے کے مقصد کے لیے خیرات کر دینا چاہیے یہ دینی فرض تھا اور حکومت کا اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اگر کوئی شخص زیادہ خیرات کرتا ہے تو یہ قابل تعریف ہے لیکن لازمی نہیں۔ انھیں شاید یہ توقع نہ رہی ہو کہ اتنی مختصر رقم قرآن میں مذکورہ جماعتوں کی مصیبت سے نجات کے لیے کافی ہوگی۔ لیکن زمانہ کے حالات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ امویوں اور عباسیوں کے ساتھ

ئے برنی علاؤالدین کی اسلام سے واقفیت کا پورا اندازہ نہیں لگا سکا ہے۔ اس کے چاروں طرف تعلیم یافتہ لوگ تھے اس نے ان سے قرآن پڑھا ہوگا اور اسلامی عقاید سیکھے ہوں گے۔ شیخ نصیرالدین جو اس وقت حضرت شیخ کے کار خیر کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے ہیں کہ علاؤالدین کی اصلاحات حضرت شیخ کے حلقہ میں بہت زیادہ پسند کی گئیں۔

بادشاہت آئی جسے غلطی سے خلافت کہا گیا اور اسے بہت اچھی طرح منظم دفتری حکومت کا تعاون ملا جس کے اراکین کو حکمراں مقرر اور برطرف کرتا تھا۔ محصولات حکومت کے اخراجات کے لیے وصول کیے جاتے تھے نہ کہ فلاح عام کے لیے۔ حکومت سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ تعلیم و تمدن کے لیے کچھ کرے گی لیکن یہ اس کے فیصلہ پر منحصر تھا اور حکومت اس مد پر قدرتی طور پر اس اندازہ سے خرچ کرتی تھی کہ اس کی طاقت کو مزید تقویت ملے۔ اولیں عباسیوں کے عہد میں (۸۶۱-۷۵۴ء) عظیم مجتہد گزرے اور حالاں کہ کچھ کہانیاں امام شافعی کو ہارون رشید سے منسلک کرتی ہیں لیکن سنی مسلکوں کے دوسرے بانی حکومت سے الگ تھلگ رہے۔ نیز شیخ جنید کے قول کے مطابق یہ وحشت کا زمانہ تھا۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ان بدلے ہوئے حالات میں مجتہدین نے تعلیمات قرآن اور رسول اکرم کی ریاست کے مقاصد حاصل کرنے کی غرض سے ضوابط وضع کیے ہوں گے اور اپنے جانشینوں کو وقتاً فوقتاً ایسا کرتے رہنے کی تلقین کی ہوگی۔ اس طرح ہمیں ایک ترقی پذیر شریعت مل گئی ہوتی۔ لیکن اس میں شک کی بہت گنجائش ہے کہ مجتہدین کی ریاست سے متعلق کہی گئی کوئی بات حکمرانوں اور حکمراں طبقے کے لیے لازمی تصور کی جا سکتی تھی یا تاریخ کے دھارے کو بدل سکتی تھی۔ بہر صورت جیسا کہ برنی بھی اشارہ کرتا ہے چاروں مسلکوں کے بانیوں نے ریاست سے متعلق تمام امور کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا اور ان سے کوئی حقیقی رہنمائی حاصل نہیں ہوئی البتہ انھوں نے یہ ضرور کیا کہ رسول اکرم اور خلفائے راشدین کے اقوال و افعال کو، جو انتہائی مختلف حالات زندگی میں وجود پذیر ہوئے تھے۔ تحریر میں محفوظ کر دیا۔ چنانچہ امور ریاست میں شریعت کا حوالہ دینا جن کی تسلیم شدہ مجتہدین نے اشاعت کی تھی، ایک لغو بات تھی۔ سید نورالدین مبارک غزنوی کی طرح علماء کے ظاہری اپنے طبقہ اور پیشہ کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی ذاتی تشریحات کی تشہیر کر سکتے تھے۔ لیکن ایسی ادنیٰ باتوں کی کوئی سند نہیں ہے۔ فرشتہ نے، جس نے اکبر کی اصلاحات دیکھی تھیں۔ علاؤالدین کی اصلاحات کے بارے میں خیال ظاہر کرتے وقت یہ کہا کہ "جدید دنیا کی حکومت اور خاص طور سے ہندوستان کی حکومت شریعت کے مطابق چلانا ممکن نہیں ہے۔" البتہ احکام شریعت شخصی قوانین کے دائرہ میں یقیناً اب بھی لازمی طور پر عاید ہوتے تھے۔ جیسے وراثت، شادی، طلاق اور دوسرے معاملات بھی جیسے کہ سود خوری یا سود کی ممانعت۔

تاریخ کے پس منظر میں یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اگر قرآن کے کسی بخوبی واضح مقصد کا، خاص طور سے سماجی معاملات کے سیاق میں شریعت کے کسی قانون یا خود قرآنی قانون سے ٹکراؤ ہوا ہے تو قرآن کا مدعا غالب آیا ہے۔ یہ اس لیے کہ قانون کے کسی مقصد یا مدعا کے حوالے کے بغیر کوئی معنی نہیں ہوتے۔ نیز قانون انسان (کی ضروریات) کی تکمیل کے لیے بنا ہے، نہ کہ انسان قانون کی تکمیل کے لیے۔ کوئی غیر مسلم یہ خیال کر سکتا ہے

کہ مسلمانوں کے عام عقیدہ کے مطابق ایک حکم قرآن کسی حدیث کو منسوخ کر دے گا اور ایک حدیث مجتہدین کے کسی حکم کو منسوخ کر دے گی۔ یہ عام طریقہ ہونا چاہیئے تھا خواہ ہم اس سند پر غور کریں جو کوئی حکم دیتی ہے یا اس حکم کے دستیاب ثبوت دیے جا چکے ہوں۔ قرآن کو مکمل صحت کے ساتھ محفوظ رکھا گیا ہے لیکن غیر مستند احادیث کافی تعداد میں پوری شدت کے ساتھ رائج کر دی گئی ہیں جب کہ مجتہدین کے بہت سے اقوال کی ہمارے پاس صرف بالواسطہ شہادتیں ہی ہیں اور ان کی تحریر نہیں ہے لیکن ازمنہ وسطیٰ کے ملّا اس معاملہ کو مختلف زاویہ سے دیکھتے تھے۔ وہ کسی تعلیم یافتہ مسلمان کو قرآن پڑھنے اور دین کے معاملات میں اپنی توجیہہ کے مطابق خود کی رہنمائی کرنے سے نہیں روکتا تھا اور نہ روک سکتا تھا لیکن شریعت کے دائرہ میں صورت حال مختلف تھی ہر مسلک کا بنیادی دعویٰ یہ تھا کہ اس کے مجتہدین کوئی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر قرآن کا کوئی حکم یا کوئی حدیث بظاہر کسی مجتہد کے قول سے متناقض نظر آتی تھی تو اسے تاویل کے ذریعے اس قول کے موافق بنایا جاتا تھا۔ لہذا شریعت اسلام اس طرح ہے جس طرح عظیم عباسیوں کے عہد میں (۷۵۰ - ۸۶۱) مجتہدین نے بنا دی ہے۔ اس کے بعد سے کوئی 'اجتہاد' نہیں ہوا ہے۔ بعد کی فقہ کی کتابیں، جیسے عظیم 'ہدایہ'، حقیقتاً تالیف ہیں لیکن عظیم ترین مفکر، جیسا کہ مرحوم ایچ۔ اے۔ ایل فشر نے اپنی تاریخ یورپ (History of Europe) میں رائے زنی کرتا ہے، نئی ترتیبیں پیش کرنے کے لیے زندگی کی تمام گنجائشوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ایک زبردست تبدیلی . . . . . آگئی۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ 'اجتہاد' کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ یہ دروازہ کبھی بند نہیں کہا جا سکتا ہے، ہاں ایک زیادہ بڑے حاکم نے علماء سے اجتہاد کا اختیار لے لیا تھا۔ ریاست نئی 'مجتہد' تھی، پرانی طرح کے اجتہاد کا دروازہ بند کرنا تھا تاکہ نئے 'اجتہاد' یعنی ریاستی قوانین' کا دروازہ کھولا جا سکے۔ لیکن شریعت کے بارے میں بچکانہ اور بے تکی گفتگو جاری رہی۔ ایک اچھے مسلمان کا یہ فرض تھا اور رہا ہے کہ وہ شریعت کی تعریف کرے اور اس کے نفاذ کا مطالبہ کرے، لیکن 'عملی منطق' کی بنیاد پر اس کے نفاذ سے بچ نکلنا اور بھی زیادہ بڑا فرض رہا ہے۔

برنی سلطان علاؤالدین خلجی اور قاضی مغیث الدین بیانوی کے درمیان جس گفتگو کو قلمبند کرتا ہے اس کا جائزہ لیتے وقت ان ملحوظات کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ گفتگو سلطان کے دریافت کیے ہوئے چار سوالوں پر ہوئی[۱]

(۱) ہندوؤں کی محصول ادا کرنے والوں کی حیثیت سے حالت۔ ہندوؤں کے سلسلے میں قاضی نے وہی

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۸۹ - ۲۹۶

دہرایا جو عراق، ایران اور وسط ایشیا میں ہدایہ کی نوعیت کی درسی کتابوں میں ان ملکوں کے لاچار غیر مسلم اقلیتوں کو ذلیل کرنے کے بارے میں کہا گیا تھا۔ لیکن علاؤالدین کو عام ہندوؤں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو ہندو سرداروں یعنی چودھریوں، خوطوں اور مقدموں کی طرف سے فکرمند تھا جو اسے محصولات ادا نہیں کر رہے تھے۔ مورلینڈ نے مسلم ہندوستان کے زراعتی نظام (Agrarian System of Muslim India) میں اس نکتہ کی وضاحت کردی ہے۔

(۲) بدعنوانی، رشوت، غلط حسابات وغیرہ کے مرتکب حکومت کے اہل کاروں کے لیے شریعت کی مجوزہ سزائیں قاضی نے یہ بتایا کہ اس مسئلہ پر شریعت نے بحث نہیں کی ہے اور اس نے کسی بھی کتاب میں اس سوال کے بارے میں نہیں پڑھا ہے اس لیے سلطان جس طرح بھی مناسب سمجھے غلطی کرنے والوں کو سزا دے سکتا ہے لیکن جو بیت المال سے چوری کرتے ہیں ان پر ہاتھ قلم کرنے کی شرعی سزا کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

(۳) دیوگیر سے لائے گئے خزانے۔ علاؤالدین نے ان خزانوں کو اس بنیاد پر بیت المال سے علیحدہ رکھا تھا کہ انھیں اس نے اپنی تخت نشینی سے پہلے حاصل کیا تھا۔ قاضی نے کہا کہ وہ لشکر اسلام کی طاقت کے زور پر حاصل کیے گئے تھے اور اس لیے انھیں بیت المال میں ہونا چاہیے۔ لیکن چوں کہ سلطان اپنی مرضی سے بیت المال کو سنبھالتا تھا لہٰذا نکتہ خالص علمی تھا۔

(۴) شاہی خزانہ پر سلطان اور اس کے خاندان کا حق۔ شریعت اس معاملہ میں ساکت ہے اور کسی بھی وقت شاہی اخراجات پر کوئی شرعی پابندیاں نہیں رہی ہیں۔ قاضی نے جو کچھ کہا اپنی ہی ذمہ داری پر کہا۔ چار صورتیں تھیں (الف) رسول اکرم اور خلفائے راشدین کی روایات کے مطابق سلطان اتنی تنخواہ لے سکتا تھا جو وہ اپنے اچھی طرح لیس رسالے سپاہیوں کو دے سکے (یعنی ۲۳۴ ٹنکہ سالانہ) (ب) ایک صورت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے اعلیٰ ترین افسروں کو جو تنخواہ دیتا تھا وہی خود بھی لے (ج) تیسرے علما دینا نے سلطان کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنا وقار برقرار رکھنے کے لیے اپنی اعلیٰ ترین افسروں کے مقابلہ میں اچھی خاصی زیادہ رقم لے سکتا ہے۔ (د) لیکن مصلحت ملکی بنیادوں کے علاوہ اس سے زیادہ رقم کو جائز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

بعد ازاں سلطان نے ان سزاؤں کا ذکر کیا جو وہ دے رہا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ وہ تمام شریعت کے خلاف ہیں۔ قاضی نے جواب میں کہا کہ وہ سب شریعت کے خلاف ہیں کیوں کہ رسول اکرم کے اقوال اور علما نے یہ کہیں اظہار خیال نہیں کیا ہے کہ اولوالامر اپنے احکام کی تنقید کے لیے جو اس کی مرضی ہو، کر سکتا ہے، قاضی نے یہ حجت کی کہ علاؤالدین کی سخت سزاؤں کی شریعت اجازت

نہیں دیتی تھی۔ وہ یہ نہیں بتا سکا کہ شریعت کے مطابق کونسی سزائیں دینا چاہیئے کیوں کہ شریعت ساکت تھی۔ تمام گفتگو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ سلطان ضوابط تو بنا سکتا ہے لیکن سخت سزاؤں کو، جب تک کہ شریعت ان کی اجازت نہ دیتی ہو، خلاف شریعت سمجھنا چاہیئے کیوں کہ وہ انسانیت کے خلاف ہیں۔

برنی محمد بن تغلق کے ضوابط اور نئے منصوبوں (اسلوب) پر کچھ تفصیل میں گفتگو کرتا ہے۔ لیکن اس سلطان کے ذکر میں وہ شریعت بر خلاف ضوابط کے مسئلہ کو نہیں چھیڑتا ہے اور صرف اس کے منصوبوں کے عملی نتائج پر تبصرہ کرتا ہے [۱]

برنی کا ریاست اور اس کے ضوابط کے بارے میں قطعی خیال اس نظریے سے ظاہر ہو جاتا ہے جو اس نے بغراخاں کی زبان سے ادا کروایا ہے۔ "سچی اور صحیح بات تو یہ ہے کہ صرف اس حکمراں کو سلطان کہنا اور سمجھنا چاہیے جس کی مملکت میں کوئی شخص ننگا اور بھوکا نہیں سوتا اور جو ضوابط بناتا ہے اور ایسے اقدامات (موازن) وضع کرتا ہے جن کے سبب اس کی کسی رعیت کو ایسی درماندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جس سے زندگی کو خطرہ ہو" [۲]

اس موضوع پر اسے اس کا حرف آخر خیال کرنا چاہیے۔ قرون وسطیٰ کی ادبی تخلیقات کے حالات کے پیش نظر اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

---

[۱] بہر حال علماء سے یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ سلطان کے اقدامات (موازن) پر اعتراض کریں گے۔ سلطان نے قحط کے دوران دہلی کے باہر کنوئیں کھودنے کا حکم دیا اور زراعت کے لیے تمام ضروری چیزیں فراہم کیں۔ ایک مشہور فقیہ مولانا عفیف الدین کاشانی نے اس پر اعتراض کیا کیوں کہ یہ زرعی کام اناج کے شاہی گودام بھرنے کے لیے زبردستی کیا جا رہا تھا۔ سلطان محمود نے اسے گرفتار کروالیا اور اس کے بعد آزاد کر دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد سلطان نے یہ سنا کہ عفیف الدین کاشانی نے دوسرے فقہا سے اس کے خلاف باتیں کی تھیں اور اس نے ان تینوں کو سزائے موت دے دی۔ (ابن بطوطہ، عجائب الاسفار، اردو ترجمہ از خان محمد حسین، ج ۲، ص ۱۴۲)

[۲] فیروز شاہی، ص ۱۴۸

باب ۵

حکمراں طبقہ

بلبن کی بارگاہ میں کوئی بھی شخص سپہ سالار حسام الدین کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتا تھا جب تک کہ وہ ترکی النسل نہ ہو کیوں کہ بلبن نسل اور نسب کے معاملہ میں خبطی تھا اور غالباً اتنے ہی خبطی برنی کے خاندان کے بزرگ ارکین بھی تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑی بے دردی سے اس کے نوجوان ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ عالی نسب ہونے کی وجہ سے وہ عوام الناس سے بلند تھا۔ ذاتی حرماں نصیبوں نے اسے بچپن سے چلے آنے والے زعم باطل کو زندگی کا فلسفہ بنانے پر مجبور کردیا اور حالاں کہ اسے نظریہ نسل کی تائید میں ایک بھی مذہبی تحریر نہیں مل سکی لیکن اس کے باوجود وہ دین اور تدبیر الٰہی کو اس کی حمایت میں پیش کرتا ہے (نصیحت ۲۱) برنی کی پیدائش کے وقت ترک افسر دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک تو وہ تھے جنھوں نے غلاموں کی حیثیت سے اعلیٰ عہدے حاصل کیے اور کبھی کبھی اپنے کو سلطانی کہتے تھے اور دوسرے وہ جو آزاد افراد کی حیثیت سے حکومت کی ملازمت میں داخل ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برنی کا خاندان آخر الذکر جماعت سے تعلق رکھتا تھا کیوں کہ کچھ جگہوں پر وہ زرخرید غلاموں کا نفرت سے ذکر کرتا ہے۔

لیکن اس کے خاندان کی ہندوستان میں کئی پشتیں گزر چکی تھیں اور غیر ممالک سے ان کے روابط منگول حملوں کے باعث ان تعلقات کے منقطع ہونے سے کافی پہلے ختم ہو چکے تھے۔ اپنے دوست امیر خسرو کے برخلاف وہ ترکی زبان سے کسی واقفیت کا اظہار نہیں کرتا ہے اور اس کی تصانیف میں عام مستعمل خطابات کے علاوہ ترکی کے کوئی الفاظ نہیں ہیں اس کی وسط ایشیا اور ایران کے جغرافیہ سے لاعلمی حیرت انگیز ہے۔ برنی کی جو تین تصانیف دستیاب ہیں ان میں کہیں بھی وہ اپنے کو ترک نہیں کہتا ہے

تہ فیروز شاہی، ص ۵۴۳

اور طرز احساس و فکر میں وہ سو فی صد ہندوستانی ہے۔ اس کا حکمراں طبقہ کا نظریہ عام ہندو زن نظام کا فلسفہ ہے جسے مسلم شکل میں ڈھال لیا گیا ہے۔ حالاں کہ وہ خود اس حقیقت سے بے خبر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے یہ شکل موزوں نہیں رہی۔ عام ہندو عقیدہ یہ ہے کہ برہمانے انسانوں کو مختلف ورنوں میں پیدا کیا ہے اور یہ ودھان کا فرض تھا کہ وہ ورنوں کے اختلاط کو روکے۔ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کی مقدس کتابوں میں اس کے مساوی کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف ایک ایسا شخص جس پر ہندو ورن نظام کی روایت کا بہت گہرا رنگ چڑھا ہوا ہو جیسا کہ برنی تھا یہ کہنے کی جرأت کر سکتا تھا کہ تقویٰ صرف عالی نسب افراد کی دسترس میں تھا۔ آج ہم ان ترکوں کے بارے میں جنھوں نے ہندوستان میں بود و باش اختیار کر لی تھی صرف اپنی دستاویزات کی وجہ سے کچھ علم رکھتے ہیں۔ وہ ملک میں کہیں بھی نہیں ملیں گے۔ غالباً برنی کے زمانے ہی میں ترکوں کا ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ اختلاط کا مسئلہ شروع ہو چکا تھا حالاں کہ سیاست کے میدان میں وہ دو الگ اور مخالف جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ترک صرف ہندوستانی عورتوں سے شادی نہ کر کے اپنے مختلف سماجی وجود کو قائم رکھ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنے... آبائی ترک ہونے کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن ان کے گھر اور ان کے ساتھ ان کے بچوں کے تصورات ہر نئی نسل کے ساتھ پہلے سے زیادہ ہندوستانی ہوتے گئے۔

اسلام نے یہ تعلیم دی تھی کہ سبھی انسان بلا امتیاز و تفریق بھائی بھائی تھے اور اس طرح اسلام نے اپنے دائرۂ اثر میں مساوات کو اس حد تک قائم کر دیا جو اس سے پہلے کسی بھی گروہ کے لیے ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے باوجود پرانے خیالات باقی رہے۔ نیز جدید دریافتوں نے جس طرح جمہوریت کے وجود کو ممکن بنایا اس سے پیشتر کوئی بھی حکومت کسی حکمراں طبقہ کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی لہٰذا تمام فارسی ادب نسل کی بنیاد پر کمتر طبقوں کے حقارت آمیز ذکر سے بھرا ہوا ہے۔ اشراف کی گفتگو میں بھی یہی بات پائی جاتی تھی۔ تاہم اس حقیقت پر بہت زیادہ زور نہیں ڈالنا چاہیے کیوں کہ روشن خیال مسلمانوں کی ایک بہت اہم جماعت ادنیٰ متوسط طبقہ یا اعلیٰ مزدور طبقوں سے تعلق رکھتی تھی۔

برنی کے نظریہ نسل میں ایک بنیادی تضاد ہے جسے اس نے خود محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ واحد طبقہ شرفا جسے برنی اہمیت دیتا تھا ایک متحد ریاست کا سرکاری عملہ تھا۔ اس کی نظروں میں تاجروں اور دوسرے طبقوں کی کوئی وقعت نہیں تھی خواہ وہ کتنے ہی خوش حال کیوں نہ ہوں اور نہ ہی وہ قرون وسطیٰ کے یورپ کے جاگیردار طبقہ امراء جیسے کسی سماجی نظام سے واقف تھا اور جب اس نے

اس سے مشابہ کوئی چیز دیکھی تو بشیر مسلم مفکرین کی طرح اسے طوائف الملوکی کہہ کر اس کی مذمت کی کیوں کہ یہ ضوابط کی تنقید اور درحقیقت ریاست ہی سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

قبل اسلام کے زمانہ کے سلسلے میں برنی کے لیے یہ کہنا آسان تھا کہ حکومت کا ہر عہدہ موروثی تھا حالاں کہ تھوڑے غور و فکر ہی سے اسے یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس طرح کے انتظام سے ریاست منتشر ہوگئی ہوتی۔ برنی کے ذہن میں اموی اور عباسیوں کی بحیثیت حکمراں طبقہ کی ریاستوں کے بہت صاف تصویر تھی۔ آخرالذکر کی عمارت اول الذکر کی بربادی پر کھڑی کی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کا علم دھندلا پڑ جاتا ہے لیکن چوں کہ اس نے دہلی سلطنت کی ڈیڑھ صدی کا جائزہ لیا ہے لہٰذا اس نے اس کے بعد دوسری حکمراں جماعت کو زوال پذیر ہوتے ہوئے دیکھا۔ نصیحت ۲۲ میں اس کی اچھی خاصی تصویر کشی کی گئی ہے جو خاص طور سے دہلی سلطنت کے تجربہ پر مبنی ہے۔

برنی کے خیالات کو سمجھنے کے لیے عام مسلم ریاست کے تین بنیادی اصولوں کو ذہن نشین رکھنا چاہیے رسول اکرم اور خلفائے راشدین نے مخصوص فرائض کے لیے افسر تعینات کیے۔ ان فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ان سے متعلق افسران کے عہدے ختم ہوجاتے تھے لیکن انھیں ریاست کا سربراہ اپنی سمجھ اور فیصلہ سے برطرف بھی کرسکتا تھا۔ امیر معاویہ نے مسلم بادشاہت کا نظام قائم کیا۔ پہلے تو انھوں نے عالی رتبہ عرب قبیلوں سے افراد منتخب کرکے ایک عملہ یا حکمراں طبقہ منظم کیا۔ تمام افسروں کو سربراہ مملکت مقرر کرتا تھا اور وہ انھیں کسی وقت بھی برطرف کرسکتا تھا۔ دوسرے سربراہ مملکت کو اپنا جانشین یا جانشینوں کی قطار نامزد کرنے کا حق تھا لیکن نامزد شخص اسی وقت تخت نشین ہوگا جب اعلیٰ افسر اسے تسلیم کرلیں۔ اگر وہ اس سے غیر مطمئن ہوتے تو انھیں مرحوم حکمراں کے بیٹوں یا بھائیوں میں کوئی دوسرا شخص منتخب کرنے کا اختیار تھا۔ تیسرے جب اسلامی دینی علوم عظیم عباسیوں کے عہد میں تحریر میں آگئے اور ان کی تعلیمات کو ایک مناسب بنیاد مل گئی تو دینی اور نیم دینی فرائض کے لیے افسروں کی ایک جماعت یعنی علماء ظاہری کو بھی سرکاری عملہ کے خاکے کے مطابق منظم کیا گیا۔ اس کے اراکین کو سربراہ مملکت اپنی مرضی سے مقرر اور برطرف کرتا تھا۔

یہ طریقہ کار اس وقت تک باقی رہا جب تک مسلم بادشاہت باقی رہی۔ لیکن اس طریقہ کار میں ان گنت انقلابات ممکن تھے۔ پھر بھی عام طور سے مسلم ریاستوں نے موروثی عملہ یا علماء دین کے موروثی طبقہ کو کبھی برداشت نہیں کیا حالاں کہ سربراہ مملکت سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے متوفی اہل کاروں کے اعزہ کا مناسب لحاظ رکھے گا۔ انھوں نے موروثی زمیندار طبقہ امراء کو بھی برداشت نہیں کیا۔ البتہ کبھی مستثنیات کے علاوہ جیسے ایران کے دہقان اور دہلی سلطنت کے رائے، رانا اور راوت (زمیندار طبقہ

امراء جب ابھرا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ افسروں نے اپنی زیر نگرانی زمینوں پر قبضہ جمالیا تھا اور ریاست کا زوال ہو رہا تھا۔

یہ اصول قائم کرنے کے بعد (الف) شرافت و امارت نسل در اصل چلتی ہے کیوں صرف امراء اور شرفاء کے بیٹے ہی امیر اور شریف ہوتے ہیں اور (ب) یہ کہ صرف امراء و شرفاء کا ہی حکومت کے عہدوں پر حق ہوتا ہے۔ برنی کے لیے خاندان امراء و شرفاء کی وضاحت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حکمراں طبقے بہت زیادہ تیزی سے ایک دوسرے کو تباہ کر رہے تھے۔ برنی خاندان امراء و شرفاء کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ سکتا تھا وہ یہ کہ یہ ایسا خاندان ہو جو تین چار پشتوں سے اعلیٰ عہدہ پر فائز رہ چکا ہو۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی خاندان موثر طریقہ سے اور مستقل طور پر اعلیٰ عہدوں سے محروم کر دیا گیا تو اس کا شمار خاندانی شرفاء کے بجائے عوام الناس میں ہوگا۔

برنی نے خاص خاص عملہ جاتی انقلاب (طبقۂ امراء میں تبدیلیاں) درج کیے ہیں:

(۱) شہاب الدین کے بعد اس کے غلام افسر جانشین ہوئے لیکن التتمش کو اپنا اختیار قائم کرنے کے لیے یلدوز اور قباچہ اور ان کے افسروں کا خاتمہ کرنا پڑا۔

(۲) التتمش نے اپنے عملہ کے ایک حصہ کو تو شہاب الدین کے غلام افسروں اور ان کے ورثاء کو لے کر منظم کیا اور توازن قائم رکھنے کے لیے اس نے اپنے عملہ کے ایک اور حصہ کی تشکیل کی جس کے لیے اس نے اپنی دارالسلطنت میں منگولوں کے مفتوحہ مسلم ممالک سے آنے والے امراء و شرفاء اور تعلیم یافتہ لوگوں میں سے کچھ کا انتخاب کیا۔

(۳) التتمش کی موت کے بعد دونوں بازوؤں میں تصادم ہوا۔ اس کے جانشینوں کے عہد میں طاقت در ترک غلام افسروں نے جنھیں چہل گانی کہا جاتا تھا، امور حکومت کو اپنے قابو میں کر لیا اور آزاد ملکوں اور امراء کو نکال دیا، "دنیا کے لوگوں نے صاف صاف دیکھ لیا کہ جب تک عظیم الشان اور امراء کا خاتمہ نہیں ہو جاتا نالائق اور زر خرید غلاموں کو اعلیٰ عہدے اور قیادت نہیں ملتی۔"[۱]

(۴) کیوں کہ تمام چہل گانی ترک افسر اپنے کو ایک دوسرے کے برابر سمجھتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ "میں، اور کوئی دوسرا نہیں" لہذا تیس سال تک (۱۲۶۶-۱۲۳۶) طوائف الملوکی کا دور رہا اور مرکزی طاقت کا اقتدار معدوم ہو گیا۔ بلبن نے (۱۲۸۷-۱۲۶۶) اپنے حریفوں کو مٹا کر مرکزی اقتدار کو دوبارہ قائم

---

[۱] فیروز شاہی، ص ص ۲۷-۲۶

کیا۔ لیکن وہ نسل کے بارے میں بہت زیادہ خبطی تھا۔ چنانچہ اس نے ترک امراء کے طبقہ کو جوں کا توں رکھا لیکن کیقباد کے عہد میں اس کے وزیر ملک نظام الدین نے اپنے ترکی النسل ہونے کے باوجود افسروں کی ایک بھاری تعداد کو سلطان کے احکام سے قتل کرادیا اس طرح باقی ماندہ قدیم ترک غلام عملہ کی کمر ٹوٹ گئی اور ایتمار کچھن اور ایتمار سرخا سلطان جلال الدین خلجی کی تخت نشینی کو نہیں روک پائے لیکن جلال الدین وہ انسان نہیں تھا جو کسی انقلاب کو اس کے ناگزیر نتیجہ تک پہنچا سکتا۔ چنانچہ اس نے پرانے عہد کے بہت سے ترک افسروں کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا۔

(۵) علاؤالدین نے اپنے چچا کے افسروں کو جسے اس نے قتل کردیا تھا سونے کی پیش کش سے اور انھیں ان کے عہدوں پر بحال کر کے جیت لیا۔ لیکن اس کے عہد کے دوسرے یا تیسرے سال میں جب اس کا اقتدار پوری طرح قائم ہوچکا تھا جلال الدین کے تمام سابق افسر جو اپنے پرانے آقا کے خاندان سے غداری کر کے علاؤالدین کے ساتھ شامل ہوگئے تھے اور جنھوں نے اس سے منوں سونا، عہدے اور اقطاع لے لیے تھے۔ شہر اور فوج میں پکڑ لیے گئے کچھ کو قلعوں میں ڈال دیا گیا اور قید کر لیا گیا تو کچھ دوسروں کو اندھا یا قتل کردیا گیا۔ انھوں نے علاؤالدین سے جو بھی پیسہ حاصل کیا تھا وہ سب بمعہ ان کی دولت مکانوں اور جائدادوں کے قبضہ میں لے لیا گیا۔ ان کے مکان ریاست کی ملکیت ہوگئے۔ اور ان کے دیہات خالصہ میں واپس لے لیے گئے اور ان کے بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا۔ ان کے سپاہیوں اور اہل کاروں کو علاؤالدین کے افسروں کی زیر نگرانی دے دیا گیا اور ان کے خاندانوں کو ختم کردیا گیا۔[1] پرانے افسروں میں سے تین کو جن کے خاندانی نام علوی خلجی اور رانا تھے بخش دیا گیا[2] اور باقی کو بالکل مٹا دیا گیا۔ اس طرح جن افسروں کو سزائیں دی گئیں ان میں سے بیشتر بلبن کے افسروں کے وارث رہے ہوں گے جو عالی نسب ترک تھے اور جن کے بزرگوں نے غلام افسر یا سلطانی کی حیثیت سے شہرت حاصل کی تھی۔ علاؤالدین کارگزاری اور اطاعت چاہتا تھا۔ اس کے لیے نسب کوئی شے نہیں تھی۔ نیز پرانے عہد کے یہ افسر (جیسا کہ خود برنی وضاحت کرتا ہے) سلطان کے خلاف بغاوت کرنے کرنے کے عادی تھے۔ اگر پرانے دور کے افسروں کو جو اپنے کو خدا کے منتخب خاندان تصور کرنے کے عادی تھے، ان کے عہدوں پر برقرار رکھا جاتا تو علاؤالدین کے ذہن میں جو نئے منصوبے تھے وہ کامیاب نہ ہوپاتے۔ دہلی کی سلطنت کی تاریخ میں امراء یا افسروں کے کچلنے کا سب سے بڑا واحد اور مکمل عمل تھا نصیحت ۲۲ میں

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۱-۲۵۰

[2] ان خاندانی ناموں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ترکی النسل نہیں تھے۔

برنی نے معزول عہد کے عہدے داروں کے لیے، جن کے ساتھ کوئی مصالحت ممکن نہیں ہے، جو رویہ تجویز کیا ہے غالباً اس کی محرک یہی صورت حال رہی ہوگی (۶) یہ بہت عجیب بات ہے کہ برنی علاؤالدین خلجی کے افسروں کے خلاف کم نسل اور کم اصل ہونے کا الزام نہیں لگاتا۔ ان کے باپ دادا اعلیٰ عہدوں پر نہیں رہے تھے لیکن انھوں نے حکومت کے معمولی عہدوں پر کام کیا ہوگا جو غیر شرفاء کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ علاؤالدین سخت نگرانی رکھتا تھا لیکن اس کے افسر قابل لوگ تھے اور وہ انھیں ایسے امتیازی اختیارات دیتا تھا جو ان کے لیے ضروری ہوتے تھے۔ برنی علاؤالدین کے افسروں کو تین پشتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلی پشت بہت ممتاز تھی جس کی قیادت چھ افسروں نے کی تھی جنھوں نے سلطان جلال الدین کو قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ دوسری پشت قابل اور اہل تھی اور برنی اس کا بہت زیادہ احترام کرتا ہے۔ علاؤالدین کے افسروں کی تیسری پشت میں بہت زیادہ 'جی حضوری' داخل ہو گئے تھے۔ جب کہ اس نے اپنے وزیر مالیات شرف قائینی کو نامعلوم وجوہات کی بناء پر قتل کروا ڈالا۔ تاہم قرون وسطیٰ کی سیاست کے حادثات اور محمد بن تغلق کے عہد میں اس پر پڑنے والے دباؤ کے باوجود علاؤالدین کے عملہ کا سلسلہ محمد بن تغلق کے عہد کے اختتام تک قائم رہا۔ چنانچہ علاؤالدین کے عہد کے آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ محمد ایاز سیری کا کوتوال تھا اور اس کا بیٹا خواجہ جہاں احمد ایاز دہلی میں سلطان کی وفات کے وقت محمد بن تغلق کا نائب تھا۔ یہ سب ہی کے لیے تعجب کی بات ہے کہ قطب الدین مبارک شاہ نے اپنے باپ کے اعلیٰ عہدے داروں کو دوبارہ مقرر کیا اور انھوں نے اس کی سلطنت کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ غیاث الدین تغلق شاہ خود بھی شاہی عملے کا ایک رکن تھا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس نے اپنے سابق رفیقوں کے رتبے اور وقار کو برقرار رکھا۔ دو شاہی منظور نظر مصاحبوں ملک کافور اور خسرو خاں نے جن کی کہانیاں بہت عام ہیں سلطنت کے عملہ پر تسلط قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ملکوں اور امراء کی خاص جماعت ان دونوں سے محفوظ رہنے میں کامیاب رہی۔

عملہ کی طرف محمد بن تغلق کے رویہ کا اس جگہ مختصراً جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اس کے عہد کے تینوں عظیم مورخ برنی معصامی اور ابن بطوطہ قطعی طور سے یہ کہتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ سفاک تھا۔[۱]

---

[۱] حسب ذیل اقتباسات اس تاثر کی کچھ تصویر پیش کریں گے جو اس عہد کی سفاکی کی وجہ سے برنی کے ذہن پر مرتب ہوا تھا۔ "مذکورہ بالا منصوبوں میں سے ہر ایک عملی شکل میں آنے کے بعد ہنگاموں، مصیبت اور تباہی کا باعث ہوا۔ خاص و عام کے قلوب سلطان محمد سے نفرت سے بھر گئے اور مضبوطی سے قائم علاقے اور ولایتیں ہاتھ سے نکل گئے۔ چوں کہ اس کے احکام اس کی حسب خواہش رو بہ عمل نہیں لائے گئے لہٰذا سلطان کا مزاج بدتر ہو گیا اور سلطان کے بدلے (باقی صفحہ ۲۸۳ پر)

اس کے طور طریق میں کچھ ایسی بات تھی جس سے اس کے ابتدائی دور سے ہی اس کے اعلیٰ ترین عہدیدار تک شبہ میں مبتلا ہو جاتے تھے. چنانچہ جس وقت وہ اپنے باپ کے عہد میں وارنگل کا محاصرہ کر رہا تھا تو فوج کے چار بڑے ملک تمر، تگین، مل افغان اور کافور مہردار اپنے آدمیوں کے ساتھ قلعہ سے واپس کوچ کر گئے کیوں کہ شاعر عبید نے انھیں یہ باور کرا دیا تھا کہ چوں کہ وہ علاؤ الدین کے عالی رتبہ افسر اور ایک طرح سے سلطنت میں شریک تھے لہٰذا محمد بن تغلق جس کا اس وقت الغ خاں لقب تھا) ان سب کو پکڑ کر اسی دن ان کے سر قلم کر دیگا. اسی طرح جب سلطان قحط کی وجہ سے دہلی کے باشندوں کو ساتھ لے کر سرگ دواری چلا گیا تو وہ عین الملک سے

بقیہ حاشیہ: ہوئے مزاج کی وجہ سے لوگوں کے سر ساگ سبزیوں اور مولیوں کی طرح کاٹ دئیے گئے. مسلمانوں کے قتل کا یہ کام جو وحدہ لاشریک میں یقین رکھتے تھے اور سنی تھے بد قماش کی ایک ایسی جماعت نے سنبھالا جس کا ثانی آدم کے زمانہ سے آج تک پیدا نہیں ہوا اور حتیٰ کہ حجاج بن یوسف بد قماشی کے معاملات میں ان کا غلام یا خادم بننے کا مستحق نہیں تھا. زین بندہ مخلص الملک، یوسف بغرا، سر راوات دار کا بیٹا خلیل، محمد نجیب، ملعون شہزادہ راہ وندی، قرنفل سیاف، ملعون ایبہ، بھیرا بو رجاح جس پر اللہ کی ایک ہزار بار لعنتیں ہوں، قاضی گجرات انصاری کا بیٹا اور تھانیسری کے تینوں بدبخت بیٹے ایسے ہی کمینے تھے. انھیں مسلمانوں کے قتل کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا. خدا کی قسم میرا پختہ یقین ہے کہ اگر زین بندہ، یوسف بغرا اور نالائق خلیل کے سپرد قتل کے لیے بیس انبیاء کیئے جاتے تو وہ ایک رات گزرنے سے پہلے ہی یہ حکم بجا لاتے. سلطان دن رات شر پسندوں کو سزا دینے کے منصوبے میں مصروف رہتا تھا اور اس الزام کے تحت ماخوذ ہزاروں لوگوں کو سزائے موت دے دی گئی. مذکورہ بالا مٹھی بھر لوگ جو اس دنیا میں اور عالم بالا میں بدترین آدمی تھے اس کی بارگاہ کے منتخب اور بالخصوص معتبر افسر تھے." (فیروز شاہی، ص ص ۲ - ۴۷۱)

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب سنی مسلمانوں کے سر ساگ سبزیوں اور مولیوں کی طرح نہ اڑائے جاتے ہوں اور شاہی دروازہ سے مسلم خون کا ایک دھارا نہ بہایا جاتا ہو. انھوں نے ایک دیوان سزا منظم کیا اور اس دیوان میں کچھ بدبختوں، بے دین لوگوں کو مفتی کی حیثیت سے مقرر کیا گیا جب کہ دوسرے لوگ جو مزاجاً ملحد اور کافر تھے اس کے افسر محاسب اور محقق مقرر کیے گئے سزا کا کام اس حد تک پہنچا دیا گیا تھا کہ آسمان اور زمین، بہشت اور فرشتے اس سے اکتا گئے اور نفرت کرنے لگے' فیروز شاہی، ص ۴۹۷)

ان حالات میں عصامی جو کہ شدید ناقد تھا قدرتی طور پر یہ سوچتا ہے "اگر ملک کے عوام ایک ذہن ہو جاتے ہیں اور ایک دل ہو کر بغاوت کر دیتے ہیں اور اچانک دین کے اس دشمن پر حملہ کر دیتے ہیں تو اس میں حیرت نہیں ہوگی اگر وہ اس کا دھڑ سے جدا کیا ہوا سر زمین پر اچھال کر پھینک دیں (فتوح السلاطین، ص ۴۳۶) لیکن محمد بن تغلق کے قتل کی ایک بھی کوشش نہیں درج کی گئی ہے (باقی صفحہ پر)

ؔ تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۵۱۸ - ۵۰۸

جس نے اس کے لوگوں کے لیے غلہ فراہم کیا تھا اتنا خوش ہوا کہ اس نے ظفر آباد کی صوبے داری سے ترقی دے کر اسے اپنے سابق استاد قتلغ خاں کی جگہ دیوگیر میں قائم مقام حکمراں بنانے کا فیصلہ کر لیا. لیکن عین الملک خوف زدہ ہو گیا اور حالاں کہ وہ سپاہی نہیں تھا پھر بھی اس نے بغاوت کر دی[1] ملتان کے صوبے دار، بہرام ایبہ (کشلو خاں) کی بغاوت، جو تغلق شاہ کا رفیق اور سلطنت کے بزرگ ترین افسروں میں سے تھا، اسی طرح کی غلط فہمی کا نتیجہ تھی، بہرام کو سلطان کے ایک عامل کے خلاف اس کی گستاخی کی وجہ سے سخت قدم اٹھانے کے لیے مجبور کیا گیا. سلطان نے کوئی وضاحت نہیں سنی اور بہرام کے خلاف کوچ کر دیا بہرام نے لڑتے ہوئے مرجانا ہی باعث عزت خیال کیا.[2] اس کے باوجود سلطان سلطنت کے مقامی اعلیٰ اور ادنیٰ افسروں کی اکثریت کو اپنا وفادار رکھنے میں کامیاب رہا.

سلطنت کے دور افتادہ صوبوں کے ادنیٰ افسروں کے ساتھ محمد بن تغلق کا رویہ مختلف تھا. جب سلطان نے عزیز حمار، کم اصل، کو دھار اور پورے مالوہ کا صوبے دار بنایا تو اس نے اسے اس طرح ہدایت کی: "میں سنتا ہوں کہ جو بھی بغاوت کرتا ہے وہ امیرانِ صدہ (صدہ امیر: ایک سو سپاہیوں کے کمانڈر) کے تعاون سے ایسا کرتا ہے اور امیرانِ صدہ (شاہی طرز عمل سے) ناراض ہو کر اور لوٹ مار سے محبت ہونے کی وجہ سے اس کی مدد کرتے ہیں." عزیز حمار نے نواسی صدہ امیروں کو طلب کیا اور ان کے سر اڑا دیے[3] اس سے وہ آگ پھیلنا شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں سلطان کے تمام دکنی مقبوضات جاتے رہے. برنی اس پر اس طرح رائے زنی کرتا ہے. "اس جابر اور کم اصل (عزیز حمار) کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی کہ اگر صرف صدہ امیر ہونا ہی ایسا ہی جرم تھا جس کی سزا سزائے موت تھی تو دیوگیر، گجرات اور دوسرے مقامات پر جہاں کہیں بھی صدہ امیر ہوں گے وہ بغاوت کر دیں گے. اور اگر امیرانِ صدہ ناراض ہو جائیں اور بغاوت کر دیں تو ملک کی فوج کو کس طرح قائم رکھا جا سکے گا؟ دھار کے امیرانِ صدہ کے، امیرانِ صدہ ہونے کے باعث قتل کی خبریں دیوگیر اور گجرات پہنچیں. لہٰذا ان دونوں صوبوں کے امیرانِ صدہ ہوشیار ہو گئے اور انھوں نے بغاوت کی تیاریاں کر لیں[4]."

اس عہد کے دوسرے مورخین نے امیر صدہ کی اصطلاح استعمال نہیں کی ہے لیکن ان کی حیثیت سمجھنا مشکل نہیں ہے. بغرا خاں کی زبان سے برنی جو نصیحت نقل کرواتا ہے اس میں اس نے حسب ذیل الفاظ میں نظام

بقیہ حاشیہ: اور ہم ہمیشہ اسے بہت زیادہ وفادار افسران کے حلقہ میں ہی پاتے ہیں.

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۴۹۱-۴۸۹ [2] عصامی: فتوح السلاطین، ص ص ۴۲۷-۴۲۰

[3] تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۵۰۳ اور ۵۰۷

[4] فیروز شاہی، ص ۵۰۴

فوج کی وضاحت کی ہے[۱] "ایک سرخیل دس منتخب شہسواروں کی کمان سنبھالتا ہے۔ دس سرخیلوں پر ایک سپہ سالار ہوتا ہے۔ دس سپہ سالاروں پر ایک امیر، دس امیروں پر ایک ملک، دس ملکوں پر ایک خان ہوتا ہے اور ایک سلطان کی کمان میں کم از کم دس خان ہونا چاہئیں۔ مکمل امیر ایک ہزار شہسواروں کی کمان سنبھالے گا اور اعلیٰ شاہی عملہ صرف خانوں، ملکوں اور امیروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ برنی کے امیر صدہ بغراخاں کے سپہ سالار ہیں۔ ان کی قوت کا راز یہ تھا کہ وہ اس فوج کی ریڑھ کی ہڈی تھے جس نے علاؤالدین کی کمان میں دکن فتح کیا تھا اور جن پر محمد بن تغلق کا کوئی احسان نہیں تھا[۲]۔ دکن کے علاقوں کو سلطنت میں شامل کیے جانے پر وہ ان علاقوں میں پھیل گئے۔ اگر ایک تھانہ میں دس شہسوار تھے تو ایک امیر صدہ دس تھانوں یا ایک پرگنہ کے رقبہ کے برابر علاقہ کی کمان سنبھالتا تھا۔ انھوں نے مفتوحہ ممالک کے تمام انتظامیہ کو قائم رکھا اور بہمنی سلطنت کا آغاز انہی کی بغاوت سے ہوا۔ وہ عالی نسب نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا انھیں برنی کی ہمدردی حاصل نہیں ہوئی۔

برنی کی محمد بن تغلق کے خلاف ایک زبردست شکایت ہے کہ اس نے ہندوؤں اور کم اصل انسانوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ "میں نے سلطان محمد بن تغلق کی بارگاہ میں خدمت انجام دی ہے اور اس کے انعامات و تحائف کی شکل میں ڈھیروں سونا حاصل کیا ہے۔ میں اس سلطان کی متضاد خوبیوں پر حیرت زدہ ہوں جو عجائب المخلوقات میں ہے۔ اس پورے عرصہ کے دوران میں نے اس کے مبارک ہونٹوں سے کم اصل اور رذیل لوگوں کی قابل نفرت اور ناقص شخصیت سے متعلق کہانیاں سنی ہیں وہ دلائل اور مثالوں سے یہ ثابت کریگا کہ اجلاف احسان فراموش، نمک حرام اور بدکار ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح بات کرتا ہے جیسے کہ وہ بتوں سے زیادہ اجلاف سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے ایک موسیقار کے رذیل بیٹے نجبہ کی اس حد تک حوصلہ افزائی کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ وہ رتبوں میں بہت سے ملکوں سے زیادہ بلند ہو گیا کیوں کہ گجرات، ملتان اور بدایوں اس کے سپرد کیے گئے تھے اسی طرح اس نے عزیز حمار[۳] اور اس کے بھائی فیروز حجام، منکا طباخ، مسعود خمار، لدھا باغبان اور دوسرے گوہر کم اصل (جواہر ستره) کو اعلیٰ رتبے، عہدے اور ولایتیں دے کر بلند کیا۔ اس نے نایک جلاہے کے بیٹے شیخ بابو کو اپنے قریب مقام عطا کیا اور عوام الناس میں ایسے رذیل شخص کے درجات اور مقام کو بڑھا دیا اس نے ہند اور سندھ کا رذیل

---

[۱] فیروز شاہی، ص ۱۴۵

[۲] چنانچہ ان کا نمائندہ عصامی محمد بن تغلق کی مذمت کرتا ہے لیکن علاؤالدین خلجی کا بہت زیادہ احترام کرتا ہے۔

[۳] حمار کے لغوی معنی گدھا ہیں۔ یہ خطاب لوگوں کو ان کی جسمانی قوت کے لحاظ سے دیا جاتا تھا۔ لیکن اس میں ایک نکتہ کے اضافہ سے اسے خمار پڑھا جا سکتا ہے۔

اجلاف میں سے رذیل ترین شخص پیرامالی کو دیوان وزارت تفویض کیا اور اسے ملکوں، امیروں، والیوں اور مقطعوں کے اوپر رکھ دیا۔ اس نے رذیل ترین کش برزان اندری کو اودھ کی ولایت دی۔ احمد ایاز کے غلام مقبل کو، جو صورت اور سیرت میں تمام غلاموں کے لیے باعث شرم تھا، گجرات کی وزارت عطا کی جو عظیم خانوں اور وزیروں کا عہدہ تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس نے کس طرح اراذل واجلاف کو وسیع ولایتوں اور بڑے صوبوں کے اعلیٰ عہدے اور حکومتیں تفویض کیں۔" [۱]

اوپر خاندانی ناموں میں جن پیشوں کی طرف اشارہ ہے وہ مذکورہ بالا افسران کے آبائی پیشے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ افسر بذات خود بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور قابل لوگ تھے۔ چھ صدی پیچھے دیکھتے ہوئے ہم اس سلسلہ میں محمد بن تغلق کی نظر کی کشادگی کی تعریف کے علاوہ کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ترکوں کے تیزی سے تسلط قائم کرنے کا سبب یہ تھا، جیسا کہ میں دوسری جگہ ثابت بھی کرچکا ہوں [۲]، کہ ہندو سماج دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا جن کے درمیان ایسی خلیج تھی جسے کبھی عبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک طبقہ آریہ ذاتوں کا تھا اور دوسرا چنڈالوں کا۔ آخرالذکر ہندوستان کے بنیادی مزدور تھے۔ نیز یہ واقعہ کہ شہاب الدین غوری کے بعد مسلم سلاطین پانچ سو سال تک ہندوستان میں اورنگ نشین رہے۔ اس اہم ترین حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ ان کا نظریہ مزدور طبقوں کو اس بات کی ضمانت دیتا تھا کہ ورن نظام کی خصوصیات واپس نہیں آئیں گی۔

برنی ہمیں ایسی حکمت سے باخبر کرتا ہے جس سے وہ خود ناواقف ہے۔ ہندوستان پر اس کے سپوتوں کی مدد کے بغیر اچھی طرح حکومت نہیں کی جاسکتی تھی۔ مملوک سلاطین یہ تعاون حاصل کرنے سے قاصر رہے اور انھوں نے موجودہ ہندو سربراہوں، یعنی راؤں، اناؤں، راوتوں، اور ران سے نیچے) چودھریوں، خوطوں اور مقدموں سے محض مال گزاری کی ادائیگی کے لیے انصرامات پر اکتفا کیا۔ دہلی سلطنت کی حکومت فارسی کے علم اور ساتھ ہی مقامی زبان کے بغیر نہیں چلائی جاسکتی تھی کہ جس طرح برطانوی ہند کی حکومت کے لیے انگریزی اور صوبائی دونوں زبانوں کا علم ضروری تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح سب سے نچلی سطح پر حکومت کے کام پٹواری کو

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۵۔ ۵۰۴

[۲] مقدمہ الیٹ اور ڈاؤسن، ج ۲، کوسموپولیٹن پبلشرس، بدر باغ، علی گڑھ۔ ۱۹۳۰ء کے بھگ چنڈالوں کی حالت کے لیے دیکھیے سچاؤ کا البیرونی کی کتاب الہند، کا ترجمہ، ج ۱، باب ۹ اور ج ۲، باب ۶۴۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ منوسمرتی کب لکھی گئی تھی لیکن اس میں چنڈالوں کے لیے جو مقام تجویز کیا گیا ہے، وہ البیرونی کے ذاتی مشاہدوں پر مبنی تذکروں سے حقیقتاً مختلف نہیں ہے (آئین منو، Code of Manu ، بہلر کا ترجمہ، باب ۱۰)۔

مقامی زبان میں ہی چلاتا تھا اس طرح اعلیٰ عہدوں کے لیے فارسی اور مسلم طریقۂ زندگی کا علم ضروری تھا۔

لیکن غوری کی فتح کے بعد ہندوؤں کی کونسی جماعتوں کو فوری طور پر فارسی پڑھنے کے لیے اکسایا جاسکتا تھا؟ رایوں کو بہرحال ترغیب نہیں دی جائے گی جو دہلی سے معمولی انتظامی روابط کے لیے اپنی خدمت میں ترجمان رکھ سکتے تھے۔ بڑے بڑے تاجر اور مہاجن بھی ترجمان رکھ سکتے تھے لیکن وہ بات چیت کی سطح تک فارسی سے واقفیت کو مفید محسوس کر سکتے تھے۔ شمالی ہند کے کسی باشندے کے لیے بات چیت کی حد تک فارسی سے واقفیت حاصل کرنا مشکل نہیں تھا۔ فارسی کے مصادر ہندوستانی زبانوں کے مصادر سے مختلف ہیں لیکن اسموں کی ایک مختصر تعداد یکساں ہے اور جملوں کی ترکیب ایک سی ہے۔ کسی جاہل ہندوستانی کو (خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان) اگر ایران لے جاکر اسے اپنے کو خالص ایرانی ماحول میں ڈھالنے کے لیے مجبور کر دیا جائے تو وہ چھ سے آٹھ ہفتوں کے اندر فارسی میں اپنا مدعا بیان کر سکتا ہے۔ علاؤالدین کے زمانہ میں کوئی ہندو پانچ چھ ماہ کے اندر بغیر کسی کوشش کے فارسی بولنا سیکھ سکتا تھا۔

لیکن محررانہ اور بعدازاں ادبی سطح پر چند دالوں کے ان تمام اراکین کے لیے (خواہ وہ اسلام قبول کرتے ہوں یا نہیں) فارسی سیکھنا ضروری ہو گیا جو اس موجودہ حکومت کے ساتھ تعاون کر کے جو کہ تمام مناسب اندازوں کے مطابق قائم ہو چکی تھی اپنی تقدیریں بہتر کرنا چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے ہمیں ترقی کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ ایک نیا متوسط درجہ کا شخص نویسندہ یا محرر کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ اگر شرف قاینی نے پٹواری کے کاغذات سے مرکزی مال گزاری کا موازنہ کر کے پائی پائی وصول کر لیا تھا تو ضرور ہی اس کے پاس دو زبانیں بولنے والا بہت بڑا عملہ رہا ہوگا اگر اپنے جرائم کے لیے سزا پانے والے نویسندوں کی تعداد سات ہزار سے دس ہزار تک گھٹتی بڑھتی رہی تھی تو ان کی مجموعی تعداد (اگر ان اعداد میں مبالغہ بھی ہے) خاصی بڑی رہی ہوگی۔[1]

کسی حکمراں طبقہ کی رکنیت کے لیے، خواہ اس حکمراں طبقہ کی کوئی بھی شکل ہو، ایک مشترکہ زبان اور تہذیب کی یا کم از کم ایک دوسرے کے طریقۂ زندگی سے واقفیت اور رواداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملوک سلطانوں کے عہد میں اعلیٰ نوکر شاہی کی رکنیت ایک ہندوستانی مسلمان کے لیے خطرناک اور ہندو کے لیے محال تھی لیکن

---

[1] "تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۹۷-۲۹۶۔ علاؤالدین یوں کہتا ہے: "نویسندوں اور عاملوں کی چوریوں کی وجہ سے میں سے ہیں نے شہر میں غالباً دس ہزار نویسندوں کو محتاج بنا دیا ہے اور ان کے جسموں میں کیڑے ڈال دیئے ہیں۔" نیز دیکھیے ص ۳۸۲ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ سلطان مبارک شاہ نے دہلی میں علاؤالدین خلجی کے چھ یا سات ہزار قیدی رہا کر دیے اور صوبوں میں قیدیوں کی رہائی کے احکام کے ساتھ قاصدوں کو روانہ کیا۔

خلجی انقلاب ایک تبدیلی لایا۔ امیر خسرو اپنی خزائن الفتوح [۱] میں ہمیں بتاتے ہیں کہ علاؤالدین نے علی بیگ، طرطاق اور طرغی منگولوں کے خلاف ایک ہندو افسر ملک نائک اخور بیگ میسرہ کو تیس ہزار شہسواروں کے ساتھ بھیجا محمد بن تغلق کی حکومت میں اجلاف (ہندو ہوں یا مسلمان) کا مقام ڈیڑھ سو سالوں پر پھیلے ہوئے عمل کی قدرتی معراج تھی۔ برنی کی فہرست صرف بتیس بہا نمونوں، کی ہے۔ یہ مکمل نہیں ہے۔ عصامی دکن کے قائم مقام قتلغ خاں کے نمایاں افسروں میں کانڈی رائے کا ذکر کرتا ہے۔ نیز وہ یہ واقعہ بھی درج کرتا ہے کہ ایک ہندو جس کا نام بھرن تھا، گلبرگہ کا مقطع تھا [۲] اور یہاں تک کہ برنی بھی حسب ذیل واقعہ کو بغیر کسی تبصرہ کے درج کرتا ہے ایک مہتہ (ہندو افسر انتظامیہ) کو کرنال میں مقرر کیا گیا اور وہاں رانا کنکھر کو قید کر کے بارگاہ سلطانی میں لایا گیا۔ [۳] لیکن برنی میں معقول وجوہات کی بناء پر جیسا کہ ہم دیکھیں گے) اتنی جرأت نہیں تھی کہ فہرست میں عظیم ترین شخص کنا کا نام درج کرے جو ایک ہندو نو مسلم تھا جسے محمد بن تغلق نے بتدریج ترقی دے کر سلطنت کے نائب وزیر کے عہدے پر فائز کیا۔

یہ واقعات کچھ نکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگر ہر راجپوت راجہ کے پاس محمد بن تغلق کی جیسی مخلوط حکومت ہوتی جس میں چنڈال جماعتیں بھی شامل ہوتیں تو ترکوں کے خلاف صحیح معنی میں قومی مزاحمت ممکن ہو سکتی تھی اور شہاب الدین غوری کو کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ اور بہر صورت ہندوستان میں ترکوں کا اقتدار چین کے منگول (یا ایوان) شاہی خاندان کی طرح تھوڑے ہی عرصہ تک رہتا۔ دوسرے یہ اجلاف سلطان کی طاقت کا سرچشمہ تھے۔ یہاں تک کہ برنی کے معاندانہ تذکرے بھی ہمیں ان کی وفاداری کے سلسلہ میں شبہ میں نہیں چھوڑتے۔ تیسرے صرف یہ اجلاف ہی وہ ہندو تھے جن کا سلطان تعاون حاصل کر سکتا تھا۔ اس کے عہد کے رائے اکبر کے راجپوت والیوں کی طرح شاہی افسروں کی حیثیت سے اس کی خدمت میں داخل ہونے کے لیے رضامند نہیں رہے ہوں گے۔ چوتھا نکتہ ایسا امر ہے جس کے بارے میں صرف قیاس کیا جا سکتا ہے لیکن غالباً ہم صحیح راہ پر ہیں ہندوستان کی انتظامی اور مالیاتی تاریخ میں کائستھوں کے فرائض بخوبی معلوم ہیں۔ لیکن ایسا کہا جاتا ہے اور

---

[۱] میرا ترجمہ Compaigns of Allauddin Khilji (ص ۲۷ - ۲۶) دیول رانی خضر خاں میں امیر خسرو قطعی طور سے یہ کہتے ہیں کہ ملک نائک عالی شان بارگاہ کا ایک ہندو بندہ تھا۔ برنی بھی ملک نائک اخور بیگ کا حوالہ دیتا ہے (ص ۳۲۰) لیکن قطعی طور پر یہ نہیں کہتا ہے کہ وہ ہندو تھا۔

[۲] عصامی، فتوح السلاطین، ص ۴۵۰ اور ۴۶۴

[۳] فیروز شاہی، ص ۴۸۵

شاید صحیح بھی ہے کہ وہ پیشہ ور ہیں کوئی ذات نہیں. کیاہم کائستھوں کی ابتدا ان ہندوؤں میں تلاش کرنے میں حق بجانب ہوں گے جنھوں نے ذات پات کا خیال کیے بغیر تیرھویں صدی میں فارسی پڑھنا شروع کی اور رفتہ رفتہ دونوں فرقوں کی تہذیب حاصل کرلی اور بالآخر "مالیات اور حسابات" میں اپنی شمولیت کو ناگزیر بنادیا؟

اس جگہ صوفیاء اور علماء کے ساتھ محمد بن تغلق کے تعلقات پر گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے. برنی یہ بحث نہیں چھیڑتا ہے اور حالاں کہ ان میں سے کچھ نے سلطان کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا اور بعض دوسروں کو ترغیب دے کر عملہ شاہی میں داخل کر لیا گیا. لیکن افسران انتظامیہ کی حیثیت سے کوششیں عارضی اور ناکام رہیں. خلیق نظامی تمام دستیاب شہادتوں کا جائزہ لینے کے بعد حسب ذیل رائے قائم کرتے ہیں: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق علماء اور صوفیاء سے وہی کام لینا چاہتا تھا جو خلفاء راشدین نے علماء اور زہاد سے چاہا تھا یعنی خدمت ریاست[۱۳]" یہ خیال صحیح ہے. لیکن ان سے یہ مطالبہ غلط تھا. ابن خلدون اس طرح رائے زنی کرتا ہے: "ہمارے علماء دوسرے تمام لوگوں کے مقابلہ میں سیاسی امور سے سب سے زیادہ بے تعلق ہیں[۱۴]" مذہبی حلقوں سے لیے گئے لوگ، خواہ وہ علمی حلقے ہوں یا صوفی، جیسا کہ خلیق نظامی بہت صفائی سے اعتراف کرتے ہیں، انتظامی امور میں سلطان . . . کی کوئی دست گیری نہیں کرسکتے تھے جب کہ ان میں سے بعض اپنی خدمات کی وجہ سے تباہ ہو گئے. ایک مثال کافی ہوگی. سلطان نے جو شیخ فرید اجودھنی کے پوتے شیخ علاؤ الدین کا مرید تھا اپنے شیخ کے بیٹے شیخ معز الدین کو گجرات کا صوبہ دار بنادیا. چشتی صوفی اصولوں کے مطابق اسے یہ تقرر قبول نہیں کرنا چاہیے تھا. لیکن صوبہ دار بننے کا لالچ بہت زبردست تھا. سلطان نے حکم دیا کہ معز الدین کو دو لاکھ ٹنکے دیے جائیں تاکہ وہ دو یا تین ہزار بخوبی لیس شہسواروں کی جماعت منظم کرکے پرچم شاہی کے ساتھ کوچ کرسکے. انہلواڑہ پہنچنے پر سلطان نے خود معز الدین کو حکم دیا کہ وہ اپنے افسروں کے ساتھ وہیں قیام کرے اور سلطان نے خود آبو پہاڑی کی طرف کوچ کیا. لیکن بعد ازاں جب سلطان اپنے افسروں کے ساتھ دکن میں اسماعیل مخ افغان کی زیر سرکردگی امیران صدہ کی پہلی بغاوت کچلنے کے لیے روانہ ہوا تو طغی نے، جو کہ موچی تھا اور صفدر ملک سلطانی کا سابق غلام تھا. مقدموں کی مدد سے بغاوت کردی. سب سے پہلے اس نے انہلواڑہ پر قبضہ کیا. علاوہ ازیں اس نے معز الدین کے ایک مشیر ملک مظفر کو قتل

---

[۱۳] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، (اردو)، ص ۳۶۲

[۱۴] مقدمہ، ابن خلدون (اردو ترجمہ) ۱۹۰۴ء، ج ۳، ص ۲۱۶. "العلماء ابعد الناس عن السیاسة."

کردیا لیکن اپنے مقصد کی خاطر اس نے معزالدین اور اس کے افسروں کو قیدیوں کی حیثیت سے اور بطور یرغمال رکھنا مناسب سمجھا. طغی کے پاس باغیوں کی بہت مختصر اور حرکت پذیر فوج تھی اور شیخ معزالدین کا انہلواڑہ کا دفاع افسوسناک حد تک ناکافی رہا ہوگا. بعد ازاں جب سلطان شدت سے تعاقب کر رہا تھا تو طغی نے انہلواڑہ پہنچ کر معزالدین اور اس کے تمام افسروں کو قتل کر دیا[۱] یہ ایک افسوسناک داستان ہے جو ابن خلدون کی رائے کی صحت ثابت کرتی ہے. عام طور سے علماء نے اپنے کو زیادہ ہوش مندانہ تدبیر تک محدود رکھا اور امور ریاست کے مشکل ترین اور خطرناک ترین کام سنبھالنے کے بجائے علمی سطح پر یہی بتانے پر اکتفا کیا کہ انھیں کس طرح چلانا چاہیے.

خلاصہ یہ کہ تحریر سچائی کا میزان ہے. برنی کا نظریہ ضوابط اس لیے صحیح ہے کہ یہ دہلی سلطنت کے انتظامی تجربہ پر مبنی ہے لیکن اس کے اس نظریہ کی کوئی عملی یا نظری اہمیت دریافت کرنا ممکن نہیں ہے کہ ریاست کے عہدوں پر اشراف ہی کی اجارہ داری ہونا چاہیئے اور عہدے نسل در نسل باپ سے بیٹے کو منتقل ہونا چاہیئے. وہ بار بار یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس کا نظریہ کام نہیں کرے گا لیکن وہ اس کی ناکامیابی کو زمانہ اور گردش افلاک سے منسوب کرتا ہے.

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۵۱۸ - ۵۰۸

باب - ۶

ضیاالدین برنی: عالمِ شباب اور عہد

۱

ضیاالدین برنی کے بیان سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ شور بختی کا شکار رہا حقیقتاً اس کی زندگی ۱۳۵۱ء میں اس کے زوال تک خاصی آرام دہ تھی۔ معلوم نہیں اس کے باپ کا کب انتقال ہوا لیکن اس نے اپنی زندگی کے بارے میں جو اشارے چھوڑے ہیں ان سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی عمر کے پندرھویں سال تک بہت مطمئن انسان کی طرح رہا اور اس نے وہ دو چند زندگی بسر کی جسے ہمارا ہندوستانی سماج آخری یا دو پشت پہلے دولت مند شہریوں کے لیے موزوں خیال کرتا تھا اور جسے عام قاعدہ کی رو سے صرف روا ہی نہیں کہا گیا تھا بلکہ پسند بھی کیا گیا تھا۔ اس کے باپ نے اس کے لئے ایک بہت بڑا مکان غالباً محلسرائے، کیلوگڑھی میں چھوڑا تھا جو دہلی کا نواحی علاقہ تھا اور جسے سلطان معزالدین کیقباد نے اس طرح آباد کیا تھا کہ وہ اس کی عیاشی کے لئے زیادہ موزوں رہے۔ عین ممکن ہے کہ کیقباد کی موت کے بعد بہت سی رقاصائیں، مسخرے، موسیقار اور بھانڈ وغیرہ اسی نواحی علاقے میں رہتے رہے جہاں انہوں نے اپنے مکان تعمیر کر رکھے تھے۔ جلال الدین، یا علاالدین کے عہد میں عیاشی کی ممانعت نہیں تھی۔ بشرطیکہ نظم و ضبط میں خلل نہ پڑے۔ فرشتہ کے مطابق علاءالدین کی مفصل فہرست محاصل میں رقاصاؤں کی اُجرتیں بھی شامل تھیں تاکہ نوجوانوں کی زندگیاں برباد نہ ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے مصنف نے باندیوں اور موسیقاروں کو اسی جگہ رکھا تھا۔ یعنی زندگی کے زیادہ باعزت پہلو کے لئے اس نے غیاث پور میں ایک مکان تعمیر کروایا جہاں وہ اپنے ادبیٔ دوستوں سے ملاقات کرتا تھا اور ظاہری مذہب کی وہ زندگی بسر کرتا تھا جو حضرت شیخ کے پڑوس میں ضروری تھی۔

صرف برنی ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے عیش و عشرت کی زندگی بسر کی تھی لیکن وہ اس امر پر زور دیتا ہے

اور اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے[1]: اس سلطان (کیقباد) کی عیاشیوں اور اس عہد کے عیاشوں، حسیناؤں، مدامی عاشقوں اور دلداروں کے بارے میں اپنی ہی لکھی ہوئی داستان پڑھکر میں ہوش کھو بیٹھتا ہوں۔ اور اپنی موجودہ حالت میں جبکہ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے میرے مسوڑھوں میں ایک بھی لگا نہیں رہ گیا ہے اور میرا ذہن پریشان ہے اور میں اپنے مخالفین کا نشانہ بنا ہوا ہوں اور اپنے دشمنوں اور حریفوں کی ٹھوکروں اور ضربوں کی وجہ سے جھک گیا ہوں تو میں اپنے عالم شباب اور ساتھ ہی ماضی کی عیش و نشاط کی ان مجلسوں کی یاد پھر سے تازہ کر لیتا ہوں جن میں میں نے عالی ظرف اور عالی حوصلہ اشخاص کے ساتھ شرکت کی۔ میری مجلسوں میں بکثرت حسینائیں، بذلہ سنج، بے مثل ظریف، لبہائے سیمیں والی نازنینیں، سرو قامت ساقی، شیریں لبوں والے غلمان، ممتاز موسیقار اور غزل سرا ہوا کرتے تھے[2]۔ ان کی یاد میرے دل کو کچوکے لگاتی ہے۔ ان جماعتوں کی کمیابی اور اپنے پاس سونے چاندی کی کمی کے باعث میں مصیبت زدہ، بے قدر و قیمت اور کسی خریدار و پرستار کے بغیر ذلت و مسکنت کے گوشہ میں محدود ہو گیا ہوں۔ میں کیا کروں؟ کس کے پاس میں اس تاریخ کو لے جاؤں اور انصاف طلب کروں؟ بہر حال میں نے معزی عہد کے واقعات اور یادوں کے بارے میں یہ کچھ صفحات لکھے ہیں۔ (نیز) میں نے سلطان معز الدین اور اس کے ہمعصروں کی عیش و عشرت سے متعلق حسیناؤں کی شان میں غزلوں کا ایک دیوان مرتب کیا ہے۔ اور اسے قبۃ التاریخ کا نام دیا ہے[3]۔ اگر یہ تالیف دور ماضی کے ادبی نقادوں یا ادبی ذوق رکھنے والوں کے سامنے آگئی ہوتی تو میرے سینہ سے غم کا بادل چھٹ جاتا اور ان کی تعریف اور انصاف کی وجہ سے میرے دل کی تکلیف دور ہوتی، اور ان ماہرین ادب کی روح کی قسم[4]، جو کبھی میرے دوست

۱- صفحات ۱۶۶ - ۱۶۵ -

۲- میں "مجلس من" سے یہ مفہوم اخذ کرنے کی طرف مائل ہوں کہ ایک وقت برنی خود بھی اس مقام پر تھا کہ ان رقاصاؤں بھانڈوں وغیرہ کو رکھ سکے یا کم از کم انہیں اپنی مجلسوں میں اپنے دوستوں کی تفریح کرانے پر اجرت دے سکے۔

۳- میں اس جملہ کا یہ مطلب سمجھتا ہوں کہ قبۃ التاریخ برنی کا اپنی عشقیہ غزلوں کے دیوان کو دیا ہوا عنوان تھا۔

۴- یہ جملہ کہ ماہرین ادب جو میرے دوست اور ساتھی تھے، صاف طور سے امیر خسرو اور امیر حسن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ان کا ہم پایہ کوئی نہیں باقی رہا تھا۔ پھر بھی ممتاز ادبی لوگ موجود تھے جیسے کہ عین الملک ماہرو (جس کی انشا کو علی گڈھ کے پروفیسر شیخ عبدالرشید نے مرتب کیا ہے) تاتار خاں، جس کی فتاویٰ، جسے علما کی ایک جماعت نے اس کی نگرانی میں ترتیب دیا تھا، ایک یادگار کارنامہ تھی جس کے صرف کچھ حصے باقی رہ گئے ہیں، مولانا جلال الدین رومی جو علائی تالاب کے کنارے فیروز شاہ کے مدرسہ کے شیخ تھے اور سید نجم الدین سمرقندی جو سعیدی حوض کے (عمارت بالا بر آب سعیدی) نزدیک مدرسہ کا سربراہ تھا۔ فیروز شاہ کے عہد کے تذکرہ میں

٩٣

اور ساتھی تھے، پورے ہندوستان میں کوئی بھی ایسا مشہور ادبی شخص یا فاضل منشی میرے ذہن نہیں میں آتا ہے جس کے پاس میں اپنی تصانیف لے جاؤں اور جس کی تعریف اور انصاف کی وجہ سے میں اپنے خشک اور ویران قلب میں اطمینان اور سکون محسوس کر سکوں۔ اور اگر میں مذکورہ بالا صفحات کو جس کے ہر لفظ سے لطف بڑھتا ہے کسی دولت مند شخص کے پاس بھیجنے کی کوشش کروں جسے نکتہ سنج اور خوش وضع لوگوں کی صحبت کی تمنا ہو تو قسم خدا کی جس نے آغاز زندگی میں مجھے عزت بخشی اور آخری ایام میں ذلیل کیا، مجھے کسی بھی جگہ کوئی ایسا مہذب، حسن شناس، حوصلہ مند اور عالی نسب نظر نہیں آتا۔ اور اگر اپنی بے بسی اور بے چارگی میں میں کسی ایسے خانزادہ یا ملک زادہ کو تلاش کرنا چاہوں جو مہذب، عیش و عشرت کا خواہاں، عیاش اور دوسروں کو آرام و آسائش کے ذرائع فراہم کرنے کے قابل ہو اور اپنے صاف ستھرے اور مہذب ذہن کی وجہ سے لطف و محبت کے مرکوزہ بالا معمولی الفاظ سے مسرت حاصل کر سکتا ہو اس طرح کہ اُسے میں اپنے ازور بیان کے، جادو سے وارفتہ کر سکوں اور اس سے زر حاصل کر سکوں تو میں نازنینوں کے مزاج، لب و رخسار اور اداؤں اور چندر مکھی حسیناؤں کے عشوہ و غمزوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے ایسا کوئی نوجوان یا اس کا نشان نہیں مل سکتا اس طرح کی بے چارگی میں میں اپنی زندگی پر آنسو بہاتا ہوں اور کسی نہ کسی طرح اپنے دن گزار رہا ہوں۔ میرے دل میں جو مایوسی ہے وہ میری آنکھوں سے خون کے آنسو بن کر ٹپکتی ہے۔ میری آنکھوں سے خون کی ندی کی ایک دھار باہر آتی ہے، میرے قلم سے ٹپکتی رہتی ہے اور صفحہ قرطاس پر دھبے ڈال دیتی ہے۔"

برنی کی زندگی کے دوسرے رخ پر نظر ڈالنے سے تسکین ہوتی ہے۔ علاءالدین خلجی کے عہد میں اسے کوئی عہدہ نہیں ملا۔ پھر بھی بارگاہ سلطان کے اعلیٰ ترین حلقوں کے علاوہ تمام حلقوں تک اس کی رسائی تھی۔ اس کے باوجود اسے اوّل الذکر کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا۔ اس کے باپ اور چچا ملک کے اعلیٰ ترین افسروں میں تھے اور اس پر کسی بھی گھر کے دروازے بند نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ملک لارابیگ جیسے افسروں سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ شیخ نظام الدین اور ان کے حلقے تک اس کی رسائی تھی اور امیر خورد اپنی سیرالاولیاء میں برنی کے ناپید حسرت نامہ، میں سے اس کی اور حضرت شیخ کے درمیان ہوئی ایک گفتگو نقل کرتا ہے۔ ہمارا مصنف علاءالدین کے عہد کے روایتی اور عقلی علوم دونوں کے علماء کی بے حد تعریف کرتا ہے اور دہلی کے چھیالیس 'نمایاں علماء' کی بہت فہرست دینے کے بعد مزید لکھتا ہے کہ چھیالیس علماء جن کے نام میں نے دیئے ہیں وہ ہیں جن کے ساتھ میں پڑھا ہوں یا

بقیہ ص۔ برنی ان چاروں کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس نے ان کی دور ہی سے تعریف کی اور ان تک اسے ذاتی رسائی حاصل نہیں تھی اور ساتھ ہی خط و کتابت کے مراسم بھی نہیں تھے (فیروزشاہی ص۔ ۶۵ : ۵۶۴، ۵۹۶)

۵۷۹

جن کے روبرو میں نے اپنے کو پیش کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر سے میں نے نشستوں اور مجلسوں میں ملاقات کی ہے یا انہیں درس دیتے ہوئے دیکھا ہے"۔[۱] اسی طرح سیدوں کے متعلق لکھتے ہوئے وہ اس طرح خیال آرائی کرتا ہے "تاریخ فیروز شاہی کے مصنف کو سید تاج الدین اور سید رکن الدین سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور اس نے ان کی قدمبوسی کی۔ ہم نے شاذ ہی اتنے وقار اور مسلم اوصاف کے سید دیکھے ہیں"۔[۲] ہمارا مصنف علاءالدین کے طوفان انگیز عہد میں دہلی میں رہا اور اس نے ہر چیز دیکھی، ہر چیز کا مشاہدہ کیا اور ہر چیز پر گفتگو کی۔ حالانکہ کبھی کبھی وہ واقعات کا تسلسل بھول جاتا ہے پھر بھی اس کا علاءالدین کے عہد کا ذکر کسی دوسرے سلطان کے عہد کے ذکر سے زیادہ مکمل ہے۔ یہ دہشت، کامرانی، حقیقی ترقی اور مادّی فلاح و بہبود کا دور تھا اور اس کی تمام خصوصیات برنی کے ذہن میں بہت گہرائی تک منقش تھیں۔

ہمارا مصنف اپنے ماضی کے ادبی دوستوں میں سے امیر خسرو اور امیر حسن کو مخصوص ذکر کے لئے منتخب کرتا ہے جن پر کوئی بھی فخر کر سکتا تھا حالانکہ کوئی شخص اس پر کفِ افسوس ہی مل سکتا ہے کہ برنی نے ان کی وفات کے بعد ان کے خیالات کو پورے طور پر ترک کر دیا۔

وہ ہمیں مطلع کرتا ہے[۳] کہ "علاءالدین خلجی کے عہد میں ایسے شعرا تھے جنہیں زمانے نے اس کے بعد یا پہلے بھی نہیں دیکھا۔ لاثانی امیر خسرو قدیم اور جدید دور کے شعرا کے ملک الشعرا تھے۔[۴] وہ اپنی تصانیف کی تعداد اور نئے خیالات کی اختراع میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی مخفی معنیٰ کی وضاحت میں ان کا کوئی جواب تھا اگر نثر اور نظم کے دوسرے اساتذہ ایک یا دو صنفوں میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے تو امیر خسرو تمام اصنافِ سخن میں سبقت لے گئے تھے۔[۵] ایسا استاد شاعر جسے شاعری کی تمام اقسام میں افضلیت حاصل تھی، نہ تو کبھی ماضی میں دیکھا گیا اور نہ شاید قیامت تک دیکھا جا سکیگا۔ امیر خسرو نے نثر اور نظم کا ایک پورا کتب خانہ مرتب کیا ہے اور انشا پردازی کے فن میں اعجاز دکھائے ہیں۔ خواجہ سنائی نے[۶] امیر خسرو کی تعریف میں ہی حسب ذیل شعر کہا ہوگا: بخدا کیا نیلے فلک کے زیر سایہ اس جیسا کوئی ہے، رہا یا رہے گا"

۱۔ فیروز شاہی، ص ۳۵۴۔

۲۔ فیروز شاہی، ص ص ۹-۳۴۸۔ ۳۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۳۶۰-۳۵۹

۴۔ خسرو کے معنی ہیں، بادشاہ۔

۵۔ امیر خسرو نے نظامی گنجوی کے (پانچ غزلیاتی جلدوں پر مشتمل) 'خمسہ'، کے جواب میں اپنے 'پنج گنج'، کی عشقیہ غزلوں کی پانچ جلدیں شروع کیں۔ لیکن اپنی آخری جلد میں انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ نظامی برتر تھا کیونکہ وہ ایک فن میں طاق تھا لہٰذا وہ یگانہ ہے۔ (چوں یک فنہ بود، شد یگانہ)۔

۶۔ یعنی یہ پیش بینی ہے کہ خواجہ سنائی سلطان محمود کے غزنی میں آخری جانشین سلطان بہرام کے عہد میں تھا۔

"اور اپنے علم، ادبی فضیلتوں، فن اور خوش بیانی کے علاوہ وہ بہت پائے کے روحانی درجہ کے صوفی تھے۔ ان کی بیشتر زندگی روزہ، نماز، ریاضت اور تلاوتِ قرآن میں گزری۔ وہ مستقل روزے رکھتے تھے اور ان کا شمار شیخ نظام الدین کے منتخب مریدوں میں ہوتا تھا۔ میں نے ان جیسا دوسرا کوئی مرید نہیں دیکھا جسے حضرت شیخ سے اتنی پائیدار عقیدت ہو۔ فرائض و نوافل کی ادائیگی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کے پاس عشق و محبت کا لائقِ تعریف حصہ تھا، انہیں صوفی نغموں سے محبت تھی۔ وہ صاحب وجد و کیف تھے۔ وہ موسیقی اور موسیقی کی اختراعات میں طاق تھے[1] قادر مطلق نے انہیں تمام فنونِ لطیفہ اور جمالیات میں ممتاز پیدا کیا تھا۔ ان کا وجود بے مثل اور متاخرین کے لئے سراپا تحیر تھا۔

علاؤالدین کے عہد کے دوسرے لاثانی شاعر امیر حسن سنجری تھے[2]۔ نثر اور نظم میں ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ان کی تالیفات کو ان کی ادبی ترکیبوں اور طرزِ بیان کی روانی کی وجہ سے نمونہ تصور کیا جاتا تھا۔ انہوں نے بکثرت رواں اور وجدانی غزلیں لکھی ہیں لہٰذا انہیں سعدئ ہند کہا جاتا ہے۔ اور ان لوگوں میں جو خوبیٔ ذات سے متصف ہیں میں شاذ ہی کسی ایسے شخص سے ملا ہوں جو کہ مجلسوں میں قصے بیان کرنے اور بذلہ سنجی میں، دہلی کے سلطانوں، بڑے عہدہ داروں اور علماء کے بارے میں فوری معلومات فراہم کرنے اور متانت استدلال میں صوفیاء کے اصولوں کے مطابق طرز زندگی اور قناعت اور سچی مذہبیت میں خوش رہے اور دنیاوی ذرائع کے بغیر خوشی خوشی وقت گزارنے میں اور دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر ایک مجرد زندگی بسر کرنے میں ان کا جواب رکھتا ہو۔

"میرے اور امیر خسرو اور امیر حسن کے درمیان سالوں سے الفت اور رفاقت تھی۔ وہ میری صحبت کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور میں بھی ان کی صحبت ترک نہیں کر سکتا تھا۔ ان سے میری دوستی کی وجہ سے یہ دونوں اساتذہ بھی دوست بن گئے تھے اور ایک دوسرے کے مکان پر آنے جانے لگے تھے[3]۔

"امیر حسن کو شیخ نظام الدین سے جو گہری عقیدت تھی اس کی وجہ سے انہوں نے شیخ کے تمام ملفوظات کی کئی جلدیں ہو بہو ویسی ہی جمع کر لیں جیسا کہ انہوں نے انہیں اپنے دوران مریدی میں سنا تھا اور انہیں فوائد الفواد سے موسوم کیا[4]۔

۱۔ دولت شاہ نے اپنی تذکرۃ الشعراء میں امیر خسرو کے ایک شعر کو نقل کیا ہے جس میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ اگر وہ اپنی موسیقی کی اختراعات لکھتے تو تین جلدیں ہو جاتیں جس طرح کہ ان کی غزلوں کے تین دیوان ہیں چوتھا دیوان انہوں نے بعد میں لکھا تھا۔

۲۔ سنجری نہیں جیسا کہ اکثر غلطی سے لکھ دیا جاتا ہے سنجری کا مطلب ہے سجستان سے متعلق جس کا قدیم نام شاکستان (شاکاؤں کا ملک) ہے جسے سیستان کہا جاتا ہے۔

۳۔ یہ دعویٰ اس حقیقت کی روشنی میں عجیب نظر آتا ہے تو امیر خسرو اور امیر حسن دونوں سلطان محمد کی خدمت میں تھے (خان شہید) جبکہ برنی اپنے پالنے میں پڑا ہوا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مصنف سے دوستی کی وجہ سے ان دونوں کے آپس میں مراسم اور گہرے ہو گئے ہوں۔

۴۔ فوائد کو پانچ مختصر جلدوں میں تیار کیا گیا تھا ان سب کے چھپنے پر لیتھو کے تقریباً ۲۵۰ صفحوں پر مشتمل ایک کتاب بنتی ہے۔

وحشت انگیز بوجھ اور ذلت سے تعبیر کرتے تھے۔ غالباً برنی، جس کا تعلق قدیم افسران کے خاندان سے تھا، مختلف طریقہ سے سوچتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر اشراف کا حق تھا اور اس واقعہ نے اسے اور بھی زیادہ اجلاف وارا ذیل کے خلاف بھڑکا دیا ہوگا کہ اسے اپنی عمر کے پچاسویں سال تک کوئی عہدہ نہیں ملتا تھا۔ بہر کیف ۱۳۳۴ء کی خزاں میں سلطان محمد بن تغلق نے برنی کو اپنا ندیم مقرر کیا۔ اس عہدہ میں بڑا فائدہ تھا لیکن ذمہ داری کوئی بھی نہیں تھی اور جس شخص کے پاس عزت نفس ہو اس کے لئے یہ موزوں بھی نہیں تھا۔

عظیم سلجوق وزیر نظام الملک طوسی نے سیاست نامہ[1] میں ندیم کے مقام اور فرائض کا ذکر کیا ہے۔ یہ فرائض قدرتی طور پر سلطان کی شخصیت مطابقت سے مختلف ہوں گے۔ لیکن برنی کے اعتراضات کی روشنی میں ہم دیکھیں تو سیاست نامہ کی تصویر کشی کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

نظام الملک لکھتا ہے کہ "سلطان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ ندیم مقرر کرے تاکہ وہ ان سے کھل کر مل سکے اور ان کے قریب آسکے۔ بڑے بڑے امرا اور سپہ سالاروں سے زیادہ گھلنے ملنے سے سلطان کی عظمت اور وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے کیونکہ اس سے وہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بالفرض سلطان کسی شخص کو ایک عہدہ یا کسی انتظامی عمل کے لئے مامور کرتا ہے تو اسے اس شخص کو ندیم نہیں بنانا چاہیے، اور اگر وہ کسی کو ندیم مقرر کرتا ہے تو اسے کسی عمل کے لئے تعینات نہ کرے کیونکہ سلطان کی مجلس میں حاصل اپنی آزادی کی وجہ سے وہ جارح ہو جائے گا اور لوگوں کو نقصان پہنچائے گا۔ افسروں کو ہمیشہ سلطان سے خوفزدہ رہنا چاہیے۔ ندیم کو جری ہونا چاہیے تاکہ سلطان کو اس کی صحبت میں مسرت حاصل ہو سکے۔ ندیم کی موجودگی سے سلطان کے دماغ کو تسکین ملتی ہے۔ ندیموں کو اپنے وقت کا خیال رکھنا چاہیے۔ سلطان کے دربار برخواست کرنے اور بڑے افسران کے تخلیہ کے بعد ندیموں کے لئے وقت ہوتا ہے کہ وہ سلطان کے پاس حاضر ہوں۔

ندیم کو خدمت میں رکھنے کے کچھ فوائد ہیں۔ پہلے تو وہ سلطان کا دوست ہوتا ہے۔ دوسرے چونکہ وہ دن رات سلطان کے ساتھ گزارتا ہے لہٰذا وہ سلطان کا محافظ ہو سکتا ہے۔ تیسرے، اگر کوئی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے تو ندیم اپنی زندگی قربان کر دیتا ہے اور سلطان کے لئے اپنے جسم کو ڈھال بنا لیتا ہے۔ چوتھے (سلطان کے لئے) یہ ممکن ہے کہ وہ ندیم سے ازراہ مذاق یا سنجیدگی سے ایک ہزار باتیں کہے جو (اس کے لئے) وزیر یا حکومت کے دوسرے بڑے افسران سے کہنا ممکن نہیں کیونکہ وہ اعلیٰ رتبوں پر ہیں اور اس کے امور کے منصرم ہیں۔ پانچویں، وہ سلطان کو جاسوسوں کی طرح ملکوں کی سرگرمیوں سے باخبر کرتے ہیں۔ چھٹے، وہ ہر چیز کے متعلق بہت بے باکی سے بات کر سکتے ہیں۔ نیز سنجیدہ اوقات اور

۱۔ سیاست نامہ کے فارسی نسخہ کو مرحوم پروفیسر شیفر نے مرتب کیا تھا۔ لیکن یہ ایڈیشن عرصہ سے مل نہیں رہا ہے۔ میں نے آغا عباس اقبال کے نہایت نفیس ایڈیشن کو استعمال کیا ہے جسے مجلس پریس، تہران نے، اُردی بہشت ۱۳۲۰ء میں چھاپا۔ پروفیسر شیفر نے سیاست نامہ کا فرانیسی میں ترجمہ کیا۔ اس کا کوئی

بقیہ اگلے ص۹۷ پر

نشہ کی کیفیت میں وہ سلطان پر (امور ریاست کا) بھلا بُرا واضح کر سکتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اس میں حکمت عملی کے بہت سے فوائد ہیں۔

"ندیم کو عالی نسب، باکمال، خوش اخلاق، خوش اطوار، خوش شکل، راسخ العقیدہ، قابلِ اعتماد اور اپنے طور طریق میں راست باز ہونا چاہئے۔ وہ اس لائق ہو کہ بکثرت مزاحیہ اور سنجیدہ کہانیاں سنا سکے۔ اسے لاتعداد ضرب الامثال یاد ہونا چاہئیں وہ ہمیشہ (لوگوں کی) اچھائی کرتا ہو اور خوشخبریاں لاتا ہو۔ اسے نردؔ[1] اور شطرنج سے واقف ہونا چاہئے۔ جب بھی سلطان کوئی بات اپنے لبوں پر لائے اور گویا ہو تو اسے مرحبا! بہت خوب! کہنا چاہیے۔ اسے سلطان سے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ 'یہ کرو'، 'وہ نہ کرو'، 'آپ نے ایسا کیوں کیا؟' 'یہ نہیں کرنا چاہئے'۔ سلطان کو ایسی گفتگو پیچیدہ نظر آتی ہے اور وہ اسے ناپسند کرتا ہے۔ سلطان کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ مے نوشی، لذتوں، نالشوں، مجلسوں، شکار، چوگان[2] اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے متعلق ہر چیز کے سلسلہ میں ندیموں کے ساتھ معاملات طے کرے۔ لیکن حکومت، جنگوں، مہموں، انتظامیہ، دیوانی، شادی بیاہ کے معاہدوں، سیر و سیاحت، پڑاؤ، فوج رعیت اور اسی طرح کے دوسرے کاموں کے سلسلہ میں سلطان کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ وزیر، سلطنت کے اعلیٰ افسران اور تجربہ کار بزرگوں سے معاملات طے کرے کیونکہ وہ ان چیزوں میں اس کے شریک کار ہیں۔ چنانچہ اس طرح ہر معاملہ مناسب طریقہ سے طے پا جائے گا۔"

محمد بن تغلق کے عہد کے دسویں سال تک، جس وقت برنی کا تقرر ہوا تھا، سلطان کی تدبیر کے اعتراض و مقاصد اور جن طریقوں سے وہ حکومت کرنا چاہتا تھا سب پر اچھی طرح عیاں ہو چکے تھے۔ برنی خدا اور اس کے بندوں کے سامنے بحیثیت ندیم اپنی سرگرمیوں کے لئے اپنی ذمہ داری کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ سلطان کا وفادار رہا لیکن سلطان کی حکمت کے بہت سے ایسے پہلو تھے جن کی طرف سے وہ متفکر اور دہشت زدہ تھا اور اس کے لئے سب سے زیادہ لرزہ انگیز مسلمانوں کا طرح طرح کے حیلوں سے خون بہانا تھا۔ برنی ہمیں مطلع کرتا ہے کہ مسلمانوں اور خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان رکھنے والوں کو قتل کرنا سلطان کی شخصیت اور عادت کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اس نے علماء، مشائخ، سیدوں، صوفیوں، قلندروں، نویسندوں اور لشکریوں کی کافی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کوئی دن یا ہفتہ ایسا نہیں گزرتا تھا جب کافی مسلمانوں کا خون نہ بہایا جاتا ہو اور باب سلطان کے سامنے خون کا چشمہ نہ بہتا ہو۔[3]"

"اور مجھ کمبخت، بدنصیب کو دیکھئے جس نے کئی کتابیں پڑھی ہیں اور علم کا ایک حصہ حاصل کیا ہے جس سے افادہ،

بقیہ حاشیہ کا۔ انگریزی ترجمہ نہیں ہے۔

[1] قرونِ وسطیٰ کا ایک کھیل جو پانسے سے کھیلا جاتا تھا۔

[2] یعنی قرونِ وسطیٰ کا چوگان۔

[3] تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۴۶۵-۴۶۶۔

روحانی ہوتا ہے کہ میں نے مکروفریب سے سلطان کے نزدیک ایک مقام حاصل کرلیا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ سخت سزا کے معاملہ میں جو کہ شریعت کے خلاف ہے سلطان سے کچھ کہوں میں اپنی زندگی کی وجہ سے جسے لازمی طور پر فنا ہے اور دولت کی وجہ سے جسے لازمی طور پر چلے جانا ہے خائف تھا۔ اس معاملہ میں میرا سکوت مقابلتاً معمولی جرم تھا لیکن ٹنکوں اور جتیلوں اور سلطان کی قربت میں مقام حاصل کرنے کی خاطر شریعت سے انحراف میں مدد کرکے اور ناقص نظریں سنا کر میں اس معاملہ میں شریکِ جرم ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے جیسے دوسروں کا کیا حشر ہوگا۔ لیکن میں نے جو بدیاں کہی اور کی ہیں ان کے باعث میں اس دنیا میں ذلیل، قابلِ نفرت، بے قدر اور ناقابل اعتبار ہوگیا۔ اپنی مفلسی کی وجہ سے میں در در بے عزت ہوا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آخرت میں میرا کیا انجام ہوگا اور کون سی سزائیں میری منتظر ہیں[۱]۔" یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ سلطان کو پکا یقین تھا کہ اس کی مسلسل موت کی سزائیں اور دیگر سزائیں جائز تھیں اور آخر زندگی تک اس کے ضمیر یا قوت فیصلہ نے اس معاملہ میں اسے الجھن میں نہیں پڑنے دیا۔

برنی کو سلطان سے گفتگو کرنے کے بہت سے مواقع ملے ہوں گے لیکن وہ صرف چار گفتگوؤں کا ذکر کرتا ہے۔

ا۔ سلطان سابق استاد قتلغ خاں دوگیر میں اسکا قائم مقام تھا اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں چست تھا۔ وہ عام بہبود کے لئے ثابت قدم، موقع شناس اور مستعد تھا۔ اس نے شہاب سلطانی اور (سلطان علاؤالدین کے دیوان غرض ظفر خاں کے بھتیجے (Nephew) کڑا کے علی شاہ جیسے باغیوں کی سرزنش کی اور انہیں دہلی بھیجا[۲]۔ لیکن اس کے طریقے سلطان کے طریقوں سے مختلف تھے۔ لہٰذا سلطان نے اسے واپس طلب کرلیا اور اس کی جگہ اس کے بھائی عالم الملک مولانا نظام الدین کو عارضی طور پر تعینات کیا۔ جب بڑودہ اور دیوہوی کے امیران صدہ نے بغاوت کی اور گجرات کا نائب وزیر مقبل کو شکست دے دی تو سلطان نے بذاتِ خود باغیوں کے خلاف کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر قتلغ خاں نے برنی کے توسط سے سلطان کی خدمت میں حسب ذیل عرضی بھیجی: "بڑودہ اور دیوہوی کے امیران صدہ اتنے اہم نہیں ہیں کہ سلطان ان کے خلاف کوچ کریں۔ انہوں نے عزیز حمار کی بداطواریوں اور سزاؤں کی وجہ سے علمِ بغاوت اٹھایا ہے۔ اگر انہوں نے یہ سن لیا کہ سلطان ان کے خلاف کوچ کر رہا ہے تو وہ ہندو ریاستوں میں پناہ لے لیں گے لیکن سلطان کے خلاف امیرانِ صدہ میں ناراضگی پھیلے گی۔" قتلغ خاں نے یہ بیڑہ اٹھالیا کہ اسے سلطان کی فیاضی سے جو انعامات عطا ہوئے تھے ان سے ایک فوج منظم کرکے گجرات کے باغیوں کو ٹھیک اسی طرح شکست دے دے جس طرح اس نے دکن کے باغیوں کو دی تھی۔ برنی نے سلطان کو عرضی سنائی لیکن سلطان کو قتلغ خاں کی تجویز پسند نہیں آئی اور اس نے کوئی جواب نہیں دیا[۳]۔

ا۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۴۶

۲۔ عصامی نے فتوح السلاطین، ص ص ۵۰۴ - ۵۰۶ میں ان بغاوتوں پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

۳۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۵۰۷ - ۵۰۸

۲۔ گجرات کے باغیوں کے خلاف کوچ کے دوران سلطان نے چار یا پانچ دن قصبہ سلطان پور میں ماہِ صیام کی وجہ سے قیام کیا برنی ہماری اطلاع کے لئے لکھتا ہے کہ[1] ایک مرتبہ شب کے ختم ہونے کے وقت سلطان نے مجھے طلب فرمایا۔ سلطان نے مجھ سے فرمایا: تم دیکھ رہے ہو کتنی بغاوتیں بھڑک رہی ہیں مگر میں ان بغاوتوں سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ لیکن عوام کہتے ہیں کہ ان بغاوتوں کا سبب سلطان کی انتہا سے زیادہ سخت سزائیں ہیں۔ خیر میں لوگوں کے کہنے کی وجہ سے اپنی سزائیں ترک نہیں کرونگا تم نے بہت سی تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے۔ کیا تم نے کسی میں ایسے جرائم کے متعلق پڑھا ہے جن کے لئے سلطانوں نے سنگین سزائیں دی ہیں؟"

برنی نے اپنی پسندیدہ جعلی کتابوں میں سے تاریخ کسروی کا حوالہ دیا۔ سلطنت کے قیام کے لئے سزائیں ضروری تھیں۔ لیکن جمشید نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا: 'سات ایسے جرائم ہیں جن کے لئے سلطان سزائے موت دینے میں حق بجانب ہے۔ بالفرض سلطان ان حدود کے باہر گیا تو سلطنت کے لئے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی'۔ اس کے بعد برنی وہ سات جرائم گنواتا ہے جن کے لئے جمشید نے سزائے موت تجویز کی ہے: (۱) الحاد ــــ صحیح مسلک ترک کرنا اور اس غلطی پر مصر ہونا۔ (۲) قتل ــــ سلطان کے کسی محکوم کو ارادتاً (اور بغیر کسی جواز کے) قتل کرنا۔ (۳) زنا ــــ شادی شدہ مرد کی کسی دوسرے کی زوجہ سے مباشرت (۴) سازش سلطان کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنانا بشرطیکہ سازش ثابت ہو جائے، (۵) بغاوت ــــ سلطان کے خلاف بغاوت کرنا یا کسی باغی سرغنہ کی دستگیری کرنا۔ (۶) سلطان کے دشمنوں کی امداد کرنا۔ اگر کوئی رعیت سلطان کے دشمنوں، مخالفوں یا حریفوں کو اطلاعات ہتھیار بہم پہنچا کر ان کی امداد کرتی ہے یا دوسرے طریقوں سے انہیں مدد بہم پہنچاتی ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے۔ (۷) نافرمانی۔ سلطان کی ایسی نافرمانی جس سے ملک کو خطرہ پیدا ہو جائے اور دوسری نافرمانیاں اس زمرہ میں شامل نہیں ہیں۔

سلطان کے اس استفسار کے جواب میں کہ رسول اکرم نے کن جرائم کے لئے سزائے موت تجویز کی ہے برنی نے جواب دیا۔ الحاد، قتل اور زنا۔ ملک کی بہبود کی خاطر دوسرے چار جرائم کے لئے سزائے موت دینا سلطان کی ذمہ داری ہے۔ اس نے جمشید کا ایک اور مقولہ دہرایا۔ سلطنتوں نے وزیروں کو منتخب کر کے انہیں اعلیٰ رتبے پر پہنچایا ہے اور امور سلطنت ان کی زیرِ نگرانی دے دیئے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وزیر ملک کے لئے ضوابط وضع کرنے اور انہیں مستقل طور پر نافذ کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ ان ضوابط کے نفاذ کے سبب سلطان کے لئے یہ ضروری نہیں۔ رہا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو کسی بھی مخلوق کے خون سے آلودہ کرے'[2]

سلطان نے جواب میں کہا کہ "جمشید کی مجوزہ سزائیں ازمنہ قدیم کے لئے تھیں۔ موجودہ دور میں بکثرت بدقماش اور شرپسند لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ میں بغاوت، بدنظمی اور سازش کے شبہ اور کسی مفروضہ کی بنیاد پر موت کی سزائیں دیتا ہوں میں

۱۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۱۱ ـ ۵۰۹۔ کیونکہ یہ ماہ صیام تھا اس لئے یہ گفتگو سحری کے وقت ہوئی ہوگی۔

۲۔ صاف ظاہر ہے کہ تاریخ کسروی کا مصنف قرونِ وسطیٰ کے حالات کے پیش نظر غداری کی وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیز وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ مستقل ضوابط اور ساتھ ہی شہادت کی بنیاد پر غداری کے لئے سزائیں دی جائیں اور نہ کہ سلطان کے ذاتی قوت فیصلہ کی بنیاد پر برنی نے اپنے فتاوائے جہانداری

بقیہ اگلے صفحہ پر

لوگوں کو ان کی معمولی سی نافرمانی پر سزائے موت دیتا ہوں اور میں اسی طرح موت کی سزائیں دیتا رہوں گا تا وقتیکہ میں نہ ختم ہو جاؤں یا لوگ راہِ راست پر نہ آجائیں اور بغاوت نافرمانی ترک نہ کر دیں۔ میرے پاس کوئی ایسا وزیر نہیں ہے جو اس طرح کے ضوابط وضع کرے کہ میرے لئے اپنے ہاتھ خون سے آلودہ کرنا غیر ضروری ہو جائے۔ نیز میں موت کی سزائیں اس لئے بھی دیتا ہوں کہ لوگ اچانک ہی میرے دشمن بن گئے ہیں۔ میں نے عوام میں اس قدر دولت تقسیم کی ہے لیکن اس کے باوجود کوئی بھی شخص میرا سچا بہی خواہ نہیں ہوا ہے۔ اب مجھ پر لوگوں کی برہمی بالکل عیاں ہو گئی ہے۔ وہ میرے دشمن اور مخالف ہیں؟

۳۔ محمد بن تغلق دکن کے امرائی بغاوت کچلنے کے بعد ابھی وہاں کی سرزمین پر امن و امان قائم نہیں کر پایا تھا کہ اسے، گجرات میں طغی کے بغاوت کی خبر ملی لہٰذا اس نے اس کے خلاف کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فیروز شاہ، ملک کبیر اور احمد ایاز نے، جو مجلس ارباب ثلاثہ کے رکن تھے اور جنہیں دہلی میں سلطان کی قائم مقامی کے فرائض سونپے گئے تھے انہوں نے برنی کو جو اس وقت دہلی ہی میں تھا سلطان کے پاس اس کی فتح پر مبارکبادی کا ایک خط دے کر روانہ کیا۔ سلطان گھاٹی ستون پار کر چکا تھا اور اس نے ایک یا دو منزل ہی آگے کوچ کیا ہوگا کہ برنی اس کے سامنے پیش ہوا۔

برنی لکھتا ہے کہ "سلطان مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ ایک دن میں سلطان کا ہم رکاب تھا۔ سلطان گفتگو کرتا رہا اور اسی دوران باغیوں کا مسئلہ بیچ میں آپہنچا اور مجھ سے گویا ہوا: تم دیکھ رہے ہو کہ احسان فراموش امیران صدہ کیسی کیسی پریشانیاں پیدا کر رہے ہیں۔ اگر میں ایک سمت میں ان کی بغاوت کچلتا ہوں اور ملک میں امن و امان قائم کرتا ہوں تو یہ دوسری سمت میں بغاوت کھڑی کر دیتے ہیں۔ کاش میں نے شروع میں ہی دیوگیر، گجرات اور بھڑوچ کے امیران صدہ کی بیخ کنی کا حکم دے دیا ہوتا تو مجھے اس وقت ان کی وجہ سے اتنی زیادہ پریشانیاں نہ بھگتنا پڑتیں۔ کاش میں نے اپنے اس احسان فراموش غلام طغی کو قتل کر دیا ہوتا یا عدن کے سلطان کے پاس بطور یادگار بھیج دیا ہوتا تو آج وہ بغاوت نہ کر پاتا۔ سلطان کے حضور میں مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ یہ کہہ سکوں کہ ہر سمت میں جو پریشانیاں اور بغاوتیں کھڑی ہو رہی تھیں اور جو عام نفرت نظر آرہی تھی اس کا سبب سلطان کی موت کی سزائیں ہیں اور اگر یہ سزائیں کچھ دیر کے لئے روک دی جائیں تو ہو سکتا ہے کہ عوام ٹھنڈے پڑ جائیں اور خواص و عوام کے قلوب سے عام نفرت کم ہو جائے۔ لیکن اس خوف سے کہ سلطان بھڑک نہ اٹھے میں اس کے سامنے یہ کھل کر نہیں کہہ سکا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا، یہ کیسی (خداداد) دانشمندی ہے کہ وہ حکمت جو سلطنت میں تباہی و بربادی کا موجب ہو رہی ہے سلطان کو امن و امان اور بحالی کا ذریعہ نظر آتی ہے"۔

۴۔ برنی جس چوتھی گفتگو کا ذکر کرتا ہے وہ سلطنت کی خرابیوں سے متعلق ہے۔ طغی کی رسی ابھی دراز تھی کہ سلطان

بقیہ حاشیہ: میں ان خیالات کی توضیح کی ہے (نصیحت ۷)

۱۔ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۱۱-۵۱۰۔ لوگوں سے ہمیں مراد افسران اور خواص لینا چاہیئے نہ کہ عام باشندے۔ ۲۔ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۱۷-۵۱۶

نے گجرات میں امن وامان کی بحالی کی طرف توجہ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اسی وقت دیوگیر کی دوسری بغاوت کی اطلاع ملی اور سلطان کو اپنے منصوبے پر دوبارہ غور وخوض کرنا پڑا۔ ان دنوں جب سلطان دیوگیر جانے کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا اس نے مجھے طلب کیا اور مجھ سے یوں گویا ہوا "میری سلطنت بیمار ہے اور اس کے مرض کا کسی بھی دوا سے علاج نہیں ہوسکتا۔ اگر طبیب اس کی کمر کا علاج کرتا ہے تو بخار بڑھ جاتا ہے اور اگر بخار کا توڑ کرتا ہے تو دل کی طرف دورانِ خون میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے۔ میری سلطنت میں ایک ساتھ مختلف النوع بیماریاں گھر کر گئی ہیں۔ اگر میں اسے ایک جگہ ٹھیک کرتا ہوں تو دوسری جگہ بدامنی سر اٹھا لیتی ہے اور اگر میں دوسری جگہ اس کا تدارک کرتا ہوں تو کسی تیسری جگہ پر بداعنیاں نمودار ہوجاتی ہیں۔ دورِ ماضی کے سلطانوں نے سلطنت کی ان بیماریوں کے بارے میں کیا کہا ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ تاریخ کی کتابوں نے سلطنت کی بیماریوں (خرابیوں) کے تدارک کے لئے سلطانوں کی مجوزہ تدابیر کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے، کچھ سلطان تو یہ دیکھتے ہوئے کہ عوام نے ان پر اعتماد کرنا بند کردیا ہے اور ان کے خلاف عام ناراضگی پھیل چکی ہے سلطنت سے دست بردار ہوگئے اور اپنی دورانِ زندگی ہی میں اپنے بیٹوں میں سے جسے بھی انہوں نے قابل ولائق سمجھا اسے سلطنت سونپ دی۔ اس کے بعد انہوں نے سلطنت میں کہیں گوشہ نشینی اختیار کرلی اور ایسے کاموں میں مصروف ہوگئے جن میں تھکن محسوس نہ ہو اور کچھ ندیموں کی زندہ دل صحبت پر اکتفا کیا۔ انہوں نے (اپنی دست برداری کے بعد) امور سلطنت میں مداخلت نہیں کی۔ دوسرے سلطانوں نے عوام کی نفرت کے باعث پیدا شدہ سلطنت کی بیماری کے سبب اپنے کو اچانک ہی شکار، موسیقی اور شراب کے لئے وقف کردیا اور تمام امور سلطنت یعنی ہر مسئلہ کے حل کے اصول اور تفصیلات دونوں کو اپنے وزیروں، اعلیٰ افسروں اور سلطنت کے معاونوں کے سپرد کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی تفتیش یا تحقیق نہیں کی یا کسی بھی امر کے متعلق احکام جاری نہیں کئے۔ ایسا علاج سلطنت کی اس بیماری کو دور کرسکتا ہے بشرطیکہ یہ عوام کے لئے قابلِ قبول ہو اور سلطان بدلہ لینے کے لئے مشہور نہ ہو۔ سلطنت کے سب سے زیادہ خطرناک اور مہلک امراض میں سے ایک خواص وعوام کی نفرت اور عام رعایا میں اعتماد کی کمی ہے۔

سلطان یہ سن کر یوں گویا ہوا "اگر میری حسبِ خواہش امور سلطنت طے پاگئے تو میری یہ تمنا ہے کہ کعبۂ مقدس جاؤں اور دہلی سلطنت کے امور ان تین اشخاص یعنی فیروز شاہ، ملک کبیر اور احمد ایاز کے سپرد کردوں۔ لیکن ان دنوں میں عوام سے ناراض ہوں اور عوام مجھ سے ناراض ہیں۔ عوام نے میرا ذہن بھانپ لیا ہے اور میں نے عوام کے شر پسند اور باغیانہ منصوبے بھانپ لئے ہیں۔ میں جو بھی تدارک کرتا ہوں وہ ضائع ہوجاتا ہے۔ باغیوں، مخالفوں، نافرمان افراد اور بدخواہوں کا علاج میری شمشیر ہے میں اپنی شمشیر سے اس وقت تک سزا دیتا رہوں گا اور وار کرتا ہوں گا جب تک کہ یہ یا تو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کردیتی یا چوک نہیں جاتی۔ جتنا زیادہ لوگ میری مخالفت کریں گے اتنا ہی میری سزاؤں میں بھی اضافہ ہوگا۔"[1]

۱۔ فیروز شاہی، ص ص ۲۲-۵۲۱۔

باغی طغی بھاگ کر ٹھٹہ کے جام کے پاس پہنچ گیا۔ سلطان نے فیصلہ کیا کہ اس کا تعاقب کیا جائے۔ اس وقت ماوراء النہر میں ایک خان برائے نام حکومت کر رہا تھا جو یقیناً چنگیز کی نسل میں سے تھا۔ لیکن اس خطے کا اصل حکمراں امیر قزغن (تیمور لنگ کا نانا) تھا۔ قزغن نے سلطان کی مدد کے لئے التون بہادر کی کمان میں ... ۴ یا ... ۵ منگولوں کی ایک فوج روانہ کی۔ سلطان نے چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح بے حساب، فوج لے کر ٹھٹہ کے خلاف کوچ کیا تاکہ طغی اور جام کو شکست دے سکے لیکن ۱۰ رمضان ۷۵۲ھ کو وہ بخار میں مبتلا ہو گیا اور اسی ماہ کی ۲۱ تاریخ (۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء) کو اس کا وصال ہو گیا۔

منگولوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ بے قائد فوج پر ایک طرف سے حملہ کر کے اسے لوٹیں گے جبکہ سندھ کے سُمیرا اس پر دوسری طرف سے حملہ کر رہے تھے۔ ان حالات میں تمام موقعہ پر موجود رہنماؤں نے (جن میں شیخ نصیر الدین چراغ بھی شامل تھے) فیروز شاہ کو اپنا سلطان منتخب کیا اور ۲۴ محرم کو اسے تخت نشین کیا۔ نئے سلطان کے انتخاب سے نظم و ضبط دوبارہ قائم ہو گیا۔ منگولوں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا اور اس طرح دہلی کے لئے کوچ شروع ہو گیا۔ بھکر پہنچنے پر فوج کو یہ اطلاع ملی کہ خواجۂ جہاں احمد ایاز نے جسے محمد بن تغلق نے اپنا نائب بنا کر دہلی روانہ کیا تھا ایک لڑکے کو مرحوم سلطان کا بیٹا کہہ کر تخت نشین کر دیا ہے۔ لہٰذا اصولی طور پر وہ بغاوت کا مرتکب تھا۔ بظاہر تو اس کا یہ عمل ناقابل توجیہ معلوم ہوتا ہے۔ محمد بن تغلق کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ حالانکہ اس نکتہ پر کچھ بحث رہی ہے لیکن عصامی کا حسب ذیل جملہ جو سلطان کی دوران زندگی ہی میں لکھا گیا اور شائع ہوا اس معاملہ کا قطعی طور پر تصفیہ کر دیتا ہے: "اگر سلطان (خسرو) کا کوئی بیٹا نہیں ہے تو اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ تمام دنیا اسی کی طرح ہو جائے"۔[1] اس پر طرہ یہ تھا کہ احمد ایاز کی عمر چوراسی سال تھی۔ وہ خالص انتظامیہ کا آدمی تھا اور اس نے کبھی ایک تیر بھی نہیں چلایا تھا اور نہ ہی کسی تیز و طرار گھوڑے پر سواری کی تھی۔ برنی فیروز شاہ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ محل ہزار ستون کی سیڑھیاں چڑھنے سے احمد ایاز کی سانس پھول جاتی تھی اور یہ خطرہ تھا کہ کہیں اس کے قلب پر اثر نہ ہو جائے۔ پھر آخر ایسے شخص کو کسی مایوس کن بغاوت کے لئے کیوں قدم اٹھانے کی ضرورت پڑی جبکہ امرا اور فوج فیروز شاہ کو سلطان تسلیم کر چکی تھی؟

شمس سراج عفیف اپنی تاریخ فیروز شاہی میں اس کا اعتراف کرتا ہے کہ عام طور سے لوگوں کا یہ یقین تھا کہ فیروز شاہ کے انتخاب کی خبر سن کر احمد ایاز نے بغاوت کر دی تھی لیکن وہ اس کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ اپنی ذاتی تحقیقات کی بنیاد پر اور ملتان کے سابق صوبیدار بہرام شاہ ابن کشلو خاں کے بیٹے کشور خاں سے اس نے جو کچھ سن رکھا تھا اس کی بنیاد پر عفیف اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ محمد بن تغلق کی موت کی خبر سن کر منگولوں نے فوجی خیمہ کے مرکزی بازار پر حملہ کیا اور لوگ تتر بتر ہو گئے۔ خواجۂ جہاں کا ایک بہت معتبر غلام تھا جس کا نام ملیح تُن تُن تھا جسے اس نے سلطان کے پاس بھیجا تھا ابھی لوٹ مار ہو ہی رہی تھی کہ تُن تُن نے فوجی خیمہ چھوڑ دیا اور دہلی پہنچ کر خواجۂ جہاں کو حسب ذیل اطلاع دی "سلطان

۱۔ عصامی، فتوح السلاطین ص ۴۳۳ (مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسین)

محمد کی موت ہو گئی ہے۔ منگول مرکزی بازار پر حملہ کر کے اسے لوٹ چکے ہیں۔ فیروز شاہ اور تاتار خاں کا کوئی نشان پتہ نہیں معلوم یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ منگولوں کے ہاتھ پڑ چکے ہیں یا مار دیئے گئے ہیں۔" عفیف مزید لکھتا ہے کہ آج بھی دہلی کے عوام کو ملیع تُن تُن کا نام یاد ہے۔

خواجہ جہاں نے سلطان محمد اور فیروز دونوں کے لئے آنسو بہائے" خواجہ جہاں اور فیروز شاہ میں آپس میں بہت محبت تھی، ایسی محبت کہ کوئی بھی تیسرا شخص ان کے درمیان نہیں آسکتا تھا۔ خواجہ جہاں کی بیوی فیروز شاہ کو اپنا فرزند کہتی تھی اور اس سے پردہ نہیں کرتی تھی۔" لیکن اس یقین پر کہ فیروز شاہ مر چکا تھا، خواجہ جہاں نے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے لڑکے کو تخت نشین کر دیا، یہ اجتہاد غلط ثابت ہوا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت دہلی میں موجود بیشتر افسر اس سے متفق تھے۔ جب خواجہ جہاں نے فیروز شاہ کی پیش قدمی کے بارے میں سنا تو وہ سیاسی حکمت عملی کی خاطر ایک فوج جمع کرتا رہا حالانکہ جنگ کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن مرحوم سلطان کی سخاوتوں کے سبب خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ صرف تقریباً بیس ہزار سپاہی ہی جمع کر سکا۔

جب فیروز شاہ کی فوج دہلی پہنچی تو نائب وزیر اور دہلی میں دوسرے پائے کا متقدم افسر قوام الملک (بعد از اں جہان مقبول) بھاگ کر فیروز شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ خواجہ جہاں بہت زیادہ پریشان ہوا۔" ایک تہ کا چوغا پہنے، انگلیوں میں اپنی تسبیح پھنسائے، دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے اور جوتے پہنے ہوئے خواجہ جہاں ہزار ستون کی سیڑھیوں سے اوپر نیچے آجا رہا تھا۔" لیکن اس نے اپنے افسروں کو قوام الملک کا تعاقب کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے سوچا کہ اس کا منصوبہ غلط تھا اور بہتر یہ ہوگا کہ وہ فیروز شاہ کے حضور میں جائے اور اپنی غلطی کا اقبال کر لے چنانچہ اگلے روز نماز جمعہ کے بعد ان تمام افسروں کے ساتھ جو اس کے ساتھ شریک تھے وہ شہر دہلی کے باہر آیا اور علائی تالاب کے کنارے خیمہ ڈال دیا۔ مستقبل کے ارادوں کے متعلق اپنے افسروں کے سوالات کے جواب میں اس نے کہا" تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ محمد بن تغلق کے بیٹے کو تخت نشین کرنے کے اس منصوبہ میں میرا کوئی ذاتی مدعا نہیں تھا۔ قیادت (امامت) کا تعلق سلطانوں سے ہے اور وزارت کا وزیروں سے۔ اگر سلطان وزیروں کا کام کرنے کے خواہاں ہو جائیں اور وزیر سلطانوں کے کام کرنے کی کوشش کریں تو ایک وقت آئیگا کہ ملک تباہ ہو جائیگا۔ دونوں طرف لوگ داستانیں گڑھ رہے ہیں لیکن سلطان بنانے کے معاملہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس وقت تک سلطان محمد کے عہد میں فیروز شاہ کو اپنا فرزند کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ میری بیوی اس کے سامنے آتی تھی اور وہ مجھے اپنا باپ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کیا ہونے والا ہے، لیکن تمہیں میرے ساتھ آنا چاہیے، سلطان فیروز ایک مہربان انسان ہے، وہ میری درخواست کو نظر انداز نہیں کریگا اور تمہیں بخش دیگا۔" عفیف کہتا ہے کہ خواجہ جہاں ایک انسان تھا، اس کی عمر چوراسی سال کی تھی، سر منڈا ہوا تھا، داڑھی سفید تھی۔ وہ شیخ نظام الدین کا مرید تھا اور ایک سجادہ نشین صوفی شیخ کی طرح لگتا تھا۔

اس کے کچھ پیروکاروں نے اس تدبیر کی مخالفت کی لیکن خواجۂ جہاں نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کروائی کہ شہر دہلی کے دفاع کے لئے کوشش کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں ہوگا اور اس سے مسلم خواتین پر مصیبتیں نازل ہوں گی۔ اس کے کچھ افسروں نے تو اس ... کا ساتھ دیا اور دوسروں نے راہِ فرار اختیار کرلی۔ قوام الملک فتح آباد کی منزل پر فیروز شاہ کے سامنے شرف یاب ہوا۔ خواجۂ جہاں آگے روز اکرندا کے قریب دھانسور کے مقام پر نصب شاہی خیمہ میں پہنچ گیا۔ جس وقت فیروز شاہ نمازِ عصر کے بعد بار میں جلوہ افروز تھا وہ بارگاہ کے دروازہ پر اپنے گلے میں ایک زنجیر ڈالے ہوئے اور سر پر پگڑی کی جگہ صوفی طاقیہ پہنے ہوئے اور گردن میں ایک ننگی تلوار باندھے ہوئے حاضر ہوا۔ عصر کے وقت بارگاہ میں سلطان کے اور ان لوگوں کے درمیان جو اس کے حضور میں سلام کے لئے حاضر ہوتے ہیں ایک تیر کے نشانہ کے برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی فیروز شاہ کی نگاہیں خواجۂ جہاں پر پڑیں اس نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ وہ اُسے مناسب لباس زیب تن کرواکر شاہی ڈولی میں بٹھائیں اور ایک خیمہ (خرگاہ) لے جائیں اور اسے مطلع کریں کہ وہ (فیروز شاہ) اس سے وہیں ملاقات کے لئے آئیگا۔

فیروز شاہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ خواجۂ جہاں کا قصور معاف کردے گا اور اسے وزیر کے عہدہ پر دوبارہ فائز کردے گا۔ لیکن اُس کے افسروں نے اس موضوع پر گفتگو کی اور اس منصوبے کے خلاف رائے دی۔ وہ اس کے محل آئے اور عماد الملک بشیر سلطان کو اس کے پاس باریابی کی اجازت لینے کے لئے بھیجا۔ جب فیروز شاہ نے انھیں شرفِ حاضری عطا کردیا تو وہ بہت زیادہ عزت واحترام سے پیش آئے۔ ہر سلطان پر حج فرض تھا۔ وہ اس سے حج کے لئے روانگی کی اجازت طلب کررہے تھے۔ دیوانی اور مالیات سے متعلق چھوٹے چھوٹے سیاسی جرائم کو تو بخشا جاسکتا تھا لیکن غداری قابلِ معافی نہیں ہوسکتی تھی۔ خواجۂ جہاں نے ایک لڑکے کو تخت نشین کیا تھا۔ خزانہ کے پیسہ کو بری طرح اُڑایا تھا اور اس کے بعد اس نے ملک کے سونے چاندی کے برتنوں کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے وہ اس وقت آیا جب اس کا مقصد فوت ہوچکا تھا!

عفیف لکھتا ہے کہ "فیروز شاہ بخوبی سمجھتا تھا کہ وہ سب متفقہ طور پر اور ایک آواز ہوکر خواجۂ جہاں کے خاتمہ کا مطالبہ کررہے تھے۔ انتہائی فکر اور احتیاط کی وجہ سے اس کا رنگ پیلا پڑگیا۔" مرحوم سلطان کے عہد میں اس طرح کی کوئی بات واقع نہیں ہوسکتی تھی۔ افسر اس فرماں روا سے گفتگو کے لئے حاضر نہیں ہوئے تھے بلکہ جسے انہوں نے خود ہی منتخب کیا تھا اسے ہدایت دینے کے لئے آئے تھے۔ فیروز کے حواس جواب دے گئے کیونکہ وہ مستقبل میں دوسرے مواقع پر بھی یہی کرنے جارہے تھے۔ چنانچہ کچھ روز غور وخوض کرنے کے بعد اس نے عماد الملک کو طلب کرکے اس سے کہا کہ وہ افسروں کو رازدارانہ طریقہ سے یہ مطلع کردے کہ وہ خواجۂ جہاں سے اپنے حسبِ مرضی نمٹ لیں اور وہ اس معاملہ میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ افسروں نے سلطان کی طرف سے خواجہ جہاں کو مطلع کیا کہ اس بڑھاپے کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے سمانا کا اقطاع (صوبہ) عطا کیا گیا ہے۔ لیکن اسے سمانا کے لئے روانہ کرتے وقت انہوں نے اپنے مقتدر ترین افسروں میں سے شیر خاں کو بھی اسی سمت میں بھیجا جو عمر میں خواجۂ جہاں سے بھی بزرگ تر تھا۔ شیر خاں نے بھی ان ہی منزلوں پر اپنے خیمے نصب کئے جہاں خواجۂ جہاں

نے نصب کئے تھے لیکن اس سے ملاقات نہیں کی۔ خواجۂ جہاں نے اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اس کو مجھے ختم کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے"۔ اور اس نے اس سے پہلے ہی اپنا خاتمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے روز خواجۂ جہاں نے شیر خاں سے ایک خیمہ نصب کرنے کے لئے کچھ کپڑے دینے کی درخواست کی اور شیر خاں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ خواجۂ جہاں نے اپنے آدمیوں کو ایک کھلے میدان میں خیمہ نصب کرنے اور زمین کو پاک و صاف کرنے کا حکم دیا۔ جب یہ سب ہو گیا تو وہ اسے اس مقام پر لائے۔ ذہنی پریشانی کے عالم میں وہ اس جگہ پہنچا اور پانی طلب کر کے وضو کیا اور کسی برگزیدۂ حق کی طرح اس نے دو رکعت نفل پڑھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے سر پہ وہ کلاہ رکھی جو اسے شیخ نظام الدین سے عطا ہوئی تھی اور اس کے گرد وہی دستار باندھی جو اسے حضرت شیخ سے ملی تھی۔ پھر وہ سپاہی کی طرف مڑا اور اس سے پوچھا "کیا تمہارے پاس تیز تلوار ہے؟" اس شخص نے اپنی تلوار دکھائی۔ اس کے بعد خواجۂ جہاں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ وہ وضو کر کے دوگانہ نفل ادا کرے۔ جب اس کا دوست تیار ہو گیا تو پھر خواجۂ جہاں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھی اور کلمہ کا ورد شروع کر دیا۔ اس کے دوست نے (ہدایت کے بموجب) تلوار سونتی اور خواجۂ جہاں کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔[1]

برنی کے 'زوال' کے حالات کو واضح کرنے کے مقصد سے ان واقعات کا صحیح اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اس وقت دہلی میں موجود تھا اور اسے خواجۂ جہاں کی نام نہاد بغاوت میں ملوث کر لیا گیا ہوگا کیونکہ جو بھی اہل رائے تھے وہ سب منصوبہ میں شریک تھے۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا جو کسی عام تحریک کے خلاف جاتا۔ اس مفروضہ کو اس کے اس ناشائستہ لہجہ سے اور بھی تقویت ملتی ہے جس سے وہ خواجۂ جہاں کو یاد کرتا ہے تاکہ وہ فرماں روائے وقت کا منظورِ نظر ہو جائے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ خواجۂ جہاں نے ایک غلط اطلاع پر کام کیا حالانکہ اسے یہ حقیقت معلوم ہی ہوگی۔ نیز وہ ان آخری شرائط کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہتا جو افسروں نے فیروز کے سامنے رکھی تھیں یا یہ کہ خواجۂ جہاں کی موت کس طرح واقع ہوئی۔ دوسرے یہ کہ نئے عہد میں اس کے بکثرت دشمن تھے۔ اس کی تحریر اور حالات دونوں اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں۔

نئے عہد کے شروع میں وہ بھٹنیر کے قلعہ میں شہر بند تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان افسروں کی طرح بھاگ کر وہاں

۱۔ خواجۂ جہاں کے متعلق ان واقعات کو عفیف نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں (۵۱ تا ۸۷ تک) بیان کیا ہے۔ عفیف برنی کی تصنیف کا حوالہ دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ اس کے سلسلہ کو جاری رکھے گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ 'خواجۂ جہاں' کی بغاوت' کا پورا ذکر کرتا ہے کیونکہ برنی نے مرحوم وزیر کے اقدامات اور مقاصد کو بہت زیادہ غلط بیانی سے پیش کیا ہے۔

پہنچا ہو جو خواجہ جہاں کے علائی تالاب پر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے یا اسے حکومت کے حکم سے وہاں بھیجا گیا ہو۔ بہر صورت اس نے حاکموں کے فیصلہ کے انتظار میں پانچ ماہ امید و بیم میں گزار دیئے۔ نعت محمدی کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے[1] اللہ کی حمد اور رسول اکرم اور اُن کی آل کے لئے دعائے برکت اور صحابہ کو سلام و تہنیت کے بعد امت محمدؐ کا سب سے بڑا گنہگار ضیا برنی یہ عرض کرتا ہے کہ جب اس گنہگار کی عمر ستر (قمری) سال کو پہنچ گئی تو کمزوری نے میری قوت کی جگہ لے لی، حواس خمسہ ماند پڑ گئے، میں کمزور ہو گیا اور (زندگی کی) آخری گھڑی کا سامنا کرنے کا خوف، جو کہ بھیانک وقت ہے، میرے سینہ پر مسلط ہو گیا ہے اور ملک الموت سے ملاقات کا خیال جو کہ نہایت ہولناک ملاقات ہوتی ہے میرے ہوش و حواس پر چھا گیا ہے۔ میں حضرت محمدؐ کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور خود اللہ نے حضرت محمدؐ کے سر اور زندگی کی قسم کھائی ہے کہ میں نے بے حد سوچا لیکن پھر بھی مجھے اپنی زندگی کے آخری دو قرن کے دوران کوئی بھی ایسا اچھا عمل یا پسندیدہ فعل نہیں یاد آیا جو گناہ اور بے انصافی کے زیر اثر تباہ اور ناقص نہ ہو گیا ہو۔ مجھے اپنی تمام زندگی میں کوئی ایسی ریاضت یا نیکی نہیں مل سکی جس کے سہارے میں اپنی زندگی قربان کرتے وقت تحفظ حاصل کر سکوں یا جس کی قوت پر میں اس دنیا سے رخصت ہو سکوں یا جسے سینے سے لگا کر میں آخرت کی آزمائشوں اور خطروں کو عبور کر سکوں۔ جیسے جیسے ہر لمحہ میں اپنے گناہوں اور غلطیوں کو یاد کرتا تھا اتنا ہی زیادہ سے زیادہ میں ناامید ہوتا جاتا تھا۔"

مسلمانوں میں موت کے وقت اس طرح کے اعتراف رسمی اور روایتی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن برنی ہمیں بہت نکتہ کی بات بتاتا ہے: "جن پانچ ماہ میں میں بھٹیر میں شہر بند رہا وہ دن میں نے رنج و الم میں گزارے۔ اس غم کی حالت میں جب میں پو پھٹتے دیکھتا تھا تو مجھے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ آیا میں رات تک زندہ رہوں گا اور اگر رات آتی تھی تو مجھے یہ امید نہیں ہوتی تھی کہ صبح زندہ اٹھوں گا۔ اس سخت اذیت کے عالم میں میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں رسول اکرم کی تعریف میں ایک کتاب کی تالیف کروں اور حدیث کی کتابوں میں جو کچھ دیکھا اور پڑھا ہے اسے فارسی زبان کے قالب میں لاؤں اور اس کتاب کو موت کے وقت کے لئے مضبوط دستہ کی طرح استعمال کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اپنے اس خیال کو ایک عمدہ تخلیقی تحریک تصور کیا اور میرے قلب میں طاقت آ گئی۔ میرے معاملات ایسی نازک حالت کو پہنچ چکے ہیں کہ میرے دوست اور شناساؤں نے مجھ سے رخ پھیر لیا ہے اور میری بدنصیبیوں کی وجہ سے میرے دشمنوں اور مخالفوں کے دل کی کلی کھل گئی ہے۔ ان حالات میں اس کتاب کی تالیف کی وجہ سے جو میری دینی اور دنیاوی معاملات کی پشت و پناہ ہے میں وقتاً فوقتاً اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کرتا ہوں۔"

ظاہرہ برنی کو قلعہ کے اندر نقل و حرکت کرنے کی آزادی تھی اور تاریخ فیروز شاہی میں وہ قلعہ میں قیام کے بارے

---

[1] نعت محمدی کا واحد قلمی نسخہ رامپور لائبریری میں ہے۔ اس کے مقدمہ میں یہ کچھ اقتباسات پروفیسر شیخ عبدالرشید کے لئے نقل کئے گئے تھے۔ یہ عبارت انہی اقتباسات کا ترجمہ ہے۔

میں ایک ضمنی ذکر کرتا ہے[1]: "جب میں بھٹنیر کے قلعہ میں تھا تو جاڑے کے موسم میں شورشوں کا کچھ خطرہ کھڑا ہوا۔ دیہاتوں کے لوگ (تلاؤنڈی) قلعہ کی دیوار کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے گھوڑوں اور مویشیوں کی وجہ سے اتنی دھول اڑی کہ روشن دن رات کی طرح تاریک ہو گیا اور لوگ ایک دوسرے کا چہرہ نہیں دیکھ سکے۔ مشکل سے رعیت کا ایک ہزار واں حصہ بمعہ اپنے گھوڑوں کے بھٹنیر کے قلعہ میں داخل ہو سکا۔ میں نے اختیار الدین مدقو حجام کے اصطبل میں گھوڑوں کا شمار کیا۔ اس میں ایک ہزار یا دو ہزار تنکوں کی قیمت کے برابر تیرہ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔"

نئے حکمرانوں نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ طے کیا کہ وہ اپنے دور کا آغاز کشت وخون سے نہیں کریں گے۔ صرف تقریباً پندرہ اشخاص کو سزائے موت دی گئی۔[2] جن میں برنی احمد ایاز، نتھو سودھل، حسن، حسام آدھنگ اور احمد ایاز کے دو غلاموں کے ناموں کا ذکر کرتا ہے لیکن ان باغیوں کے رشتہ داروں کو سزائے موت نہیں دی گئی۔ غالباً ملک الامرائ ملک شکار بیگ و ملان سلطانی کی سفارش پر فیروز شاہ نے ضیاء الدین برنی کی جان بخش دی۔[3] "مرحوم سلطان (محمد بن تغلق) کے انتقال کے بعد میں ضیاءٔ برنی، مصنف تاریخ فیروز شاہی کئی قسم کے مہلک خطرات میں گھر گیا۔ میری زندگی کے بدخواہ، طاقتور اور مضبوط دشمن میری موت کے خواہاں تھے۔ یوں کہئے کہ ان کی نفرت کی چوگان نے مجھے پاگل ہونے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے سلطان کے حضور ہزاروں زہر آلود الفاظ مجھ سے منسوب کئے۔ اگر خدا کی مہربانی کے بعد سلطانِ وقت وزماں فیروز شاہ السلطان' کا رحم، انکسار، شفقت مہربانی اور صداقت کا احترام میری نجات کو نہ آجاتا اور اگر اس نے بندۂ ضعیف کے طاقتور اور بااثر دشمنوں کے زہر آلود الفاظ پر کان رکھے ہوتے اور انہیں تسلیم کر لیا ہوتا تو میں زمین کی گود میں سو رہا ہوتا۔ اگر بیکسوں کے پالن ہار اس سلطان کی نیک سیرت نے میرے ہاتھوں کو گرفت میں نہ لے لیا ہوتا تو میں آج کس طرح زندہ رہ سکتا تھا؟ میں اپنی زندگی کے لئے سلطان کا احسان مند ہوں۔[3]"

۴

حکومت نے اس کی جان تو بخش دی لیکن اس کا مال واسباب یقیناً ضبط کر لیا گیا۔ کیلو گرھی میں اسے اپنے والد کے مکان میں دوسرے ورثا کے ساتھ حصہ کرنا پڑتا ہوگا لیکن اس نے غیاث پور میں خود ہی اپنا مکان تعمیر کیا تھا پھر مرحوم سلطان نے اسے تحائف وانعامات سے نوازا تھا۔ اس کی دولت اور جائداد کا کیا بنا؟ اس کا واحد جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ بحق حکومت ضبط کر لیا گیا مرحوم سلطان اپنے تحائف میں بہت بے پرواہ تھا ———— اور

۱۔ ص۔ ۵۵۴

۲۔ تاریخ فیروز شاہی، ص۔ ۵۵۲

۳۔ تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۵۵۷

اس سلسلہ میں وہ کسی خوبی یا خدمت کا کم ہی لحاظ کرتا تھا۔ کافی مقدار میں سونا چاندی ہندوستان کے باہر چلا گیا تھا اور اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن جو باقی رہ گیا تھا اور دہلی میں ہی موجود تھا اسے واپس حاصل کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے غور کیا نئی حکومت کو رقم اور اشیاء کی سخت ضرورت تھی۔ بہت ممکن ہے جس وقت برنی بھٹنیر میں اپنی قسمت کے فیصلہ کا انتظار کر رہا تھا اس وقت اس کے مال و جائداد کی فہرست بنائی گئی ہوگی۔ اس کی کچھ آمدنی اس کے لئے چھوڑ دی گئی تھی۔ کچھ ایسی چیزیں جنہیں امیر خورد از راہ عنایت 'وظیفہ' کہتا ہے۔ لیکن باقی کو ضبط کر لیا گیا۔ ہو سکتا ہے فیروز شاہ اس کے صحیح سالم نکل جانے کے حق میں ہو لیکن وہ اپنے افسروں کی وجہ سے مجبور تھا۔ یہ الزام غالباً صحیح تھا کہ برنی 'زہر آلود الفاظ' استعمال کرتا رہا تھا۔ اس کی تصانیف اس قدر مغلظات سے پُر ہیں کہ اس کی عمر کے انسان کے لئے قابل تحسین نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بحیثیت ندیم مرحوم سلطان کی خوشنودی کے لئے اکثر زہر آلود الفاظ استعمال کرتا رہا ہو۔

چنانچہ دہلی واپس آکر برنی کو 'زندہ' رہنے کے لئے ندامتوں کے سوائے کچھ بھی نہیں ملا۔ خاص طور سے اگر ہم اسے اس معیارِ زندگی کے پس منظر میں دیکھیں جس کا وہ عادی تھا تو یہ یقینی ہے کہ وہ بہت زیادہ تنگ دست تھا لیکن یہ بھی اتنا ہی یقینی ہے کہ تنگ دستیوں میں اسے موت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ برنی حکومت کے خوف سے اور اس امید پر کہ اس کی خطا معاف کی جا سکتی ہے اپنے خلاف الزامات اور جائداد کی ضبطی دونوں کے سلسلے میں خاموش ہے۔ لیکن اس طرح کے حالات میں سکوت اعتراف کے مترادف ہے۔

برنی کو اپنے بڑھاپے اور غربت میں صرف اس ثروت کی چاہ نہیں تھی جو اس سے رخصت ہو چکی تھی بلکہ وہ اس طرح لکھتا تھا جیسے کہ وہ اس وقت بھی جنسی زندگی کے لائق تھا۔ لیکن اسے حقیقتاً جس چیز کی پریشانی تھی وہ تمنا نہیں بلکہ ہوس کی تمنا تھی۔

سلطان جلال الدین خلجی کی مجلس کا حسب ذیل ذکر بہت اہم ہے جو اس وقت سے متعلق ہے جب برنی مشکل سے گیارہ یا بارہ سال کا رہا ہوگا لیکن جسے اس نے چوہتر سال کی عمر میں تاریخ فیروز شاہی میں سپرد قلم کیا۔[۱]

"ساقی یلدوز اور ہیبت خاں اور نظام خریطہ دار کے بیٹے (سلطان جلال الدین خلجی کی) مجلس کے ساقی تھے اور وہ اتنے حسین و جمیل اور دلربا تھے کہ اگر کسی زاہد کی ان پر اتفاق سے نظر پڑ جاتی تو وہ ان توبہ شکنوں کی محبت میں اپنی کمر میں تسبیح باندھ کر اور اپنے گوشہ تنہائی سے بھاگ کر مے خانے کا رخ کرتے۔

"مجلس کے مطربوں میں محمد شاہ چنگی جو چنگ بجاتا تھا جبکہ فتوحہ اور نصرتی کی دختر اور نصرت خاتون نغمہ سرا ہوتی تھیں۔ ان کی آوازوں کے سوز اور شیرینی پرندوں کو بھی بلندیوں سے نیچے اترنے پر مجبور کر دیتی تھی لیکن ان کے

۱۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۰۱-۱۹۹

(انسان) سامعین کے تو ہوش تک اُڑ جاتے تھے۔ مہر افروز اور نصرت بی بی کی باکمال دختر، جن کا بے انتہا حسن و شباب مجلس کے ہر اس گوشہ کو سحر انگیز کر دیتا تھا جس پر وہ ایک نظر ڈال دیتی تھیں، موسیقی پر رقص کرتی تھیں۔ ان کی ادائیں اتنی دلربا تھیں کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ان پر جان فدا ہو رہا ہے اور وہ ایک لمحہ بھی ان کے سحر کن تھرکتے ہوئے پاؤں سے اپنی نگاہیں نہیں ہٹاتا تھا۔[۱]

مختصراً سلطان کی مجلس کا صرف خواب میں ہی تصور کیا جا سکتا تھا۔ سلطان کی مجلس کے ملک الندما امیر خسرو و مہتاب رو غلمان اور دلفریب حسیناؤں کی تعریف میں ہر روز نئی نئی غزلیں پیش کرتے اور جس وقت ان غزلوں کی نغمہ بندی کی جاتی تھی اس وقت موسیقی اور خوبصورت حسیناؤں کے ناز و ادا اور حسین رقاصاؤں کے رقص کے دوران ساقی حاضرین مجلس کو دعوت صہبا دیتے تھے۔ اس صحبت میں جس کی مثال روئے زمین پر نہیں دیکھی جا سکتی اور نہ بیان کی جا سکتی ہے، شکستہ دل اور افسردہ لوگوں کو نئی زندگی ملتی تھی جبکہ عیش و عشرت کے طالب زمین پر ہی بہشت کا لطف لیتے تھے اور زود اثر طبیعتیں محسوس کرتی تھیں جیسے وہ دنیا اور اس کی تلخیوں سے بے تعلق ہو چکی ہوں۔ اس طرح کی مجلس میں جس کے دروازہ پر حوریں اور پریاں زمین پر اپنا لباس پھیلائے ہوئے نشست سنبھالے ہوتی تھیں اگر کسی انسان پر نشہ کی کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی تو وہ جذبات سے بالکل عاری ایک سنگدل اور سخت جان انسان ہی ہو سکتا تھا۔[۲]

۱۔ اس پیراگراف کا بغور جائزہ لینے پر معلوم ہوگا کہ تقریباً ساٹھ سال کے وقفہ کے بعد برنی حسب ذیل لوگوں کے نام یاد رکھنے سے قاصر تھا ہیبت خاں اور نظام خریطہ دار کے بیٹے، قتائی کی دختر اور نصرت بی بی کی باکمال دختر۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برنی کی جذباتی یادداشت بہت مضبوط تھی اور اس نے جو کچھ محسوس کیا تھا وہ اسے یاد تھا۔ فیروز شاہی میں بھی جگہ جگہ برنی لوگوں کے نام یاد رکھنے سے قاصر رہا اور اس نے ان کا بالواسطہ ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر 'عزیز خمار اور اس کا بھائی'۔

لیکن برنی کے ذہن میں تصویر یا شکل قائم رکھنے کے سلسلے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ فیروز شاہی کے قاری کو ان اشخاص میں سے کسی کی بھی شخصیت یعنی ظاہری صورتوں اور چہرہ مہرہ کے متعلق کوئی ذکر نہیں ملے گا جن کی سیرت کا اس نے خاکہ کھینچا ہے ــــــ علاؤ الدین خلجی، ملک کافور، خسرو وغیرہ دیکھنے میں کیسے لگتے تھے؟ برنی ان کی شکل و صورت بہ آسانی بیان کر سکتا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کرتا ہے۔ کیا برنی کی بصری یادداشت نے اس کا ساتھ نہیں دیا یا تاریخ فیروز شاہی میں اس خلا کا باعث تاریخ کی روایت ہے؟ میں آخر الذکر صورت کی طرف راغب ہوں کیونکہ فارسی تاریخ کی روایت اپنی ممتاز شخصیتوں کی ظاہری شکل و صورت کے بیان کی ضرورت نہیں سمجھتی۔

۲۔ حوریں وہ خوبصورت عورتیں ہیں جو بہشت میں نیک مسلمانوں کی راحت کا سامان بہم پہنچائیں گی پریاں وہ خوبصورت عورتیں ہیں جو موجودہ وقت میں کوہ قاف میں رہتی ہیں۔

ـــ

جہاں تک مجھ گمراہ ضعیف انسان کا سوال ہے، جو ناکامیابیوں کے صحرا میں گم ہو چکا ہے، اس کی زندگی کی صرف چند سانسیں باقی ہیں۔ لیکن جس وقت میں ان مجلسوں کے مناظر کی قلمی تصویریں پیش کرتا ہوں توان جوان، حیات بخش اور مہتاب رُو حسیناؤں کو یاد کر کے جن کے دلکش اور دلربا رقص میں دیکھ چکا ہوں اور جن کے نغمے میں سن چکا ہوں میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں اپنے شانوں کے گرد برہمن کا جنیوُ ڈالوں، اپنی منحوس پیشانی پر کشکہ کھینچوں، چہرہ سیاہ کروں اور ایسی حالت بناکر ہر بازار اور کوچہ میں گشت کروں اور دنیائے حسن کی ملکاؤں اور شائستگی اور لطافت کے آسمان کے ماہتابوں کی حرماں نصیبیوں کے غم میں اپنے کو ذلیل و رسوا کروں۔ اس کو ساٹھ سال گزر چکے ہیں تاہم میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے کپڑے پھاڑ دوں، سر اور داڑھی کے بال نوچ ڈالوں اور ان کی قبروں کے پائنتی رنج والم میں اپنی جان دے دوں۔ اپنے ماضی پر توبہ، ہزار توبہ بھیجتا ہوں کیونکہ نہ تو میں اپنے دینی امور ہی میں امتیاز حاصل کر سکا اور نہ ہی اپنی دنیاوی زندگی میں وہ آسودگی حاصل کر سکا جو ایک شائستہ اور مہذب ذہن کو مطمئن کر سکتی۔ اور جب کہ میں ضعیف ہو چکا ہوں اور بینائی کھو چکا ہوں تو میں ایک گوشہ میں مجبور و مفلس محدود ہوں اور میرے پاس پشیمانیوں کے علاوہ گزارہ کا کوئی سامان نہیں ہے اور اپنے ساتھ (دوسری دنیا تک) لے جانے کے لئے میرے پاس ناکردہ حسرتوں کے سوائے کچھ نہیں ہے۔ اکثر میں ان اشعار کو دہراتا ہوں جو میرے حسبِ حال ہیں:۔

"نہ تو میں کافر ہوں اور نہ ہی مسلمان۔ نہ میرا قلب میرے ہاتھوں میں ہے اور نہ ہی میرا ایمان۔ صرف خدا ہی میرے قلب کو میری حقیقی حالت سے باخبر کر سکتا ہے نہ تو مجھے (رحمتِ الٰہی کی) قوی اُمید ہے اور نہ ہی میں نجات کے عقیدہ پر ثابت قدمی سے جما ہوا ہوں کیونکہ میری اُمید کی راہ ہزار جگہوں پر منقطع ہو چکی ہے۔ میں کہاں جاؤں؟ میں کیا کروں؟ کس سے اپنے دل کی باتیں کہوں؟ نہ تو مجھ میں چلنے کی سکت ہے اور نہ ہی بیٹھے رہنے کا عزم میری دنیا کے مشرق و مغرب ایک چیونٹی کے سینہ کی طرح مختصر ہو گئے ہیں۔ میرے زمین و آسمان انگوٹھی کے حلقہ کی طرح تنگ ہو گئے ہیں۔ یارب اپنی رحمت کے دروازہ مجھ پر کھول دے کیونکہ میں بے چارگی، کمزوری، پریشانی اور رنج کی انتہاؤں تک پہنچ چکا ہوں"[1]

برنی کا حسبِ ذیل نالہ بھی قابلِ ذکر ہے: "میں نے اس فیاض انسان (ملک نصرت صباح) کو دیکھا ہے۔ بسا اوقات وہ میرے والد کے مکان پر مہمان ہوتا تھا۔ حالانکہ ان دنوں میں بہت زیادہ بے چارگی اور پریشانی میں ہوں اور فقرا (خواہندگان) میرے دروازے سے مایوس ہو کر واپس ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی چونکہ میں ایک سخی انسان کا بیٹا اور فیاض بزرگوں کا وارث ہوں لہٰذا میں ایسے دن

۱۔ ان اشعار کا ترجمہ پروفیسر سید عبدالرشید کی تصنیف 'ضیاالدین برنی' ایک مطالعہ' (Ziauddin Barni, a study) سے لیا گیا ہے۔

سے موت کو ہزار بار بہتر سمجھتا ہوں۔ میرے پاس اپنا کچھ نہیں ہے اور میں دوسروں سے کچھ بھی مستعار نہیں لے سکتا۔ دن رات میں سخاوت کرنے اور درہم اور دینار[۱] تقسیم کرنے کی تمنا میں گھلتا رہتا ہوں[۲]۔ اگر اس تاریخ کی تصنیف سے مجھے کوئی دوسرا فائدہ نہیں حاصل ہوتا ہے تو میں نے کم از کم اس میں ان سخی لوگوں کی فیاضی اور سخاوت کا ذکر تو شامل کر ہی دیا ہے جن کے بارے میں میں نے اپنے والد اور دادا سے سنا تھا اور جن میں سے کچھ کو میں نے خود دیکھا ہے۔ فیاض لوگوں کی یاد اور ان کا ذکر تو میرے شکستہ دل کو سکون اور اطمینان بخشتا ہے۔ ان کے نام مجھے موت سے زندگی کی طرف کھینچ لاتے ہیں۔"[۲]

۵

ان حالات میں برنی نے فیروز شاہ کے دورِ حکومت کے پہلے چھ سالوں پر جو گیارہ باب لکھے ہیں ان کا سب سے اہم مقصد مقتدر لوگوں کی خوشامد اور عہد کی تعریف کرنا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس عہدِ حکومت کی کچھ ایسی چیزوں کی بھی تعریف کر جاتا ہے جن کی اس نے دوسری جگہ مذمت کی ہے۔ (الف) فوج کو دور دراز کی مہمات پر نہیں بھیجا جاتا ہے[۳]۔ (ب) دوکاندار کسی دوسرے دور کے مقابلہ میں زیادہ آسودہ حال ہیں۔ اس وقت دوکاندار بازار کا حکمراں ہے۔ وہ حسبِ مرضی خریدتا ہے اور حسبِ مرضی فروخت کرتا ہے"[۴]۔ (ج) دوکانداروں، تاجروں، ساہوکاروں اور احتکار کرنے والوں کی دولت لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں میں پہنچ گئی ہے[۵]۔ (د) خوطوں اور مقدموں کے مکانوں میں ان کے گھوڑوں، مویشیوں اور غلہ کی وجہ سے کسی بھی دوسری شے کیلئے کوئی جگہ نہیں رہی ہے[۶]۔ (ہ) عوام کی زندگی کو بے چین کرنے کے لئے کسی بھی قسم کے خفیہ افسران نہیں ہیں یعنی نہ تو خفیہ جاسوس (منہیہ) اور نہ ہی عام نامہ نگار (منہی)[۷]۔ برنی نے فتاوائے جہانداری میں فیروز شاہی کے شروع کے حصہ میں ان تمام باتوں کی مذمت کی ہے۔ لیکن اب وہ ایک مختلف نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے۔

برنی قدرتی طور پر شاہی خاندان کے افراد جیسے فیروز شاہ کے دو فرزند شادی خاں (جو وکیل در تھا) اور فتح خاں، جن سے

۱۔ درہم اور دینار سلطنت روم کے تانبے اور نقرئی سکے تھے جنہیں مسلمانوں نے اپنا لیا تھا۔ طلائی سکہ کو عام طور سے دینار سرخ (سرخ دینار) کہا جاتا تھا۔

۲۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۵۰۳-۲۰۴۔

۳۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۵۳۔

۴۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۵۴۔

۵۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۵۳

۶۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۵۳

۷۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۵۷-۵۵۶۔

عوام واقف تھے جبکہ دوسرے شہزادے ابھی تک حرم میں رکھے گئے تھے،' اور سلطان کے دو بھائی قطب الدین اور فخر الدین ابراہیم کی تعریف کرتا ہے۔[1] اعلیٰ افسران میں مندرجہ ذیل کو خصوصی تعریف کے لئے منتخب کیا گیا: (۱) وزیر خاں جہاں مقبول "سلطان نے اسے مکمل اختیارات دیئے ہیں۔ کسی بھی سلطان نے اپنے وزیر پر اتنی عنایات کی ہیں جتنی کہ فیروز شاہ نے خان جہاں پر کی ہیں"، (۲) تاتار خاں۔ (۳) عریض ممالک ملک الشرق عماد الملک بشیر سلطانی عارض ممالک۔ ملک الامرأ شکار بیگ و ملان سلطانی۔ "وہ تاریخ فیروز شاہی کے اس مصنف کے لئے بہت مددگار رہا ہے اور اس جیسے عظیم انسان نے تخت سلطانی کے سامنے میرے حق میں کچھ سفارش کی ہے"۔ (۵) گجرات کا صوبیدار افتخار الملک۔ (۶) محمود بیگ شیر خاں۔ برنی اس کی عمر ۹۰ اور ۱۰۰ کے درمیان بتاتا ہے۔ "اپنے طویل دور میں، جس کے دوران وہ سپہ سالار، امیر اور ملک کے مدارج سے گزر کر خاں کے رتبہ کو پہنچا، اس نے کبھی کسی بغاوت میں حصہ نہیں لیا"۔[2] (۷) نائب وزیر ظفر خاں۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ خان جہاں سلطان کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا لیکن حکومت کے فیصلے دراصل خان جہاں کے فیصلے ہوتے تھے۔ برنی نے (اپنے نقطۂ نظر کے مطابق معقول وجوہات کی بنا پر) خان جہاں کی ابتدائی زندگی کو نظر انداز کیا ہے لیکن عفیف اپنی تاریخ فیروز شاہی میں مندرجہ ذیل عبارت درج کرتا ہے:

"خان جہاں تلنگ سے آیا تھا اور مشرف بہ اسلام ہونے سے قبل اس کا کنو نام تھا۔ وہ اپنی جماعت میں سب سے زیادہ باعزت شخص تھا اور اسے رائے تلنگ کے دربار میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ محمد بن تغلق نے رائے کو گرفتار کر کے دہلی کیلئے روانہ کیا لیکن رائے راستہ ہی میں مر گیا۔ خان جہاں مؤدبانہ محمد بن تغلق کے سامنے آیا اور کلمۂ شہادت پڑھا۔ سلطان نے اسے مقبول (قبول کیا ہوا) نام دیا اور اس پر نظر عنایت کی۔ بعد ازاں جب سلطان نے خان جہاں میں عقل و فہم کے تمام آثار دیکھے تو اسے شہر دہلی کا نائب وزیر مقرر کیا اور اس کے لئے ترقی کے دروازے وا کر دیئے۔ خان جہاں[3] جب کسی مراسلہ پر مہر ثبت کرتا تھا اور دستخط کرتا تھا تو وہ اپنا نام اس طرح لکھتا "مقبول غلام محمد تغلق حالانکہ ممتاز وزیر پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا پھر بھی وہ سب سے زیادہ دانشمند تھا اور اپنی فہم و ذکا کے باعث دار السلطنت کی زینت تھا۔ اسے اپنے دور کے آغاز میں قوام الملک کا خطاب ملا تھا اور ملتان کی صوبیداری اس کے سپرد کی گئی تھی۔ بعد ازاں اسے نائب وزیر مقرر کیا گیا۔ خواجۂ جہاں سلطان محمد کا وزیر تھا۔

"خان جہاں نے نائب وزیر کی حیثیت سے قوانین و ضوابط بنائے اور محکمۂ دیوانی کو بخوبی منظم کیا۔ صوبیدار خواجۂ

۱۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۸۶-۶۰۷ شاہی خاندان اور اعلیٰ افسران کی تعریف کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ شہزادہ فتح خاں کی عمر صرف سال کی لیکن برنی کا یہ دعویٰ ہے کہ شہزادہ اس پر مہربان تھا۔

۲۔ ص ۳۹۸-۳۹۴۔

۳۔ میں نے اسے خان جہاں سے یاد کیا ہے لیکن اسے یہ خطاب فیروز شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد عطا کیا تھا۔

جہاں سے زیادہ خائف نہیں تھے لیکن وہ خان جہاں سے شدید خوف محسوس کرتے تھے۔ اگر خواجہ جہاں کسی علاقہ کے صوبیدار کے ساتھ زیادہ سختی کرنا چاہتا تھا تو وہ اسے خان جہاں کے حوالے کردیتا اور آخر الذکر ضوابط کے مطابق اس کے ساتھ انتہائی بے دردی سے پیش آتا۔ نیز جب خواجہ جہاں، جو کہ ایک دیندار شخص تھا، دیوان کے عہدہ سے اپنی عبادت وریاضت کی خاطر کنارہ کش ہوا تو خان جہاں نے اس کی جگہ لی۔ وہ صوبیداروں سے سختی سے پیش آیا اور شاہی خزانہ کے لئے بکثرت رقوم اور اشیاء جمع کیں۔ خواجہ جہاں کے پاس وزیر کے خطاب کے سوائے کچھ بھی نہیں تھا۔ دیوان وزارت (محکمۂ دیوانی) کا تمام کام خان جہاں کے تجربہ اور ذہانت کے توسط سے چلتا رہا۔"

جیسا کہ بتایا گیا دونوں رفیق کار ایک دوسرے کے سخت دشمن بن گئے اور افسروں نے خواجہ جہاں کی معزولی کا جو مطالبہ کیا اس کی پشت پر کار فرما لیکن وجہ یہ تھی کہ وزیر کا عہدہ۔ اور حکومت کے طرز عمل کی نگرانی۔ خان جہاں کو تفویض ہونے والی تھی......

عفیف نے اس کے طریق کار کی ایک تصویر پیش کی ہے "عظیم وزیروں کی روایات کے مطابق خان جہاں ہر روز اپنے محکمہ میں تکیہ سے پشت لگا کر بیٹھتا تھا۔ وہ صوبیداروں اور دوسرے افسروں کے حسابات کا بغور جائزہ لیتا تھا اور خزانہ کا حصہ وصول کرتا تھا۔ خزانہ کا آمد و خرچ ہر روز اس کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ اس کا یہ اصرار ہوتا تھا کہ شمار سے باہر پیسہ ہر روز خزانہ میں رکھا جائے۔ اگر کسی دن خزانہ میں کافی پیسہ نہیں جمع ہوتا تھا تو وہ اپنے تمام افسران پر بہت برہم ہوتا اور اکثر یہ ہوتا کہ تشویش و فکر کی وجہ سے وہ کھانا ہی نہ کھاتا۔ ایسے مواقعہ پر یہ کہتا کہ حکومت کا استحکام خزانہ پر منحصر ہے۔ اگر خزانہ میں کافی پیسہ نہیں ہے یا اگر پیسہ نامناسب طور پر خرچ کیا جاتا ہے تو حکومت کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ اگر خدانخواستہ کسی دوراندیش سلطان کا خزانہ کسی سبب سے خالی ہوجاتا ہے تو حکومت کا قیام محال ہوجاتا ہے'۔ اسی وجہ سے وزیروں نے دن رات خزانہ کے لئے پیسہ جمع کرنے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا"[۱]

خان جہاں کی زندگی کا ایک اور پہلو ہے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ برمحل ہے۔ اُسے صنفِ نازک سے، بہت محبت بھی اور اُس نے بے حساب باندیاں رکھنے کے لئے مسلم شریعت کی اجازت کا پورا پورا استعمال کیا۔ اس کے گماشتے ملک ملک انہیں تلاش کرتے۔ عفیف لکھتا ہے "یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے حرم میں روم (بازنطین) سے لے کر چین، تک کے تمام ممالک کی دو ہزار باندیاں تھیں۔ ان میں سے ہر باندی اپنے کو عمدہ اور دلفریب ملبوسات اور زیورات سے آراستہ کرتی تھی، اور خان جہاں کام کے بوجھ کے باوجود ان کے ساتھ اپنے حرم میں کافی وقت، خاص طور سے مذہبی اہمیت کے تعطلات کے دن، گزارتا تھا۔ اس کے بکثرت بچے تھے"۔ فیروز شاہ نے خان جہاں کے ہر بیٹے کیلئے گیارہ ہزار ٹنکوں اور ہر بیٹی

۱۔ عفیف، فیروز شاہی، ص ۹۸۔ ۳۹۰۔

کے لئے پانچ ہزار ٹنکوں کا سالانہ وظیفہ (نان) مقرر کیا۔ فیروز شاہ نے اس کے رتبہ کو آگے سر تسلیم خم کر لیا گیا۔ وہ کہتا تھا کہ 'دہلی کا حقیقی سلطان اعظم ہمایوں خاں جہاں ہے'۔[1]

گزشتہ واقعات کے پیش نظر ہمیں یہ محسوس ہو گا کہ دہلی سلطنت، جس میں ایک نو مسلم ہندو ماں کے بطن سے پیدا ترک النسل سلطان بر سر اقتدار تھا اور جس کا وزیر ایک نو مسلم ہندو تھا جس کے پاس ایک بین الاقوامی حرم تھا، اُن زبردست کوتاہیوں کی کسی قدر تلافی کر رہی تھی جو اس صورت میں ناگزیر تھیں جبکہ حکومت کی باگ ڈور ایک مختصر سے مسلم حکمراں طبقہ کے ہاتھوں میں ہو۔ نیز خان جہاں نے جو مقام حاصل کیا وہ طویل اور مسلسل کوششوں اور بہت سی ناکامیوں کا نتیجہ تھا۔ یاقوت حبشی کو ترک شاہی خلہ نے قتل کیا حالانکہ وہ ہر لحاظ سے نیک اور متقی انسان تھا۔ ہمیں ریحان کے متعلق کچھ نہیں معلوم لیکن اسے غیاث الدین بلبن کی جماعت نے ہندی النسل ہونے کی وجہ سے قتل کر دیا۔ خلجی انقلاب نے بہت ہی کوتاہ حدود کے اندر نئے لوگوں کے لئے دروازے کھولے۔ یہ نئے لوگ وہ ہندوستانی مسلمان تھے جن کے اجداد نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جو ملک میں مسلمانوں کی تعداد کا بڑا حصہ تھے۔ نیز ان نئے لوگوں نو مسلم ہندو بھی تھے اور وہ ہندو بھی جنھوں نے مذہب تبدیل نہیں کیا تھا۔ ملک کافور وہ پہلا نو مسلم ہندو ہے جس نے قوتِ بازو سے انتظامیہ میں اپنے لئے بہترین ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ علاؤالدین خلجی کے دور حکومت کے آخری ایام میں اس کے طرز عمل میں انحطاط کی وجہ سے غالباً یہ حقیقت تھی کہ بیشتر افسر اس کے نسب کی وجہ سے اس کے مخالف تھے۔ خسرو خاں کی، جو محض مصاحب میں تھا کوئی گنتی نہیں۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ محمد بن تغلق کے عہد میں کافی تعداد میں ہندوستانی ہندو اور مسلمان دونوں ہی وفاداری اور قابلیت کی بنا پر انتظامیہ میں ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے۔ ان افسروں میں خان جہاں سب سے زیادہ ممتاز تھا۔

برنی کو، جو کہ بلبن کے عہد کے آزاد ترک افسروں کی جماعت کا ایک نو عمر رکن تھا، یہ سب کچھ برا لگا اور خدا کے دائمی احکام کے متضاد محسوس ہوا۔ وہ ہندوؤں سے نفرت کرتا تھا۔ وہ نو مسلم ہندوؤں سے بھی کم نفرت نہیں کرتا تھا کیوں اس کے خیال میں اسلام کا تعلق پیدائش سے تھا شعوری انتخاب سے نہیں۔ وہ حکومت میں ان نوواردوں سے نفرت کرتا تھا جن کے اجداد کسی گنتی شمار میں نہیں آتے تھے۔ ملازمت کے سلسلہ میں اس نے وفاداری اور قابلیت کے دونوں معیاروں کو مسترد کیا کیونکہ منصب حکومت کیلئے اس کا واحد معیار عالی نسب ہونا تھا جس کے مقابلہ میں کسی دوسری لیاقت کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اس کے خیال میں عالی نسب ہونے کا مطلب وسط ایشیا یا ایران سے ہجرت کئے ہوئے ایسے خاندان سے وابستہ ہونا تھا جسے ہندوستان میں اعلیٰ عہدوں سے سرفراز کیا گیا ہو اور جو 'نسباً' آزاد ہو اور جس کی اصل غلاموں سے نہ ملتی ہو۔

۱۔ عفیف، 'فیروز شاہی'، ص ۴۰۰۔

خان جہاں برنی کی تصانیف نہیں پڑھ سکتا تھا جن کی اس وقت تک تالیف نہیں ہوئی تھی لیکن برنی نے مرحوم سلطان کی بارگاہ میں جو کچھ بھی کہا تھا وہ اس کے علم میں ہوگا۔ ہندوؤں، کم اصلاح وغیرہ کے متعلق الفاظ جو برنی کو الہامی محسوس ہوتے تھے، ان جماعتوں کے اراکین کو قدرتی طور پر زہر آلود، نظر آئے۔ چنانچہ خان جہاں نے اپنا ذہن بنالیا۔ اس نے فیروز شاہ کا لحاظ کرتے ہوئے برنی کی جان تو بخش دی لیکن اس کی بیشتر جائیداد ضبط کر لی اور اسے حکم دیا کہ وہ بارگاہ سلطانی سے دور رہے۔ اس حکم میں بارگاہِ سلطانی کے حاضرین کے لئے بھی یہ ہدایت مضمر تھی کہ وہ برنی سے دور رہیں۔ یہ حسرت ہو سکتی ہے کہ کاش خان جہاں اخراجات کے معاملہ میں برنی کے ساتھ زیادہ فیاضی سے پیش آتا لیکن بنیادی طور پر حکم صحیح تھا۔ برنی کے لئے نئے حکمراں طبقہ میں یا اس بارگاہِ سلطانی میں کوئی جگہ نہیں تھی جس پر خان جہاں حاوی تھا برنی نے کہیں بھی اپنے دشمنوں کے نام نہیں لئے ہیں۔ وجہ صاف ہے واحد دشمن جس کا وہ نام لے سکتا تھا کوئی اور نہیں بلکہ عظیم وزیر وقت تھا۔

باب - ۷

نظریۂ بادشاہت

برنی اس طرح گفتگو کرتا ہے جیسے کہ بادشاہت تاریخ انسان کی عالمگیر سیاسی حقیقت تھی اور اسے اس کا کوئی شائبہ بھی نہیں کہ دنیا میں مختلف اصولوں کی بنیاد پر مختلف النوع بادشاہتیں رہی ہیں۔ وہ نظریۂ بادشاہت کو انتہائی سہل اور سادہ بنا دیتا ہے۔ آدم کے وقت سے لے کر اسلام کی آمد تک کرۂ ارض پر کچھ شاہی خاندانوں نے حکومت کی۔ رسول اکرم اور خلفائے راشدین 'سلطان' کے عام مفہوم کے مطابق 'سلطان' نہیں تھے' ان کے ظہور میں خدا کی طاقت شامل تھی اور ان کے طریقۂ کار کو قائم رکھنا ممکن نہیں تھا۔ برنی بعد کی خلافتوں کا معتقد نہیں ہے اور نہ ہی وہ نام نہاد مسلم ریاست کے نظریہ کا قائل ہے۔ امویوں کے بر سر اقتدار ہونے کے ساتھ پرانے طریقے پھر سے رائج ہو گئے۔ برنی کو پکا یقین ہے کہ مسلمانوں کی بادشاہت میں اور قدیم مشرکوں کی بادشاہتوں کے درمیان ایک حقیقی فرق ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بھی مسلم سلطان مصر کے فرعونوں کی طرح خدائی کا کھلم کھلا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تاہم اس کے پاس اس فرق کے بارے میں کوئی واضح تصور نہیں ہے جسے وہ مکمل طور پر مذہبی حلقے تک محدود رکھتا ہے لیکن وہ اپنے اس یقین کا اعادہ کرتا ہے کہ اسلام سے پیشتر کے اصول حکومت اس وقت بھی صحیح ہیں اور کیوں کہ مسلم سلاطین نے وہ درباری ضابطہ اختیار کیا جو ساسانی طریقہ کار سمجھا جاتا تھا لہٰذا برنی کا میلان ساسانی اور مسلم بادشاہتوں کے بنیادی فرق نظر انداز کرنے کی طرف محسوس ہوتا ہے۔ برنی کا دنیا کی تاریخ اور تاریخ عجم کے بارے میں بھی علم صرف سطحی ہی نہیں بلکہ نہایت گمراہ کن ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اس کی 'فتاوائے جہانداری سلطان محمود کے عہد میں تصنیف کی گئی تھی لہٰذا وہ دہلی کے کسی بھی فرماں روا کا حوالہ دینے سے محروم رہا ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ جہاں داری میں ہندوستانی

سماجی اور سیاسی نظام پر بحث کرتا ہے اور اس کے سیاسی افکار کی اصل اہمیت اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ یہ دہلی سلطنت کے اداروں کی پچانوے سال سے زیادہ کی کارگزاری کے جائزہ پر مبنی ہے. لیکن اس کے ذہن پر دوسری قسم کی باتیں بھی چھائی ہوئی تھیں اور ان دونوں کو علاحدہ کرنا ضروری ہے.

اگر بادشاہت کے بارے میں برنی کی بنیادی شرائط کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ بادشاہت کے بارے میں اس کا ایک نظریہ نہیں بلکہ دو نظریے تھے. اس کا پہلا نظریہ روایت (یا مفروضہ روایت) سستے ملاؤں کے اصولوں، حکمت کے متروک معیاروں اور انتہائی سطحی قسم کے مروجہ ضرب الامثال پر مبنی ہے. یہ نظریہ لازمی طور پر برنی کو تناقضات کے انبار میں پھنسا دیتا ہے. ان کا تفصیلی جائزہ غیر ضروری ہے صرف انتہائی اہم تناقضات شمار کرنے کی ضرورت ہے.

(الف) سلطان اپنے اس منصب کی نوعیت کی وجہ سے ہی ایک بڑا گنہگار بن جاتا ہے جسے قرآن اور رسول اکرم نے ناپسند کیا ہے. اس کے باوجود اگر وہ برنی کی نصیحتوں کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے تو اسے صوفیاء وانبیاء کے درمیان مقام حاصل ہوگا. یہ تو اسی طرح ہوا جیسے یہ کہا جائے کہ مسلم ڈاکو پر خدا کی رحمت ہوگی اگر وہ اچھا ڈاکو ہے ۔ یعنی اگر وہ دین کی بھلائی کی خاطر ایک بڑے پیمانے پر غیر مسلموں کو لوٹتا ہے، اپنی آمدنی کا ایک اچھا خاصا حصہ خیرات کے کاموں میں دیتا ہے (جس میں ملاؤں کے لیے فیاضانہ نذرانے شامل ہیں) اور اپنے کام میں مذہبی اصولوں سے رہنمائی حاصل کرتا ہے.

(ب) سلطان زمین پر خدا کا 'نائب' اور 'نمائندہ' ہے. وہ 'ظل الٰہی' ہے. اس کے اور اس کے مشیروں کے دماغ الہامات ربانی سے فیضیاب ہوتے ہیں. یہ شرط پہلے بیان کی تردید کرتی ہے. اور حقائق بھی اس کی تردید کرتے ہیں. عملی طور پر مسلمان یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ سلطان کا دماغ انوار الٰہی سے فیضیاب تھا مسلمانوں میں بشتر موروثی سلطان موروثی بے وقوف تھے جب کہ غاصب عام طور سے ظالم فرماں روا تھے. سلطان کی طاقت اسی وقت تک قائم رہتی جب تک وہ اسے اپنی انتظامی خوبی اور زور شمشیر سے برقرار رکھ سکتا تھا. اگر وہ ناکامیاب ہوتا تو اس کے مخالف اس پر کوئی رحم نہیں کرتے تھے. وہ اسے کتے کی طرح مار ڈالتے اور اس کی لاش اور اس کے سر کو نیزہ پر رکھ کر کھلے عام مظاہرہ کرتے. مسلم سلاطین کی اکثریت کو اور اسی طرح متوکل کے بعد بشتر عباسی خلفاء کو بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا. جب تک کوئی مسلم سلطان واقعی سلطان ہوتا اس کے گرد جبلی الوہیت کا 'ہالہ قائم' رہتا اور لوگ اسے سجدہ کرتے. لیکن اس کی طاقت کے زوال کے بعد اس کی الوہیت بھی دفعتاً غائب ہو جاتی. مسلم سیاسی شعور نے کسی بھی سلطان کو جائز فرماں روا کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا. معزول سلطان عام طور سے کٹا ہوا سر یا لاش ہوتا تھا جس کی کھلے عام نمائش کی جاتی تھی.

رج) برنی کے خیال کے مطابق سلطان خدائے تعالےٰ کی طرح اپنی متناقض خوبیوں کے ذریعہ حکومت کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے سلطان خدا کے ساتھ شرکت کا دعویٰ کرنے کی گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ شرک ہے جو قرآن کی رو سے ایک ناقابل معافی گناہ ہے۔ پھر بھی سلطان کے لیے نظم و نسق چلانے کے لیے ان متناقض خوبیوں کا حامل ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر اسے بخشش الٰہی حاصل کرنا ہے تو اسے اپنے دل میں اپنے اعمال و افعال کے لیے سراسر نادم رہنا چاہیئے ورنہ اس کا حشر فرعونوں کے ساتھ ہوگا۔ خدا اور سلطان کی متناقض خوبیوں کے اس نظریہ میں دوہری غلطیاں شامل ہیں۔ یہ درست ہے کہ قرآن نے خدا کے ساتھ جو صفات منسوب کی ہیں، جو عام خیال کے مطابق تعداد میں ننانوے ہیں، وہ لغوی معنی میں ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ لیکن یہ کہنا قطعی درست نہیں ہے کہ سمجھدار مسلمانوں نے خدا کو متناقض صفات کے مجموعے کی حیثیت سے تصور کیا ہے۔ خدا کے بارے میں ان کا بنیادی تصور خدائے رحمٰن رحیم) کا ہے خدا کی سہاد دینے والی صفات دراصل اس کی رحمت کی وجہ سے ہیں کیوں کہ ان میں بھی مخلوق کے لیے رحم موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح سلطان (یا مملکت) ناقابل مصالحت منافیات کا پلندہ نہیں ہے۔ مملکت کا مقصد (جیسا کہ خود برنی نے واضح کر دیا ہے) ضوابط کے نفاذ کے ذریعہ عوام کی بہبود ہے۔ سزا و جزا، عزل و نصب، محاصل و مصارف، گو بظاہر متضاد محسوس ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً یہ تضاد نہیں ہیں۔ اگر اختیارات مملکت کا صحیح استعمال ہو تو اہم خصوصیت متناقض نہیں توافق اور ہم آہنگی ہوگی۔ یہ واقعہ ہے کہ منافیات کا مکمل اخراج ممکن نہیں ہے تاہم عوام کی بہبود کے لیے ہم آہنگی مرکزی مقصد ہونا چاہیئے۔

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ برنی کو ان لغو خیالات کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہیئے جو اسے ماضی کی روایت سے ورثہ میں ملے تھے اور جنھیں اس نے بلا ضرورت وسعت دی۔

برنی کا دوسرا نظریہ، جس کے لیے رصرف وہی ذمہ دار ہے، ادارۂ بادشاہت کا اساس سماجی نظام کی ضرورتوں پر خاص طور سے نفاذ عدل پر رکھتا ہے۔ سماج کے ایک رکن کی حیثیت سے انسان کی اولین ضرورتیں ایک مرکزی انتظامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ برنی یونان اور قدیم دنیا کی جمہوریتوں یا غلامی کی ملکیت رکھنے والی شہری جمہوریتوں کے وجود سے واقف نہیں تھا۔ بہرصورت یہ واقفیت اس کے مقصد کے لیے ناموزوں ہوتی۔ جمہوری حکومتیں صرف مختصر مملکتوں میں ہی ممکن تھیں۔ اسلام میں غلاموں کی ملکیت رکھنے والی جمہوریت ممکن نہیں تھی کیوں کہ عالم اسلام میں اگر ایک طرف غلاموں کی تجارت کرنے والے ملک میں غلام لاتے تھے تو دوسری طرف دفتر قضا کی عدالتی کارروائیاں مزدور طبقہ جماعتوں کے ان غلاموں کو آزاد کرانے میں مدد کرنے کے لیے تیار ہوتی تھیں جو قاضیوں کو یہ اطمینان دلادیں کہ وہ اپنی روزانہ کی کمائیوں میں سے ایک تہائی اپنے آقاؤں کو دیں گے غلامی ایک نہایت بدنما ادارہ ہے لیکن اس کے کچھ بھی نقائص ہوں۔ ہندوستانی سماج کی بنیاد غلام مزدور

نہیں بلکہ اجرت کمانے والا مزدور تھا اور معاہدہ کی صورت میں مسلم شریعت مذہبی بنیادوں پر کسی بھی تفریق کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ نیز مسلم سیاسی شعور نے، مختلف وجوہات کی بناء پر، وسیع علاقائی مملکتوں کا مطالبہ کیا اور ان مملکتوں پر مرکزی امتیاز و اقتدار کے علاوہ کسی بھی دوسری صورت سے حکومت نہیں کی جا سکتی تھی اور یہ قرون وسطیٰ کے حالات کے تحت صرف ادارہ بادشاہت کے ذریعہ ممکن ہو سکتا تھا۔

بادشاہ کو ایک بار تسلیم کر لیا گیا تو اس کے دوسرے دستور و رواج خود بخود تسلیم کر لیے جائیں گے۔ مملکت کے سیکولر اور مذہبی دونوں طرح کے افسروں کی تقرری، ترقی اور برطرفی پر سلطان کا اختیار ہونا چاہیئے اس سلسلہ میں برنی تفصیل سے نصیحت کرتا ہے کہ یہ کس طرح کیا جائے۔ سلطان کو یہ اختیار بھی ہونا چاہیئے کہ وہ مختلف طرح کے جاسوس، مخبر اور خبر رساں افسر مقرر کر سکے جو سے اس کے عملہ کی کارگزاریوں سے مطلع کر سکیں۔ سلطان کے اقتدار کی ایک بنیاد طاقت ہے لہٰذا سلطان کو اپنی فوج کے سلسلہ میں ممتاط رہنا چاہیے فوج کے معاملہ میں برنی کفایت شعاری کی تمام باتوں کو بے محل سمجھتا تھا۔ لیکن ان سب سے زیادہ سلطان کو ضوابط بنانے کا اختیار حاصل ہونا چاہیئے خواہ انتہائی صورتوں میں وہ شریعت کے متضاد ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر ان قوانین کو مناسب طریقے سے بنایا اور نافذ کیا گیا تو حکومت کے زیر اثر علاقہ پر اس کے شعبوں کا یکساں عمل یقینی ہو جائے گا اور رعایا کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس مقام پر کھڑی ہے، وہ کہتا ہے "نظم حکومت کی اصطلاح میں ضابطہ کا مطلب (ایک طریق) عمل پر چلنا ہے جسے سلطان ایک لازمی فرض کی حیثیت سے اپنے اوپر عائد کرتا ہے اور جس سے وہ کبھی منحرف نہیں ہوتا ہے (نصیحت ۱۴)"۔ اس تشریح میں وہ انتظامی احکامات شامل ہیں جو صرف حکومت کے عملہ سے متعلق ہیں اور وہ قوانین بھی، جو عوام پر فرائض عاید کرتے ہیں اور انھیں اختیارات دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ برنی کے زمانہ میں مملکت سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ جب تک ضروری ہی نہ ہو، وہ مختلف اقوام کے شخص قوانین میں مداخلت نہیں کرے گی۔

لیکن اگر سلطان کو بذات قوانین بنانا تھے تو ہر شے اس کی ذہانت اور قوت کردار، حکمت اور قوت ارادی پر منحصر ہوگی۔ کمزور سلطان کے پاس ناجائز دباؤ کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہو سکتی۔ بہر صورت اگر ہر نئے تخت نشین کی آمد پر قوانین بدلتے رہے تو ان کا بنانا بے کار ہوگا۔ علاوہ ازیں قوانین کا بنانا ایک مشکل اور نازک مسئلہ ہے۔ اس کے لیے موجودہ قوانین اور موجودہ حالات سے واقفیت، سوجھ بوجھ، دانش مندی اور دور بینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ برنی ان کے پیش نظر اور دوسرے ملحوظات کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے اور مزید قرآن کی ہدایت پر مبنی اپنے استدلال کی بنیاد پر سلطان کی مجلس کو قوانین اور انتظامی ضوابط کی تشکیل کا اختیار دے کر بادشاہت کو دستوری شکل دینا چاہتا تھا (نصیحت ۲۰)، اراکین مجلس کا انتخاب سلطان کو غور و خوض

کے بعد اور قیاساً خود مجلس کے وضع کیے ہوئے اصولوں کے مطابق کرنا چاہیئے۔ سلطان کو بحثوں کے دوران موجود رہنا چاہیئے اور سوال قائم کرنا چاہیئے لیکن مجلس کو (زیر بحث) موضوع کے ہر پہلو پر، سلطان کی رائے سے باخبر ہوئے بغیر، بحث کرنے کی آزادی ہونا چاہیئے اگر اراکین متفق الرائے ہوں تو سلطان کو ان کا مشورہ قبول کرنا چاہیے اور ان میں اتفاق نہیں ہے تو بہتر یہی ہوگا کہ (زیر بحث) موضوع پر دوبارہ بحث کرلی جائے۔ محض مجلس کی اکثریت بے معنیٰ تھی کیوں کہ یہ صرف ایک مقررہ جماعت تھی۔ لیکن جہاں مجلس کے کام کے بنیادی اصول کا معاملہ ہے برنی نے بڑی جرأت سے یہ نصیحت کی ہے کہ" سلطانوں کے لیے کوئی رائے نہیں" برنی نے جس قسم کی مجلس کی تجویز کی اس کا کبھی تجربہ نہیں کیا گیا۔ سلاطین دہلی کی مجلس خاص ایک مختلف ادارہ تھا۔ اسے نظر انداز کیا جاسکتا تھا' اسے رد کیا جاسکتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح سلطان بھی مشکلات کے وقت صلاح ومشورہ کی طرف رجوع ہوتے تھے اور برنی نے جن زبردست کارناموں کا مشاہدہ کیا وہ سلطان کی مجلس خاص کے مرہون منت تھے جیسے علاؤالدین خلجی کی مال گزاری اور دوسری اصلاحات اور اس کے اقتصادی ضوابط۔ لیکن بعد ازاں علاؤالدین نے مجلس سے مشورہ کرنا ترک کردیا۔ محمد بن تغلق مباحثہ کے دوران اپنے مخالفین پر غالب آجاتا تھا۔ اس نے کبھی مشورہ نہیں لیا۔ جلال الدین خلجی (اگر برنی پر اعتبار کیا جائے) اکثر مجلس سے مشورہ کرتا تھا لیکن اس کے بڑے افسر ندیموں کی طرح بات کرتے تھے۔۔ سلطان نے مداخلت کی اور اپنے بھتیجے احمد چاپ پر حاوی ہوگیا۔ نتیجتہً مجلس کبھی کوئی صحیح فیصلہ نہیں کرسکی۔ دوسرے فرماں روا یا تو اپنے مصاحبوں کی خواہشات کے مطابق چلتے تھے یا اپنے افسروں سے علاحدہ علاحدہ مشورہ کرتے تھے۔

برنی نے بادشاہت میں یقین رکھتے ہوئے لیکن سلطانوں کے غیر مستقل کردار سے پریشان ہوکر جسے وہ دیکھ چکا تھا، یہ نظریہ قائم کیا کہ سلطان کی مجلس کو قاعدہ یا رواج کے مطابق، تقریباً آزاد جماعت ہونا چاہیئے تاکہ تخت نشین ہونے والوں یا ان کے بدلتے ہوئے مزاج کے ساتھ حکومت کے طریقۂ کار میں تغیر نہ ہوتا رہے۔ اس منصوبہ کی مشکلات ظاہر ہیں، ذمہ داری سلطان کی تھی۔ ذمہ داری کا یہاں مفہوم یہ ہے کہ بدانتظامی کے لیے سلطان کو اپنا سر گنوانا ہوتا تھا۔ ۱۲۰۶ء سے ۱۳۵۰ء تک حکومت کرنے والے دہلی کے سترہ فرماں رواؤں میں سے دس (جن میں خسرو خاں شامل ہے) قتل کیئے گئے یا انھیں زہر دیا گیا یا انھیں مرنے کے لیے قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ اگر سلطان کی ذمہ داریوں کو سزائے موت کے ذریعہ یقینی بنانا تھا تو یقیناً مقتولوں کی یہ تعداد نہایت مناسب تھی۔ لیکن خفیہ طور پر گفتگو کرنے اور اتفاق رائے سے عمل پیرا ہونے والی مجلس کو نہ تو عوام ہی ذمہ دار قرار دے سکتے تھے اور نہ ہی حکومت کے افسران۔ مزید خطرہ یہ لاحق تھا کہ مجلس شاہی اقتدار کو ختم کردیگی اور ترکان چہل گانی کی طرح طوائف الملوکی کے دور کا آغاز کردے گی۔ مجلس خاص جیسی بھی ہو سلاطین دہلی

اس پر نگاہ رکھتے تھے تاکہ یہ کہیں خود اپنی کوئی روایات نہ بنالے۔

بادشاہت کی ایک اور خامی، جسے برنی درست کرنا چاہتا تھا، سیاسی سزاؤں سے متعلق تھی۔ قرآن ان اشخاص کی طرف اشارہ کرتا ہے جنھیں منافقین کہا گیا ہے جو یا تو رسول اکرم کے مخالف تھے یا اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی برتتے تھے۔ لیکن قرآن ان کے نام نہیں لیتا ہے اور رسول اکرم نے انھیں سزائیں نہیں دیں۔ پہلے دو خلفاء کے زمانہ میں بغاوت کا کوئی مسئلہ نہیں اٹھا۔ تیسرے خلیفہ کے آخر عہد میں طوائف الملوکی پھیلی اور چوتھے خلیفہ کے عہد میں خانہ جنگی ہوئی۔ خلافت راشدہ، جیساکہ برنی نے بہت صحیح کہا ہے، عوام کے اتفاق پر مبنی تھی، قرآن یا رسول اکرم کے کسی حکم پر نہیں۔ بغاوت کا جرم، اصل معنیٰ میں، اسی وقت ممکن ہوسکا جب موروثی بادشاہت اور خالصتاً عالی نسب عرب قبیلوں سے چنے گئے اراکین پر مشتمل ار ال طبقہ کی بنیاد پر امویوں نے اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ قرآن یا اقوال رسولؐ میں ایسی کوئی ہدایت نہیں ہے جو کسی مسلمان کو اس طرح کی حکومت کی اطاعت یا اس کی مخالفت سے باز رہنے کی تاکید کرتی ہو۔ امویوں کی اپنی ہی خوبیاں تھیں۔ اموی فرماں رواؤں میں خوبیاں ضرور تھیں لیکن انھوں نے طاقت اور دہشت جیسی چیزوں پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی جو کہ خلفائے راشدین کے عہد میں غیر معروف تھیں۔ لاتعداد بغاوتیں ہوئیں اور ان سب کو۔ علاوہ آخری بغاوت کے۔ بڑی بے دردی سے کچل دیا گیا۔ امویوں نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے مخالفین کی بے دردانہ سرکوبی کا طریقہ اختیار کیا۔ عباسیوں نے امویوں کو معزول کرنے کے بعد یہی طریقہ کار اپنایا۔

سنیّوں کی شریعت عظیم عباسیوں کے عہد میں ہی مرتب و منظم کی گئی۔ اس نے بادشاہت اور بغاوت کے سلسلہ میں خاموشی کو ترجیح دی۔

برنی نے دہلی سلطنت کے جن پچانوے سالوں کا جائزہ لیا ہے ان میں کچھ مختصر عہدوں کو مستثنیٰ کرکے تمام حکومتوں نے اپنے مخالفین کو نہایت سنگین سزائیں دیں۔ وہ بلبن کے زمانہ سے ان سزاؤں کا اندراج شروع کرتا ہے جو محمد بن تغلق کے عہد میں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں یہ ایک المناک اور دل شکن داستان ہے جس میں خاص طور سے معصوم عورتوں اور بچوں کے قتل کے دل ہلا دینے والے واقعات بھی شامل ہیں۔

برنی حکومت کے وقار کو برقرار رکھنے کے لیے مناسب تعداد میں سزاؤں کے لیے تیار ہے اور اول تا آخر اس کی ہمدردیاں حکومت کے ساتھ ہیں جن کا اظہار اس نے ان کے مخالفین کے ساتھ کبھی نہیں کیا ہے۔ خواہ وہ کسی سلطان کو ناپسند ہی کیوں نہ کرتا ہو لیکن باغیوں کے ساتھ کبھی ہمدردی نہیں کرتا۔ وہ جلال الدین خلجی کی حکومت کی طرح کی کمزور اور ضرورت سے زیادہ نرم حکومت سے لاحق خطرہ سے بخوبی واقف ہے۔ وہ اس کی مزید تصدیق کرتا ہے کہ ان فتنہ پرداز ہندوستانیوں کو سخت اور بے رحم سلطان کے علاوہ کوئی بھی قابو

میں نہیں رکھ سکتا، لیکن وہ ان سزاؤں اور اذیتوں سے بہت زیادہ وحشت زدہ تھا جو اس نے اپنے گرد و پیش میں دیکھی تھیں اور تاریخ فیروز شاہی میں وہ ان کی بار بار مذمت کرتا ہے. جہاں داری میں (نصیحت ۱۴) وہ قانون بغاوت کے اصول پیش کرتا ہے جو حکومت کے استحکام کو قائم رکھ کر بھی عوام کے لیے حد سے سوا وحشت ناک اور انسانیت کے اصولوں کے مکمل منافی نہیں ہیں. قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں جو با اقتدار لوگ تھے ان کے لیے برنی کی تجاویز بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھیں اور ان پر غور کرنا ضروری تھا. لہٰذا یہ بہت افسوس ناک بات ہے کہ فتاوائے جہاں داری کبھی باقاعدہ شائع نہیں ہوئی اور اس طرح سیاسی بدعنوانیوں کے لیے سزاؤں کے مسئلہ پر برنی کے انتہائی معقول خیالات کی کوئی سماعت نہیں ہو سکی.

برنی بادشاہت کے حق میں تو ہے لیکن اس کی خامیوں کے بارے میں وہ کسی طرح کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہے. اس نے جن سلاطین کا مطالعہ کیا ہے ان میں سے کسی بھی سلطان کے طریق کار سے وہ مطمئن نہیں ہے. علاوہ غیاث الدین تغلق کے جس نے علاؤالدین خلجی کے طریق کار کو ان وحشت ناک طریقوں کو اختیار کیے بغیر جاری رکھنے کا بیڑہ اٹھایا جن کے سہارے اس طریقہ کو قائم کیا گیا تھا. ظاہر ہے اس یقین کے سبب کہ بادشاہت بحیثیت ایک نظام کے ناگزیر خامیاں رکھتی ہے اور سلطان بحیثیت سلطان کے کبھی پوری طرح سے اپنے فرائض کی انجام دہی نہیں کرے گا، برنی اپنی آخری نصیحت میں یہ تجویز رکھنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ سلطان کا قلب ہمیشہ قادر مطلق کے روبرو عاجز و منکسر رہنا چاہیے اور نیز اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خدا کی رحمت اور فضل و کرم کی اسے ہمیشہ ضرورت رہے گی.

فتاوائے جہانداری کی تصنیف تاریخ فیروز شاہی کے بعد ہوئی لیکن جس وقت مصنف فیروز شاہی تالیف کر رہا تھا اس کے ذہن میں ا... (یعنی فتاوائے جہاں داری) کے تمام خیالات موجود تھے چنانچہ ایک ہی مثال لیجیے، برنی بلبن سے اس کے بیٹے سلطان محمد (خان شہید) کے لیے ایک طویل نصیحت (جو دس صفحات پر مشتمل ہے) دلواتا ہے. اس نصیحت کے تمام خیالات جہاں داری میں مل جائیں گے. فتاوائے جہاں داری کا مدعا جیسا کہ برنی نے سوچا تھا، دہلی سلطنت کے اداروں کے چلانے کے لیے ایک معیار تجویز کرنا اور اس کے افسروں کو ضروری ہدایات دینا تھا. اس کی طرف پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ متناقضات اور محض لغویات سے لبریز روایتی نظریہ ایک ایسے نظریہ میں مخلوط ہو گیا جسے بذات خود برنی نے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں تیار کیا تھا اور جو بنیادی طور پر سیکولر تھا. اگر پہلے نظریہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس صورت میں دوسرا نظریہ جو باقی رہ جاتا ہے اسے ان شرائط کے ساتھ جن پر پہلے ہی بحث ہو چکی ہے تسلیم کیا جا سکتا ہے. قرون وسطیٰ کے ہندوستان کے مورخ کے لیے ایک خطرہ اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ وہ قرون وسطیٰ کے اداروں کو جدید

تصورات اور جدید معیاروں کی بنیاد پر پرکھنے کی طرف مائل ہے۔ جہاں داری کی اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ یہ ہمیں ان معیاروں سے متعارف کراتی ہے جو قرون وسطیٰ کے ایک عظیم مدبر نے اس عہد کے اداروں کے جائزہ کے لیے تجویز کیے تھے۔

اس موجودہ کتاب کی تصنیف کے دوران یہ ضروری ہوگیا تھا کہ کئی ایسی باتوں کی طرف اشارہ کیا جائے جو ہمارے مصنف کے لیے معیوب کن تھیں جیسے اس کی کمزور یادداشت، نسل ونسب کے بارے میں اس کی مایوس کن خود پسندی جو کسی قدر اس کی تباہی کا باعث ہوئی، ہندوؤں کے خلاف اس کا غیر منطقی تعصب جس کے لیے اسلام کوئی جواز فراہم نہیں کرتا ہے اور جو ارباب اقتدار کے لیے قابل قبول ہی نہیں تھا اور مذہب اسلام کے بارے میں اس کا انتہائی سطحی ادراک۔ یہ ضروری تھا کہ ان باتوں کو بھی زیادہ تر نقل کیا جائے جو برنی نے خود اپنی بدنامی کے لیے لکھیں۔ لیکن ان تمام کمیوں کے باوجود بھی تاریخ فیروز شاہی عہد سلطنت کی بقیہ موجودہ کتابوں میں عظیم ترین کتاب ہے۔ اس لحاظ سے اس کی برتری کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ امیر خسرو یا امیر حسن کی کسی بھی تصنیف کا اس سے موازنہ نہیں ہوسکتا وہ زیادہ قابل اور شہرت یافتہ لوگ تھے لیکن ان کی نمایاں تصانیف ایک خاص طریقہ فکر اور ایک مخصوص زبان سے بندھی ہوئی ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی کی عظمت یا غالباً خوش نصیبی اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ یہ مکمل طور پر تاریخ ہند پر مشتمل ہے اور جب تک تاریخ ہند کا مطالعہ کیا جاتا رہے گا برنی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔ عہد وسطیٰ میں اس کی تصنیف کے نسخے آسانی سے دستیاب نہیں تھے اکثر لوگ اس کے بارے میں خلاصوں کے ذریعہ واقفیت تھی یا پھر ان کے کانوں میں اس کے بارے میں محض سنی سنائی باتیں پڑگئی تھیں۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ "شیر خاں نے، بنگال کو مستثنیٰ کرکے تمام ہندوستان کو سینتالیس انتظامات میں تقسیم کردیا۔ اس نے فوجیوں کے گھوڑوں پر داغ لگانے کا طریقہ اختیار کیا، وہ علاؤالدین خلجی کے منصوبوں سے بھی واقف تھا جو تاریخ فیروز شاہی نے بیان کیے تھے اور اس نے ان میں سے کچھ کو اختیار کیا۔[1]" آج بلبن اور علاؤالدین کی قبریں نامعلوم ہیں۔ سیری میں صرف دو ٹیلوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ محل ہزار ستون کہاں کھڑا تھا، لیکن برنی نے جو ضعیف ہوچکا تھا جس کی آنکھوں کی روشنی تقریباً ختم ہوچکی تھی اور جو زبردست مصائب میں مبتلا تھا، یادداشت کی ایک شاندار کوشش کے ذریعہ بے جان نقش کو نئی زندگی بخشی یقیناً وہ ان کے ساتھ زندہ ہے ایسے مشکل حالات میں اور اتنا عمر رسیدہ ہونے کے بعد کسی بھی مورخ نے اتنی عظیم تصنیف پیش نہیں کی ہے۔

---

[1] اکبر نامہ بب انڈیکا، ج ١، ص ١٩٢

ضمیمہ الف

فارسی اصطلاحات کی فرہنگ

اباحتی۔ وہ لوگ جو مذہبی محرمات خاص طور پر زناکاری کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اسماعیلی فرقہ کے لیے استعمال کی گئی ایک فحش اصطلاح جس پر انتہائی لغو اور بے بنیاد الزام لگائے گئے ہیں۔

ابدال۔ صوفیا کا ایک درجہ۔ یہ درجات اوصاف کے لحاظ سے مندرجہ ذیل ترتیب سے ہوتے ہیں: غوث (قطب یا قطب الاقطاب) ابدال، اوتاد، اخیار وغیرہ۔

امیر۔ جمع امراء۔ امر سے یعنی حکم یا فرمانا۔ اس طرح امیر وہ ہے جو حکم دینے کا مجاز ہو۔ خلیفہ عمر نے امیرالمومنین کا خطاب اختیار کیا اور یہ عہدہ اس وقت سے خلیفہ کے برابر سمجھا گیا ہے۔ ایران کے وہ چھوٹے حکمراں جو نظریاتی طور پر خلیفہ کے ماتحت تھے انھوں نے امیر کا خطاب اختیار کیا۔ عہد سلطنت میں امرا تیسرے درجہ اور کمترین درجہ کے اعلیٰ افسران ہوتے تھے لیکن عہد وسطیٰ میں امرا کی اصطلاح اجتماعی طور پر حکومت کے اعلیٰ افسران کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ موجودہ دور میں لفظ امیر ایک دولت مند شخص کی نشاندہی کرتا ہے۔ شمالی ہندوستان کے عام محاورہ ہونے کے علاوہ اس استعمال کے لیے اور کوئی دوسرا جواز نہیں ہے۔

امیر داد۔ عدلیہ کا افسر

امیر صدہ۔ ایک سو (سپاہیوں) کا سپہ سالار

انصار۔ مدینہ کے مسلمان جنھوں نے رسول اللہؐ کی مدد کی جب کہ وہ وہاں آئے۔

اسلوب۔ حکومت کے احکام، منصوبے یا تدابیر۔

احتکار۔ کم قیمت پر اشیاء کو خریدنا اور کافی زیادہ پر فروخت کرنا کیوں کہ خرید و فروخت کرنے والا اشیاء

کا خصوصی مالک ہے۔ برنی احتکار پر نکتہ چینی کرتا ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ طریقہ ملک کے صرف بڑے ہندو تاجر اختیار کرتے تھے۔

الٰہیات۔ خیالات جو خدا تعالیٰ سے متعلق ہیں۔

امام۔ یہ اصطلاح مختلف معنیٰ میں استعمال ہوتی ہے (الف) عام سنی اس اصطلاح کے معنی باجماعت نماز کے پیش امام سے لیتے ہیں۔ سنی شریعت کی کتابوں میں حکومت کے سربراہ کو بھی امام کہا گیا ہے۔ سنی نسب، تقدس اور پاکیزگی کی بنیاد پر آل رسولؐ میں حضرت علیؓ سے لے کر امام مہدی تک کے بارہ اماموں کو مانتے ہیں (ب) شیعوں کا یقین ہے کہ یہ بارہ امام قانوناً صدر مملکت تھے اور شریعت مطہرہ کی ترجمانی کا اختیار رکھتے تھے (ج) اسماعیلی جو شیعوں کے بارہ اماموں میں سے حضرت امام جعفر صادق تک کے اماموں ہی کو مانتے ہیں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کاظم کے بجائے اسماعیل کو جانشین ہونا چاہیئے تھا۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے ایک مخفی یا ظاہر امام کی ضرورت ہے۔ مخفی امام اپنے نائب یا داعی کے ذریعہ انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور امام اس بات کا مجاز ہے کہ وہ قرآن کے قانون کو حالات کے مطابق تبدیل کرے۔

استبداد۔ ظلم

استحسان۔ عوام کی فلاح کا اصول

بیت المال خزانہ گھر۔ شریعت کے اصول کے مطابق سرکاری خزانہ تمام مسلمانوں کا ہوتا تھا اور رسول اللہؐ و خلفاؓ صرف اس کے محافظ تھے۔ لیکن اموی خلافت کے عروج کے ساتھ عوام کا خزانہ حکمراں کے ذاتی کاموں سے متعلق ہو گیا۔ سرکاری اخراجات اسے عوام سے حاصل ہونے والے لگان سے کرنا ہوتے تھے۔ لیکن وہ اپنی مرضی کے مطابق جتنا چاہتا خزانہ سے لے سکتا تھا اور اس کی محافظ کی حیثیت محض ایک داستان ہو کر رہ گئی تھی۔

برید۔ خبر پہنچانے والے افسران

برشگال۔ ہندوستان کا مانسون یا برسات۔ برنی اس کو ان ممالک سے منسوب کرتا ہے جہاں لوگ مانسون کو نہیں جانتے۔

بسط۔ راجع قبض

بدعت۔ نوطرزی۔ وہ کام کرنا جو رسول اللہ اور ان کے صحابہ نے نہیں کیے۔

تفسیر . قرآن پاک کی شرح

تصوف . مسلمانوں کی صوفیانہ روش یا میکانکی تشریح کے برعکس دین کی روحانی ترجمانی۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دین کے چار راستے ہیں: شریعت (ظاہری فقہی قانون اور میکانکی عمل) طریقت (عبادات و ریاضات) حقیقت (اصلیت) معرفت (علم الٰہی)، صوفیا شریعت یا ظاہری فقہی قانون پر نکتہ چینی نہیں کرتے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ صرف مذہب کی میکانکی پیروی ناکافی ہے۔ صوفیاء کے مقصد معرفت الٰہ کے بارے میں شیخ شہاب الدین سہروردی نے اس طرح تشریح کی ہے: کسی بھی خاص عنوان مثلاً گرامر (قواعد) کا مطلب ہے اس کے تمام اصولوں اور ساتھ ساتھ ان اصولوں کے استعمال کی بصیرت۔ وجود الٰہی کا مطلب ہے وجود (یا کم از کم روحانی زندگی) کے تمام اصولوں اور ساتھ ہی ساتھ ان اصولوں کے اطلاقات کی بصیرت۔ صوفیا کا دعوی تھا کہ علماء ظاہری سے، جنھیں وہ برا سمجھتے تھے، وہ قطعی جدا ہیں۔ تصوف کی بہترین روایت کا تقاضہ تھا کہ صوفی حکومت اور اس کے افسروں سے بے تعلق ہو۔

توفق آراء . رائے کی یکسانیت۔

جہانداری . حکومت (فتاوائے جہانداری دیکھیے)

جماعت خانہ . ایک صوفی کا گھر۔ عام طور پر ایک بڑے ہال پر مشتمل ہوتا تھا جس میں شیخ کے تمام مرید رہا کرتے تھے۔

جاسوس . جو خفیہ طور پر کام کرے۔ برید اور وقائع نویس سے جن کا تقرر علانیہ اور باضابطہ طور پر ہوتا تھا، جاسوس مختلف ہوتا تھا۔

جزیہ . شریعت کی کتابوں میں اس اصطلاح سے مراد وہ محصول ہے جو غیر مسلموں پر ان کے غیر مسلم قائم رہنے پر لگتا تھا۔ مسلم ممالک کی اقلیتوں پر جزیہ لگانا مشکل نہ تھا۔ لیکن عہد وسطیٰ میں جزیہ عاید نہیں کیا گیا۔ یہ ایک رجعت پرستانہ محصول تھا جو ۱۲، ۲۴ اور ۴۸ کے تناسب میں ہوتا تھا اور اس سے مزدور طبقہ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچتا تھا۔ لیکن عہد وسطیٰ میں یہ اصطلاح شریعت کے مفہوم کے ساتھ استعمال نہیں ہوئی۔ امیر خسرو اور امیر حسن دونوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں پر جزیہ عاید کیا گیا تھا۔ برنی جزیہ کو محصول آراضی کے علاوہ کسی بھی محصول کے مترادف سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے ایران کے حکمراں جزیہ وصول کرتے تھے اور اپنے زمانہ کے ضمن میں وہ اپنی اس بات پر بہت زیادہ اصرار کرتا تھا کہ ہندو رائے اپنی ہندو رعایا سے خراج اور جزیہ دونوں محصول کرتے ہیں اور یہ محصولات دہلی سلطنت کے مقابلے میں سو گنا زیادہ ہیں۔

چودھری . مقامی گروہ کا رہنما یا گاؤں کا مکھیا

چہل گانی . لفظی معنی چالیس؛ حوالہ اعلیٰ عہدہ داروں کی اس محدود تعداد کی طرف ہے جو التمش کی وفات سے

بلبن کے عہد حکومت تک برسر اقتدار رہے۔ ضروری نہیں کہ وہ تعداد میں چالیس ہوں۔

حدیث۔ رسول اللہ کی روایات یعنی رسول اللہ کے افعال اور اقوال زریں۔

حال۔ صوفیا کی اصطلاح جو صوفی کے روحانی مقام اور اس کی حالت ظاہر کرتی ہے۔

حدود۔ وہ جرم جس کے لیے قرآن میں سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔

خلیفہ۔ لفظی معنی جانشین یا نمائندہ۔ دونوں معنیٰ مناسب ہیں لیکن جس مفہوم میں یہ استعمال کیے جاتے ہیں اس کی وضاحت ضروری ہے (الف) قرآن پاک اعلان کرتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے انسان کو نمائندہ کی حیثیت سے زمین پر بھیجا ہے کیوں کہ تمام مخلوقات میں صرف انسان ہی کو اخلاقی طور پر ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ لیکن قرآن میں کوئی ایسی عبارت نہیں ہے جو برنی کی اس حجت کو صحیح ثابت کرتی ہو کہ سلطان خدا تعالیٰ کا نائب یا خدا کا نمائندہ ہے یہ دعویٰ قرآن کی بنیاد پر صرف انسانوں کے لیے ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ انسان خدا تعالیٰ کا کائناتی مقاصد کا مظہر ہے (ب) خلفائے راشدین اپنے آپ کو خلفاء کہتے تھے۔ کیوں کہ حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے وہ رسول اللہ کے جانشین تھے۔ انھوں نے کبھی دعوی نہیں کیا کہ وہ صرف خدا کے نمائندے ہیں۔ بعد میں یہ اصطلاح بگڑ گئی۔ برنی خلیفہ، بادشاہ اور فرماں روا کو مترادف معنیٰ میں استعمال کرتا ہے۔ میں یہ نہیں معلوم کر سکا کہ جدید اردو میں نائی خلیفہ کیوں کہلاتے ہیں۔

خان۔ ایک ترکی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں 'ہیرو'، 'بہادر جنگجو، حکمراں'۔ منگولیائی اور ترکی ممالک میں (مثلاً چنگیز خاں کی حکومت اور ان کے وارثوں کی سلطنت اور دولت عثمانیہ) خان کا خطاب حکومت کے سربراہ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ نویں اور دسویں صدی میں ترکی کی چھوٹی ریاستوں کے فرماں رواؤں نے بھی خان کا لقب اختیار کیا۔ عہد سلطنت میں خان کا خطاب اعلیٰ ترین افسران کو دیا جاتا تھا۔ مغلیہ دور میں صرف وہی لوگ خان کا خطاب استعمال کر سکتے تھے جنھیں بادشاہ نے انفرادی امتیاز کی خاطر یہ خطاب عطا کیا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان اصل یا ذہنی افغان نسل کے ہر فرد نے اپنے آپ کو خان کہنا شروع کر دیا۔ افغانستان میں یہ اب ہر شہری کا خطاب ہے جس طرح کہ ہمارے ملک میں شری کی اصطلاح ہے۔

خانقاہ۔ صوفیا کا ایک بڑا مکان

خواص۔ نمایاں لوگ۔ ملک کے اعلیٰ افراد۔ برنی اس اصطلاح کے معنیٰ میں ملک کے اعلیٰ افسران یا مذہبی علما کو بھی شامل کرتا ہے۔ ان میں مورخین بھی شامل ہیں جن کو وہ زاہدوں کے برابر کا

کا جز دیتا ہے

خراج۔ پیش کش، نذر۔ عام طور پر زمین کے محصول کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یا اس پیش کش کے لیے جو کوئی ماتحت حکمراں اپنے سے برتر فرماں روا کو دیتا تھا۔

خوط۔ عام طور پر مقدم یا گاؤں کے سربراہ کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔ یہ اس خط یا نوشتہ سے قواعد کو نظرانداز کرتے ہوئے ماخوذ ہے جو خوط محصول وصول کرنے کے بعد حکومت کو دیا کرتا تھا۔

خسرو۔ بازنطین یا نئے روم کے شہنشاہ۔ فارسی ادب میں روم کی اصطلاح عام طور پر بازنطین کی حکومت کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ سکندر اعظم کو اکثر سکندر رومی کہا جاتا ہے۔

دہریت۔ مادیت پرستی

دہقان۔ ایک جاگیردار امیر جو ضرورت کے وقت بادشاہ کو کمک دے۔ ابتدائی دور میں تو یہ اصطلاح اسی مفہوم میں استعمال ہوئی۔ لیکن بعد کے ادب میں اس کے معنی کسان یا گاؤں والے سے لیے گئے ہیں۔

درہم اور دینار تانبے اور چاندی کے رومی سکے جو مسلمانوں نے اختیار کیے۔

دیوان۔ ایک وزارت، ادارہ یا دفتر لیکن جب تک کہ کوئی متعلقہ صفت نہ بڑھائی جائے اس وقت تک دیوان سے مراد لگان کی وزارت ہوگی۔

دیوان ہشم۔ وزارت جنگ

روایات۔ رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے زمانے کے طریقۂ کار کا علم

زکوٰۃ۔ قرآن شریف کے مطابق ضروری خیرات۔ خلیفہ عثمان کے زمانہ سے حکومت اس کی وصولیابی نہیں کرتی ہے لیکن اس کی ادائیگی عوام کی مرضی پر چھوڑ دی گئی ہے جو صاحب نصاب ہیں۔ یہ آمدنی کی تقریباً ۲½ فی صدی ہوتی ہے۔ لیکن کچھ غیر نامی چیزوں مثلاً عورتوں کے زیورات پر بھی زکوٰۃ ضروری ہے۔ زکوٰۃ کی چنگی اور درآمدات پر محصول کے معنی میں کبھی کبھی استعمال ہونے کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ شریعت کے مطابق مسلمانوں پر یہ محصول ۲½ فی صدی اور غیر مسلموں پر پانچ فی صدی ہونا چاہیئے۔ لیکن عملی طور پر یہ امتیاز ناممکن تھا چنانچہ اس کا مقصد صرف یہ ہو کر رہ گیا کہ غیر مسلموں کی جائداد مسلمانوں کے نام سے بچ کر نکل جاتی۔ مغل شہنشاہ بھی یورپ کی تجارتی کمپنیوں سے ایک نگی بندھی رقم لینے پر راضی ہوگئے۔ یہ بھی شریعت کے اصولوں کا انحراف تھا۔

ستیش۔ مطلق العنان

سوداگر۔ برنی اس اصطلاح کو اعلیٰ درجہ کے تاجروں کے لیے استعمال کرتا ہے جنھیں وہ سوداگر کاروانی اور سوداگر بازار میں تقسیم کرتا ہے۔ کاروان کے منتظمین کو سوداگر کاروانی کہتے تھے اور سوداگر بازاری سے مراد بظاہر تھوک بیوپاری سے ہے۔ یہ بات نصیحت ۹ (نرخوں کا ضبط) سے واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں گروہ ہندو فرقہ سے متعلق تھے۔ معمولی دوکانداروں کو برنی نے بازاری اور بازار کے لوگ کہا ہے۔

سلسلہ۔ صوفیا کا نظام۔ سلسلہ کی ابتدا شاید گیارھویں صدی کے اختتام یا بارھویں صدی کے آغاز میں ہوئی سوائے سلسلہ خواجگان کے (جو بعد ازاں نقشبندی سلسلہ کہلایا) جو دسویں صدی یا اس سے بھی پہلے دریائے جیحون سے ماوراء ترکی ممالک میں شروع ہوا جس کے بانی کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سلسلہ کی بنیاد اس پر ہے کہ اپنے شیخ یا روحانی رہنما کی فرماں برداری کی جائے۔ لیکن چوں کہ مشائخ کے احکام ان کے مریدوں کے لیے آخری حرف ہوتے تھے لہٰذا مسلم صوفیاء رومن کیتھولک کلیسائی نظام کی طرح کا کوئی مذہبی نظام قائم نہیں کر سکتے۔

سلطان۔ لفظی طور پر اس کے معنی 'طاقت'، 'قوت'، اشتقاقی طور پر حکمراں یا بادشاہ مراد ہے۔ منہاج السراج جوزجانی لکھتا ہے کہ محمود غزنوی پہلا حکمراں تھا جس کو عباسی خلیفہ نے سلطان کا لقب دیا۔ اگرچہ اس کے سکوں میں صرف امیر محمود کا حوالہ ملتا ہے۔ دہلی کے حکمراں اپنے آپ کو شاہ السلطان کہتے تھے۔ اس کے بعد اس لقب کی اہمیت اس قدر گھٹ گئی کہ انتہائی چھوٹے علاقوں کے چھوٹے چھوٹے حکمراں بھی اپنے کو سلطان کہنے لگے۔

سلطانی۔ سلطان کا غلام۔ یہ لقب اکثر ان غلاموں نے اختیار کیا جو اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئے تھے۔

سنہ۔ لفظی معنی روایت کے ہیں۔ سنہ کے تین درجے مانے جاتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی سنت، رسول اللہ کی سنت اور ملت کی سنت۔ اللہ تعالیٰ کی سنت معلوم کرنا دقت طلب ہے۔ عملی طور پر کسی حد تک قبل اسلام کے رسم و رواج اور کچھ حد تک نئے حالات زندگی کی وجہ سے ملت کی سنت رسول اللہ سے منسوب سنت پر غالب ہوئی ہے۔

سورہ۔ وہ ابواب جن میں قرآن شریف کو تقسیم کیا گیا ہے۔ سہولت کے لیے قرآن شریف کو ۳۰ مساوی حصوں میں منقسم کیا گیا ہے جو پارے کہلاتے ہیں۔

شیخ۔ عربی میں شیخ کے معنی ایک اعلیٰ شخص یا سردار کے ہیں۔ مسلم مذہبی ادب میں ہندی کے لفظ گرو کے مترادف

کوئی لفظ نہیں ہے لیکن صوفیا کی اصطلاح میں شیخ کا لفظ اسی مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ حقیقت میں شیخ وہ صوفی ہوتا تھا جس کو اس کا مرشد ایک باقاعدہ اجازت نامہ دے جو خلافت نامہ (جانشینی کا نوشتہ) کہلاتا تھا جو اس کو اپنے مرشد کے سلسلے میں مرید کرنے کا مجاز بنا دیتا تھا۔

شرک۔ خدا کا شریک قرار دینا

مشرک۔ وہ شخص جو یہ عقیدہ رکھے کہ خدا اپنا شریک رکھتا ہے۔

صدہ امیر۔ ایک سو سپاہیوں کا سپہ سالار

صفار۔ تانبے کا کام کرنے والا۔ مسلم مورخین نے صفاری لقب اس شاہی خاندان کو دیا جس کی حکومت کی بنیاد یعقوب بن لیث نے ڈالی تھی یہ حکومت تھوڑے عرصہ کے لیے رہی۔

ضوابط حکومت کے قوانین۔

ظل اللہ خدا کا سایہ۔ بادشاہوں کا لقب

عالم۔ راجع علماء

عارض ممالک عارض اصل وزیر جنگ

عرض۔ سپاہیوں کا جائزہ کے لیے اکٹھا ہونا جس وقت ان کے گھوڑے، ہتھیار اور ان کی صلاحیت کا معائنہ ان کی تنخواہوں کی ادائگی سے پہلے کیا جاتا تھا۔

علماء عالم کی جامع۔ عالم کے معنی پڑھا لکھا شخص یا وہ شخص جو علم رکھتا ہو۔ عملی طور پر یہ اصطلاح صرف مذہبی علماء تک محدود رہ گئی۔ مجرد سائنس دانوں مثلاً البیرونی کو اس میں شامل نہیں کیا ہے۔ روایتی طور پر علماء کو دو گروہوں میں منقسم کیا ہے۔ (الف) علماء ظاہری یا علماء دنیاوی جو دنیا کی چیزوں کے خواہاں تھے خواہ وہ کسی بھی شکل وصورت میں ہو لیکن عام طور پر حکومت کی ملازمت مثلاً قاضی، صدر، مدرس وغیرہ (ب) علماء دینوی، علماء باطنی یا صوفیا جنھوں نے مذہبی علم کو دنیاوی ترقی کے لیے استعمال نہیں کیا اور جن کا نصب العین صرف تلاش حق (خدا) ہوتا تھا۔

عرف رسم یا رسوماتی قانون

عبادت؛ مذہبی ریاضت

عدد؛ ایک مسلمان بیوہ کے لیے مقرر کی گئی چار ماہ اور دس دن کی مدت جو اسے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد دوسری شادی سے پہلے گزارنا ہوتی ہے۔

فتاوائے جہانداری۔ مسلم شریعت کی اصطلاح میں فتویٰ سے مراد کسی مختلف فیہ قانونی اصول پر کسی مفتی یا فقیہ کی دی

ہوئی رائے سے ہے۔ جہانداری کے معنی دنیا کو زیر نگین رکھنا ہے۔ یہ جہاں گیری یا دنیا کو فتح کرنے سے مختلف ہے۔ برنی اپنی کتاب کے عنوان کے لیے ان دونوں لفظوں کو عام معنی میں استعمال کرتا ہے۔ یوں کہیئے کہ حکومت اور ریاست سے متعلق ضوابط یا نصائح کے معنی میں۔ اس کی وضاحت اس حقیقت سے ہوجاتی ہے کہ اس نے اپنی تصنیف کو ۲۴ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ کو 'نصیحت' عنوان دیا ہے۔

فرض۔ ضروری مذہبی ذمہ داریاں۔

فقہ۔ اسلامی قانون۔

فتوح۔ ہمسایہ کے لیے غیر مطلوبہ خیرات۔ دورِ سلطنت کے چشتی صوفیاء کے مطابق وہ ذریعہ معاش جس کی ایک صوفی کو اجازت دی گئی تھی فتوح یا زمین احیاء تھی یعنی ایک غیر کاشت شدہ زمین کو جوتنے کے بعد جو پیداوار حاصل ہو۔

قبض اور بسط۔ صوفیاء کی اصطلاح میں طبیعت کی گھٹن اور ہلکا پن۔

قلندر۔ عہدِ وسطیٰ کا نیم صوفیانہ گروہ جو اب تقریباً مکمل طور پر ختم ہوچکا ہے۔ اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔ (الف) گروہوں میں رہنا جو مسلسل گشت کرتے رہیں۔ (ب) تجرد، (ج) ذاتی جائداد کے اصول سے انکار جس کے نتیجہ میں وہ فقیر بن گئے اور ضرورت کی چیزوں کو زبردستی مانگنا شروع کردیا (د) تعلیم کی کمی، (ہ) اسلام کی عبادات کو نظر انداز کرنا (و) زعفرانی رنگ کے کپڑے، ایک لوہے کا کڑا اور ایک کشکول (ز) داڑھی، مونچھ اور سر کے بال منڈوانا۔ مسلم صوفی مصنف جو عام طور سے انھیں غیر شائستہ اور غیر مہذب کہتے ہیں۔ ان کی ابتداء کے بارے میں کچھ دریافت کرنے میں ناکامیاب رہے۔ وہ غالباً بدھ مذہب کے بھکشو تھے۔ جو اسلام قبول کرنے کے باوجود اپنی پرانی عادات ہی میں رہے۔ یہ لوگ اکثر مسلم ممالک میں دیکھے گئے۔

قصد۔ کوشش، قوت ارادہ

قاضی۔ شریعت کے مطابق قاضی ایک منصف ہے اور بحیثیت قاضی اس کی ذمہ داری یہیں تک محدود ہے کہ وہ ان مقدموں کا فیصلہ کرے جو حکومت یا نجی طریقوں کے ذریعہ سے اس کے سامنے لائے جائیں۔ پھانسی دینے کا اختیار جو امیر داد کے دائرہ عمل میں آتا تھا قاضی کو حاصل نہیں تھا۔ لیکن اکثر انھیں دوسرے فرائض بھی سونپے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر اکثر ان کو صدر بنایا جاتا تھا خیراتی کام، ریاست کے انعامات و وظائف، مسجدوں کی نگرانی وغیرہ کا انتظام ان کے دائرہ عمل میں ہوتا تھا

قیاس۔ تسلیم شدہ فقہی اصول کی مماثل حالات تک توسیع۔

قطب۔ لفظی معنی محور۔ قطبی ستارہ کو بھی کہتے ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں صوفیاء میں بلند ترین مقام رکھنے والا۔

قطب الاقطاب۔ محوروں کا محور۔ عملی طور پر قطب کے ہم معنی۔

کافر۔ راجع کفر

کلمہ۔ کلمہ طیبہ: لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کسرا۔ قبل اسلام کے ایران شہنشاہ

کفر۔ لفظی معنی ناشکر گزار۔ کافر وہ ہے جو اپنے ناشکرے پن کی وجہ سے خدا کے حقوق کو تسلیم نہ کرے۔

لنگر خانہ یا ضیافت خانہ۔ ایک خیراتی باورچی خانہ جس کا انتظام بادشاہ یا دوسرے افراد کی طرف سے کیا جاتا تھا اور جہاں سے غرباء کو کھانا تقسیم ہوتا تھا۔

لوح محفوظ۔ محفوظ تختی۔

محضر عموماً مذہبی راہنماؤں پر مشتمل ایک ایک مجلس جسے بادشاہ مختلف فیہ معاملہ کے لیے طلب کرتا تھا۔ ایسی مجلس کے فیصلہ کو بھی محضر کہتے ہیں۔ لفظی طور پر وہ جگہ جہاں لوگ بیٹھتے ہیں۔ ایک نشست اور اجتماع۔ اس سے برنی کی مراد وہ نشست یا اجتماع ہے جو بادشاہ طلب کرتا تھا۔ اگر عوامی ہوتی تھی تو مجلس عام یا بار عام، اگر صرف رازدارانہ مسائل کے لیے ہوتی تو مجلس خاص، مجلس رائے، مجلس محرم یا مجلس خلوت کہلاتی تھی۔

مکتوم۔ ایک روپوش صوفی

ملک۔ ملک کے عربی معنی بادشاہ یا حکمراں ہیں اور قرآن میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔ لیکن ایرانی بادشاہوں نے یہ نام اپنے اعلیٰ افسران کو دیا اور دور سلطنت میں حکومت کے دوسرے درجے کے اعلیٰ افسران ملک کہلاتے تھے۔ مغلیہ دور میں بادشاہوں نے ذاتی اعزاز کے طور پر ملک کا خطاب دیا۔ مغلوں کے زوال کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں نے جن کے آباؤ اجداد ملک تھے۔ موروثی امتیاز کے طور پر یہ لقب اختیار کر لیا۔

منقولات۔ علم منقولات، وہ علم جو روایات پر مبنی ہو، مثلاً قرآن، احادیث اور مجتہدوں کے اصول۔

منسوخ۔ وہ حکم جو بعد میں نازل شدہ قرآنی آیت کے ذریعہ رد کر دیا گیا۔

معاملات۔ انسانی کام، قانونی تعلقات۔

مہاجر۔ ایک مسلمان جو رسول اللہ کے ساتھ مکہ سے مدینہ منتقل ہوا ہو۔

محتسب۔ اخلاقیات کا نگراں

مجتہد۔ (الف) سنی اس اصطلاح سے مراد ان نامور لوگوں سے لیتے ہیں جنھوں نے شریعت کی بنیاد ڈالی۔ اور جو عباسیوں کے دور میں عروج پر تھے۔ ان کے بعد اجتہاد کا دروازہ اور شریعت کے نئے اصول وضع کرنے کا طریقہ ختم ہو گیا (ب) شیعوں کے مطابق مجتہد وہ عالم ہے جس کی سند پہلے گیارہ اماموں سے کسی ایک امام سے ملتی ہو

مخبر۔ خفیہ طور پر خبر دینے والا

ملاّ۔ ایک مذہبی آدمی یا عالم

منافقین۔ دھوکے باز۔ اصطلاحی طور پر مدینہ کے وہ لوگ جنھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا لیکن دراصل وہ مخلص نہیں تھے۔ قرآن ان کی تنبیہہ کرتا ہے لیکن ان کو سخت وسست نہیں سناتا ہے اور نہ ہی ان کے لیے کوئی خاص اور واضح سزائیں مقرر کرتا ہے۔ روسو کا کہنا ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنا انتظام ترغیب کے ذریعہ کیا اور سختی اور زبردستی سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ انھوں نے دھوکہ اور مکر کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا۔

منہی۔ ممنوعہ چیزوں کے متعلق باضابطہ خبر دینے والا

مقدم۔ ایک گاؤں یا کئی گاؤں کا سربراہ

مقام صوفیاء کی ایک اصطلاح جو صوفی کی ایک مخصوص منزل اور حالت کی نشاندہی کرتی ہے۔

مشرک۔ راجع شرک

ندیم۔ درباری

ناسخ۔ قرآن کی آیت جو پچھلے حکم کو معطل کردے۔

نرخ برآورد لاگت کے اعتبار سے قیمتیں۔ برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ علاؤالدین نے روزانہ کے استعمال کی چیزوں کی قیمتیں اس اصول کے مطابق مقرر کیں تھیں۔ فتاوائے جہاں داری میں وہ وہ کہتا ہے کہ تمام بادشاہوں کو اس اصول کا پابند ہونا چاہیئے۔ اگر آمدورفت کے ذرائع معقول طور مہیا ہوتے ہیں تو چیزوں کی قیمت خود بخود لاگت کے مطابق ہو جاتی ہے۔ لیکن عہد وسطیٰ میں سڑکیں غیر محفوظ تھیں اور چند تاجر ذرائع آمدورفت۔ گاڑیاں اور بیل۔ بلا شرکت غیرے اپنے قبضہ میں رکھتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر وہ اس حیثیت میں تھے کہ لاگت کا خیال کیئے بغیر قیمتیں مقرر

کر سکیں۔ برنی نے زور دیا ہے تمام چیزوں کی قیمتیں بادشاہ خود ہی مقرر کرے۔

ولی۔ صوفی کا عام لقب۔

وصایا۔ عہدنامہ، مرنے والے کی خواہش، وصیت کی جمع ہے۔

ضمیمہ (ب)

فتاوائے جہانداری میں برنی نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے

(مقدمہ میں ان کتابوں کی نوعیت کے متعلق گفتگو کی جا چکی ہے۔ انھیں اسی ترتیب سے درج فہرست کیا گیا ہے جس ترتیب سے جہاں داری میں ان کا حوالہ دیا گیا ہے سوائے تاریخ محمودی کے جس کا حوالہ برنی اپنی تاریخ برمکی کے مقدمہ میں دیتا ہے۔)

۱۔ مولانا قفال: تاریخ محمودی (تاریخ سلطان محمودؒ)

۲۔ تاریخ سامانیاں: (سامانی خاندان کی تاریخ) مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے۔

۳۔ امام اسمعی: تاریخ خلفاء عباسیہ (عباسی خلفاء کی تاریخ)

۴۔ وصایای جمشید: (جمشید کی وصیتیں) مصنف نامعلوم۔

۵۔ مآثر عمری: (خلیفہ حضرت عمرؓ کی روایات) مصنف نامعلوم

۶۔ امام واقدی: تاریخ مختصر

۷۔ تاریخ مآثر صحابہ: (صحابہ کے عمدہ کارناموں کی تاریخ) مصنف نامعلوم

۸۔ امام سلمی: تاریخ عباسیہ (عباسیوں کی تاریخ)

۹۔ تاریخ اکاسرہ: (ایرانی کسراؤں کی تاریخ) مصنف نامعلوم

۱۰۔ مآثر الخلفاء: (خلفاء کے عمدہ کام) مصنف نامعلوم

۱۱۔ شرح السنہ: (رسول اللہ کی روایات کی شرح)

۱۲۔ معین اعثم: (تاریخ سنجری (سلطان سنجری کی تاریخ)

۱۳۔ غدر السیر: غالباً وہ کتاب جس میں خلیفہ حضرت عمرؓ کے خلاف بغاوت کا ذکر ہے۔ مصنف نامعلوم

CHECKED 2019